OSMANIA UNIVERSITY

ارتقائے نظم حکومت یورپ

سلسلۂ نصابات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

ارتقائے نظمِ حکومتِ یورپ

تصنیف

ہنری سجوک

ترجمۂ

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے

رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

۱۳۴۸ھ م ۱۳۳۸ف م ۱۹۲۹ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب مسرز میکملن اینڈ کمپنی کی اجازت سے جن کو
حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ کرکے
طبع وشائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین ارتقائے نظم حکومت یورپ

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتقائے نظم حکومت یورپ

خطبۂ اول

تمہیدی تبصرہ

ا — میرا مقصد یہ ہے کہ اس تمہید کے بعد جو خطبات شروع ہوں ان میں سیاسی معاشرتوں کی تاریخ کے ایک اہم حصہ پر سیاسیات استقرائی کے لحاظ سے جیسا کہ میں اس علم کو سمجھتا ہوں بحث کروں "سیاسی معاشرت" کا پورا مفہوم جوں جوں ہم اس مضمون کو آگے پڑھیں گے معلوم ہوتا جائیگا۔ سردست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس جملہ سے میری مراد ایک گروہ آدمیوں کا ہے جو آپس میں متحد ہوتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں سے اس بنا پر امتیاز رکھتے ہیں کہ وہ ایک ہی نظم حکومت کے مطیع رہنے کے عادی ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ایک متحدہ مجموعہ ہیں یعنی کل کا اطلاق ان پر ہوتا ہے۔ اس مجموعۂ انسانی کی زندگی میں اور ان لوگوں کی زندگی میں جس سے یہ مجموعہ بنا ہے تمیز کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی معاشرت (یعنی سیاسی معاشرت) جب تمدن کے ایک خاص درجہ پر پہونچتی ہے تو اس کو "سلطنت" بھی کہتے ہیں اور یہ امر میرے لئے اختیاری ہوگا کہ میں اس کو چاہے "سیاسی معاشرت" کہوں چاہے سلطنت۔ نظم حکومت کو میں ایک لازمی خاصہ سلطنتوں یا سیاسی معاشرتوں کا اس حیثیت سے کہ وہ "سلطنتیں" یا سیاسی معاشرتیں ہیں سمجھتا ہوں۔ اور چونکہ ان میں نظم حکومت ہوتا ہے اس لئے ہم کو ان ہی سلطنتوں یا سیاسی معاشرتوں سے از اول تا آخر بحث رہے گی۔ معاشری انسان کے دیگر خصائص جنکے

ساتھ وہ ہم کو مختلف زمانوں اور ملکوں میں نظر آئے گا اور اس کے السنہ و رواج، اس کے مذاہب اور علوم و فنون حتیٰ کہ اس کی معاشی حالت سے ہم کو جو کچھ بحث ہوگی وہ بواسطہ ہوگی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان دیگر خصائص سے ہم کو اسی حد تک بحث ہوگی جس حد تک کوئی بڑا تعلق علت و معلول کی قسم کا اس چیز میں نظر آئے گا جکو میں مختصر طور پر دستور کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دستور سے میری مراد ہوگی نظم حکومت کی وہ ساخت جس کے تحت میں انسان رہتا ہے اور اس نظم حکومت کے وہ تعلقات جو اس کو اپنے محکوموں کے ساتھ ہوتے ہیں

میرے اس قول کا کہ میں سیاسی معاشرتوں سے بلحاظ سیاست بحث کروں گا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو مجھکو بحث دساتیر سے ہوگی جیسے کہ وہ ہیں یا رہ چکے ہیں اور اس سے بحث نہ ہوگی کہ کسی دستور کو کیسا ہونا چاہئے اور دوسری طرف مجھکو اس تحقیق کیلئے غور کرنا ہوگا کہ (۱) یہ دساتیر اپنے اقسام میں کس قسم کے ہیں یا وہ عام نمونے کیا ہیں جنکو یہ دساتیر بطور مثال کے پیش کرتے ہیں اور (۲) وہ اسباب کیا ہیں جن سے کوئی عام نمونہ مختلف ملکوں میں مختلف زمانوں میں رائج ہوا۔ اس طرح جن پہلوؤں سے سیاسیات کو دیکھا جاتا ہے ان میں امتیاز قایم کروں گا یعنی ایک جانب تو سیاسی فلسفے سے جسکا میدان بہت وسیع ہے اور دوسری جانب معمولی سیاسی تاریخ سے سیاسیات کا فرق بتاؤں گا۔ سیاسیات کو جب اس طریقے سے بیان کیا جائے گا تو ایک جانب تو یہ دریافت ہوگا کہ اس علم کو سیاسی فلسفہ کی طرح اس بات سے براہ راست کوئی بحث نہیں ہے کہ نظم حکومت کی کونسی شکل صحیح اور بہترین ہے یا اس کی وہ کونسی شکل ہے جس کو ہم معاشرت کے ارتقا میں ایک خاص درجہ پر پہونچ کر رائج کریں۔ فی الواقع ہم سیاسیات سے ایسے نتائج اخذ کرنے کی توقع کر سکتے ہیں جو انسان کو عملی فایدہ پہونچاتے ہیں۔ اور میں آگے چلکر غور کروں گا کہ کس طریقے سے اور کس حد تک یہ نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں لیکن سیاسیات کا اصلی کام یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی سیاسی تعمیر کھڑی کردے۔ بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سیاسی واقعات سے خواہ وہ تاریخ سے مہیا ہوئے ہوں یا کسی زمانۂ خاص کے مشاہدے سے، عام نتائج مستنبط کرے۔ جہاں تک ہمارے مطالعہ کو دستور کے نمونوں سے بحث ہے وہاں تک یہ نمونے وہ ہیں جو دنیا کے واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ یہ مثالی نمونے نہیں ہیں جن کو مطمح نظر بنانے کے لئے سیاسیات ہمارے سامنے پیش کرتی ہو۔

دوسری جانب سیاسیات اور سیاسی تاریخ میں جو چیز تمیز پیدا کرتی ہے وہ
سیاسیات کی یہ غرض ہے کہ اس سے نتائج کلی پیدا کئے جائیں۔ لیکن سیاسیات کے طالب علم
ہونے کی حیثیت سے ہمارا اصلی مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی خاص تاریخی قوم کی نظم حکومت
کی ساخت یا اس کے منصبی فرائض کو تحقیق کریں بلکہ ہمارا اصلی مقصود یہ ہے کہ نظم حکومت
کی مختلف شکلوں میں جو خصوصیات بہ اعتبار ان کی ساخت اور منصبی فرائض کے ایسے ہوں
جو ان شکلوں میں تمیز کراتے ہوں انکو تحقیق کیا جاے۔ ہمارا اصلی کام یہ نہو گا کہ اس
خاص روش کو جو مثلاً ایتھنز یا انگلستان میں سیاسی تبدیلی نے اختیار کی اس کو دریافت
کریں بلکہ ہمارا کام ان قوانین اور رجحانات کو دریافت کرنا ہوگا جن کی مثال سیاسی
تبدیلی کی ان خاص روشوں میں ملتی ہے۔

چنانچہ اکثر ہوتا ہے کہ سیاسی واقعات بالکل ایک ہی ہیں لیکن مورخ اور
متعلم سیاسیات ان کو بالکل مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرتا ہے۔ مورخ کی اصلی غرض
یہ ہوتی ہے کہ واقعات کو وقت کے لحاظ سے ترتیب دے کر پیش کرے۔ لیکن بنی
نوع انسان کے مختلف حصوں میں ان کے ارتقا کا مقابلہ کرنے میں ہم کو تمام زمانۂ
ماضی اور حال میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر محض ایک زمانہ لیا جائے تو ان مختلف حصوں
کے ارتقا مختلف مراحل پر نظر آئیں گے اور اس وجہ سے یہ تقریباً ممکن ہے کہ ارتقا کے
ایک ہی مرحلہ پر وہ ایسے مختلف زمانوں میں ہوں جن میں بڑا فصل ہو۔ پس سیاسیات
کا مقصد یہ ہے کہ مقابلہ کی غرض سے ان معاشرتوں کو یکجا کرے جو اپنے سیاسی خصائص
میں مشابہت رکھتے ہوں۔ زمانہ کے لحاظ سے خواہ ان میں کتنا ہی بعد ہو۔ اس طرح
جب اس مطالعہ کے شروع میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ "ابتدائی ہندی جرمانی" دستور
کا ایک عام تخیل قائم کریں تو ہم کو مصنف ٹیسیٹس نے اپنے زمانہ میں جرمانیوں
کا جو کچھ حال لکھا ہے اس کا مقابلہ اسی زمانہ کے سیاسی نظام رومائے سے نہیں کرنا پڑتا بلکہ
اس سے بہت پہلے کے رومانی دستور سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے جس کا حال ازمنۂ قدیمہ کے
بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہے اس سے دریافت ہوتا ہے۔

۲۔ پس دیگر علوم کی طرح سیاسیات کا مقصد بھی یہی ہے کہ جن چیزوں
کو وہ مطالعہ کرے ان میں مشابہت کے تعلقات کو دریافت کرے۔ ان چیزوں

کو اقسام میں ترتیب دینا یا ان کو اس طور سے پیش کرنا کہ وہ سیاسی نمونوں کی مثالیں ہیں اس کا کام ہے۔ لیکن گو اقسام میں ترتیب دینا اس کے کام کا بڑا حصہ ہے لیکن یہ کل کام نہیں ہے اور نہ میں کہوں گا کہ یہ سب سے زیادہ خوشگوار کام ہے مختلف شکل کے دستوروں میں جو چیز خاص طور پر دلچسپ معلوم ہوتی ہے وہ ان کے اسباب اور نتائج کا دریافت کرنا ہے اور خصوصاً ارتقا میں اس التزام کو معلوم کرنا کہ دستور کی ایک مشکل کس طرح دوسری شکل اختیار کرنے کی طرف مائل رہتی ہے۔ اس کام کی دشواری میں مطلق شبہ نہیں۔ تمام سیاسی معاشرتوں کے متعلق جو تاریخ میں ملتے ہیں سرسری طور پر یا امتحاناً اس کام کو انجام دینے کی میں ہمت تک نہ کر سکا۔ البتہ اس مضمون کے صرف ایک محدود حصہ سے مجھکو بحث رہیگی جس کو میں نے اس وجہ سے منتخب کیا ہے کہ میرے سامعین علمی و سیاسی دونوں اعتبار سے اس میں دلچسپی رکھتے ہیں پس میری کوشش زیادہ تر اس طرف مبذول رہیگی کہ سیاسی معاشرت کی جن خاص شکلوں کو یورپ کی تاریخ تمدن ظاہر کرے ان کو مع ان کے تمیزی خصوصیات کے پیش کروں اور جو بڑی مشابہتیں ان میں ہوں ان کے لحاظ سے ان کے اقسام قائم کروں اور ارتقار مسلسل کا ایک تصور قائم کر کے اس کی بناء پر ان میں ایک رشتہ پیدا کروں۔ اور ان کی نسبت خیال کروں کہ یہ خاص شکلیں اس راہ کے مراحل ہیں جنکو سیاسی معاشرتوں نے تاریخ کی اقلیم میں طے کیا ہے اور جسکا نتیجہ آج کل کی سلطنت ہے جیسا کہ ہم اس کا علم رکھتے ہیں۔

یورپ کی تاریخ پر اس پہلو سے بحث کرنے میں اس کو ایک احدیت اس قسم کی حاصل ہو جائے گی جو ترکیب وارتقار اجسام حیوانات و نباتات میں پائی جاتی ہے! لیکن در حقیقت یہی ایک پہلو نہیں ہے جس سے تاریخ کی احدیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ متمدن معاشرت کا نشو و نما ایک بڑا پیچیدہ واقعہ ہے جسکے بہت سے اجزاء اور منظر ہیں۔ پھر اس کے دوسرے اجزاء بھی ہیں مثلاً خیال اور علم کا ارتقا۔ یہ اجزاء ایک ایسا مرکزی اور اساسی واقعہ صحیح طور پر سمجھے جا سکتے ہیں جسکے گرد دوسری قسم کے ارتقاؤں کو جمع کرنا پڑے گا۔ تاہم منظمہ سیاسی معاشرت کے ارتقا میں ہم کو معاشری تبدیلی کی زنجیر کی ایک ایسی کڑی ملجاتی ہے جسکی درجہ بدرجہ تحقیق سے تاریخ کے وہ سلسلے جنکو ہم زمانہ قدیم یا زمانہ وسطیٰ و دور جدید کی تاریخیں کہکر ان میں

فرق کرنے کے عادی ہو گئے ہیں وہ سب قدرتی طور پر ایک ہی مسلسل و بسیط تاریخ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اب تاریخ کی اس احدیت کا ایک روشن اور مکمل تصور قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ماضی و حال کو جوڑ دیں۔ یعنی اپنے ذہن میں اس بات کو ہمیشہ حاضر رکھیں کہ "تاریخ زمانۂ ماضی کی سیاست ہے اور سیاست زمانہ حال کی تاریخ ہے"۔ اور جب ہم اس طرح ماضی کو حال سے ملا دینگے تو لازمی ہے کہ ہمارے خیالات حال سے مستقبل میں پہونچیں۔ خاصکر سلطنتوں کے اس مجموعے کی آیندہ حالت کا اندازہ کرنے لگیں جنکا ایک رکن انگریزی سلطنت بھی ہے، اور جو اس وقت بدیہی طور پر کرۂ ارض کے بڑے حصہ پر صاحب اقتدار ہے اور اسطرح، گو سیاسیات جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں صرف علم ہے، براہ راست کوئی عمل نہیں، ہم قدرتاً سیاسی معاشرت کے ارتقائے ماضیہ کو ایک خیالی شوق علمی سے بڑھکر کسی چیز کے لئے مطالعہ کرنے لگتے ہیں یعنی اس تحقیق میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنے زمانہ کے عملی مسائل سیاسی کے متعلق اس مطالعہ سے کس قسم کی اور کس قدر ہدایت حاصل کرنے کی ہم کو توقع رکھنی چاہئے۔ میرا خیال نہیں ہے جیسے کہ میں کہیں اور بھی کہہ چکا ہوں کہ تاریخی طریقہ وہ طریقہ ہے جو عملی سیاسیات کے مسائل کو معقول طور پر حل کرنے میں حقیقتاً مستقل ہو سکتا ہو۔ اس کی پہلی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ تاریخ نہ تو سیاسی ادارات میں ان کے آخری مقصود کو بتا سکتی ہے اور نہ ان میں برے بھلے صحیح و غلط کے معیار کا اندازہ کر سکتی ہے خواہ اس کو ہم انسان کی "عام مسرت" سمجھیں اور خواہ جیسا کہ اور لوگوں نے خیال کیا ہے "انسانی بہبودی" تصور کریں جس کا مفہوم کسی طور پر ایسا بتایا گیا ہے کہ "انسانی مسرت" کے مفہوم سے اس میں تمیز ہو سکے۔ یہ آخری مقصود ہم تاریخ سے حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ہم اپنے ساتھ اس کو تاریخ میں لاتے ہیں یعنی جسوقت ہم پرانے قوانین یا سیاسی ادارات کو تاریخ میں پڑھکر ان کی بھلائی برائی کا اندازہ کرتے ہیں تو اس آخری مقصود کے خیال کو ہم پیش نظر رکھتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ ہم اس امر میں متفق بھی ہو گئے کہ وہ مقصود آخری کیا ہے جس تک ایک سیاسی مدبر کو پہونچنا چاہئے تو اس حالت میں بھی میرے خیال میں تاریخ بہت محدود طریقے پر ان ذرائع کے انتخاب

میں مدد دے گی جو مقصود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس کا باعث یہ ہے کہ تبدیلی اور ارتقا کا سلسلہ جس میں سیاسی معاشرت نقل و حرکت کرتی ہے برابر جاری ہے اور اس بنا پر زمانہ گزشتہ کے تجربے اگر یہ زمانہ گزشتہ بالکل ہی ماضی قریب نہیں ہے ان ضروریات پر اکثر عائد نہیں ہوتے جو موجودہ زمانہ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کو پیش آتی ہیں۔

لیکن گزشتہ زمانہ کی تاریخ میرے خیال میں اصلی سرچشمہ ان معلومات کا نہیں ہے جنکی بنا پر ہم اپنے زمانے اور اپنے ملک کے مسائل سیاسی کا فیصلہ کرتے ہیں تاہم یہ بہت ضروری ہے کہ اس گزشتہ تاریخ سے جس حد تک ہدایت مل سکے ہدایت حاصل کی جائے۔ اولاً۔ جو کچھ گزر چکا ہے اس کے مطالعہ سے ہم سیاسی ارتقا کے قوانین دریافت کرتے ہیں اور اسطرح پیش بینی کر سکتے ہیں۔ گو بہت غیر واضح طور پر کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس پیش بینی میں ہم کوئی سیاسی تخیل ایسا نہیں قائم کرسکتے جس سے ہم کو اس کا اندازہ ہو کہ کس چیز کو ہمیں اپنا مقصود بنانا چاہئے لیکن اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس چیز کو اپنا مقصود نہ بنانا چاہئے، اس بنا پر کہ اپنی پہونچ سے وہ باہر ہے۔ واقعات گذشتہ کے مطالعہ سے ہم کو کسی قدر اندازہ ان حدود کا ہو جاتا ہے جس میں ایک قابل عمل سیاسی تخیل محدود ہے، اور اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرت اور حالات کس قسم کے ہوں گے جنکا لحاظ کرکے آیندہ سیاسی ادارات کو ان کے موافق مزاج بنانا ہے۔ تاریخ گذشتہ کے مطالعہ سے ہم گو بالکل یقین کے ساتھ نہیں لیکن احتمال کے بڑے درجہ تک یہ بھی دریافت کر سکتے ہیں کہ خود ہماری سیاسی معاشرت سے کون سے اجزا اور خصائص ایسے ہیں جو تعداد میں بڑھتے جائیں گے اور ان کی وقعت کم ہوتی جائے گی اور کون سے اجزا، و خصائص ایسے ہیں جو تعداد میں کم ہوتے جائیں گے اور ان کی قیمت گھٹتی جائے گی۔ اس قسم کی پیش بینی کا مادہ صحیح طور پر کس حد تک حاصل ہو سکتا ہے میں ابتک نہیں معلوم کر سکا ہوں لیکن سیاسیات کا مقصد اور اس کی بڑی تمنا یہی ہونی چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو اس پیش بینی کی قابلیت کو حاصل کرے۔

دوسرے یہ کہ تاریخ ایک اور طرح پر بھی ہماری خدمت کرتی ہے،

یعنی یہ کہ ایسی معاشرتوں سے جو ہم سے غیر ہیں خواہ وہ غیر قومیں ہوں یا ماتحت ممالک ان کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہئے۔ سیاسی ادارت کی تاریخ میں سیاسی اور معاشری نظام کی شکلیں طرح طرح کی نظر آتی ہیں جنکے مطالعہ سے ہم اسی قسم کے ہم زمانہ نظاموں کی نوعیت کو اور اس امر کو کہ ان سے کس عمل کے ظاہر ہونے کا احتمال ہے بہتر طریقہ پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ انسانی معاشرتیں (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) ارتقا کے مختلف مراحل میں ہم زمانہ ہوتی ہیں، اور ہم کو بحث فی الواقع ان قوموں سے ہوتی ہے جنکی موجودہ سیاسی معاشرت کی حالت کیلئے ہدایت آموز نظیریں ایسی گزشتہ معاشرتوں کی حالت میں دریافت ہوتی ہیں جن سے ہم بہتر طریقہ پر واقف ہیں، مثلاً نہایت قابل مبصروں کی رائے ہے کہ اگر قبضۂ اراضی کا تاریخی ارتقا جسطرح کہ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق وہ یورپ کے ملکوں میں پیش آیا تھا اگر انگریزی مدبروں کے پیش نظر ہوتا تو ہند کی انگریزی حکومت میں بہت سی صریح غلطیاں نہ ہونے پاتیں۔

اس طرح تاریخ اپنے معمولی مفہوم میں یعنی یہ کہ وہ ایک مطالعہ زمانۂ ماضی کا ہے ایک جزو اس علم کا مہیا کرتی ہے جسکو ہم "سیاسیات متقابلہ" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ دوسرا جزو اس علم کا اسی زمانہ کے مشاہدات سے مہیا ہوتا ہے، اگرچہ معلومات کے جو مختلف مجموعے ان دونوں اجزا سے حاصل ہوتے ہیں ان کا ملانا ایک دشوار کام ہے۔

۲۔ اس کے بعد ایک سوال جو سب سے زیادہ وقعت رکھتا ہے یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی دستور کی گذشتہ تاریخ سے ہم اپنی سیاسی حالت کی کس حد تک ایسی نظیریں یا تمثیلیں (مشابہتیں) دریافت کر سکتے ہیں جن سے ہدایت حاصل ہوتی ہے؟

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ اگر مغربی یورپ کے لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ ترقی کی راہ میں وہ اوروں سے آگے ہیں تو ہم کو اس قسم کی اکثر نظیریں (مشابہتیں) جن سے ہدایت حاصل ہو سکتی ہے ان سلطنتوں کی زمانہ حال سے کچھ پہلے کی تاریخ میں ملیں گی جو ہمارے مجموعے میں شامل ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں مثلاً ممالک متحدہ امریکہ اور انگریزی نوآبادیاں تجربے کے بڑے قیمتی سبق اس مضمون کے متعلق دے سکتی ہیں کہ نیابتی جمہوریت جو انگریزوں کے مقدر میں لکھی معلوم ہوتی ہے لیکن جو انگلستان کی

بہ نسبت ممالک متحدہ اور نوآبادیوں میں زیادہ مکمل طریقہ پر رائج ہے کس طرح کام کرتی ہے۔

زمانۂ حال سے کچھ پہلے کی تاریخ ہی سے یہ ہدایت آموز نظیریں اس وقت تلاش نہیں کی گئیں جبکہ ایک بڑا سلسلہ سیاسی مباحث کا اس بنا پر مدت تک جاری رہا تھا کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جمہوری آزادی اور اس کی برکتیں حاصل کرنے کے شوق نے بڑے پرجوش طریقہ پر اپنا اعلان کیا تھا بلکہ مونٹسکیو اور روسو کے زمانہ سے سرہنری مین کے زمانہ تک اس قسم کی سیاسی بحث میں ایک بڑا درجہ اس عمومیت پر غور کرنے کو دیا گیا جس کا علم ہم کو یونان اور روما کی تاریخوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر اس پرانی عمومیت کا مطالعہ غور واحتیاط سے کیا جائے تو اس تبدیلی کی تدریجی حالت دریافت ہو جائے گی جو سیاسی معاشرت کے اس نمونے میں پیش آرہی ہے جسکو ہم مغربی یورپ اور امریکہ کی باقاعدہ سلطنت کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس میں عام طور پر اتفاق کیا گیا ہے کہ مغربی یورپ کی سلطنتیں عمومیت کی طرف حرکت کر رہی ہیں اور اس امر پر غور کرنے میں کہ یہ تحریک اچھی ہے یا بری اور جو خطرات ومشکلات اس راہ میں پیدا ہیں ان کو کسطرح رفع کیا جائے تمثیلی دلائل ہمیشہ اس بات پر مبنی کیے گئے ہیں کہ یونان کی شہری سلطنتوں میں عموم کا اور روما کی جمہوریت میں جبکہ وہ اپنی آخری شکل اختیار کر چکی تھی عمومی مجالس کا چلن اور برتاؤ کیسا تھا۔ میرے خیال میں اس قسم کے نظائر وتشبیہات سے کام لینے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ یونان وروما کے سیاسی حالات میں اور موجودہ یورپ کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے۔ خاصکر (۱) ایک چھوٹی سی سلطنت کی بلاواسطہ عمومیت میں جہاں قوم کے سب لوگ مجلس میں شریک ہو سکتے تھے اور بڑی سلطنتوں کی نیابتی عمومیت میں جسکا آجکل بالعموم رواج ہے بڑا فرق ہے (۲) دوسرا فرق وہ تھا جو رواج غلامی نے پیدا کیا تھا۔ اس فرق نے قدیم زمانہ کی سب سے زیادہ عمومی قوموں میں مزدور پیشہ جماعت کے ایک بڑے حصہ کو سیاسی حقوق سے قطعی محروم کر دیا تھا۔ (۳) تیسرا فرق کلیسا اور سلطنت کی علحدگی تھا جو ہمارے آج کل کی معاشرتوں نے وسطی یورپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ (۴) چوتھا فرق آج کل کی سلطنت میں صنعت وحرفت کے تبدیل شدہ حالات اور مرتبہ کا ہے، مگر ان فرقوں کا لحاظ کرنے کے بعد بھی میرے

خیال میں یہ بات دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ قدیم یونان اور اطالیہ کی شہری سلطنتوں کے تیز رفتار ارتقا میں جو مراحل یکے بعد دیگرے پیش آئے اور موجودہ یورپ کی "ملکی سلطنت" کے سُست رفتار ارتقا میں جو مراحل ایک کے بعد ایک پیش آئے، ان میں مقابلہ کیا جائے کیونکہ ان ارتقاؤں میں مشابہت چاہے کسی درجہ کی ہو پھر بھی ان میں احتیاط اور قاعدے سے مقابلہ کرنا وہ چیز ہے جو ہماری نظر کو ان نصیحتوں کی پوری قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے صحیح کردے گا جو آجکل کے ارباب سیاست کے لئے قدیم تاریخ سے ہمیشہ نکلتی رہیگی یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ قدیم اور بعد کے ارتقا میں صرف مشابہت ہی کی بناء پر تعلق نہیں ہے۔ "جدید سلطنت" جو سیاسی تمدن کا آخری ثمرہ ہے ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مثالیں صرف مغربی یورپ کی سلطنتوں میں یا ایسی نو آبادیوں میں جو ان سلطنتوں نے قایم کی ہیں مل سکتی ہیں اور مغربی یورپ کی سلطنتیں یا تو (۱) رومانی شہنشاہی کے ٹکڑے ہیں جو جرمانیوں کی ناگہانی یورشں نے کردئے تھے اور جن کی سیاسی تنظیم رومانی تمدن اور جرمانی قبائل کے سیاسی عادات کے مطابق از سرنو ہوئی - یا (۲) وہ قومیں ہیں جوان جرمانی قبائل فاتح سے ابتدا میں نسلی قرابت رکھتی تھیں اور بعد کو انھیں کے سیاسی اور معاشری ارتقا کے اثرات سے ان کی طرف کھنچ آئیں۔ فرانس - ہسپانیہ - اطالیہ پہلی قسم کی مثالیں ہیں اور جرمانیہ اور اسکانڈی نیویا دوسری قسم کی۔ انگلستان تاریخی حیثیت سے تو ان دونوں کے بین بین ہے لیکن جب ان کے سیاسی ارتقا کے حالات دریافت ہوتے ہیں تو انگلستان کو دوسری قسم میں رکھنا پڑتا ہے[ع]۔ علاوہ اس کے ان سلطنتوں کے کل مجموعے کے سیاسی خیال پر ایک بڑے درجہ تک وہ اثر پڑا جو تاریخ یونان کے مطالعہ سے اور حکمائے یونان کے اُن تصورات اور اصول کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا جو انھوں نے یونان کی شہری سلطنتوں پر غور کرکے قائم کئے تھے۔

لہذا میرا قصد ہے کہ میں قدیم یونان و روما کے سیاسی ادارات اور رومانی دور

ع - گو انگلستان مدت دراز تک رومانی شہنشاہی کا ایک صوبہ تھا اور جرمانیہ کل کا کل کبھی رومانی شہنشاہی میں داخل نہ تھا پھر بھی انگلستان کی بہ نسبت جرمانیہ کے سیاسی ارتقا پر ان خیالات کا زیادہ اثر پڑا جو روما سے ماخوذ تھے۔

سلطنت کے بعد والے مغربی یورپ اور اس کی نوآبادیوں کے سیاسی ادارات کے دائرہ میں اپنی توجہ تمام تر محدود رکھوں۔ یہ حد بندی اس قدر تنگ نہیں ہے جیسے کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ سیاسیات کی غرض جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں پیش نظر رکھی جائے بلاشبہ سیاسی ادارات اپنے وسیع ترین معنوں میں کرۂ ارض کے کسی خاص حصہ یا انسان کی مختلف نسلوں میں سے کسی خاص نسل سے مخصوص نہیں ہیں۔ گو ایسی معاشرتیں یعنی گروہ میں رہنے والے آدمیوں کی جماعتیں موجود ہیں جن میں حاکم و محکوم کی تفریق بہت ہی مشکل سے نظر آتی ہے لیکن اس طرح کی معاشرتیں بنی نوع انسان کا ایک بہت ہی قلیل حصہ ہیں۔ یہ تقریباً بالکل صحیح ہے کہ انسان ایک "سیاسی حیوان" اس معنی میں ہے کہ یا تو وہ حاکم ہے یا محکوم، یا کسی نہ کسی نظم حکومت کا مطیع ہے یا نظم حکومت نے خود اس سے ترکیب پائی ہے، لیکن ایک اور معنی یہ ہیں کہ اعلیٰ قسم کا سیاسی نشو و نما دراصل سفید نسل کے چند مخصوص حصوں میں جسکو اب تک نسل تفقازی کہتے ہیں شروع ہوا اور اب تک وہ ان میں محدود ہے۔ صرف اسی سفید نسل کے مخصوص حصوں نے تمدن[1] کے نشو و نما کے ساتھ حکومت کے وہ نظام پیدا کیے ہیں جنکے ارکان حکومت کرنے اور اطاعت کرنے کے (جیسی باری ہو) عادی ہیں، یعنی یہ کہ آیا (۱) حاکم بالا صرف ایک خاص مدت کے لئے شہریوں کی جانب سے منتخب ہوتا ہے اور پھر اپنے اختیارات اس کو چھوڑنے پڑتے ہیں اور ان اختیارات کو کام میں لانے کے متعلق اس سے باضابطہ طریقہ پر باز پرس ہو سکتی ہے۔ یا (۲) یہ کہ شہریوں کی ایک جماعت (کل یا اس کا کوئی حصہ) اعلیٰ حکومت بحیثیت مجموعی خود کرتی ہے جس کے لئے وہ وقتاً فوقتاً ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔

ادارات سیاسی کی تاریخ میں یہ سیاسی شکلیں ہم کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہیں، نہ صرف اس حیثیت سے کہ ہم کسی مغربی یورپ کی سلطنت کے شہری ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ ہم سیاسیات کے متعلم ہیں۔ ان کی دلچسپی ہمارے لئے ایسی ہی ہے جیسے حیاتیات کے طالبعلم کے لئے حیات کے اعلیٰ ترین نمونوں کی۔ اس لئے میں اپنی توجہ

---

[1] یہ شرط ضروری ہے! کیونکہ اس قسم کے نظم حکومت کے ابتدائی مراحل "مسلح قوم کی مجلس" کی شکل میں ہم اس ابتدائی دستور سیاسی میں رکھتے ہیں جو کسی ایک نسل تک محدود نہیں ہے۔

صرف ان قوموں کی طرف مبذول رکھوں گا جنھوں نے نشو و نما کی قابلیت اپنے میں ظاہر کی ہے، اور ان میں سب سے زیادہ قابل وقعت اور نمایاں قومیں جن کا حال ہم جانتے ہیں یونان اور اہل روما اور مغربی یورپ کی قومیں ہیں۔ بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں میں یہ قومیں سب سے زیادہ نمایاں اس بات میں ہیں کہ ان میں نہ صرف سیاسی ادارات نے بلکہ سیاسی دستوروں اور دستوری خیالات اور نظریوں نے اس اعلیٰ ترین درجہ تک نشو و نما پایا ہے جہاں تک ان کا تمدن پہونچا ہے۔

فی الحقیقت ہم اپنی توجہ صرف دستوری حکومت تک محدود نہیں رکھ سکتے کیونکہ جس تغیر کو ہم تحقیق کر رہے ہیں اس میں تقریبًا ابتدا سے لیکر انتہا تک ہمارے سامنے نظم حکومت کا وہ طرز متواتر پیش ہوتا رہے گا جسکو عام طور پر مطلق العنان بادشاہی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ امر قابل غور ہے کہ اگر ہم نظم حکومت کے متعلق متمدن معاشرتوں کے واقعی تجربوں کا ایک سرسری معائنہ کریں اور اس معائنہ میں جہانتک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ زمانے اور زیادہ سے زیادہ ملکوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تعداد کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے سب سے بڑے حصہ پر جو نظم حکومت حاوی ہے وہ مطلق العنان بادشاہی ہے۔ لفظ مطلق العنان سے مراد یہ نہیں ہے کہ محکوم پر حاکم کے اختیارات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس طرح کے حاکم کو ہمیشہ اپنی رعایا کی ناراضی کا خوف لگا رہتا ہے، اس کی ہر وقت خواہش ہوتی ہے کہ رعایا کے دل میں اس کی قدر ہو، اس کے علاوہ انقلاب پیدا کرنے والے اسباب سے بھی اس کو خطرہ رہتا ہے۔ یہ خطرہ وہ ہے جس سے کوئی سیاسی معاشرت کبھی لاعلم نہیں رہی ہے۔ مذہب کا اثر بھی اس کی طبیعت پر رہتا ہے اور اس کو اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس کی رعایا پر بھی مذہب کا اثر موجود ہے۔ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں ایسے حاکم کے اختیارات پر بڑی روک یہ تھی کہ اور لوگوں کے مانند وہ بھی انسانی ارادے کے بجائے کسی الٰہی قوت کو قانون و رواج کا مبدا، تصور کر کے ان چیزوں کو قطعی معین اور ناقابل رد و بدل سمجھتا تھا۔ از منۂ مابعد میں بادشاہ کے اختیارات پر بڑی روک اس طرح ہوگئی کہ قانون اور ذرائع انتظام حکومت ایک مہذب سلطنت میں ایسے پیچیدہ ہوگئے کہ ان کی وجہ سے ایک بادشاہ کے لئے اپنے حسب مراد

کوئی تبدیلی (بغیر ایسے برے نتائج کے جنکو وہ نہ دیکھنا چاہتا ہو) پیدا کرنی سخت دشوار ہوگئی۔ بہرحال بادشاہ کو مطلق العنان کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ایسے بادشاہ کی سلطنت میں کوئی دستوری اقتدار یعنی کوئی دوسرا انسانی اقتدار ایسا قایم نہیں ہوتا جسکی اطاعت وہاں کی رعایا عادتاً اپنے بادشاہ کی اطاعت کے مثل کرتی ہو اور جو جائز طریقہ پر بادشاہ کا مقابلہ یا اس سے بازپرس کرسکتا ہو۔

اس بات کا سمجھنا کہ اس قسم کی شاہی حکومتیں اس قدر کیوں عام ہیں، مشکل نہیں ہے کوئی حکومت خواہ اس کی ترکیب و ساخت کیسی ہی پیچیدہ ہو اگر عمدگی کے اعتبار سے اعلیٰ ترین حالت رکھتی ہے تو اس کے مختلف اجزا و اعضائے حکمرانی کے ارادوں اور افعال میں مثل ان احکام و حرکات کے جو ایک صاحب عقل و ادراک کی فکر کا نتیجہ ہوں احدیت و مطابقت پائی جائے گی۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب سے سادہ طریقہ حکومت میں احدیت اور نظم و سلسلہ پیدا کرنے کا یہ ہے کہ جملہ امور سلطنت کا انتظام اخیر نوبت میں صرف ایک شخص کے سپرد کردیا جائے جو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق عمل کرے۔ ایسے نظم حکومت کا مفید و کارگر ہونا جس میں اختیارات صرف ایک شخص کو دیدیئے گئے ہوں گزشتہ اور نیز موجودہ زمانہ کی بہت سی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے گو ان مثالوں میں مطلق العنانی بے قاعدہ طور ہی پر کیوں نہ ظاہر ہوتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ بڑی بڑی بادشاہیاں جو فتوحات کے ذریعہ سے قایم ہوئیں ان میں مفتوح کی اطاعت اس بنا پر نہیں ہوئی کہ نئے نظم حکومت سے اس کو فوائد حاصل ہوتے ہیں بلکہ اس اطاعت کا باعث ان نتیجوں کا خوف ہوتا ہے جو مقابلہ اور سرکشی سے پیدا ہوسکتے ہیں، لیکن قوم فاتح کی اس عادت میں کہ وہ ایک ہی شخص کی مطیع رہے اس وجہ سے مضبوطی آجاتی ہے کہ غیر قوموں سے کشمکش کے وقت یہ چیز اس کے کاموں اور ارادوں میں ایک طرح کا زور، ربط و اتحاد پیدا کردیتی ہے۔ اسی بنا پر تو اگلے زمانہ میں نہ صرف ٹرائن پر اپنے لڑنے والوں نے جن کا ذکر الیاڈ (Iliad) میں آیا ہے بلکہ دیگر قدیم نبرد آزماؤں نے بھی یہ کہا تھا کہ "بہت سے لوگوں کا حاکم ہونا اچھا نہیں۔ حاکم تو صرف ایک ہی آدمی ہونا چاہیئے"۔ جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا تھا ہم کو یہ نہیں فرض کرنا چاہیئے کہ جہاں اس قسم کی حکومت مستقل طور پر قائم ہے وہاں رعایا نے ہمیشہ صبر

کے ساتھ ان خرابیوں کو گوارا کر لیا جو ایک نااہل اور غیر ذمہ دار متنفس کے ہاتھ میں کل اختیارات دیدینے سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہاں ایسی حکومت کے مقابلہ میں رعایا نے بغاوت میں کامیابی بھی حاصل کی تو اس نے طرز حکومت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف یہ کیا کہ ایک آدمی سے پیچھا چھڑا کر دوسرے آدمی کو اس کی جگہ بٹھادیا۔

ادارات سیاسی کی عام تاریخ سے سفید نسل یا انسانی نسلوں کے بعض حصوں میں یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ کر انھوں نے ایک جدا طریقہ مطلق العنان حکومت کی خرابیوں سے بچنے کا قائم کیا جو زیادہ تر مصنوعی بھی تھا اور باقاعدہ بھی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ارادے اور عمل کے اس اتحاد کو قائم رکھنے کی کوشش کی جو حکومت کے کاموں کو معقول طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے اور یہی طریقہ وہ ہے جس کو ہم دستوری طریقہ کہتے ہیں۔

چونکہ یہ طریقہ پورے طور پر نشو ونما پا کر حکومت اور سیاسی اطاعت کی عادت کے متعلق مروجہ خیالات میں زیادہ پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے اس لئے مجبوراً ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا پورا نشو ونما صرف ایسی انسانی جماعتوں میں ہوتا ہوگا جنھوں نے تمدن میں کچھ ترقی کر لی ہے۔ لیکن تاریخ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ تمدن کی ترقی ہر نوع اپنے ابتدائی مدارج میں اس طریقہ کو برتنے کی طرف کوئی عام میلان نہیں رکھتی حقیقت میں یہ طریقہ جیسا کہ میں نے بیان کیا (زمانۂ حال سے کچھ پہلے تک) صرف سفید نسل میں خاص کر (گو تمامتر نہیں[1]) اقوام عالم کی "ہندی جرمانی" خاندان میں محدود تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان حدود کے اندر بھی اپنے نشو ونما کے لئے اس کو خاص طور پر خارجی وسائل کی ضرورت ہوئی۔

۴۔ "نسل" اور "خاندان اقوام" کے متعلق کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے اولاً جب میں "سفید نسل" کہتا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ ابتداً انسان کی چار پانچ مختلف نسلیں تھیں اور ان میں رنگ اور دوسری علامتوں سے تمیز کی جاتی تھی۔ مثلاً کوئی نسل سفید رنگ کی، کوئی بھورے رنگ کی، کوئی زرد اور کوئی سیاہ رنگ کی

[1] معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی قرطاجنہ سامیہ کے نظام حکومت کو یونان میں بہت شہرت حاصل تھی۔

تھی۔ علم الانسان کے مطابق جو حالت اس وقت علم کی ہے نسلوں میں اس قسم کے فرق ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور جو طبیعی فرق فی الواقع نسلوں میں موجود ہیں وہ ان تفریقوں سے جو عام طور پر (گورے یا بھورے یا پیلے اور کالے کے) مانے جاتے ہیں کہیں زیادہ اور پیچیدہ ہیں اور ایک فرق دوسرے فرق میں رفتہ رفتہ متبدل ہوتا ہے اور چونکہ علم حیوانات کی رو سے انسان کی تمام قسموں کی ایک ہی نوع ہے یعنی کوئی سی دو قسموں میں شادی بیاہ سے ایسی اولاد پیدا ہو سکتی ہے جس میں خود صاحب اولاد ہونے کا مادّہ ہے، اس لئے نسلوں کی جن طبیعی تفریقوں کو تاریخ پیش کرتی ہے وہ بے انتہا وسعت کے ساتھ نسلوں کے دوغلے ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں اس کی ایک خاص مثال ان بڑی تفریقوں میں ملتی ہے جو شمالی یورپ کے سفید اور جنوبی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں کے سیاہی مائل سفید باشندوں میں نظر آتی ہیں کیونکہ علم الانسان کے متعدد ماہروں کا خیال ہے کہ جنوبی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں کی سیاہی مائل سفید نسل غالبًا سفید اور کسی سیاہ نسل کے میل سے پیدا ہوئی ہے لیکن یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ نسلوں کے دوغلے ہو جانے سے جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ اس نسلی تفریق کی تردید کرتا ہے جو لسانیات متقابلہ کی رو سے ہم آریا یا ہندی جرمانی اور سامی قوموں میں دکھاتے ہیں اور اس سے نسل کے خیال کو عائد کرنے میں ایک اور شبہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ مختلف انسانی جماعتوں کے لوگوں کو جو دماغی خصوصیات ایک کو دوسرے سے تمیز کراتے ہیں ان میں سے ایسے خصوصیات کو جو معاشرت کے اثر سے پیدا ہوئے ہیں اور ایسے خصوصیات کو جو نسلی وراثت کا نتیجہ ہیں جدا کر کے دکھانا مشکل ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ لسانی قرابتیں نسلی قرابتوں کو ثابت کرنے کا کامل ذریعہ نہیں ہیں، پس جب میں "ہندی جرمانی خاندان اقوام" کا ذکر کروں تو اس سے میری مراد یہ نہ سمجھنی چاہئے کہ جو قومیں اس طرح ایک ہی مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں وہ طبیعی طور پر ایک ہی اصل رکھتی ہیں بلکہ میری مراد یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قدیم معاشرتی مجموعہ سے اس بناء پر متعلق کی گئی ہیں کہ ان کی معاشی زندگی میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے جس کا ثبوت زبان اور کم از کم ایک حد تک نسلی تسلسل سے ملتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی بعض مخصوص امتیازات نسل میں طبیعی حیثیت سے ایسے

ہیں جو تاریخ کے پورے سلسلے میں تقریبًا مستقل طور پر برقرار رہے ہیں۔ چنانچہ ٹایلر صاحب[1] لکھتے ہیں کہ شہر تھیبز (Thebes) واقع مصر کی دیواروں پر رنگین تصویروں کو دیکھکر ہم بہت آسانی سے سرخی مائل بھورے رنگ کے مصریوں اور حبشیوں کو اس طرح پہچان سکتے ہیں جیسے کہ آج کل کے مصریوں اور حبشیوں کو پہچانیں۔ اسی طرح فلسطین کے قیدی الگ پہچانے جاتے ہیں جن کے چہرہ کا نقشہ اگر پہلو سے دیکھا جائے تو وہی ہے جو ابتک سامیوں کی شکل میں نظر آتا ہے اور جسے سب جانتے ہیں یا اسی طرح موٹے ہونٹوں والے سیدی اور گورے رنگ کے باشندگان لیبیہ اس طرح پہچانے جاتے ہیں جیسے آجکل ان لوگوں کو کوئی پہچانے۔ ان مثالوں سے یہ بات پھر ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ "اگر تمدن کو اس کے وسیع ترین معنی میں لیا جائے تو اس پر سفید نسل کا تنہا اجارہ نہیں ہے۔ "عہد تاریخ کے آغاز میں تہذیب و تمدن کے پیش رؤوں میں سانولے رنگ کے مصری اور بابلی تھے۔ ان دونوں کی زبانیں کسی ایسی معلوم زبان سے جو سفید رنگ والی قومیں بولتی ہوں تعلق نہیں رکھتی ہیں۔" اسی طرح زرد رنگ منغولی چینی "چار ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ سے ایک متمدن اور خواندہ قوم چلے آتے ہیں۔" جو تمدن بحر متوسط کے گرد شایع ہوا اس کے بانی سیاہی مائل سفید رنگ کی قومیں یعنی فینیقی، یونانی اور رومانی نہ تھے بلکہ وہ اس کو چلا رہے تھے باوجود اس کے شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کا سیاسی تمدن اور ایک "متمدن سلطنت" میں دستوری حکومت کو فروغ دینے کی قابلیت ابتدا سے سفید نسل کا متاع ہے اور بالخصوص سفید نسل کی ان شاخوں کا جو کوئی ہندی جرمانی زبان بولتی ہیں اور اس طرح ظاہر کرتی ہیں کہ جز ًا ایک ہی اصلی مجموعے سے ان کا نزول بہ تسلسل ہوا ہے۔

نسل پر غور کرنے کے بعد قدرتًا ہم کو موسم اور احوال خارجی پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اب یہ خیال بالکل پارینہ ہو گیا ہے کہ انسانی نسلوں کا اختلاف انکی اصلوں کے جدا جدا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے اب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے ابتدائی نظام عضوی پر جو عمل بواسطہ یا بلا واسطہ احوال خارجی نے کیا ہے

[1] "انسانیات"۔ باب ۱

اس کے اثرات کا مجموعہ فی الواقع اختلاف نسل کا باعث ہوا ہے۔ پس خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہم کسی قدر غور اس بات پر کریں کہ موسم اور احوال خارجی نے سفید نسل کے بعض حصوں یا اس کی ہندی جرمانی شاخ پر کس حد تک اس قسم کا اثر کیا کہ اس کی طبیعت میں ایک مناسبت اعلیٰ سیاسیات کو ترقی دینے کی بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ پیدا ہوگئی۔ یقینی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ترقی کے لئے منطقۂ معتدلہ زیادہ موافق و معاون ہے، کیونکہ شمالی ملکوں میں تنازع للبقا میں خاص مشکلیں پیش آتی ہیں اور اس وجہ سے وہاں کی آبادی قلیل ہے جو ترقی تمدن کی روکنے والی ہے اور یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ منطقۂ حارّہ کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکے جذبات آسانی سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور (تاوقتیکہ طبیعی ضرورتیں مجبور نکریں) وہ کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ اس طرح عقل و ہوشمندی، طبیعت میں ضبط، محنت و جفاکشی میں ثابت قدمی جن کی ضرورت دستوری حکومت میں ہوتی ہے منطقۂ معتدلہ میں اپنے نشو و نما کے لئے بہتر موقع رکھتی ہیں۔ دستوری حکومت نے گو منطقۂ معتدلہ میں نشو و نما پایا لیکن وہ ایسے ملکوں میں بھی جہاں کی وہ ایجاد نہیں ہے دیگر ایجادوں کی طرح جو خاص خاص مفید حالات میں انسان کی بہتری کے لئے عمل میں آتی ہیں شائع ہوسکتی ہے لیکن دستوری حکومت کی تاریخ دریافت کرنے میں ملکوں کا موسم ہی ایسی حکومت کا بڑا خارجی سبب نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ میں ہم کو متواتر ایسی مثالیں ملتی ہیں جنمیں بنی نوع انسان کے بعض حصوں کا غیر معمولی سیاسی نشو و نما اس سرزمین کی غیر معمولی نوعیت یا تعلقات کے بنا پر ہوا ہے جس پر وہ آباد ہیں۔ چنانچہ عہد وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تاریخ سے میں صرف وینس۔ سوئیزرستان۔ ولندستان، انگلستان کے نام لینے کافی سمجھتا ہوں جو اس سیاسی نشو و نما کی مسلم مثالیں ہیں جن میں تازہ کردینگے۔ اس زمرہ میں یونان کی مثال بھی کم وقعت نہیں ہے۔ صرف تاریخ یونان کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ملک یونان کی خاص قدرتی وضع، یعنی اس کے پہاڑ جو قبیلوں کو جدا کرکے آزادی کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کے بحری راستے جو تجارت اور آمد و رفت کے لئے سودمند ہیں، متمدن دستوری حکومت کے ابتدائی طرزوں کے ارتقا کے لئے کیسی موزوں تھی، اور اس خیال کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ دوسرے

ملکوں میں جہاں قدرت نے زرخیز مسطح زمینوں پر بڑے بڑے دریا دوڑا کر وسائل آمد و رفت اور ذرائع نقل مال و انسان کو بغیر آزادی کی ترغیب دیئے ترقی دی اور اس طرح جہالت سے نکلکر تہذیب میں آنے کے لئے سہولتیں پیدا کردیں، وہاں تمدن کی ترقی محض مطلق العنان بادشاہیوں کے ذریعہ سے ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ محض شاہی طرز حکومت کا بکثرت رواج جو تاریخ تمدن کے ایک بڑے حصہ میں ہماری نظر سے گذر چکا ہے۔ وہ چیز ہے جو ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یونان کی عجیب و غریب ترقی ایک حد تک اس کے خاص طبیعی حالات کا نتیجہ تھی۔ مصر و بابل۔ اشور و ایران کی بڑی بڑی سلطنتوں میں جن کی تاریخ یونان کی تاریخ سے یا تو بیشتر کی ہے یا ان کی ہم زمانہ ہے، بادشاہی ان معنوں میں جو اوپر بیان ہوئے بالکل مطلق العنان تھی۔ جس زمانہ سے کہ ہمارا تاریخی علم کچھ بھی شروع ہوتا ہے یہ بھی دریافت ہوتا ہے کہ افراد قوم کے جم غفیر کو "نظم حکومت سے بجز اس کے مطلق واسطہ نہ تھا کہ حکومت کی اطاعت کی جائے" اور ماتحت والیان ملک کو کوئی دستوری استحقاق اس کا نہ تھا کہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکیں۔ جب کبھی اس قسم کا کوئی مقابلہ پیش آیا ہے تو وہ بغاوت یا ایک حد تک بدعملی سمجھا گیا ہے۔

بہرکیف اب ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جہاں تک تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے یہ سیاسی حالت (یعنی مطلق العنان شاہی) کوئی ابتدائی سیاسی حالت نہیں ہے اور میں آگے چلکر اس امر کے ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ جس وقت خاندان ترقی کرکے سلطنت بنتا ہے تو سلطنت بنتے ہی اس میں شاہی حکومت کے قائم ہونے کو ایک قدرتی صورت سمجھنے کے لئے ہماری پاس کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ بہرکیف سب سے ابتدائی سیاسی دستور جو ہم کو ان قوموں کی تاریخ میں نظر آتا ہے جس سے ہم کو یہاں بحث ہے وہ اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس قسم کا معلوم ہوتا ہے جس میں حالات سیاسی میں بمقابلہ شاہی حکومت کے زیادہ مساوات اور زیادہ شخصی آزادی ہی نہیں دریافت ہوتی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے قبیلے میں جو لوگ لڑنے والے ہوتے تھے وہ متحد ہوکر دوسروں کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔

۵- لہذا یورپ میں سیاسی ادارات کی ترقی کا حال میں اس سیاسی دستور کے بیان سے شروع کرونگا جس کو فریمین نے قدیم[1] آریا یا ہندی جرمانی دستور لکھا ہے لیکن

[1] میں بعد یہ ظاہر کروں گا کہ لفظ "قدیم" سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دستور محض آریا یا ہندی جرمانی نسل کے ساتھ مخصوص ہے تاہم میں اس دستور کی ان شکلوں کی صرف جانچ کروں گا جن شکلوں میں ہندی جرمانی نسل کی شاخوں میں از روئے تاریخ اس دستور کا ارتقا ہونا پایا جاتا ہے، اور یہی وہ شاخیں ہیں یعنی یونانی رومانی اور جرمانی قومیں جن سے ہم کو خاص طور پر بحث ہے۔ جب ہم جرمانیوں کے پرانے سے پرانے سیاسی ادارات کا جو ہم کو معلوم ہیں اور یونانیوں اور رومانیوں کے پرانے سے پرانے سیاسی ادارات کا جن کا علم ہم کو ہے باہمی مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں اختلاف نظر آتا ہے مگر میں باوجود اس اختلاف کے ان میں ایک مشابہت دکھاؤں گا اس کے بعد ان قوموں کے قدیم تاریخی حالات کے بام پر جن سے ہم کو خاص دلچسپی ہے کھڑے ہو کر میں پیچھے کی طرف نظر دوڑاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ اس سے بھی قدیم زمانے کے سیاسی ارتقا کا حال جیسا کچھ بھی غیر واضح اور قیاسی طور پر وہ معلوم ہو سکے دریافت کروں اور اس کوشش میں محققین سلف کے قیاسات اور ان قوموں کے علاوہ دوسری اقوام قدیم کے ابتدائی مدارج ترقی سے جو نتائج مستنبط ہوں ان کو بھی شامل کروں۔ اس طریقہ تحقیق سے ہم اس منزل کے اس قدر نزدیک پہونچ جائیں گے جس قدر نزدیک میری رائے میں ایک ہوشمند محقق کو اس پرانے مسئلہ کے حل کرنے میں کہ سیاسی معاشرت کی ابتدا کیونکر ہوئی پہونچ جانا چاہئے۔

لیکن جب ہم اپنے منہ زمانے کے بہتے دریا کی طرف پھیر دیں گے تو معلوم ہو گا کہ مختلف نظامہائے حکومت بمقابلہ "ملکی سلطنت" کے جو موجودہ یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑھکر نظام حکومت ہے بہت جلد "شہری سلطنت" کی شکل اختیار کر رہے ہیں جو یونان قدیم کے زمانۂ اقبال مندی میں نظم حکومت کا سب سے بہتر نمونہ تھی۔ جہاں تک ہمارا ناتمام علم اجازت دیگا میں دکھاؤں گا کہ ابتدائی نظم حکومت جس میں صاف تمیز ہوتی ہے کہ اختیارات کی ایک خاص تقسیم مختلف نسبتوں سے تین اجزائے بسیط میں یعنی "بادشاہ" مجلس سرداران ماتحت اور آزاد لڑنے والوں کی جماعت میں کی گئی تھی، کیونکر رفتہ رفتہ عدیدی طرز حکومت تک پہونچی، اور مختصر طور پر بتاؤں گا کہ یہ عدیدی طرز حکومت کس طرح مختلف سلطنتوں میں مختلف شکلیں اختیار کرنے اور مختلف حالتوں میں سے گزرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ اس مرحلہ سے گزر کر میں

اس حکومت خود سری یا غیر دستوری مطلق العنانی کی جانچ کرونگا جس کا رواج ایک مدت کے لئے یونان کی سربر آوردہ سلطنتوں میں ایک حد تک اس وجہ سے ہو گیا تھا کہ عموم کی طرف سے قائم شدہ عدیدی حکومت کے خلاف تحریکیں پیدا ہو گئی تھیں اور جس کا شیوع یونان قدیم اور اطالیہ کے دور وسطیٰ کی شہری سلطنت کے انکشاف میں ایک قابل غور خصوصیت ہے جو بلا غلط فہمی کے صاف نظر آتی ہے گو یہ طرز حکومت اکثر عدیدی طرز حکومت سے عارضی طور پر مغلوب ہوتا رہتا ہے اور خاتمہ دور کے قریب جبکہ پرانی قومی فوج کی جگہ تنخواہ پانے والی فوج لے لیتی ہے تو اس کو پھر غیر دستوری مطلق العنانی میں بدل جانے کا اکثر خطرہ پیش ہو جاتا ہے۔ ارسطو کے بیانات سے مدد لیکر میں ان تمام اسباب کی مختصر طور پر شرح کروں گا جنھوں نے یونان کی شہری سلطنت میں حکومت کے ان مختلف طرزوں میں سے کسی ایک یا دوسرے طرز کو پیدا کیا اور قایم رکھا، اور دکھاؤں گا کہ خود ارسطو کے خیال میں اس کے مثالی طرز حکومت کے قریب تک پہونچنا کیسا نادر الوقوع تھا۔ یہ طرز حکومت وہ تھا جس میں ارکان حکومت ایسے لوگ قرار پائے تھے جو حکمرانی کی بہترین قابلیت رکھتے ہوں یعنی یہ طرز ایک حکومت اعیان اپنے صحیح معنوں میں ہو، اور میں دکھاؤں گا کہ اس معتدل دستوری عمومیت کو قائم رکھنا تک کیسا دشوار تھا جسکی ارسطو نے تعریف کی تھی کہ یہ چوتھی صدی قبل مسیحؑ کے آخری نصف حصے کی شہری سلطنت کے لئے وہ حکومت کا بہترین طرز تھا۔ بعد ازاں یونانی شہروں کا ان کی تاریخ کے سب سے بہتر و شاندار زمانہ میں ایک مستقل اتحاد قائم کرنے میں ناکام ہونے کا تذکرہ کیا جائیگا اور آخر میں، میں اپنی توجہ اس عجیب کامیابی کی طرف مبذول کرونگا جو وفاقیت نے باوجود مقدونیہ کی سیادت کے زمانہ میں نامساعد حالات پیش رہنے کے حاصل کی

اس کے بعد رومتہ الکبریٰ کی جانب متوجہ ہوکر میں رومانی سیاسی ادارات کی ابتدائی خصوصیت و تبدیلیوں کو ان پر یونان کے مماثل و متشابہ حالات کی روشنی ڈالکر بیان کرونگا، اور شرح کروں گا اس عجیب لیکن کامیابی کے ساتھ عہد و پیمان میں جکڑے ہوئے دستور سلطنت کی ماہیت اور اسباب کی جو یہ چوتھی صدی قبل مسیحؑ کے طویل المدت فتنوں و فسادوں کے سیلاب سے زندہ ابھر آیا تھا۔ میں اس امر کی شرح کرنے میں بھی کوشش کروں گا کہ ایک جمعیت عوام جو از روئے دستور سیاسی

کامل الاقتدار تھی اور زمانہ مابعد میں اس کے دو ناموں میں سے خواہ مجلس قبائل سے موسوم رہی ہو یا مجلس سنتوریہ سے ہر صورت میں اس کا رجحان ہمیشہ اس طرف رہا تھا کہ اپنے نظام میں زیادہ عمومیت کی شان اختیار کرتی جائے پھر اس نے کیونکر گوارا کر لیا کہ جس زمانہ میں روما ملک اطالیہ اور بحر متوسط کے ارد گرد کے ملکوں کی تسخیر میں مصروف تھا ملکی معاملات کے متعلق عملی اختیارات ایک اعیانی مجلس سینات کے ہاتھ میں رہنے دے۔ اس کے بعد میں یہ بھی بتاؤں گا کہ جس زمانہ میں تسخیر ممالک کا سلسلہ جاری تھا تو رومانی شہریت کی مسلسل توسیع نے جو ملک گیری میں اضافہ اور جذب دشمنوں کے باقاعدہ عمل کا نتیجہ تھی ایک بڑی سلطنت کو اس درجہ بڑھایا کہ اگر ارسطو زندہ ہوتا تو اس کو ایک حد سے گذری ہوئی اور غیر طبعی ترقی کھٹکتا۔ یہاں تک کہ جب پہلی صدی قبل مسیح کے شروع میں اطالوی اتحادیوں سے جنگ ہوئی تو اس تصادم سے یہ بڑی شہری سلطنت آخرکار تمام اطالویوں کو جذب کر کے ایک ملکی سلطنت میں بدل گئی جسکی نمائندہ دار الملک کی کثیر خلقت غلط طور پر سمجھی گئی، اور جو شہنشاہی حکومت کے کاموں کے لئے ناقص طور پر منتظم ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں مختصر طور پر اس تبدیلی کی ماہیت بیان کروں گا جو جمہوریت کو شاہی کی شکل اختیار کرنے میں بڑی تکلیفوں اور خونریزیوں کے ساتھ پیش آئی۔ پہلے اس شاہی نے جمہوریت کے بھیس میں اپنے تئیں چھپائے رکھا اور جمہوری ادارات کے ذریعہ کارپرداز رہی یہاں تک کہ کاراکالا کے عہد میں رومانی شہری اور رومانی رعیت کا فرق مٹ گیا اور دیوک لیتیان کے دور میں تو شہنشاہی اپنے منہ سے نقاب ہٹا کر بالکل ہی مطلق العنان حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی

پھر اس مقام سے یونانی رومانی تمدن کی سابقہ تاریخ پر نظر کرتے ہوئے میں نظم حکومت کے منصبی فرائض کے عام خیال کی کہ کس طرح اس کا نشو و نما ہوا اور بالخصوص قانون اور نظم حکومت کے باہمی تعلق کی جانچ دو حیثیتوں سے کروں گا یعنی جس طرح کہ متقدمین نے اس کو سوچا تھا اور جس طرح یونانی رومانی نظام حکومت کے واقعات میں اس کا عملاً ظہور ہوا۔

اس کے بعد مغربی شہنشاہی کے ویرانہ سے گزرتا ہوا میں ان تبدیلیوں کو بیان کروں گا جو ٹیوٹانی قوم کی سیاسی ترکیب کے متعلق اس جد و جہد میں پیش آئیں کہ

پانچویں صدی عیسوی کی پیچیدہ و پراگندہ نیم غیر رومانی وحشی بادشاہیوں کی سخت ضروریات کو کس طرح بہا کیا جائے۔ میں دکھاؤں گا کہ ٹیوٹانی اور شہنشاہی اور مسیحی ادارا کیونکر متحد اور آمیز ہو گئے۔ یہاں تک کہ مغربی یورپ کے اس حصہ میں جہاں بدعملی کی نوبت قطعی زیادتی تک پہونچنے کی تھی معاشرت نے رفتہ رفتہ پھر اپنی ایک ترکیب ایک نامکمل نظام کی مدد سے قایم کی جسکو ہم نظام جاگیری کہتے ہیں۔ میں یہ بھی بیان کروں گا کہ مسیحی کلیسا نے جو عقل و دانش میں دوسروں پر فضیلت رکھنے کے باعث بہت زور رکھتا تھا اور جس نے ایک زیادہ مستحکم جماعتی زندگی ان قوتوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر کے حاصل کر لی تھی جو کلیسا کے اندر اور کلیسا کے باہر تفرقہ ڈالنے والی تھیں، کیونکر یورپ کو کلیسائی حکومت کے تحت میں لانے کی ایک زبردست کوشش کی، اور میں یہ بھی بیان کروں گا کہ اس طرح مذہبی قسم کی حکومت نے (جس کی بابت ارسطو کچھ بھی نہیں جانتا ہے) سیاسی ارتقا کے اس طریقہ عمل میں جس کا علم تاریخ سے ہوتا ہے اور جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہے پہلی بار ظہور کیا۔ میں یہ بھی ظاہر کروں گا کہ دنیاوی طبقہ میں "شہر" اور "ملک" میں تمیز کرنے کی سیاسی اہمیت عہد وسطیٰ کی قوم میں، جوں جوں وہ تمدن و تہذیب میں ترقی کرتی ہے کیونکر زیادہ ہوتی جاتی ہے، اور میں قدیم یونان کی شہری سلطنت سے جس کا دارومدار غلاموں کی محنت و مشقت پر تھا عہد وسطیٰ کی صنعت و حرفت والی شہری جماعت کا مقابلہ کروں گا جو جرمانیہ اور اطالیہ میں عملاً آزاد ہو گئی تھی، جسمیں آلات سے کام کرنے والے پہلے آزادی اور پھر عزت اور اختیارات کے درجہ کو پہونچے۔

پھر میں بتاؤں گا کہ نظام جاگیری نے جو نامکمل ربط و تعلق افراد میں پیدا کیا تھا اس سے آج کل کی قوم میں زیادہ اتحاد کا نشو و نما رفتہ رفتہ کیونکر ہوا۔ اس زیادہ اتحاد نے شاہی طرز حکومت کے اقتدار و اقبال میں کہ وہ قومی یکجہتی و تنظیم کا سرچشمہ اور ذریعہ ہے اضافہ کیا اور قوم کے مختلف طبقوں کی مجلسیں پیدا کر دیں جو ایک زمانہ میں معلوم ہوتا تھا کہ ضرور ترقی کر کے مستقل طور پر دستوری نظم حکومت کے اعضا بن جائے گی۔ پھر ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ قوم کے مختلف طبقے جن سے یہہ

مجلسیں بنی تھیں ان کے نفاذ نے جو کسی طرح رفع ہو سکتا تھا ان تمام اچھے توقعات کو کس طرح خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ مغربی یورپ کے ایک بڑے حصہ پر خالص شاہی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ یہی شکل ایک متمدن اور باقرینہ ملکی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ہم ان غیر معمولی حالات کا بھی اندازہ کریں گے جنھوں نے ولندستان اور سوئیزرستان کی چھوٹی مگر باقعت قوموں میں وفاقی اور جمہوری ادارات پیدا کرکے ان کو سرسبز رکھا۔

اس مقام تک پہونچنے پر میرا قصد یہ ہوگا کہ سیاسی واقعات کی سرزمین سے گزرتا ہوا سیاسی خیال کے میدان میں آؤں اور اسی سیاسی خیال کے سلسلے کو مختصر طور پر رومانی مقننوں سے شروع کرکے بتاؤں کہ رفتہ رفتہ اس نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے خاتمہ کے قریب عام سیاسی حریت اور مساوات کا مطالبہ کس جوش وخروش کے ساتھ پیدا کردیا اور باوجودیکہ فرانس میں اس مطالبہ کی پہلی کوشش کے بعد طبیعتیں اس سے پھر گئیں لیکن ابتک وہی سیاسی خیال ایک بڑا جزو اس سلسلۂ تغیر کا ہے جس کا تعلق زیادہ تر انیسویں صدی سے ہے اور جو تمام مغربی یورپ میں موجودہ دستوری سلطنت کا بانی ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں اس تغیر عظیم کے دوسرے بڑے جزو پر غور کرنے کے لئے آپ سے درخواست کرونگا یعنی آپ سے کہوں گا کہ دستوری حکومت کے اس مسلسل اور سرسبز نشو ونما پر غور کیجیے جس کی مثال پیش کرنے کا حق مغربی یورپ کی تمام بڑی سلطنتوں میں صرف انگلستان کو نصیب ہوا ہے۔ میں فرائض حکومت کے متعلق نظریہ انفرادیت کی ابتدا پر بھی غور کرونگا جو اٹھارھویں صدی میں ہوئی اس نظریہ میں جب ان قدرتی طریقوں کا حل بھی شامل کردیا جاتا ہے جو پیدادار تقسیم اور تبادلۂ دولت کے متعلق ہیں تو ان سے بالتخصیص زمانہ حال کے وہ تمام قواعد اور اصول مراد ہوتے ہیں جس کا مجموعی نام معاشیات ہے۔

پھر میں مغربی براعظم (یعنی امریکہ) کی طرف متوجہ ہوکر مختصر طور پر اس نظم حکومت کے خصوصیات بیان کروں گا جو نوآبادیوں کی آزادی نے وہاں پیدا کی ہیں اور جو یورپ کے نظم حکومت سے بعض بڑی باتوں میں فرق رکھتا ہے اور میں اس وفاقی نظام کی ماہیت اور عمل پر غور کروں گا جس کی بنا پر شمالی امریکہ

کی بڑی انگریزی نوآبادی نے صد سالہ حریت کی زندگی کے ساتھ ایک ایسے ملک میں جو مغربی یورپ سے رقبہ میں زیادہ ہے جمہوری انتظام قائم کر رکھا ہے۔ آخر میں تمدن یورپ کی پوری تاریخ پر ایک نظر ڈالکر میں غور کروں گا کہ اس کی آیندہ ترقی کی نسبت معقول طریقہ سے کیا پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

میرے اس کل بیان سے شاید یہ خیال گزرے کہ یہ سب تو تاریخ کے ایک ضخیم حصہ کو کوزہ میں بند کرنا ہو جائے گا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کو تاریخی سوانح سے بحیثیت فن تاریخ واسطہ نہ ہوگا، بلکہ ان عام واقعات سے واسطہ ہوگا جن کی مثالیں تاریخی سوانح سے دی جاسکتی ہیں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہم کو تاریخ کے اس حصہ سے جس میں لوگوں کی ذاتیات یا دنیا کے اور تماشے بیان ہوئے ہیں، یعنی مدبران ملکی اور امرائے لشکر کے کارنامے۔ بادشاہوں کی شادیاں۔ بڑی بڑی لڑائیاں، ہم کو ان سب سے کچھ بحث نہوگی اور یہی نہیں بلکہ ہم کو اکثر کسی خاص قوم کے سیاسی ارتقا سے بھی اس حد سے زیادہ تعلق نہوگا کہ عام اسباب ورجحانات پر وہ روشنی ڈال سکتا ہے۔ جن چیزوں سے ہم کو واقعی بحث ہے وہ سیاسی معاشرت کا ایک عام نمونہ ہے جسکی مثالیں چند معاشرتیں اپنی اپنی ترقی کے ایک خاص موقع پر پیش کرتی ہیں اور اس نمونہ کے طرز وساخت کی بڑی خصوصیات ہیں اور تغیرات ہیں جو ان میں ہوتے رہے ہیں اور ان تغیرات کے اسباب ہیں۔

۶۔ اس موقع پر اس بات کو سمجھ لینا بھی مناسب ہوگا کہ ملکوں کے سیاسی نشو ونما پر غور کر کے ان سے عام نتائج نکالنے میں ایک سبب ایسا بھی ہے جو اس کام میں حارج ہوتا ہے اور جس کا لحاظ رکھنا ضروریات سے ہے۔ یہ سبب حارج کسی دوسرے نظام سیاسی کی نقل اتار لینا ہے۔

مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دستوری شاہی کی شکل میں موجودہ یورپ کا پارلیمنٹی نظم حکومت جو اطالیہ۔ بلجیم۔ اسپین اور اسکانڈی نے ویا کی سلطنتوں میں رائج ہے اور ان ملکوں میں سے ہر ایک ملک کے سیاسی نشو ونما کے متشابہ رجحانات کا نتیجہ بلا امداد غیرے ہے یہ بات ایک ایسے طالب علم پر بھی جو تاریخ کو بالکل سرسری نظر سے پڑھتا

ہے روشن ہے کہ ان مختلف ملکوں کے طرزِ حکومت میں جو مشابہت اس وقت موجود ہے اس کا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ ان سب نے بواسطہ یا بلا واسطہ انگلستان کی نقل اتاری ہے، اور انگلستان کا موجودہ طرزِ حکومت فی نفسہٖ پارلیمنٹی ادارات کے اس مسلسل نشو ونما کا نتیجہ ہے جو دورِ وسطیٰ سے لیکر اس وقت تک ہوتا رہا ہے اور جو یورپ کی تاریخ میں اگر بالکل نہیں تو تقریباً بے مثال ہے۔ جب اس تقلید یا نقل اتارنے کے مضمون کو ذہن میں رکھکر ہم تاریخ کے پرانے زمانوں کے حالات پڑھتے ہیں تو ہم کو ایسی سلطنتوں میں جن میں ہمیشہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا تھا جیسے کہ یونان کی اکثر شہری سلطنتیں تھیں کسی خاص نظم حکومت کے اسباب شیوع پر اس کے کسی خاص زمانۂ ارتقا میں غور کرتے وقت اس تقلید یا نقل اتار لینے کا بھی پورا لحاظ کرنا ضروری ہو جاتا ہے[۱]۔

اس قسم کی نقل یا تتبع کا اگر کوئی ثبوت نہ بھی مل سکے تو بھی ہم کو اس کا پورا لحاظ کرنے کے لئے بہت گنجایش رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی نقل یا تتبع کا اثر ان عام نتائج کی قدر و قیمت کو قطعی زائل نہیں کر دیتا جنکو ہم مختلف سلطنتوں کے سیاسی ادارات میں مقابلہ کرنے سے حاصل کرتے ہیں، کیونکہ محض اس واقعہ سے کہ نظام حکومت کا ایک مخصوص طرز، نقل یا تتبع کے ذریعہ سے رواج پاتا ہے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جن سلطنتوں نے اس کو اختیار کیا ان میں ایسے ہی ایک نظم حکومت کے اختیار کرنے کی طرف شدت سے رجحان موجود تھا، یعنی یہ کہ ان مختلف ملکوں میں تغیر کے لئے ہم شکل ضروریات اور خواہشات چند مخصوص اسباب عامہ کی بنا پر شدت سے محسوس ہو رہی تھیں گو جس خاص طرز کو اختیار کیا گیا اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اس سلطنت واحد میں جو نقل کے لئے نمونہ پیش کرتی ہے پہلے عمل میں آچکا تھا۔ پس یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ اگر انگلستان کی تاریخ میں نیابتی ادارات کی رفتہ رفتہ ترقی کا بے مثل واقعہ جو اس کو دوسروں میں فی الواقع ممتاز کرتا ہے نہ بھی پیش آیا ہوتا تو بھی اُنیسویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کی سلطنتیں بالعموم عمومیت کے طرزِ حکومت کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتیں اور یہ فرض کرنا قرین قیاس ہوگا کہ مغربی یورپ کی ان سلطنتوں میں ایک مجلس مقننہ کلاً یا جزءً نیابتی اصول پر قائم

---

[۱] فریمین نے بھی اپنی تصنیف "سیاسیات متقابلہ" میں تقلید کے اس پریشان کن اثر پر توجہ دلائی ہے۔

ہو جاتی کیونکہ تمام افراد قوم سے نظم حکومت کا مرتب کیا جانا ایسی وسیع سلطنتوں میں جیسے کہ فرانس اور اسپین کی تھیں سخت دشواریوں سے مملو تھا۔ نیز یہ وجہ بھی تھی کہ سوائے اطالیہ کے تمام مغربی یورپ کے ملکوں میں دور وسطیٰ کی نیابتی مجلسیں جن کے ارکان قوم کے مختلف طبقات کے لوگ ہوئے تھے موجود تھیں اور یہ انگریزی پارلیمنٹ سے کم و بیش مشابہ تھیں۔ جن اسباب نے دور وسطیٰ کی ان مجلسوں کو قائم کیا تھا وہ ہم آگے چلکر بتائیں گے، لیکن بلا تامل یہ کہدینا کہ نقل آتارنے کے لئے اگر برطانوی دستور موجود نہ ہوتا تو بھی مغربی یورپ کی سلطنتوں میں دو ایوانی مجالس مقننہ بالعموم قائم ہو جاتیں درست نہیں مثلاً ایک ایسے ملک میں جیساکہ فرانس ہے اگر وہاں کے سیاسی دستور کے بنانے والے آجکل کے خیالات سے متاثر ہوتے تو وہ آسانی سے سمجھ جاتے کہ اختیارات مقننہ عاملہ اور عدیدیہ کی کامل علیحدگی اور توازن سے نظم حکومت اعلیٰ میں اتنی پیچیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرنے کے لئے دو ایوانی مجلس مقننہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا دوسری مثال لیجئے مثلاً ایسے ملکوں میں جہاں پرانے ادارات اس طرح نہیں ہٹائے گئے جیسے کہ فرانس میں پیش آیا تھا وہاں دور وسطیٰ کی تقسیم طبقات پھر زندہ کر دی جاتی جن سے پارلیمنٹ کی تقسیم (بجائے دو کے) تین نہیں بلکہ چار ایوانوں میں ہو سکتی تھی۔ جیساکہ ملک سویڈن میں واقعی پیش آیا۔ یہاں چار طبقے یعنی شرفا۔ پادری۔ تاجر اور کاشتکار سنہ ۱۸۱۰ء سے سنہ ۱۸۶۶ء تک اکثر مقاصد کے لئے جدا جدا مشورہ کرتے رہے۔

علاوہ بریں ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی یورپ کی اگر سب نہیں تو بعض سلطنتوں نے ایک قسم کی حکومت اپنے یہاں جاری کی ہے جس کا نام بیجہٹ نے حکومت کابینی رکھا ہے۔ اس طرز کی حکومت میں جماعت مقننہ کی ایک ذیلی کمیٹی کو سب سے اعلیٰ اختیارات انتظامی حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کا وجود و عدم مجلس نائبین کی کثرت رائے پر منحصر ہے کہ جب چاہے وہ اس ذیلی مجلس کو با عانت کثرت رائے انتخاب کنندگان برطرف کر دے۔ پس اس کابینی حکومت کے بارے میں اس امر کے فرض کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس کا وجود میں آنا انگریزی نمونہ کے اثر سے علیحدہ ہے یعنی وہ انگلستان کی کابینی حکومت کی نقل نہیں ہے۔

سیاسی ادارات کے نشو و نما میں نقل اتارنا، قطع نظر نقل اتارنے کے اس رجحان پر بھی دلالت کرتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز مثل اس نمونہ کے جسکی نقل اتاری جاتی ہے پیدا کی جائے یا کم از کم ایسے حالات پیدا کئے جائیں جو اس نمونہ کو قایم رکھنے کے لئے موافق ہوں ۔ اس خیال کی مثالیں میں تاریخ یونان کی دو قوی سلطنتوں کو مقابلہ کرکے پیش کروں گا۔ ان میں ایک مثال تو ایسی ہے جس میں نقل اتارنے کی کوشش پائی جاتی ہے جس کو مثال سلبی کہنا چاہیئے اور دوسری مثال ایسی ہے جس میں یہ کوشش نہیں پائی جاتی جس کو مثال ایجابی کہنا چاہیئے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ یونان میں ڈیڑھ صدی تک جس کے حالات سب سے زیادہ معلوم اور جس کے واقعات نہایت تاباں اور درخشاں ہیں یعنی ۴۸۰ ق م میں ایران کی پسپائی سے ۳۲۶ ق م میں مقدونیہ سے مغلوب ہوجانے کے زمانہ تک ایتھنز اور اسپارٹا یونان کی دو بڑی سربرآوردہ سلطنتیں تھیں، اور ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں عددیت اور عمومیت کے اصول کے متعلق جو نزاع یونان کی دیگر شہری سلطنتوں میں برپا رہی اس میں عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایتھنز عمومیت کا اور اسپارٹا عددیت کا طرفدار تھا ارسطو فی الواقع شکایت کرتا ہے کہ یہ دونوں سلطنتیں ایسی دوسری سلطنتوں میں جو ان کے زیر اثر تھیں اپنے اقتدار کو کام میں لاکر عددی یا عمومی طرز کی حکومت قایم کرنا چاہتی تھیں جس سے مدعا یہ نہ تھا کہ یہ طرز حکومت فی الواقع ان سلطنتوں کے حق میں مفید تھا بلکہ صرف اپنی شہنشاہی کے فوائد کے خیال سے ایسا کرتی تھیں[۱]۔ پس بالعموم یونان کی شہری سلطنتوں میں عمومیت کے نشو و نما کے تدریجی حالات معلوم کرنے میں ہمارا میلان اس طرف ہوگا کہ ایتھنز کی نقل اتارنے کو ایک اصلی محرک بدرجۂ غالب اس نشو و نما کا سمجھیں ، گو ہم کو مفصل کیفیت اس قدر معلوم نہیں ہے کہ اس نقل و تتبع نے جس حد تک عمل کیا تھا اس کو ٹھیک ٹھیک بتا سکیں، لیکن ظاہر ہے کہ اسپارٹا کی نقل اتارنے کے لئے غالباً کسی نے کوشش نہیں کی اور یہ میرے خیال کی جو اوپر بیان ہوا ایجابی مثال ہے۔ کیونکہ (جیسا کہ ہم آیندہ دیکھینگے) گو بلحاظ اپنی حکمت عملی کے

---

[۱]۔ سیاسیات ۶ (۴) ۲، ۱۸

اسپارٹا دوسری سلطنتوں میں عدیدیت کے قائم کئے جانے کا طرفدار تھا اگر خود اس کا نظم حکومت متقدمین کے خیال میں ایسا نہ تھا جس کو عدیدیت کے زمرہ میں شمار کیا جاتا گو عدیدیت کے اجزا اس میں موجود تھے، اور یہ امر اور بھی قابل حیرت اس وجہ سے ہو جاتا ہے کہ مثالی نظم حکومت جس کو سیاست کے بڑے بڑے عالی خیال لوگوں نے انسان کی خیر و سلامتی کے جملہ شرائط کا جو ان کی سمجھ میں آئے لحاظ کرکے بنایا تھا وہ بہ نسبت ایتھنز کی نظم حکومت کے زیادہ مشابہت رکھتا تھا یعنی یہ کہ افلاطون کی سب سے آخر تصنیف کے مطابق اس کی مثالی نظم حکومت میں اور ارسطو کی مثالی نظم حکومت میں شہری فی الواقع ایک ایسی انسانی جماعت تھے جو صنعت و حرفت کے کاموں سے بڑی صراحت کے ساتھ قطعی مستثنی کر دئے گئے تھے ان کی بسر اوقات ایسی زمینوں کی پیداوار پر رکھی گئی تھی جنکی کاشت غلاموں کے ذمہ تھی اور خود ان کو بڑی توجہ کے ساتھ فوجی کاموں کے لئے تربیت دی جاتی تھی جیسا کہ اسپارٹا میں قاعدہ تھا لیکن باوجود اسپارٹا کی اقبال مندی کے جو اس کو عالم واقعات میں حاصل تھی اور باوجود افلاطون اور ارسطو کے اثر کے جو عالم خیال میں وہ رکھتے تھے کسی قسم کا میلان اسپارٹا کے طرز حکومت کو نقل کرنے کا یا ان حکما کے مثالی نظم حکومت کو حیطۂ عمل میں لانے کا دریافت نہیں ہوتا۔ یہ عجب شہادت اس امر کی ہے کہ نقل صرف اس حالت میں اتاری جاسکتی ہے جبکہ وہ نمونہ جس کی نقل اتاری جائے نقل اتارنے والی سلطنتوں میں ان کے سیاسی نشو و نما کے عام رجحانات سے مطابقت رکھتا ہو۔

باوجود اس کے یہ بات سچ ہی رہتی ہے اور عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس حالت میں چند سلطنتوں میں ان کے طرز حکومت میں تبدیلی کی بڑی محرک نقل رہی ہو تو یہ بتانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس تبدیلی میں جو چیزیں تبدیل ہوئی ہیں وہ کس حد تک اس نظم حکومت کے خاص نشو و نما کے باعث ہوئی ہیں جس کی نقل اتاری گئی ہے خلاصہ یہ کہ نقل اتارنا وہ چیز نہیں ہے جس سے سب باتوں کی صراحت ہوجائے لیکن پھر بھی اس سے بہت سی باتوں کی صراحت ہو جاتی ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر سیاسی نشو و نما کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش میں یہ چیز بڑی باوقعت ہے کہ ایسے مشابہ نظمہائے حکومت کا باہمی مقابلہ کرکے جن میں مشابہتیں از روئے عقل تتبع یا نقل کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں جس قدر معلومات حاصل کرنی ممکن ہو حاصل کی جائے

غرض یہ ہے کہ اس مقابلہ کو زیادہ نمودار کیا جائے اور یہی مقابلہ وہ چیز ہے جو میری کتاب کا موضوع قائم کرتا ہے، کیونکہ یورپ کی تاریخ اپنے دور فرید میں سیاسی نشوونما کے بہت سے مختلف سلسلے ایسے دکھاتی ہے جن میں ایک حدتک جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مشابہت موجود ہے اور اس وجہ سے مقابلہ کے لئے وہ بہت سامان پیش کرتی ہیں درآنحالیکہ ایک بڑی حدتک ان میں ہر ایک کا نشوونما بذات خود ہوا ہے۔ پہلے ہم کو قدیم شہری سلطنتوں کے نشوونما میں اور پھر مغربی یورپ کی سلطنت کے نشوونما میں باہمی مقابلہ کرنا ہوگا لیکن رومانی نظم حکومت اپنے تفصیلی حالات میں یونانی نظم حکومت کے نشوونما سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کے اسباب بیان کرنے میں ہم کو یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ رومانی نظم حکومت نے ایک بڑی حدتک یونانی نظم حکومت کی براہ راست نقل آتاری ہے لیکن نقل کے مسئلہ کو قطعی نظرانداز بھی نکرنا چاہئے۔ بہرکیف یونانی شہری سلطنت اور رومانی شہری سلطنت کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ ان میں ہر ایک کا نشوونما تقریباً بذات خود علٰحدہ علٰحدہ ہوا ہے اسیطرح موجودہ ملکی سلطنت کی ترقی کا ایک تیسرا سلسلہ ہے اور ایک چوتھا سلسلہ دور وسطیٰ کے شہروں کے نشوونما میں ملتا ہے جس کا میں پہلے تذکرہ کرچکا ہوں۔

یہ بات دیکھنے کی ہے کہ سیاسی دستور کے ان بدلتے ہوئے نمونوں کے چار مختلف سلسلوں میں تین سلسلے اس درجہ آپس میں تعلق رکھتے ہیں کہ ان سب کی تاریخ ایک ہی تاریخ معلوم ہوتی ہے، اور اس میں شروع کے مراحل اخیر کے مراحل سے سبب ومسبب کا تعلق رکھتے ہیں۔ روما کی ابتدائی سیاسی ترکیب سے لیکر رومانی شہنشاہی تک اور اس شہنشاہی سے دور وسطیٰ کی جزوی بے ترکیب حکومتوں تک جس میں دور وسطیٰ کے جزوی آزاد شہروں کا نشوونما ہوا اور ان سے حال کی یورپی سلطنتوں تک ایک ایسی مسلسل ترقی کا پتا چلتا ہے جس میں کہیں کوئی وقفہ بجز اس کے کہ کہیں کوئی بات مجبورانہ پیش آئی ہو نہیں پایا جاتا۔ اس حدتک قدیم اور جدید تاریخ کے متعلق مجھکو فریمین سے اتفاق ہے لیکن تاریخ یونان کی فی الواقع یہ کیفیت نہیں ہے۔ تاہم تاریخ یونان نے روما اور آج کل کی تاریخ پر بڑا اثر کیا گو یہ اثر سیاسیات میں یا دیگر اصناف علم میں زیادہ تر انسان کے خیال پر پڑا۔ سیاسی خیالات کے فراہم کردینے میں اس اثر نے اپنا زور دکھایا۔ سیاسی ادارات یا عادات فی الواقع دوسروں کو نہیں دیں۔

اس کے ساتھ ہی سیاسی خیالات پر تاریخ یونان کا اثر ہی وہ چیز نہیں ہے جس کی بنا پر یونانی شہری سلطنت کا نشو و نما ارتقا کے دوسرے سلسلوں میں جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ایک لازمی جگہ رکھتا ہو۔ میری کتاب کے موضوع کا ضروری حصہ یہ ہے کہ ان تمام شکلوں کو مطالعہ کیا جائے جن میں سے گزرنے کا میلان سلطنت کے اس نمونے نے ظاہر کیا ہے جسکو میں شہری سلطنت کہتا ہوں۔ اگر ہم متمدن دستور کی اعلیٰ ترین شکلوں پر اپنی توجہ قطعاً مرکوز کردیں تو یہی نمونہ نہ صرف وقت کی ترتیب کے لحاظ سے بلکہ اُن وجوہ کی بنا پر جن کو میں آئندہ بیان کروں گا سیاسی نشو و نما کی ترتیب میں سب سے مقدم ہے پس اگر اس نمونہ کا مطالعہ مقصود ہے تو پھر لازمی ہے کہ یونان کی تاریخ میں اس کو مطالعہ کیا جائے۔ روما کا سیاسی نشو و نما بہت سی مخصوص وجوہ سے ایسا ہے کہ جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ یہی ایک مقدمہ ایسا ہے جس میں شہری سلطنت بڑھتے بڑھتے ایک شہنشاہی ملکی سلطنت ہوگئی، اور دور وسطیٰ کے شہر اطالیہ میں بھی جہاں وہ تقریباً آزاد تھے کامل طور پر آزاد انہ رہے۔

اوپر کے مختصر تبصرے میں، میں نے کبھی "سیاسی معاشرت" کا کبھی سلطنت کا اور کبھی "قوم" کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ آگے کچھ لکھا جائے مناسب ہے کہ ان اصطلاحات کے معنوں اور ان کے آپس کے تعلقات کی جانچ زیادہ احتیاط کے ساتھ کرلی جائے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، میں "سلطنت" اور "سیاسی معاشرت" کی اصطلاحوں کو بالعموم اس طرح استعمال کرتا ہوں کہ ایک کی جگہ دوسری بلا تکلف لکھی جاسکے۔ مگر اتنا فرق ضرور کرتا ہوں کہ "سلطنت" کی اصطلاح کو صرف ان معاشرتوں تک محدود رکھتا ہوں جو سیاسی تمدن میں ایک خاص درجہ تک ترقی کرچکی ہیں، لیکن ہم کو اس بات پر بھی غور کرلینا چاہئے کہ بعض وقت "سلطنت" کی اصطلاح اس سے بھی زیادہ تنگ معنی میں استعمال کی جاتی ہے یعنی اس سے مراد ایک سیاسی معاشرت ہوتی ہے جسکو ماہرین اصول قانون اپنی اصطلاح میں "مصنوعی شخصیت" کہتے ہیں اور اس حیثیت سے اس "مصنوعی شخصیت" کے حقوق و فرائض ان افراد کے حقوق و فرائض سے قابل امتیاز ہوتے ہیں جن سے یہ "مصنوعی شخصیت" بنی ہے۔ جہاں کہیں کسی ابہام کا خطرہ نہ ہوگا میں اپنے تئیں اجازت دوں گا کہ لفظ سلطنت کو اس زیادہ تنگ معنی میں بغیر زیادہ توجیہ کے استعمال کروں

اور میں خیال کرتا ہوں کہ ہم کو اس درجۂ تمدن کی بھی تعریف کردینی چاہئے جس تک پہونچنے کے بعد سیاسی معاشرت اس خاصیت کے ساتھ سلطنت کہلائی جاسکتی ہے کہ وہ اس اساسی امتیاز سے بخوبی آشنا ہوچکی ہے جو جماعت کے حقوق و فرائض میں بحیثیت ایک مجموعہ ہونے کے اور ان افراد کے حقوق و فرائض میں جن سے یہ جماعت بنی ہے موجود ہے انگریزوں کے جرمانی آبا و اجداد کی پرانی قبیلی حالت میں اور دوسری غیر متمدن اور نیم متمدن قوموں میں یہ امتیاز ابتک غیر واضح ہے۔

علاوہ اس کے سلطنت کا جو معمولی تصور ہمارے ذہن میں ہے اس میں یہ بات شامل ہے کہ جس سیاسی معاشرت کو سلطنت کہا جاتا ہے وہ روئے زمین کے کسی خاص حصے سے وابستہ ہے۔ اور اس بنا پر اس کو اس بات کا دعوی ہوتا ہے جس کو بالعموم سب تسلیم کرتے ہیں کہ روئے زمین کے اس حصہ پر جسقدر لوگ آباد ہوں خواہ وہ اس سلطنت کے رکن ہوں یا نہوں ان سب کے حقوق و فرائض مقرر کرے، اور یہ خیال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ بعض وقت ہم لفظ "سلطنت" کو روئے زمین کے اس خاص حصہ کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کے نسبت یہ دعوی ہو۔[1]

یہاں تک میں نے ایک سلطنت کی احدیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا اس کا حصر محض اس واقعہ پر ہے کہ اس کے تمام ارکان ایک ہی نظم حکومت کے مطیع ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور واسطہ جس کو سلطنت کا تصور ظاہر کرتا ہو میرے خیال میں موجود نہیں ہے۔ تاہم اس بات کو تسلیم کرنا چاہئے کہ ایک سیاسی سلطنت جس کے ارکان کو نظم حکومت کی اطاعت کرنے کے علاوہ کسی طرح کے تعلقات کا مطلق وقوف نہیں ہے ان میں مشکل سے وہ اتصالی قوت پیدا ہو سکتی ہے جو ان ابتری ڈالنے والے صدموں اور مناقشوں کو روکنے کے لئے ضروری ہوتی ہے جو بیرونی لڑائیوں اور اندرونی ناراضیوں سے وقتاً فوقتاً پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی معاشرت یہ چاہے کہ وہ محکم طور پر قایم ہو اور اسکی

---

[1] اگر کوئی سیاسی جماعت اپنی مملکت کو چھوڑ کر کسی سرزمین میں آباد ہو جائے تو یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ اس تغیر کے دوران میں اور اس کے بعد وہ، وہی سلطنت رہی ہے جو تھی مگر میرا خیال ہے کہ یہ بحث مشتبہ ہوگی۔

حالت قابل اطمینان ہو تو اس کے ارکان کو اس بات کا علم رہنا لازمی ہے کہ ان میں ہر ایک آپس میں ہر ایک کا ہے اور وہ سب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ علاوہ اس تعلق کے جو ایک ہی نظم حکومت کے مطیع رہنے سے پیدا ہوا ہے معاشرت کے ارکان میں اس قسم کا وقوف تصور کرنے کے بعد میں "سلطنت" کو ایک "قوم" بھی کہ سکتا ہوں۔ موجودہ سیاسی تخیل کے مطابق جس کو بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے ایک "سلطنت" کو یقیناً "قوم" بھی ہونا چاہیئے۔ تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قوم ہونے کی صفت "سلطنت" یا "سیاسی معاشرت" کے الفاظ سے جسطرح کہ آجکل وہ مستعمل ہیں از خود مستنبط ہوتی ہے۔ ان الفاظ سے جو صفات عموماً مستنبط ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) آدمیوں کا مجموعہ جس کو سلطنت یا سیاسی معاشرت تعبیر کرتی ہے باہم اتحاد رکھتا ہے۔ اگر کسی اور بنا پر نہیں تو اس واقعہ کی بنا پر وہ متحد ہے کہ ایک ہی نظم حکومت کا دائمی طور پر مطیع ہونا وہ اپنی نسبت تسلیم کرتا ہے اور اس حاکم و محکوم کے تعلق میں دوام ہونے کے باعث وہ ایک "مصنوعی شخص" کی زندگی رکھتا ہے جو اس کے ارکان کی زندگیوں سے مختلف ہے (۲) نظم حکومت زمین کے ایک حصہ پر بااختیار ہے۔ اور (۳) سیاسی معاشرت کے ارکان کی تعداد کم نہیں ہے گو تعداد کا ٹھیک ٹھیک بتانا ممکن نہو[1]

یہ صفات اس وقت دریافت ہوتے ہیں جبکہ ہم سلطنت کے متعلق اپنے موجودہ تصور کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم "طریقۂ تقابل" کی مدد سے سیاسی معاشرت کی تاریخ پچھلے زمانوں میں تحقیق کرتے ہوئے ارتقا کے چشموں تک پہونچ جائیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ جس معاشرت میں ارتقا کم ہوا ہے وہ اس معاشرت سے جس میں ارتقا زیادہ ہوا ہے مقدم ہے تو پھر یہ صفات دھندلے ہوتے ہوتے بالکل ہی محو ہو جائیں گے۔ آدمیوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ محض ایک ایسے قبیلے تک نوبت پہونچیگی جس میں اور ایک بڑے خاندان میں آسانی سے تمیز نہ ہوسکیگی۔ زمین سے تعلق میں بھی ایک بے پروائی

[1] سلطنت کی حکومت کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خارجی اقتدار سے آزاد ہوتی ہے۔ مگر انگریزی زبان میں یہ اصطلاح ان محکوم جماعات کے متعلق بھی استعمال کی جاتی ہے جنمیں اس خصوص کی کمی ہوتی ہے اور جو کسی وفاقی اتحاد کے ارکان یا کسی ذی اقتدار سلطنت کے توابع ہوتے ہیں۔

نظر آئے گی کیونکہ قبیلہ ایک آوارہ گرد گروہ غول میں پھرنے والے گلہ بانوں یا کاشتکاروں کا ہوگا۔ حاکم اور محکوم کا تعلق بھی بہت خفیف طور پر دریافت ہو سکیگا۔ سردار جس کی سرداری سب نے تسلیم کی ہے ایسا نہوگا جو قوانین وضع کر سکے۔ یہ گروہ چند ایسے رواجوں کا پابند نظر آئے گا جو پشتہا پشت سے ان میں چلے آتے ہیں کوئی حاکم بھی ان میں ایسا نہ ملیگا جو عدولِ حکمی پر سزا دیتا ہو۔ اگر سردار کم سے کم زمانۂ امن میں احکام جاری کرتا نظر آئیگا تو اس کا احتمال بہت کم ہوگا کہ عام طور پر ان احکام کی پابندی بھی کی گئی ہوگی۔ آخرکار ہم کو وہ غول میں پھرنے والے گروہ ملیں گے جن میں کوئی ایسی چیز جس کو ہم باقاعدہ سرداری کہہ سکیں دریافت نہو سکیگی۔ پس ان تمام وجوہ کی بنا پر سیاسی معاشرت کے ارتقا کی تحقیقات شروع کرنے میں خاص مشکل پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ اگر ہم ابتدا سے اس تحقیقات کو شروع کرنا چاہیں جیسا کہ مقتضائے قدرت ہے تو پھر یہ قریب قریب گھپ اندھیرے میں کسی چیز کا ڈھونڈنا ہوگا اگر ہمارا یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ ہمارے سیاسی معاشرے نے ایک ایسے سیاسی نمونہ سے جس کا ارتقا نہایت نامکمل تھا اسی طرح براہ راست نزول کیا ہے جس طرح اولاد باپ سے پیدا ہوتی ہے (اور یہ سوال ایسا ہے جس پر میں اس وقت غور نکرونگا) تو پھر ہمارے سلسلۂ ارتقا کا بہت بڑا حصہ اس زمانہ میں آجاتا ہے جس کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ جس وقت تاریخ کی پہلی کرن روشنی کی ان معاشرتوں پر پڑتی ہے جن سے حال کی یورپی سلطنت کا ماخوذ ہونا قطعی طور پر تحقیق ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام معاشرتیں ایک ممیز و پیچیدہ نظام سیاسی رکھتی تھیں۔ اس امر کی تحقیق کہ سیاسی معاشرت کی سب سے پہلی بنا کیونکر ہوئی ہم کو اصلی تاریخ کے احاطہ سے باہر نکالکر قیاس اور گمان اور ایسے نتائج کی سرزمین میں پہونچا دیتی ہے جو ازروئے تمثیل مستنبط کیے جاتے ہیں۔ پس بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس پہلے سیاسی دستور سے ابتدا کی جائے جس کا علم ہم کو تاریخ سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں سب سے پہلا سیاسی دستور وہی تھا۔ پھر اس تاریخی سیاسی دستور کے مقام سے قیاس دوڑا کر معلوم کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اور پھر اس کا بعد کا ارتقا کس طرح جاری رہا اس کو تاریخ کی روشنی میں دریافت کیا جائے۔

خطبۂ دوم

دورِ تاریخی کے نظمِ حکومت کا بدو و آغاز

ا۔ میں نے اپنے سابقہ خطبے میں اس سلسلے کے طرق و مقاصد کی توضیح کر دی ہے ہمیں جس شئے کا مطالعہ کرنا ہے وہ ارتقا کی وہ رفتار ہے جو ہمیں زمانۂ جدیدہ کی سلطنت تک پہنچاتی ہے، زمانۂ جدیدہ کی سلطنت ایک آئینی سلطنت ہے، اور اس لئے یورپ کی تاریخ پر اس نظر سے نگاہ ڈالنے کے لئے کہ اس کی رفتار اس جانب رہبری کرتی ہو، ہمارا اولین تعلق دساتیر، سلطنت کی تاریخ سے ہے اور اس محدود مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم فی الجملہ قوموں کی ہندی جرمانی گروہ کی تین شاخوں کی تاریخ کے اندر ہی اندر رہ سکتے ہیں۔ ہم اپنی توجہ اصناف ذیل پر مرکوز کر سکتے ہیں (۱) یونان، (۲) روما (جس میں شہنشاہی اور خاصکر اس کا مغربی حصہ شامل ہے)۔ (۳) وہ جرمانی قبائل جنھوں نے خروج کر کے مغربی شہنشاہی کو منقلب کر دیا اور جب ان کی باری آئی تو خود ان کے سیاسی ارتقا، ان نئے حالات سے اثر پذیر ہوئے جو ان کی فتح سے اس منقلب شدہ شہنشاہی میں پیدا ہو گئے تھے اور ان حالات نے ان کے سیاسی ارتقا میں بہت کچھ ترمیم بھی کی۔

شروع ہی میں یہ ظاہر کر دینا ضروری و اہم ہے کہ یونانی اطالوی اور ٹیوٹانی تہذیب کے نشو و نما کی روشیں مختلف ہیں مگر اپنے بدو و آغاز میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ جدا نہیں ہیں۔ جب بہترین شہادتوں کے اعتبار سے ہم یونان، روما اور جرمانیہ کے سیاسی نظم کی ابتدائی شکلوں کا مقابلہ کرتے ہیں، تو ہم ان کے اہم اختلافات کے باوجود، ان کی عام ہیئتوں میں ایک گونہ اتحاد و اتفاق پاتے ہیں۔ درحقیقت

بقول فریمن۔ "آریائی خاندان کی سیاسی زندگی کی جو قدیم ترین جھلک ہمیں نظر آتی ہے، ان میں سے کم از کم یورپی ارکان خاندان میں ہم مختلف ترمیمات کے تحت میں حکومت کی ایک ہی شکل دیکھتے ہیں۔ یہ شکل وہ ہے جس میں ایک بادشاہ یا سردار ہوتا تھا جو زمانۂ امن میں حکمران اول، اور زمانۂ جنگ میں قائد افواج ہوتا تھا مگر وہ اپنی ہی خود رایانہ مرضی سے حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ سرداروں کی مجلس مشورت کا پابند رہتا تھا اور یہ سردار وہ ہوتے تھے جو عمر، نسب یا شخصی کارہائے نمایاں کی وجہ سے ممتاز ہوتے تھے۔ مزید برآں، حکمران تمام خاص خاص اہم مسائل کو قوم کی جمعیت عام میں آخری تصدیق کے لئے پیش کرتا تھا۔۔۔۔۔ ہومر کے نغموں میں یورپی زندگی کی جو پہلی تصویر کھینچی گئی ہے اس میں بھی ہمیں حکومت کی یہی شکل نظر آتی ہے ۔۔۔۔۔ جس قدیم لاطینی دستور سلطنت سے اولاً دولت عامہ اور بعد ازاں رومانی شہنشاہی وجود میں آئی، روایت سے اس کی جو قدیم ترین شکل ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے اس میں بھی حکومت کی یہی شکل نظر آتی ہے۔ ٹیسیٹس کے ہاتھوں نے ہماری نسل کی جو پہلی تصویر کھینچی ہے اس میں بھی ہم حکومت کی یہی شکل دیکھتے ہیں، اور اس نسل میں سے خاص ہماری شاخ جب اس جزیرے میں وارد ہوئی جس میں (اب) ہم رہتے ہیں تو اس کے ابتدائی ایام کے متعلق خاص ہمارے ملکی وقائع میں جو لمعات نظر آتے ہیں ان میں بھی حکومت کی یہی شکل دکھائی دیتی ہے"۔ [1]

میرے نزدیک اس رائے میں صداقت کا اہم عنصر ضرور موجود ہے مگر اس میں کسی قدر مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ پس اس موجودہ خطبے میں میری تجویز یہ ہے کہ بالترتیب ان تین مقدم صورتوں کی جانچ کروں جن پر فریمن کی تعمیم کی بنا قائم ہے، اور اس میں تشابہات کے ساتھ ہی ساتھ تخالفات کو بھی دکھاؤں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کس ترتیب سے ہم ان کی جانچ کریں فریمن کے بیان پر جو پہلی قید میں لگانا چاہتا ہوں (یہ سوال مجھے اسی جانب لیجاتا ہے) وہ قید یہ ہے کہ ان میں سے ہر صورت کے متعلق جس قدیم ترین حالت کا تاریخی تعیّن ہو سکتا ہے، جب ہم اس پر نظر کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قدیمی قومیں

[1] سیاسیات مقابلتی (Comparative Politics) خطبۂ دوم صفحات ۶۵، ۶۶

جن کی سیاسی حالت کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے وہ اس وقت ارتقا کے ایک ہی مدارج پر نہیں تھیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ موسن کے پانچویں باب میں ابتدائی رومانی دستور سلطنت کا جو خاکہ دیا ہوا ہے اس کے آخر میں اس مورخ نے صاف طور پر یہ کہدیا ہے کہ ملت رومانی کا یہ قدیم ترین قابل امتیاز سیاسی نظم (یعنی وہ دستور سلطنت جسے ہم سروِیوس تولیوس کی اصلاح کے قبل قائم شدہ تصور کرتے ہیں) ارتقاء سیاسیہ کی رفتار میں اس سے بیحد بعد کا درجہ ہے جو ہمیں ہومر کی نظموں یا جرمانیوں کے ان حالات سے معلوم ہوتا ہے جنھیں ٹیسیٹس نے بیان کیا ہے۔ اس رائے کو قبول کرنے کے بعد ہمیں اس تخالف کی ایک نمایاں مثال ملتی ہے جس کا اشارہ میں پہلے کر چکا ہوں کہ عام تاریخوں میں سیاسی واقعات کی جو تاریخی ترتیب ہوتی ہے اور سیاسیات ارتقاء کی جس ترتیب کا پتا چلانا چاہتا ہے ان دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ سیاسیات کے نقطۂ نظر سے ٹیسیٹس (یعنی پہلی صدی عیسوی) کے جرمانیوں کو چھ سو برس قبل کے رومانیوں سے مقدم سمجھنا چاہیے (یعنی ارتقا کی جس رفتار کا ہم پتا چلانا چاہتے ہیں اس کے نقطۂ آغاز سے وہ (جرمانی) قریب تر تھے۔

آیا ہم اسی طرح بقیہ دو صورتوں کا بھی تصفیہ کر سکتے ہیں؟ آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونانیوں کے جن سیاسی ادارات کا حال ہمیں ہومر سے معلوم ہوتا ہے اور جرمانیوں کی جو کیفیت ٹیسیٹس سے واضح ہوتی ہے ان دونوں میں سے باعتبار ارتقاء کے قدیم تر کون ہے۔ یہاں یہ اولین اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ تمام مقابلہ زائد از ضرورت غیر متیقن بنیاد پر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہومر کے ایسے شاعرانہ بیانات سے سیاسی نظم معاشرت یا حالت تمدن کے شکل کی تاریخی ہستی کی شہادت نہیں مل سکتی کیونکہ (۱) یہ بیانات اس زمانہ کے خصوصیات کی شہادت نہیں ہیں جس زمانہ میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں کیونکہ ہومر نے نہایت شاندار ماضی کا خاکہ کھینچا ہے۔ (۲) وہ اس زمانۂ گزشتہ کے خصوصیات کی بھی قابل اعتماد شہادت نہیں ہیں کیونکہ ہم ایک عالم قدامت کا مبلغ علم شاعر کی جانب منسوب نہیں کر سکتے۔ اس جیستان میں کچھ نہ کچھ قوت ضرور ہے، خاصکر ان مقامات کے اعتبار سے جہاں اعاظم رجال کی قوتوں، عظمتوں اور انعاموں کا ذکر ہوا ہے، تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس امر

میں شبہ کرنا تشکیک کو ضرورت سے زیادہ طول دینا ہے کہ سیاسی ادارات، معاشری رسم ورواج اور حرفتی فنون کے جو بیانات جابجا آگئے ہیں (اور صریحاً اس غرض سے نہیں داخل کئے گئے ہیں کہ قصہ کی تاثیر کو زیادہ کریں) ان سے بہ حیثیت مجموعی اس یونانی تمدن کا اظہار ہوتا ہے جسے شاعر یا شعرا اپنے تجربہ سے جانتے تھے[1]۔ اگر ایسا تھا تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ یونانی جن کے لئے ہومر کی نظمیں لکھی گئی تھیں وہ ٹیسٹیس کے جرمانیوں کی بہ نسبت عام تمدن کی سطح پر قطعاً زیادہ بلند تھے[2]، کیونکہ ان کے پاس فصیل سے گھرے ہوئے شہر تھے، انگورستان تھے، زیتون کے باغ تھے، جن کی کاشت بہت ہوشیاری سے ہوتی تھی، اور سرداروں کے شاندار محلات تھے اعلیٰ صناعی کے کام اگر وہ خود نہیں کرتے تھے تو دوسرے ملکوں سے اس قسم کے کام لاتے تھے جو صناعی میں ایکلیس کے سپر کے مانند ہوتے تھے اور سب سے آخری اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ خود نظمیں مرتب کرتے تھے، اس لئے اگر ہم انہیں صنعتی ارتقا کے زیادہ ترقی یافتہ درجہ پر پائیں تو اس میں استعجاب نہ ہونا چاہیئے۔

۲- پس اب ہم کو واقعات کے اسی جزو سے شروع کرنا چاہئے جو بہ اعتبار تاریخ سب سے موخر ہے یعنی قدیم جرمانی دستور سلطنت سے جس کے متعلق ہماری خاص سند ٹیسٹیس ہے۔ ٹیسٹیس نے جرمانی قبیلوں کے سیاسی ادارات کا جس طرح بیان کیا ہے ان میں ہم فریمین کے ہندی جرمانی نظم حکومت کے تینوں عناصر کو بالیقین پاسکتے ہیں۔ ایک جمعیت آزاد و مسلح اشخاص کی تھی جس کا اجلاس موقت طور پر ہوتا تھا جن چھوٹے چھوٹے اقطاع سے قبیلوں کی مملکت بنتی تھی ان کے والی یا سردار موجود تھے

---

[1] - دو ایک صورتوں میں شاعر کی عبارت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بالارادہ کسی ایسے رواج کا ذکر کر رہا ہے جو پرانا ہو چکا ہے، اور خود اس کے زمانہ میں وہ رواج ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، مثلاً جہاں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ پٹروکلوس کی چتا پر ٹرائے کے بارہ نوجوان قربان کئے گئے، وہاں یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

[2] ٹیسٹیس کے بیان کے بموجب جرمانی اسیران جنگ کو قربان کرتے تھے۔ وقائع، جلد اول صفحہ ۶۱۔

جوان اقطاع میں عدل و انصاف کا نفاذ کرتے تھے/ جنگ میں بالعموم اپنے جنگ آوروں کی قیادت کرتے تھے اور قومی جمعیت کے لیے پیش نظر کاموں کے طیار کرنے میں مجلس مشتشار کا کام دیتے تھے۔ بعض قبیلوں میں ایک اعلیٰ سردار یا بادشاہ بھی ہوتا تھا، یہ قطعی نہیں تھا کہ وہ موروثی ہو مگر اس کا انتخاب ہمیشہ کسی نہ کسی امیر کے خاندان سے ہوتا تھا اور ہم دوسری شہادتوں سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اکثر ایک ہی خاندان کے ارکان قابلِ انتخاب ہوتے تھے۔

لیکن جب ہم ٹیسیٹس کے بیانات کا سیزر کے اس خاکہ سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب متعلقہ گال میں دیا ہے تو ہم اس عجیب امر واقعہ سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں جسے "ابوتی بادشاہی"[1] کی حیثیت سے اس قدیمی نظم سلطنت کے بیان میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جرمانی ادارات کی جو خفیف خفیف جھلک سیزر کی کتاب میں نظر آتی ہے اس میں ہمیں قبیلہ/بادشاہی کا مطلق پتہ نہیں چلتا۔ سیزر کہتا ہے کہ امن کے زمانہ میں کوئی مشترک یا عام نظامت نہیں ہوتی تھی قبائل جن اقطاع میں منقسم ہوتے تھے ان کے سردار اپنے اپنے لوگوں میں عدل و انصاف کا نفاذ کرتے تھے۔ مشترک عام نظامت صرف اس وقت قائم کی جاتی تھی جب قبیلہ برسر جنگ ہوتا تھا۔ ڈیڑھ صدی بعد ٹیسیٹس کے زمانہ میں بھی بادشاہی یعنی کل قبیلہ کی مستقل سرگروہی نے صرف معدودے چند صورتوں ہی میں نشوونما حاصل کی تھی۔ بقول ڈاکٹر اسٹبز "قبیلوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شاہی کو بالکل ہی ساقط کر رکھا تھا۔ حکومت جسے (Civitas) کہتے تھے وہ بجائے خود ایک حد تک مرکز کا کام دیتی تھی اور قومیت کا رشتہ رابطۂ اتحاد کے لیے کافی تھا"[2]

پس جرمانی نظم سلطنت کے ارتقا میں تغیر کی جس قدیم ترین تحریک کا پتہ چلتا ہے وہ بادشاہی کی جانب ہے۔ بادشاہی سے مراد قبیلہ کی مستقل سرگروہی سے ہے جو موروثی اور بالعموم ایک ہی خاندان میں ہوا کرتی تھی۔ بعد کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے بادشاہی یوماً فیوماً رائج ہوتی جاتی تھی، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں اس کا وجود پہلے نہیں تھا

---

[1] مثلاً بلنچلی کا نظریۂ سلطنت مقالہ ششم باب ہفتم و ہشتم دیکھا جائے

[2] تاریخ آئینی (Constitutional History) باب دوم فقرہ ۱۵

وہاں استصوابِ ارادہ رائج کیا گیا، جو وسیع تر جماعتیں رومانی شہنشاہی کے فتح کرنے کا باعث ہوئیں ان میں ہم بادشاہی کو معمولی حالت میں پاتے ہیں۔ آخر میں سیکسن اور اہل فریز لینڈ ہی اپنے وطن جرمانیہ میں ایسی قومیں رہ گئیں جن میں بادشاہی نہیں تھی اور انگلستان کے سیکسن حملہ آور اگرچہ انگلستان میں بغیر بادشاہی کے وارد ہوئے مگر انھوں نے اسے بہت جلد اختیار کر لیا۔ [1]

جب صورت حال یہ ہے تو پھر فریمین کی تقلید میں یہ خیال کرنا بڑی بیباکی ہوگی کہ قدیم ہندی جرمانی قوم میں معینہ طور پر اختیارات کی سہ گانہ تقسیم ہوتی تھی، اور یہ اس وقت سے ورثہ میں چلی آرہی تھی جب یونانی، رومانی اور ٹیوٹن ایک ساتھ رہتے تھے (وجہ یہ ہے کہ قبیلہ پر لحاظ کرتے رہے) قدیم ترین شہادت سے ہم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمانیہ کے اندر جرمانیوں میں بادشاہی مفقود تھی، اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بے بادشاہ کا قبیلہ جن چھوٹے گروہوں میں منقسم تھا ان میں اعضائے حکومت کی معینہ سہ گونگی موجود تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جن قبیلوں میں بادشاہ موجود تھے ان میں یہ تینوں عناصر صاف طور پر نمایاں تھے مگر ہر حال میں ٹیسیٹس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمانی قبیلوں میں اعلیٰ اقتدار آزاد جنگجویوں کی جمعیت میں مرکوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اسٹبز نے اس بیان کا جو خلاصہ دیا ہے اس کے ایک اقتباس [2] سے میں اسے بسہولت واضح کر سکتا ہوں، یہ مسلم ہے کہ ڈاکٹر اسٹبز انگریزوں کے آبا و اجداد کے ادارات کی عمومی تعبیر کی جانب نامناسب غلو نہیں رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دونوں نظموں کے تحت میں مرکزی اقتدار کا نفاذ قومی جمعیتوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ ان جمعیتوں کا انعقاد معینہ اوقات پر اور بالعموم غرۂ ماہ یا بدرِ کامل کے روز ہوتا تھا حیثیت کا کوئی امتیاز نہیں تھا، اور سب مسلح حاضر ہوتے تھے۔ خاموش اعلان مقتدایان مذہبی کی طرف سے ہوتا تھا جنھیں بروقت اس کے نفاذ کا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ اس کے بعد مباحثہ کا آغاز کسی ایسے شخص کی طرف سے ہوتا تھا جسے خطابت

---

[1] ۔ مقابلہ کیجئے آٹو گرکی Des Deutsche Genossenschaftsreoht Pt. §

[2] ۔ تاریخ آئینی (Constitutional History باب دوم فقرہ ۱۶۵۔

کا شخصی حق حاصل ہوتا تھا مثلاً بادشاہ یا کوئی مقامی سردار، یا کوئی ایسا شخص جس کی عمر، امارت، فوجی عظمت یا فصاحت یا بلاغت اسے خطابت کے رتبے کا مستحق بنا دیتی ہو۔ یہ شخص ترغیب و مشورت کا انداز اختیار کرتا تھا، تحکم کا انداز کبھی پیدا ہونے دیتا تھا مخالفت کا اظہار بلند آواز سے ہوتا تھا، موافقت کا اظہار نیزوں کے ہلانے سے ہوتا تھا پرجوش مدح کا اظہار نیزے اور ڈھال کے بجانے سے۔

”زیر غور مسائل میں سے زیادہ اہم مسائل کا انصرام پوری جمعیت میں ہوتا تھا جس میں تمام آزاد خیالوں کو موجود ہونے کا حق ہوتا تھا اگر معاملات کو قومی تصفیئے کے لئے پیش کرنے کے قبل سردار ان کے متعلق لوگوں کو ہموار کر لیتے تھے اور وہی ان معاملات کی ترتیب بھی کرتے تھے۔ کم اہمیت اور معمولی روزمرہ کے معاملات حکام کی محدود مجلسوں میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ یہ جمعیت عدالت عالیہ کی حیثیت سے بھی کام کرتی شکایات کی سماعت کرتی۔ سزائے موت کا حکم جاری کرتی تھی“ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیسیٹس کے زمانہ میں ضلعوں اور دیہاتوں میں ”نفاذ انصاف کے لئے حکام“ کا انتخاب بھی اسی جمعیت میں سے ہوتا تھا۔

۴۔ جب ہم زمانۂ ہومر کے یونان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نظم حکومت میں زیادہ قطعی شاہانہ ہیئت نمودار ہو چکی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک سردار اعلیٰ ہوتا تھا، لیکن بازی لیوس (Basileus) کا جو لقب اس کے لئے استعمال ہوتا تھا وہی ان ماتحت سرداروں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا جنھیں ٹیسیٹس ”رکس“ (شاہ Rex) سے ممیز کرنے کے لئے (Principes) (والی یا سردار کہتا ہے[۱]، کم از کم ”اڈیسی“ میں تو ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ تاہم، (اڈیسی کے بموجب) ہومر کے بیان کردہ قبیلوں میں جو مختلف سردار ہو سکتے تھے ان میں معمولاً ایک سب سے اعلیٰ سردار یا بادشاہ ہوتا تھا

---

[۱] ٹیسیٹس، ”جرمانیا“ میرا یقین یہ ہے کہ ایلیاڈ میں بازی لیوس Basileus کا لفظ ہرگز صراحتاً کسی ایسے شخص کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے جو کسی عملاً تے (دیموس) کا سردار نہ ہو یا کسی ایسے سردار کا بیٹا نہ ہو۔ یہ ان نکات میں سے ہے، جنھیں ایلیڈ یا اس کے قدیم ترحصص کے سیاسی تصورات، اوڈیسی کے انھیں تصورات سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔

جس کا منصب لازماً (از روئے وراثت) نہیں مگر عموماً اس کے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ملتا تھا جب ایک حریف نے تیلی ماکوس سے یہ کہا کہ اپنے باپ کے وارث کی حیثیت سے اس کا یہ حق ہے کہ وہ اتھاکا کا بادشاہ ہو تو تیلی ماکوس نے متانت کے ساتھ یہ جواب دیا کہ "اتھاکا میں اور بھی بہت سے دوسرے سردار ہیں" اور اگر اودیسیوس کا انتقال ہوگیا ہے تو ان میں سے کوئی ایک انصرام مہمات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اس بحث کے انداز سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیلی ماکوس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ حق ضرور ہے مگر یہ حق باطل بھی ہو سکتا تھا[1] اس طرح قدیم جرمانی دستور سلطنت میں اپنا بادشاہ منتخب کرنے کے لئے قوم کا حق منتخب ہونے کے اس موروثی دعوے کے ساتھ عموماً ملا ہوا تھا جو ایک ہی خاندان کے ارکان سے تعلق رکھتا تھا

پس ہومر کے بیان کردہ قبائل میں ایک مرکزی بادشاہ ہوتا تھا جو معمولاً موروثی ہوتا تھا، اور جو جرمانی بادشاہ کی طرح، زمانۂ امن میں اہل قبیلہ کے آپس کے تنازعات حقوق کے فیصلہ کرنے کا فرض ادا کرتا تھا اور انھیں ظالمانہ زیادتی سے محفوظ رکھتا تھا خارجی تعلقات میں اپنی جماعت کی نمائندگی کرتا تھا، سفیروں کو باریاب کرتا اور غیر ملکیوں کی مدارات کرتا تھا، اور جنگ کے زمانہ میں معمولاً فوج کا قائد ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ملکر ماتحت سردار یا اکابر، جرمانی سرداروں کے مانند، ایک مجلس مرتب کرتے تھے، اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جرمانی سرداروں کی طرح ان کی بھی عادت یہ تھی کہ اپنے معاملات کا تصفیہ ضیافت کے موقع پر کیا کرتے تھے[2]۔ مزید براں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اہمیت عامہ کے معاملات پر بحث کرنے کے لئے قوم کی عام جمعیتیں طلب کی جاتی تھیں مگر اس قسم کی جمعیتوں کے سیاسی فرض کے متعلق مشہور علمائے مستند کے درمیان شدید اختلاف آرا ہے۔

گروٹ[3] کی رائے کے بموجب ہومر کی بیان کردہ جمعیت احرار اور مجلس سرداران سے

---

[2] سیاسی ضیافتیں بہت ہی قدیمی ادارات ہیں۔ ٹیسیٹس لکھتا ہے کہ وہ صلح اور جنگ کے معاملات پر اکثر دسترخوان پر بحث کیا کرتے تھے۔ اکیلس کے غصہ سے جو نازک حالت پیدا ہوگئی تھی اس موقع پر نسٹر اگامیمنون کو یہ صلاح دیتا ہے کہ "سرداروں کو ایک دعوت دو"

[3] تاریخ یونان حصۂ اول باب بستم (جلد دوم صفحات ۹۰-۹۲-۹۰) طبع اول۔

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے بادشاہ کو صلاح دینے کے مواقع پیدا کئے جاتے تھے اور وہ قوم میں بادشاہ کے منشا کو شائع کرنے کا واسطہ ہوتی تھیں نہ کہ بادشاہ کے اقتدار میں رکاوٹیں ڈالتی تھیں بادشاہ اپنی رائے شائع کرتا تھا مگر ہومر کے جلسہ گاہ میں "ہاں" اور "نہیں" کی تقسیم نہیں ہوتی تھی، نہ کبھی کوئی باضابطہ قرارداد قبول کی جاتی تھی، اس جمعیت کا اجلاس مکالمہ، اطلاع، اور کسی حد تک سرداروں کے مباحثوں کے لئے منعقد ہوتا تھا اور اسی حد پر اس کے ظاہری مقاصد ختم ہو جاتے تھے۔ عامۃ الناس جن پر یہ جمعیت مشتمل ہوتی تھی، وہ سنتے تھے اور راضی برضا رہتے تھے، اکثر ان میں تذبذب نہیں ہوتا تھا اور سرتابی تو کبھی ہوتی ہی نہ تھی۔

اس کے جواب میں فریمین اور گلیڈسٹن نے ناقابل انکار دلائل کے ساتھ اس امر پر زور دیا ہے کہ "باقاعدہ قراردادیں" اور "تقسیم آرا" یہ وہ نزاکت آفرینیاں ہیں جو سیاسی تہذیب کے بعد کے مدارج میں پیدا ہوئیں، ہم اس قسم کی قراردادیں اور تقسیم آرا صلح احرار کی اس جرمانی جمعیت میں بھی نہیں پاتے جس پر صلح و جنگ کے واقعی فیصلے اور دوسرے اہم معاملات کا صریحی انحصار تھا، ٹیسیٹس کہتا ہے کہ "اگر وہ کسی تجویز کو ناپسند کرتے ہیں تو اپنے انکار کا اظہار بڑبڑانے سے کرتے ہیں، اگر پسند کرتے ہیں تو نیزے آپس میں ٹکراتے ہیں[1] یہ قطعاً ظاہر ہے کہ ہومر کے یونانی پرزور ناپسندیدگی سے اجتناب کرتے تھے مگر اوڈیسی (نہم ۲۹، ۵۰) میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگامیمنون کی تجویز کی ناپسندیدگی کا موثر اظہار خاموشی سے ہوا، اور فریق مخالف کے مقرر کے لئے زور کا شور تحسین بلند ہوا، یہ عیاں ہے کہ ہومر کی جمعیت میں مقرر ترغیب وہی سے کام لیتے تھے اور ترغیبی فصاحت ان کے لئے سب سے زیادہ اہم تھی۔ شان و عظمت حاصل کرنے کے لئے اعاظم رجال کے واسطے جمعیت گاہ میدان جنگ سے کچھ کم نہ تھی[2] کم حیثیت شخص بھی اگر اسے فصاحت و بلاغت کی نعمت حاصل ہوتی تھی "وہ اپنی قوم کی جمعیت میں تاباں و درخشاں بن جاتا تھا، اور جب وہ شہر میں ہو کر گزرتا تھا تو اس پر لوگوں کی نظریں اس طرح پڑتی تھیں گویا وہ دیوتا ہے"[3] پس اس لئے جمعیت

---

[1] ٹیسیٹس "جرمانیا"۔ ۱۱

[2] اوڈیسی، ہشتم، صفحہ ۱۲۷

[3] اوڈیسی ۸، ۱۷۲

محض ایک وسیلۂ اعلان ہونے سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی تھی اور جیسا کہ گلیڈسٹن اور فریمین کہتے ہیں، جہاں خطابت عامہ روش عامہ کا آلۂ کار ہوتی ہے، آزادی کا اصلی جوہر وہیں موجود ہوتا ہے۔

مزید براں، یہ بھی واضح ہے کہ (ایلیاڈ ۱۸، ۱۱، ۳) شاعر نے یہ قرار دیا ہے کہ پالیڈمس کی عمدہ صلاح کے بجائے، ہکٹر کی ناقص رائے کو پسند کرنے کی شدید ذمہ داری ٹرائے کی جمعیت ہی پر عائد ہوئی تھی، اور اوڈیسی ۱۶، ۵، ۳ تیلے ماکوس کے مار ڈالنے کی سازش کی سزا کے طور پر پینیلوپ کے خواستگاروں کو اٹیکا سے خارج کر دینے کا اختیار اٹیکا کی جمعیت ہی کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا دشوار ہے کہ رواج کے بموجب بادشاہ مجلس یا جمعیت کی صلاح کے بغیر یا اس کی صلاح کے خلاف کس حد تک اپنے فیصلے سے کام لے سکتا تھا (کیونکہ اس میں شک نہیں کہ تینوں اعضا کے درمیان فرائض کی تقسیم غیر متعین اور تغیر پذیر تھی) تاہم یہ صاف ظاہر ہے کہ بعض سرکاری کام اس کے حدودِ اختیار کے اندر نہیں تھے۔ چنانچہ ہم بارہا یہ سنتے ہیں کہ کسی بطل اعظم کے لئے اس کی نمایاں خدمت عامہ کے صلہ میں سرکاری زمین میں سے کوئی قطعہ علیحدہ کر کے ایک جاگیر اسے عطا کر دی گئی مگر یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ یہ جاگیر بادشاہ کے اقتدار سے اسے عطا ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ لیسیا میں بیلے رو فون کے مہمات کے بعد بادشاہ نے اپنے "تمام شاہی اعزاز کا نصف حصہ اسے دے دیا تھا"، مگر "انگورستان اور کاشت سے سرسبز و شاداب جاگیر" اسے اہالی لیسیا ہی نے دی تھی (بادشاہ کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا)۔

پس اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہم تنہا ہومر ہی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یونان کے سیاسی نظم معاشرت کی جس قدیم ترین شکل کا پتہ چلتا ہے اس میں احرار کی جمعیت کو وہ حیثیت حاصل تھی جو جرمانی جمعیت سے مشابہت رکھتی تھی، اگرچہ یہ بھی یقینی ہے کہ ہومر نے جس نظم معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اس میں سردار اس سے زیادہ اور عام اشخاص اس سے کم ظاہر ہوتے ہیں جتنا کہ ٹیسیٹس نے جرمانی نظم معاشرت میں بیان کیا ہے۔

اس عام نتیجہ کی مزید تائید اس شہادت سے ہو سکتی ہے جو ہومر سے بعد کے یونان کے متعلق حاصل ہوئی ہے جس سے مکرر توضیح اس امر کی ہوتی ہے کہ استقرار اور تقابل کے ذریعہ سے سیاسی ارتقا کی عام رفتار کا پتہ چلانے میں ہمیں تاریخی ترتیب کو نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ ہمیں مختلف سلطنتوں کے ایسے سیاسی حالات کو جن میں طولانی وقفے

حائل ہوتے ہیں، متوازی رکھنا پڑتا ہے اور دوسری طرف مختلف ممالک کے ایسے یکساں حالات پر بیک وقت غور کرنا پڑتا ہے جن میں ارتقا کے طولانی وقفے حائل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ترتیب تاریخ کی اس نظر اندازی کو ہمیں ضرورت سے زیادہ طول نہ دینا چاہیئے کیونکہ یہ اغلب ہے کہ ایک قوم جس کی ارتقائی حالت پست ہو اور کسی زیادہ مہذب قوم سے ربط ضبط رکھتی ہو، وہ اس تعلق کی وجہ سے تہذیب و تمدن کے بعض عناصر اخذ کریگی اور اس طرح بعض اعتبارات میں معاشری حیثیت سے اس قوم سے بہت بڑھ جائے گی جو عموماً ارتقا کے اس درجہ پر اس سے بہت قبل ہو گزری ہو لیکن جس قسم کے قدیم نظم معاشرت پر ہم غور کر رہے ہیں، اس کی سیاسی قوتوں کے توازن پر ہمعصر تہذیب و تمدن کے اس اثر سے یہ توقع دشوار ہے کہ وہ آزاد اشخاص کی عام جمعیت کے حق میں اثر انداز نہ ہوگا کیونکہ یہ اغلب ہے کہ سردار اپنی دولت و حیثیت کے اعتبار سے تہذیب و تمدن میں عامۃ الناس پر سبقت لے جائیں گے اور اس طرح اپنے تفوق کو بڑھالیں گے۔ یونانی تاریخ میں مقدونیہ کو جب نمود حاصل ہوئی ہے اس وقت اس کے بادشاہوں کے معاملہ میں یہی صورت واقع ہوئی۔ درحقیقت وہاں شاہی خاندان کا دعوی یہ تھا کہ وہ نسلاً اپنے زیادہ متمدن ہمسایوں سے تعلق رکھتا ہے پس جب اس منبع فوقیت کے باوجود ہمیں سکندر کے مورخین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدونی بادشاہوں کے اختیارات آئینی طور پر محدود تھے اور خاصکر موت کی سزا زمان جنگ میں فوج کی اور زمان امن میں جمعیت کی منظوری کے بغیر نہیں صادر ہو سکتی تھی اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سکندر کے ایسے سربلند و ظفرمند بادشاہ کے تحت میں بھی مقدونوی فوج نے ایشیا میں اپنے اس حق کو قائم رکھا اور واقعاً ان مقدونیوں کو چھوڑ دیا جن پر خود سکندر نے فوج کے روبرو الزام عائد کیا تھا تو بالیقین فریقین کے اس توازن کی کچھ تصدیق ہو جاتی ہے جو اس نے مسلح آزاد اشخاص کی ٹیوٹنی اور یونانی جمعیتوں کے قدیم سیاسی گروہوں کے درمیان قائم کیا ہے۔

لیکن، مقدونوی دستور سلطنت کا حال ہمیں عام مبہم بیانات اور ان نتائج سے معلوم ہوتا ہے جو منفرد واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں مگر زیادہ اہم شہادت ہمیں یونان کے تاریخی دساتیر میں سے ایک سب سے زیادہ دلچسپ دستور سلطنت سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ دستور سلطنت وہ ہے جسے اسپارٹا کا لکرگس والا دستور

سلطنت کہتے ہیں میرے نزدیک یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ (۱) ڈوریس کے جن قبائل نے پیلوپونیز کو فتح کیا وہ معاشری و سیاسی دونوں گروہوں سے اس قوم کی بہ نسبت زیادہ ابتدائی حالت میں تھے جسے انھوں نے مغلوب کر لیا تھا۔ اور (۲) لکرگس کی جانب منسوب شدہ دستور سلطنت میں ایک بڑی حد تک ہمیں یہ ابتدائی حالت مصنوعی طور پر محفوظ اور بے نظیر طور پر مستحکم ملتی ہے۔ ایسے سلسلۂ تغیر کے ذریعہ سے جس کا اب پتہ نہیں چل سکتا ایک حملہ آور غول کی ابتدائی طبعی کیفیت زندگی اور اس کے جنگجویانہ عادات کسی نہ کسی طرح سے سپاہیوں کی ایک نہایت ترتیب دادہ جماعت کی مصنوعی سادگی و جفاکشی اور روایتی جنگی فن کے اندر نقش کا لحجر کر دی گئی تھی (روایات قدیمہ نے اسی سلسلۂ تغیر کو یکجائی طور پر لکرگس کے نام سے وابستہ کر دیا ہے) اب اگر ہم اسپارٹا کے قدیم دستور سلطنت کو لیں، (اور "ایفورز" یعنی ناظروں کی اس مجلس کو نظر انداز کر دیں جسے بہترین استاد نے بالاتفاق اضافۂ مابعد قرار دیا ہے) تو ہم اس کی اہم ہیئتوں کو ویسا ہی پائیں گے جیسا کہ فریمین نے قدیمی ہندی جرمانی نظم حکومت کی نسبت بیان کیا ہے، اور بالخصوص جمعیت کے اختیارات کے اعتبارات سے اس کو ٹیسٹس کے بیان کردہ نظم حکومت کے ساتھ اس سے زیادہ نمایاں مشابہت حاصل ہے جتنی ہومر کے بیان میں کہیں مل سکتی ہو بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ وہ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ بدر کامل کے دن شہریوں کو یوروٹاس کی وادی میں ایک مقررہ جگہ پر جمع کرے، (میں نے یہاں اسپارٹا کی دہری بادشاہت کی خصوصیت کی تجرید کر لی ہے، کیونکہ اس وقت ہمیں اس بحث میں الجھنا نہ چاہیئے) جرمانی جمعیت کی طرح یہ جمعیت بھی مسلح آزاد لوگوں کے فوجی اجتماع کی حیثیت رکھتی تھی۔ صلح و جنگ کے فیصلے، معاہدے، اور سلطنت کے دوسرے اہم معاملات تصفیہ کے لئے اس کے سامنے بالکل اسی طرح پیش ہوتے تھے جس طرح ٹیسٹس کی بیان کردہ جرمانی جمعیت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ دونوں میں سے کسی صورت میں بھی معمولی آزاد اشخاص مباحثہ میں حصہ نہیں لیتے تھے مگر جمعیت کو یہ اختیار رہتا تھا کہ پیش شدہ تجاویز کو قبول کرے یا رد کر دے، اور تھیوسیڈائڈیس کے زمانہ تک (جیسا کہ خود اس مورخ نے بیان کیا ہے) جرمانی جمعیت کی طرح اسپارٹا کی جمعیت کا فیصلہ بھی باضابطہ اظہار رائے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ شور کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ تمام شہادتوں کو یکجا کرنے کے بعد ہم معقول حد تک یہ فرض کرسکتے ہیں کہ سرداروں اور عام آزاد اشخاص کے درمیان رواجاً اختیار کی جو تقسیم تھی وہ یونان کے مختلف حصوں میں بہت کچھ مختلف تھی اور جہاں نسبتاً زیادہ ابتدائی معاشری حالات باقی رہ گئے تھے (جیسا کہ اس کوہستانی قطعہ میں تھے جہاں سے فاتح ڈوریائی قوم آئی تھی) وہاں عام آزاد اشخاص کی خود مختاری اور جمعیت احرار کی مجموعی قوت زیادہ متمدن حصص کے بہ نسبت بڑھی ہوئی تھی اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا بھی اہم ہے کہ سرداروں کا فوجی ساز و سامان اور ان کا طریق جنگ کیا تھا کیونکہ قدیم تاریخ میں ارتقا کا جس قدر دور شامل ہے اس تمام دور میں فوجی ساز و سامان اور تنظیم کے اختلافات کا سیاسی اختلافات پر اہم اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ ہومر کے اعاظم رجال کے مانند جہاں کہیں یونانی سردار و امرا جنگی گاڑیوں پر بیٹھ کر لڑتے تھے، وہاں ان کی سیاسی فوقیت قلیل الارتباط عام غول پر قطعاً اس سے زیادہ تھی جتنی ان ٹیوٹنی سرداروں کو حاصل تھی جو اپنے ہم قبیلہ اشخاص کے ساتھ میدان جنگ کو پیدل جاتے تھے، لیکن میرا یہ خیال نہیں ہے کہ جنگ کا یہ طریقہ یورپ کے یونانیوں میں کبھی زیادہ وسعت کے ساتھ شائع رہا ہو[1] کیونکہ جنگی گاڑیاں اس قسم کے کوہستانی ملک کے لئے جیسا کہ یونان خاص کا بیشتر حصہ ہے بالکل ہی ناموزوں تھیں۔ بہر صورت ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ ڈوریائیوں نے پیلوپونیز میں اپنے فتوحات زیادہ تر اس پیدل فوج کے ذریعہ سے حاصل کئے جو ازمنۂ تاریخی میں ان کی جنگ سازی کا ایک خاص بازو تھا۔ اور اس طرح عام ڈوریائی آزاد اشخاص کے ساتھ جو فوجی اہمیت وابستہ ہو جاتی ہے اس کا میلان یہ رہا ہوگا کہ ان کی سیاسی حیثیت برقرار رہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے پتھروں کی عظیم الشان دیواروں، سونے کے خزائن و دفائن سے پر شاندار قبروں اور میسینی اور ٹرینز کے محلات کے کھنڈروں کو ہم معقول حد تک اس امر کی شہادت قرار دے سکتے ہیں کہ ڈوریائیوں کے حملوں کے قبل پیلوپونیز کے یونانی سردار وقار و طاقت میں ٹیسیٹس کے جرمانیہ اور یونان کے زیادہ درشت تمدنی حصص کے سرداروں کی نسبت بہت بڑھے ہوئے تھے۔

عدالتی فرائض کی نسبت، قدیمی جرمانی نظم حکومت اور قدیم ترین معلومہ یونانی نظم

[1] اس کے آثار موجود ہیں کہ زمانۂ قدیم میں یہ طریقہ بوئیشیا اور یوبیا میں رائج تھا۔

حکومت کے درمیان قطعی تخالف معلوم ہوتا ہے۔ جرمانی نظم حکومت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنازعات حقوق اگر آپس کی جدال، مصالحت یا ثالثی سے طے نہ ہو جائیں تو انصاف کے اعلان کا حق خاصتہً "آزاد اشخاص" کو حاصل ہوتا تھا خواہ وہ قومی طور پر مجتمع ہوں یا مقامی طور پر۔ بادشاہ یا مقامی سردار کا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ سماعت مقدمہ کے وقت صدارت کرے اور فیصلہ کا نفاذ کر دے لیکن ہومر کے بیان کردہ یونان میں فیصلہ عام اہل شہر کے درمیان اگورا میں ہوتا تھا مگر اس کی شہادت نہیں ہے کہ معمولی مقدمات میں آزاد اشخاص عام طور پر فیصلہ میں شرکت کرتے تھے تاہم، مقدونیہ کے متعلق جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ موت کے مقدمات میں جمع شدہ آزاد اشخاص آخری فیصلہ کرنے تھے جیسا کہ روما میں اس وقت ہوتا تھا جب سزا یافتہ شخص مرافعہ کرتا تھا۔ عام بناؤں پر اغلب یہی ہے کہ اور جگہوں کی طرح یونان میں بھی مسلح لوگوں کا وہ قدیمی اجتماع جس سے سیاسی جمعیت بنتی تھی، فوجداری کے اہم معاملات کے لئے اول اول عدالتی جماعت بھی ہوتا تھا۔

مومسن نے قدیمی رومانی دستور سلطنت کا نقشہ جس طرح کھینچا ہے جب ہم اس پر مختصر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہم آزاد اشخاص کے قدیمی نظم حکومت کے تین عناصر کو قطعی اور نمایاں طور پر ممیز دیکھتے ہیں، سب سے اول بادشاہ،[1] دوسرے مجلس "آباء" (اکابر) جسے رواجاً یہ حق تھا کہ بادشاہ کو صلاح دے اور جب بادشاہ کا انتقال ہو جائے تو شاہی اختیار کی آخری امانت دار وہی مجلس ہو، تیسرے جمعیت، جسے قدیمی ٹیوٹنی یا اسپارٹوی جمعیت کے ساتھ ساتھ کم از کم تین اصولی مشابہتیں تھیں۔ (۱) معینہ دنوں پر اس کا انعقاد ضرور ہوتا تھا۔ (۲) جارحانہ جنگ "قانون عامہ"، یا ملکی تعلقات اور مروجہ قاعدے کے تغیر وغیرہ کے ایسے زیادہ اہم قومی معاملات کے متعلق اس کی منظوری لی جاتی تھی۔ (۳) جمعیت کو صرف "ہاں" یا "نہیں" کہنا ہوتا تھا، جو تجاویز پیش ہوتے تھے ان کے متعلق عام شہریوں کو تقریر کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

---

[1] رومانی اور یونانی بادشاہوں کے درمیان بعض نمایاں اختلافات موجود ہیں۔ رومانی بادشاہ کو دیوتاؤں کی نسل میں ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ اس کی نامزدگی یا تو اس کا پیشرو کرتا تھا یا سینات کا مقرر کردہ "ہنگامی بادشاہ" کرتا تھا مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روما کے بادشاہ کا انتظامی اختیار یونان کے دیوتائی بادشاہوں سے بہت بڑھا ہوا تھا اور یہ رومانیوں کی خصلت کے اس مزید تشدد و انضباط کے عین موافق تھا جس کا ثبوت ہمیں پدری اختیار کے خانگی قانون کی سختی میں بھی ملتا ہے۔

یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ جن مقدمات میں موت کی سزا تجویز ہوتی تھی ان کی بابت رواجاً رومانی جمعیت کے روبرو مرافعہ ہوتا تھا۔

یہ خیال میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ جس نظم حکومت کا یہ سرسری خاکہ کھینچا گیا ہے، وہ خصوصیت کے ساتھ ہندی جرمانی تھا۔ درحقیقت، مسٹر اسپنسر کی رائے[1] کے بموجب یہ حکمرانی کی ایک ایسی شکل تھی جسے ہم بعض اہالی ملایا اور پالینیشیا، شمالی امریکہ کے سرخ رنگ باشندوں، ہندوستان کے پہاڑوں کے دڑاوڈی قبیلوں اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں میں بھی پاتے ہیں، لیکن یہاں ہمیں زیادہ وسیع مقابلے سے سروکار نہیں ہے۔ مسٹر اسپنسر نے خصوصیت کے ساتھ یہ اضافہ کیا ہے کہ "حکومتی تنظیم کا اس کے سوا کسی اور طرح شروع ہونا ممکن نہیں ہے" کیونکہ اول اول کوئی مقتدر قوت اس مجموعی مرضی کے سوا نہیں ہوتی جس کا اظہار جمع شدہ غول میں ہوتا ہے" لیکن اس کے قبل کہ ہم اس ضرورت کی تصدیق کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سیاسی نظم معاشرت کے بدو و آغاز کے متعلق ایک ایسے مقبول عام نظریہ کی جانچ کریں جس سے اس ضروری اور مقتدر قوت کے سرانجام پانے کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ میرا مقصود نظریۂ ابوّت سے ہے جس سے قدیم نظم معاشرت میں ارتباط کی ابتدائی قوت کی حیثیت سے بچوں میں والدین کی اطاعت پیدا ہوتی تھی اور آگے چل کر یہی عادت اس سردار کی اطاعت کا موجب ہوتی تھی جو اپنے عشیرے کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ کے خطبہ میں اس نظریئے کی جانچ کروں۔

---

[1] ادارات سیاسیہ (Political Institutions) باب پنجم فقرہ ۴۶۶۔

خطبۂ سوم

نظریۂ ابوّت

۱۔ میں یہاں خطبۂ سابقہ کے نتائج کا خلاصہ مختصراً بیان کرتا ہوں، سابق ترین شواہد تحریری سے قدیم قوم کی جو کیفیت یونان و روما میں اور (کسی مشترک سردار کے ہونے کی حدتک) جرمانی قبائل میں ظاہر ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی فرائض تین مختلف الترکیب اعضا میں منقسم تھے، بادشاہ یا سردار اعلیٰ، ماتحت زعما یا اکابر کی مجلس اور کامل الحقوق شہریوں کی جمعیت، جس کی نسبت میں کہہ چکا ہوں کہ وہ آزاد و مسلح اشخاص کا فوجی اجتماع ہوتا تھا۔ جن مختلف صورتوں کا ہم نے مقابلہ کیا ہے ان میں یہ تینوں اعضا کم و بیش یکساں پائے جاتے ہیں، اور ان تینوں میں فرائض کی تقسیم جس طرح کسی ایک صورت میں ہوئی ہے دوسری صورت میں بھی کم و بیش وہی بات موجود ہے تاہم جزئیات میں ہمیں اہم اختلافات نظر آتے ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس ابتدائی درجہ میں ہمیں ان نظمہائے معاشرت کے ساتھ تقسیم فرائض کی وہ قطعیت و تعیین منسوب نہ کرنا چاہیئے جو زیادہ متمدن قوموں کے نظمہائے حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔

خطبات کے اس سلسلے کا خاص کام یہ ہے کہ یہ نظم حکومت جس ارتقا سے ہو کر گزرا ہے اس کے بعد کی رفتار کا قدم بقدم پتہ چلائے، جس قدر تمدن آگے بڑھتا جاتا ہے یہ رفتار صاف ہوتی جاتی ہے۔ اور گزشتہ معاشری و سیاسی حالات کے جو شواہد تحریری ہمارے پاس ہیں وہ زیادہ قطعی و قابل اعتماد ہوتے جاتے ہیں مگر اس موجودہ خطبے میں آگے نظر ڈالنے کے بجائے اس تاریک تر زمانہ پر نظر ڈالنا اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم قیاسات کی مدد سے کس حدتک ایک اغلب بیان اس رفتار کا مرتب کر سکتے ہیں جس سے قدیم نظم حکومت تک رسائی ہوئی۔

زمانہ جدید کے سیاسی خیال کے سابق تر مدارج میں نظم معاشرت کے بدو و آغاز کے مسئلہ پر بہت بحث ہوئی ہے کیونکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ اس سے کوئی عملی اہمیت پیدا ہوتی ہے،

مگر اب کوئی بھی یہ اہمیت اس کی جانب منسوب نہیں کرتا۔ لوگوں نے اپنے کو ایک منظم معاشرت میں پاکر اور عادتاً کسی حکومت کی اطاعت کرنے کے باعث سوال یہ کیا کہ یہ اطاعت کیوں واجب ہوئی؟ اور توقع یہ کی کہ اس کا جواب کسی ایسے نظریے میں مل جائے گا (جس سے یہ واضح ہوتا ہو) کہ اس اطاعت کی ابتدا کیونکر ہوئی یعنی یہ رائے قائم کرلی کہ حکومتی اقتدار کی ابتدا کا علم ہو جانے سے یہ متعین ہو جائے گا کہ بنی نوع انسان کے خاص خاص حصص سے حکمرانوں کو اس وقت حصول اطاعت کا جو دعویٰ ہے اس کا جواز ثابت ہو جائے گا، مگر حکومت کے ابتدائی منبع اور موجودہ فرض اطاعت کے درمیان تعلق کا یہ گمان اب عام طور پر مردود قرار پاگیا ہے اس امر پر غور کرتے وقت کہ کیوں ہم کسی قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرتے ہیں، ہم عام طور پر اطاعت و مقاومت کے اغلب نتائج کی جانچ کرتے ہیں یعنی ایک قائم شدہ نظم کو توڑنے کی برائیوں کو جور و زیادتی کی برائیوں کے مقابل رکھکر دونوں کا موازنہ کرتے ہیں پس اس طرح لاک اور فلمر کا تنازع ہمارے لئے تاریخی دلچسپی سے زائد نہیں رہ گیا ہے۔ لاک کا دعویٰ یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار سابق الحریت افراد کی آزادانہ مرضی سے ماخوذ ہوا ہے اور فلمر یہ دعویٰ کرتا تھا کہ یہ اقتدار اس فطری اقتدار سے ماخوذ ہے جو باپ کو اپنے لڑکوں اور لڑکوں کے لڑکوں پر ہوتا ہے۔ پس اب ہمارے لئے آسان ہے کہ ہم ان متبادل قیاسات کی اغلبیت کو علمی بے لوثی کے ساتھ جانچیں۔

۲۔ لیکن، قیاسات کے اس دھندلے گوشے میں قدم رکھنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ اس ابتدائی اقتدار کے مسئلہ کے متعلق (جہاں تک کہ وہ تاریخ کے نسبتاً کم مبہم حصص سے معلوم ہو سکتا ہے) جو کچھ بھی علم حاصل ہو سکے ہمارے ذہن میں محفوظ ہو، ہمیں اس بات پر قیاس دوڑانے کی ضرورت ہے کہ ازمنۂ قبل التاریخ میں سیاسی نظم معاشرت کی ابتدا کس طرح سے ہوئی، اس کے صحیح قیاس کا بہترین موقع حاصل کرنے کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ازمنۂ تاریخی میں نئے سیاسی نظمہائے معاشرت کے بنانے کے جو طریقے واقعی معلوم ہیں، وہ ہمارے پیش نظر ہوں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ تاریخی میں نئی سلطنتیں کبھی تو اجتماع سے بنی ہیں اور کبھی تقسیم سے، اور ان دونوں صورتوں میں کبھی رضامندی سے ایسا ہوا ہے، اور کبھی جبر سے۔ ازمنۂ تاریخی میں تقسیم کچھ کم کثرت سے واقع نہیں ہوئی ہے خاصکر ارتقا کے ان

سابق تر مدارج میں جبکہ وہ کارروائی جس نے بعد میں استعماریت کی صورت اختیار کی، ایک بھدی شکل میں اس طرح جاری ہوئی کہ نئے مستقروں کی تلاش میں جہاں گرد غول کے غول روانہ کئے جاتے تھے مگر جب کوئی نیا نظم معاشرت تقسیم کے ذریعہ سے بنتا ہے تو ظاہر ہے اس قسم کے کسی سابق الوجود نظم معاشرت سے ماخوذ ہوتا ہے، اس لئے یہ صاف ظاہر ہے کہ تقسیم وہ طریقہ نہیں ہوسکتا جس طریقہ سے سیاسی نظامہائے معاشرت ابتداً غیر سیاسی طریقوں سے بنے۔

اجتماع کی صورت دوسری ہے اور اس لئے اس پر زیادہ تر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ فاتح یا مفتوح جماعت کو جب تہذیب کا ایک خاص درجہ حاصل ہو چکتا ہے تو اس کے بعد نئی سیاسی جماعتوں (کے وجود میں آنے) کا ایک نہایت ہی اہم سبب قوت یا فتح کے ذریعے سے ہوتا ہے، لیکن ارتقا کے ادنیٰ ترین مدارج کے وحشی قبائل اگرچہ برابر ایک دوسرے سے برسر جنگ رہا کرتے ہیں مگر وہ محض فتح کے ذریعے سے ارتباط (یا امتزاج) نہیں پیدا کرتے مفتوحین کا یا خاتمہ کردیا جاتا ہے یا وہ بھگا دئے جاتے ہیں مگر انھیں جذب نہیں کیا جاتا، کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہوتا ہے کہ جو مرد گرفتار ہوتے ہیں، ان کا خاتمہ کردیا جاتا ہے اور عورتیں غالباً لونڈیاں بنائی جاتی یا گھر کا کام کرنے کے لئے بحالی جاتی ہیں۔ بس ہمیں یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملتی کہ سیاسی نظمہائے سلطنت کی نہایت ہی قدیم تکوین میں فتح بھی ایک عنصر کی حیثیت رکھتی تھی اور اس امر کا تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ غیر سیاسی عناصر سے سیاسی نظمہائے سلطنت اس طریق فتح سے وجود میں آئے ہوں۔

دوسری طرف ہم ازمنۂ تاریخی میں متعدد صورتیں ایسی پاتے ہیں جن میں زیادہ تر رضامندانہ اجتماع سے ایک نیا سیاسی مجموعہ ان عناصر سے بن گیا جن میں پہلے سے ایک قسم کی سیاسی تنظیم موجود تھی اگرچہ اکثر یہ تنظیم کم ترقی یافتہ ہوتی تھی۔ ہم اس کارروائی کا وقوع تاریخ کے اول ترین حصے میں بھی دیکھتے ہیں اور آخر ترین حصے میں بھی۔ اکثر وبیشتر ارتقا کے ابتدائی مدارج میں اس قسم کا اتحاد جنگ کے مقصد سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور اولاً اتنے ہی زمانہ تک رہتا ہے جب تک کہ جنگ جاری رہتی ہے۔ چنانچہ، (جیسا کہ میں ذکر کرچکا ہوں) سیزر سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں جرمانی قبائل میں مشترکہ سردار صرف جنگ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ امن کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے علیحدہ علیحدہ سردار رکھتے تھے جو عدل وانصاف کا انتظام کرتے اور اختلافات کو طے کرتے تھے، اور اس صورت

حالات کے تشابہات بہت آسانی کے ساتھ ہر حصے میں مل سکتے تھے۔[1]

لیکن اس مرحلے میں جنگ اس قدر شدت اور کرات ومرات سے واقع ہوتی رہتی اور اسقدر شدید ہوتی تھی کہ اتحاد کا نفع اس کے دوام کا باعث بن جاتا تھا۔ ٹیسیٹس نے جن جرمانی قبائل کا ذکر کیا ہے ان سب کے متعلق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اندرونی ارتباط کے اس کامل تر درجے کو حاصل کر لیا تھا، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان میں قومی جمعیتیں ہوتی تھیں جن میں چھوٹے قطعات کے سرداروں کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب ہم ان جرمانیوں سے گزر کر جنھیں سیزر اور ٹیسیٹس جانتے تھے ان جرمانیوں تک پہنچتے ہیں جنھوں نے چار صدی بعد زوال پذیر شہنشاہی کو روند ڈالا تو ہم تغیر کے اسی جانب میں مزید ترقی دیکھتے ہیں۔

لیکن یہ یقینی ہے کہ صرف جنگ اور غیر قوتوں کے مقابلے میں مدافعت ہی کی غرض سے (بہ الفاظ اسپنسر) یہ "توحد" وقوع میں آتا تھا۔ اگر جماعتیں زبان اور رسم ورواج میں یکساں ہوتی تھیں تو تہذیب وتمدن کی وجہ سے جب طبائع وحیات کی یکسانی کا احساس بڑھتا تھا تو مجموعی جماعتوں کے اندرونی تعلقات میں زیادہ مکمل نظم قائم کرنے کی خواہش ہی اس ضرورت کے لئے کافی ہوتی تھی۔ یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب ہم ان غیر معمولی صورتوں پر غور کرتے ہیں جن میں حالات نے غیر ملکی جنگ کو نسبتاً ایک شاذ ونادر واقعہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آئیسلینڈ میں قریب قریب ہی مختلف جمعیتیں تھیں اور ہر جگہ جدا جدا سردار رہتے تھے ان ہم جوار سرداروں اور ان کے حوالی میں تنازعات برپا رہتے تھے اور قانون غیر متیقن تھا یہی باعث ہوا کہ وہ سب ایک جماعت میں مبدل ہوگئے اور سنہ ۹۳۰ء میں "الفیوٹ کا دستور سلطنت" وجود میں آیا جس سے کل جزیرے کے لئے ایک مرکزی جمعیت (Thing) یعنی "جمعیت عام" (Althing) قائم ہوگئی اور ایک مفتی قانون مقرر ہو گیا جو ایک ہی قانون کا اجرا کرے۔

۴۔ پس کسی نئی سلطنت کی تکوین کے متعلق تمام تاریخی طریقوں میں سے رضامندانہ ارتباط ہی وہ طریقہ معلوم ہوتا ہے جو اس صورت پر قابل اطلاق ہو کہ کسی ایسی شے سے جو سیاسی نظم معاشرت نہ ہو ایک سیاسی نظم معاشرت کی ابتدائی تکوین وقوع میں آئے۔ لہذا لاک کے پیروؤں اور ان کے مخالفین کے درمیان جو نہایت ہی اہم تاریخی مسئلہ زیر بحث ہے اسے

---

[1] مقابلہ کیجئے، اسپنسر، "ادارات سیاسیہ Political Institutions نقرہ ۵۱۱، صفحہ ۲۹۰

اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آیا سیاسی نظمہائے معاشرت ابتداً اس طرح بنے تھے کہ فطری خاندانوں کے ایسے سرگروہوں نے جو اجتماع باہمی کے قبل ایک دوسرے پر حکومت کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے، انھوں نے برضامندی اجتماع قائم کر دیا تھا یا یہ کہ یہ نظامہائے معاشرت اس طرح بنے تھے کہ ایک ایک خاندان اپنے قرابتداروں کی بزرگ تر جماعتوں میں وسیع ہوتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ان افراد یا خاندانوں کی فوقیت مسلم ہوتی گئی جو خصوصیت کے ساتھ اپنے اجداد کی نمائندگی کرتے تھے۔

اس مسئلے پر کچھ روشنی اس طرح پڑ سکتی ہے کہ ہم اس قدیم ترین نظم معاشرت کی اندرونی ہئیت کی جانچ کریں، جس کا حال ہمیں یونان، روما اور جرمانیہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ پس میں اس بیان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اس ہئیت کے متعلق مین نے اس شہادت کی بنا پر پیش کیا ہے جو مقابلتی اصول قانون اور خاص کر قانون روما کے مطالعے سے ماخوذ ہے۔ مین کے قول کے موجب ابتدائی زمانوں میں نظم معاشرت واقعتاً اور نیز ان لوگوں کی نظروں میں جن سے وہ نظم مرکب ہوتا تھا، خاندانوں کا مجموعہ تھا نہ کہ افراد کا، لہذا "قدیم قانون" اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ شخصیات کے ایک نظم کے لئے موزوں ہو سکے۔ وہ جن مجموعات یعنی جن آبائی یا خاندانی گروہوں سے بحث کرتا ہے، انھیں وہ دائمی و ناقابل فنا سمجھتا ہے"[1] یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ روما کے قدیم ترین قانون کا جس حد تک ہمیں تاریخی علم ہے، اس میں یہ مجموعات نہایت قطعی مفہوم میں خاندانوں کی حیثیت سے مسلم ہیں بزرگ خاندان کا اقتدار صرف اسکی بیوی، اس کے بچوں کی اور ان بچوں کی اولاد تک وسیع ہوتا تھا، ان لوگوں پر وہ درحقیقت ایسا مطلق العنانہ اقتدار عمل میں لاتا تھا کہ اس کے سوا کسی اور رکن خاندان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی قسم کا قانونی وجود رکھتا تھا، وہ نہ صرف املاک کا (جس میں اس کی اولاد کی پیدا اکردہ املاک بھی شامل تھی) مالکِ مطلق ہوتا تھا بلکہ اپنے لڑکوں کو سزا دیسکتا تھا یہاں تک کہ انھیں قتل بھی کر سکتا تھا، انھیں فروخت کر سکتا یا تبنیت کے ذریعے سے منتقل کر سکتا تھا اور جس طرح چاہے ان کا نکاح کر سکتا اور طلاق دلا سکتا تھا۔ خاندان کے اندر اس کامل اقتدار کے دوش بدوش ایسی ہی وسیع ذمہ داری بھی تھی۔ بزرگ خاندان اپنے

[1] قدیم قانون (Ancient Law) باب پنجم صفحہ ۱۲۶

لڑکوں کے نقصان کے لئے جوابدہ تھا اگر وہ اس جوابدہی سے اس طرح خلاصی حاصل کر سکتا تھا کہ نقصان کے پورا کرنے کے لئے خود اس زیانکار کو حوالہ کر دے۔ جس طرح زندگی میں ایک رومانی باپ کے اختیار کی یہ وسعت زمانۂ جدید کے والدین کے اختیار کے بہ نسبت ایک خودمختار حکمران کے اختیار سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد اپنی جائداد پر اس کے اختیار کی نمایاں کمی کی بھی ایک مثال نہیں مل سکتی ہے، وہ ابتدأً یہ نہیں کر سکتا تھا کہ وصیت کے ذریعے سے اپنی جائداد اپنے لڑکوں کے سوا کسی اور کے لئے چھوڑ جائے، وہ مرنے کے بعد اپنی جائداد کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اس سے زیادہ نہیں رکھتا تھا جتنا زمانۂ جدیدہ کی سلطنت کا کوئی بادشاہ اپنے زیر حکومت ملک کے ہست و نیست کا اختیار رکھتا ہے

لیکن جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد کیا وقوع میں آتا تھا تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شہادت سے اس مسئلے کے دو جوابات خیال میں آتے ہیں۔ ہمیں جس قدیم ترین رومانی قانون کا علم ہے اس میں باپ کے مرنے کے بعد جو نتائج متصور ہیں، جب ان پر ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ باپ کے انتقال کے بعد خاندان شکست ہو جاتا تھا اس کے وہ لڑکے اور وہ بے باپ کے پوتے جو جسمانی طور پر خاندان قائم کرنے کے قابل ہوتے تھے یعنی خاندان کے وہ مرد جو حد بلوغ کو پہنچ چکے ہوتے تھے وہ خودمختار فرد ہو جاتے تھے اور عورتیں جو شوہروں کے زیر اقتدار نہیں ہوتی تھیں، وہ اپنی عدم قابلیت کی وجہ سے اپنے قریب ترین مرد رشتہ داروں کے تحت میں ہوتی تھیں[۵۱]

لیکن وراثت کے قدیم ترین رومانی قانون کی جانچ سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ارتقا میں ایک درجہ وہ آیا جب باپ کے انتقال کے بعد خاندان شکست ہو جانے کے بجائے باہم مربوط رہتا تھا۔ مین[۵۲] کے بموجب وراثت کا قدیمی رومانی تخیل "متوفی کی جملہ قانونی حیثیت کی جانشینی" کا تھا۔ رومانی قانون میں وراثت سے متعلق تمام متروک و قدیم فقروں سے

۵۱۔ بعد میں جب کہ وصیتوں نے رشتہ داروں کے ابتدائی حقوق کو باطل کر دیا تو باپ کے انتقال کے بعد غیر منکوحہ عورتیں ان متولیوں کی حفاظت میں دیدی جاتی تھیں جن کا تقرر وصیت کی رو سے ہوتا تھا۔

۵۲ قانون قدیم، (Ancient Law) باب ششم صفحات ۱۸۱، ۱۹۰، ۱۹۱۔

یہ اظہار ہوتا ہے کہ مورث سے وارث کی جانب جو کچھ منتقل ہوتا تھا وہ خاندان تھا، خاندان سے مطلب ان تمام حقوق و فرائض کا مجموعہ تھا جو اقتدار ابوی میں جمع تھے اور اس سے پیدا ہوتے تھے،،۔ اس لئے مین کا خیال یہ ہے کہ ابتدائی وصیت "ایک طرح پر یہ اعلان کرنا تھا کہ موصی کے بجائے سرداری کسے ملیگی" (راست وارث نہ ہونے کی صورت میں) غیر وصیت شدہ وراثت کے لئے قدیم قانون میں جو رشتۂ قرابت تسلیم کیا جاتا تھا وہ صرف "عصبات" یعنی ان رشتہ داروں کا دعوی تھا جن کی قرابت خالصۃً مردوں کے واسطہ سے ثابت ہو اور یہ ہمیں اس زمانہ تک پیچھے لیجاتا ہے جب ایک بیٹا اپنے باپ کے انتقال کے بعد بھی بعض اہم اعتبارات سے اس خاندانی گروہ سے متعلق رہتا تھا جس خاندان سے اس کے بھائی بلکہ اس کے بعید تر قرابت دار متعلق ہوتے تھے۔ وراثت سے ان تمام ذوی الارحام کا خارج کر دینا جو اپنا رشتہ صرف عورتوں کے وسیلے سے قائم کر سکتے ہوں، یہ اس وقت تک ناقابل تصریح ہوگا جبتک کہ ہم یہ فرض نہ کرلیں کہ عورتیں (خواہ وہ باپ کے انتقال کے بعد ہی عقد کیوں نکرلیں) خاندان کو اس مفہوم میں چھوڑ دیتی تھیں جس مفہوم میں مرد نہیں چھوڑتے تھے۔

مزید برآں، ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ رومانی قانون کے "دوازدہ الواح" میں وراثت کے حقوق معلومہ قرابتداری کے حدود سے متجاوز ہوکر اس قبیلے یا عشیرے کے ارکان تک بھی پہنچتے تھے جس سے متوفی کا تعلق ہوتا تھا۔ اس سے ہم اس جانب آتے ہیں کہ مین نے جو قدیم نظم معاشرت کو خاندانوں کا مجموعہ قرار دیا ہے اس میں بہت اہم ترمیم کی جائے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ روما، ایتھنز، اسپارٹا، غرض ہر اس جگہ جہاں کی قدیم قوم و ملت کا ہمیں صحیح علم ہے، اصلی خاندانوں کی درجہ بندی بڑی بڑی جماعتوں میں ہوتی تھی اور خاندانوں سے ان کی مشابہت صرف اس حد تک ہوتی تھی کہ ان کا ارتباط باہمی مشترک قرابتداری کے مفروضہ خیال سے ہوتا تھا، ہم سہولت کی غرض سے انھیں رومانی لفظ "Gentes" (عشایر) سے ممیز کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے (Gens) عشیرے کو مین خاندان کی خیالی وسعت کہتا ہے[1] عشیرے کے ارکان عشیرے کی حیثیت سے خون کے تعلق (جدی رشتہ داری) کا قطعی سراغ نہیں لگا سکتے تھے مگر وہ ایک مشترک نام استعمال کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو

---

[1] علی ہذا، گروٹ (حصۂ دوم باب نہم میں) اسے "وسعت یافتہ اور ایک گونہ خیالی برادری" کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔

ایک ہی مورث اعلی کے اخلاف یا شاخِ اخلاف سمجھتے تھے اور ایک ہی سی نیم خانگی قسم کے رسوم قربانی ادا کرنے سے وہ ایک مذہبی رشتے کے ذریعے سے بھی متحد ہوتے تھے اور ابتدائی زمانہ میں باہمی حقوق و فرائض کے ایک پیچیدہ رشتے میں بھی جکڑے ہوتے تھے ایہ حقوق و فرائض ویسے ہی ہوتے تھے جیسے صریحی قرابتداری سے پیدا ہوتے ہوں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایتھنز کے عشیرے کے ارکان اور ان کی املاک کے باہمی حقوق سے مربوط تھے، امداد، مدافعت، اور تلافیٔ نقصانات میں ایک دوسرے پر ذمہ داریاں عائد تھیں، بعض معینہ صورتوں میں (خاصکر جہاں کوئی یتیم لڑکی یا وارثہ ہو) ایک دوسرے سے عقد کرنے کے باہمی حقوق و فرائض تھے اور بعض صورتوں میں مشترکہ جائداد کی ملکیت بھی ہوتی تھی[۱]۔

اتحاد کے یہ روابط اس قدر مضبوط ہیں کہ جس قدیمی نظم معاشرت میں یہ پورے زور ول کے ساتھ جاری ہوں، اس کا تصور کرتے وقت ہم یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ طبعی خاندانوں کے مجموعے کی بہ نسبت زیادہ نمایاں طور پر عشیروں کا مجموعہ تھا، اور یہ قیاس بھی غیر اغلب نہیں ہے کہ روما کے ابتدائی سیاسی نظام سلطنت میں عشیروں کی اس طرح کی تقسیم کی نمائندگی ہوتی تھی، وہ "آبا" (Patres) جن سے مجلس سینیات مرکب تھی وہ اولاً قدیم عشیرات شرفا کے سرگروہ ہوا کرتے تھے۔

بعد ازاں، روما اور ایتھنز دونوں جگہوں میں خود عشیرات: زیادہ وسیع اتحادات "برادری" میں کم و بیش اسی قسم کے روابط سے وابستہ تھے اور پھر یہ وسیع تر گروہ قبائل میں مجتمع تھے۔

پس اگر ہم یہ تصور کریں کہ قدیمی قوم گروہوں کے ویسے ہی زینہ بہ زینہ سلسلے سے مرکب تھی جیسا کہ بیان ہوا یعنی ہر ایک گروہ کے اندر اتحاد کا رشتہ عام نسب کے اعتقاد یا روایت پر تھا جس کی نمائندگی و تصدیق ایک عام مورث اعلی کی پرستش کے مقدس رسوم سے ہوتی تھی تو اس صورت میں اگر میں یہ کہوں کہ نظریۂ ابوت خود بخود پیدا ہو جاتا ہے (تو کچھ بیجا نہ ہوگا)، جیسا کہ مین نے کہا ہے[۲] "گروہوں کو ہم یہ خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ یہ گروہ ان مجموعی دائروں کے نظم کے مثل تھے جو بتدریج ایک ہی نقطے سے پھیلتے ہوئے بن گئے ہوں" منشا یہ ہے کہ ابوی خاندان ترقی پذیر ہو کر اور باہم مربوط رہ کر عشیرہ بن جاتا تھا اور اسی طرح عشیرے قبیلے کے

---

[۱]۔ ملاحظہ ہو گروٹ، حسب بالا

[۲]۔ قدیم قانون (Ancient Law) باب نہم صفحہ ۱۲۸ و باب ہفتم صفحہ ۲۳۴

وسیع تر اتحاد میں ترقی کر جاتے تھے اور اگرچہ یہ محض ایک قیاس ہے مگر مین کا خیال ہے کہ "یہ محض ہوائی قیاس نہیں ہے" کہ ابوی خاندان سے ترقی کر کے جو خود مختار گروہ اس طرح بن جاتا تھا اس پر علی العموم "قدیم ترین سلسلہ کے بزرگترین مرد" کی حکمرانی ہوتی تھی جو "تمام آزاد قرابتداروں کے مشترک مورث اعلیٰ" کی نمائندگی کرتا تھا[1]

۴۔ اس رائے کی جانچ کرنے میں تین سوالات کا ایک دوسرے سے ممیز کرنا مناسب ہوگا، ۱۔ کسی قدیم جماعت (ملت) کے ارکان جس رابطہ سے وابستہ ہوتے تھے آیا وہ رابطہ ابتداً خاندان یعنی دانستہ قرابت اور مشترک نسب کا تابع تھا۔ ۲۔ مفروضہ قرابتداروں کا وہ گروہ جس سے ہماری حد معلومات کے اندر نہایت ہی ابتدائی سیاسی نظم معاشرت مرکب ہوتا تھا، آیا وہ ایک ایسے خاندان سے وسعت پذیر ہوا تھا جو ایک ہی مرد کی اولاد سے بنا ہو۔ ۳۔ آیا اس قسم کے گروہ کا سردار علی العموم ابتدائی خاندان کے مورث اول کے نمائندے کی حیثیت سے اقتدار عمل میں لاتا تھا۔

میرے خیال میں پہلے سوال کا جواب اعتماد کے ساتھ اثبات میں دیا جاسکتا ہے اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ تاریخ سے جس قدیم ترین دور کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اس دور میں انسان گروہوں میں رہتا تھا جن کا اکمل رابطۂ اتحاد بہر نوع قرابت ہی تھا۔ فی الواقع، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانیوں اور رومانیوں کے معاملے میں جن گروہ اندر گروہ سے جماعت (ملت یا کم از کم یہ کہ شہریوں کا قدیم مجموعہ) مرکب معلوم ہوتی ہے، ان میں سے کسی گروہ کے جملہ ارکان کے درمیان، روایتی محفوظ نسب ناموں کے ذریعوں سے بھی قرابت کا عام طور پر پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر عناصر کو تبنیت کی رسم کے ساتھ یا اس رسم کے بغیر ہی قرابتداروں کے اتحاد میں داخل کر لیا جاتا تھا، بایں ہم یہ امر اس خیال کا مانع نہیں ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس گروہ کو یہ سمجھا جائے کہ وہ ایک مشترک مورث اعلیٰ کے اخلاف سے تھے۔ جہاں کسی جماعت کے ارکان کی نسبت یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب قرابتدار نہیں ہیں وہاں بھی یہ ہوتا تھا کہ اپنے کو قرابتدار ہی متصور کرنے سے وہ اسے ایک طبعی و قرین عقل امر سمجھ سکتے تھے کہ وہ باہم سیاسی اتحاد میں متحد رہیں

[1] "قدیم ادارات کی تاریخ" Early History of Institutions خطبہ سوم صفحہ ۹۴

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تصور کے موثر ہونے میں اس طرح پر زور مدد ملجاتی تھی کہ ان خیالی قرابتداروں کو اس گروہ کی خانگی پرستش میں شامل کرلیا جاتا تھا۔ قرابتداری کی اس قسم کی مصنوعی وسعت کی کوئی مثال ہمیں قدیم جرمانیوں میں نہیں ملتی مگر سیزر کے بیان میں جب ان کی پہلی جھلک ہمیں نظر آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جنگ اور زمین کی کاشت وتصرف کے لئے ہم جنس گروہوں میں متحد تھے، اور اگرچہ ان تمام صورتوں میں ان ہم جنس تقسیموں کی اہمیت اس وقت کم ہوتی جارہی تھی جب کہ ان پر تاریخ کی روشنی پڑتی ہے تاہم اس امر کو قطعا طور پر ظاہر کرنے کے لئے کافی شہادت موجود ہے کہ قدیمی سیاسی نظم معاشرت کا اندرونی اتحاد خاندانی ہی کے نمونے پر خیال کیا جاتا تھا، اس کے قدیم ترین عناصر وہ گروہ تھے جو اسی طریق پر بنتے تھے اور ان جماعتوں کا جو اولیں علم ہمیں ہوتا ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جماعت کو زیادہ وسیع افسانہ وار قرابت کا احساس وادراک تھا جو اسے قرب وجوار کی جماعتوں کے ساتھ متحد کرتی تھی۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ قدیمی قبائل کے متحد ہونے کے لئے شرط اولیں کے طور پر ایک مشترک مورث اعلیٰ کا سلسلہ ضروری تھا، تاہم یہاں بھی بنیاد اتحاد کے طور پر قرابت کا خیال اس قدر فائق وغالب معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد کے بعد ایک مشترک مورث کا اعتقاد پیدا ہی ہوجاتا تھا۔

۵۔ پس ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ سیاسی نظم معاشرت کی قدیم ترین صورت نسبتاً ایک چھوٹی جماعت ایسے شخصوں کی تھی جو اپنے کو قرابتدار سمجھتے تھے، اور یہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں اس قسم کا نظم معاشرت ایک ہی خاندان کے توسع سے پیدا ہوا ہو مگر میک لینن اور دوسرے مصنفوں نے جو شہادتیں مہیا کی ہیں کہ غیر متمدن لوگوں میں ایسی قرابتداری عام طور پر رائج ہے جس کا سلسلہ صرف عورتوں کی طرف سے ملتا ہے اور شادی کے ایسے رواج ہیں جو ابوی طریق سے بہت ہی مختلف ہیں، تو اب ایسی شہادت کے بعد میں اسے قطعی اغلب بھی نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی سیاسی نظم جس کا علم ہمیں تاریخی طور پر ہو اس نے واقعتاً اس طرح پر ترقی کی ہو۔ اتنا کم ازکم غیر اغلب نہیں ہے کہ جس جگہ نئے گروہ یا گروہوں سے یہ نظم معاشرت پیدا ہوا ہو اس میں اجتماع وتقسیم کی درمیانی کارروائیاں کتنی ہی کچھ کیوں نہ ہوئی ہوں گروہ ایک ایسے درجے سے ہوکر گزرا تھا جس میں عورتوں کے وسیلے سے قرابت تسلیم کی جاتی تھی، اور اگر ایسا تھا تو بدرجۂ اقل یہ بھی غیر اغلب نہیں ہے کہ جب یہ نظم اس درجے پر پہنچا جس میں خاندانی اتحاد کے رابطے کے طور پر باپ

کی جانب سے قرابت رائج ہوئی تو اس وقت وہ نظم متعدد خاندانوں سے مرکب تھا جو قطعی طور پر اپنا سلسلۂ نسب کسی ایک ہی مرد مورث اعلیٰ سے نہیں ملا سکتے تھے، اگرچہ مردوں کے ذریعے سے قرابت کے جدید الغلبہ خیال کے اثر کی وجہ سے یقین کرنے لگتے تھے کہ ان کا کوئی ایسا مورث اعلیٰ رہا ہوگا۔ عرب قبائل میں اس قسم کے تغیر کی شہادت رابرٹسن اسمتھ نے اپنی کتاب "قدیمی عرب میں قرابتداری و مناکحت" Kinship and marriage in Early Arabia میں دی ہے۔

یہاں مجھے یہ خیال ظاہر کر دینا ہے کہ مین نے اپنی ایک بعد کی کتاب[۱] میں، میک لینن کی شہادت کے ایک بڑے حصے کی اہمیت کو قبول کر لیا تھا، اور اپنے نظریئے کو اس شہادت کا لحاظ کرتے ہوئے دوبارہ بیان کیا تھا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ "یہ امر ظن غالب سے زیادہ ہے کہ روئے زمین پر بنی نوع انسان کے ظہور پذیر ہونے کے بعد سے، نسل انسانی کے بیشمار حصوں کو مختلف اوقات میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کی شدید قلت سے تکلیف اٹھانا پڑی ہے۔" اس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اس سے لوگ اس جانب جائیں گے کہ دونوں جنسوں کے اس تناسب کی مناسبت سے ادارات قائم کریں" اور "اس قسم کے ادارات کا میلان یہ ہوگا کہ مردوں اور عورتوں کو ایسے گروہوں میں ترتیب دیا جائے جو ان گروہوں سے مختلف ہوں جن میں نظریۂ ابوت کے بموجب ابتداً ان کا اتحاد ہوا تھا" اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ "یہ کہنا غیر ممکن ہوگا کہ بنی نوع انسان کے کس حصے کو دونوں جنسوں کے اس عدم تناسب سے نقصان پہنچا ہے، لیکن پھر بھی وہ اس پر مصر ہے کہ نظریۂ ابوت سے بنی نوع انسان کی قدیمی گروہ بندی کا اظہار ہوتا ہے" اور میک لینن نے جس عجیب واقعے کی طرف توجہ دلائی ہے اس سے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک عارضی خلاف معمول امر تھا جو ابتدائی گروہ بندی اور بعد کے اس ابوی خاندان کے درمیان حائل ہوگیا تھا جس کا پتہ قدیم الترک قانون سے چلتا ہے، اور اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ میک لینن کے اصول کو ڈارون کی سند کی مدد سے پلٹ دیا ہے مگر ڈارون نے اس مسئلے کی جانب علم الحیوان کی نظر سے توجہ کی ہے[۲]۔

---

[۱] "قدیمی قانون و رواج" Early Law and custom باب ہفتم صفحات ۲۱۴-۲۱۵۔ جو لوگ اس موجودہ تحقیقات پر کچھ بھی توجہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اس باب کو پڑھنا چاہیئے معلوم ہوتا ہے کہ مین پر تنقید کرتے وقت اسپنسر کو اس باب سے آگاہی نہ تھی۔

[۲] "ہبوط انسان" (Descent of man) حصۂ سوم باب بستم۔

بندروں کے جو عادات ہیں ہمیں معلوم ہیں، ڈارون نے انھیں سے یہ استدلال کیا ہے کہ قدیم انسان کی نسبت جبکہ وہ بندروں سے قریب ترین درجہ میں تھا، یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اس قسم کے تعلقات عقدر کھتا تھا جو ان تعلقات کی بہ نسبت جنکی جانب میک لینن نے توجہ دلائی ہے ابوی خاندان سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا یعنی ہر شخص کی ایک بیوی ہوتی تھی اور اگر وہ قوی ہوتا تھا تو متعدد بیویاں ہوتی تھیں جنھیں وہ تمام دوسرے لوگوں سے رقیبانہ طور پر محفوظ رکھتا تھا اور اس اثر کے تحت میں زندگی بسر کرتا تھا جو تمام شعور میں سب سے زیادہ قوی اور تمام ادنیٰ حیوانات میں مشترک ہے، یعنی بچوں کی محبت۔ یہاں تک وجوہ موجود ہیں کہ بعض صورتوں میں مابعد ہیمونیت کی اس قدیم ترین حالت میں مستقلاً ایک بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو اس کی جانب منسوب کیا جائے۔ ڈارون کے استدلال کی قوت سے انکار کرنے کے بغیر ہیری رائے میں، ہم یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ میک لینن اور ڈارون نے مین کو وحشیوں کی زندگی کے مقابلے کی جانب جو رہبری کی اس کے اثر سے مین کے نظریۂ ابوت کی آخری شکل میں معتد بہ تغیر ہو گیا ہے۔ جیسا کہ یاد ہوگا کتاب "قانون قدیم" میں ابوی خاندان کی ایک اصلی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ بزرگ خاندان کے سب سے زیادہ معمر مرد کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے بالغ لڑکوں پر اسی طرح مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا تھا جس طرح کہ وہ گھر کی عورتوں اور چھوٹے بچوں پر، حکومت کرتا تھا اور اس تصور سے "ان غیر متمدن لوگوں پر اپنے والدین کی جو خاموش اطاعت لازم آتی ہے اس کا ذکر ایک" اولین واقعہ "کے طور پر کیا گیا ہے[۱]۔ گرین نے اپنی کتاب "قدیم قانون ورواج" میں جس طرح کے ابوی خاندان کو دکھایا ہے اس میں اس اولین واقعہ کا تصور دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس خاندان کے متعلق وہ (صفحہ ۱۹۸) کہتا ہے کہ "نیم وحشیوں سے بڑھا ہوا بلکہ انتہا درجے کا وحشی تھا" (صفحہ ۲۰۹) "جنسی رقابت" "قوت کے زور سے پوری ہوتی تھی، اور یہی وصف اس کی تعریف کا کام دے سکتا ہے" "زبردست شخص کی قوت، اس کی تکوین کی وجہ خاص تھی" (صفحہ ۲۱۵) لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کے گروہ میں جس کی بنا جنسی رقابت اور جسمانی قوت پر ہو، کونسی وجہ ہوسکتی تھی کہ ایک جوان بیٹا جو پوری جوانی کے زور میں ہو، باپ کے اقتدار کامل کا مطیع رہے۔ مین یہ خیال ظاہر

[۱] قانون قدیم (Ancient Law) باب پنجم صفحہ ۱۳۶ -

کرتا ہے کہ باپ کی دانائی کے احترام کی وجہ سے یہ ہوتا تھا کہ "سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ عاقل مرد حکمرانی کرتا تھا" (صفحہ ۱۹۸) لیکن اگرچہ نیم وحشی اس دانائی کا جو علی العموم عمر کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے، اس سے زیادہ احترام کرتے ہیں جتنا تمدن کے زیادہ ترقی یافتہ مدارج کے لوگ کرتے ہیں تاہم اگر فرض کیا جائے کہ نہایت قوی حیوانی خواہشوں کے ہوتے ہوئے یہ احترام لوگوں کو اقتدار مطلق کا تابع بنا دے گا تو یہ خیال اس احساس کی جانب اس سے کچھ زیادہ منسوب کر دیتا ہے جس کی تائید شہادت سے ہوتی ہے اور مجھے بندروں اور دوسرے جانوروں کی نسبت جو کچھ معلومات ہیں ان سے اس کی مطلق تائید نہیں ہوتی۔ (مثلاً) مجھے یہ معلوم ہے کہ "گوریلے (نسناس) کے ایک جھنڈ میں ایک ہی نر دکھائی دیتا ہے، جب نر بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اقتدار کے لئے جنگ ہوتی ہے اور جو سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے وہ باقی تمام نروں کو مار کر یا بھگا کر خود اس غول کا سردار بن جاتا ہے"۔ یہ تمام باتیں بہت غیر پدرانہ معلوم ہوتی ہیں مختصر یہ کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عفریتی خاندان جس میں ایک مرد سرگروہ اپنی بیویوں اور کم عمر بچوں پر حکومت کرتا ہو، یہی انسانی نظم معاشرت کی وہ ابتدائی اور قدیم حالت تھی جس کا تصور ہم زمانۂ سلف میں کر سکتے ہیں، تو میں اس خیال کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ "قدیم قانون" کا بیان کردہ ابوی خاندان قدامت کے اعتبار سے اس درجہ پر تھا اور نہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ دیکھتا کہ اس قسم کا خاندان "عفریتی خاندان" سے تنزل کر کے فوراً ہی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ دونوں ہر ایک اس خصوصیت کے اعتبار سے جو ارتقائے سلطنت کے متعلق ہماری موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے سب سے اہم ہے۔ غیر متشابہ ہیں، تحقیقات ہمیں یہ کرنا ہے کہ کس وجہ سے بالغ اشخاص ایک شخص واحد کی اطاعت کرتے ہیں۔

۶۔ پس اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسائل متذکرۂ بالا میں سے اختلاف آرا کا مرکز تیسرا مسئلہ ہے یعنی سیاسی اقتدار کا تعلق پدری اختیار سے۔ مین کی رائے کے بموجب باپ یا اس کے جانشین کا اختیار قدیمی نظم معاشرت کی ہیئت ترکیبی کے لئے ایک ایسا ضروری و لابدی امر ہے کہ جماعتوں کو باہم وابستہ کرنے کے رابطے کی حیثیت سے قرابتداری کی نسبت یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ قرابتداری اور عام اقتدار کی اطاعت دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ اقتدار اور یک جدی ہونے کا خیال باہم ممزوج ہو گیا ہے[1] اگرچہ یہ دونوں امور کسی

[1]۔ ڈاکٹر ہیوج حسب اقتباس ڈاروِن، "ہبوط انسان" (Descent of man) حصۂ سوم باب بستم

بیچ سے ایک دوسرے کو مغلوب نہیں کرتے۔ چنانچہ سب سے چھوٹے گروہ یعنی خاندان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ آیا جو لوگ اس میں شامل ہیں انھیں زیادہ ممیز طور پر قرابتدار سمجھنا چاہئے یا یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اس شخص کے جو اس قرابت کا منبع تھا غلامانہ یا نیم غلامانہ توابع ہیں پدرانہ اختیار کے ساتھ قرابتداری کا یہ خلط ملط ان وسیع تر گروہوں میں بھی نمایاں ہے جو خاندان کی وسعت سے پیدا ہوتے ہیں بعض صورتوں میں قبیلے کی تعریف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی ایک سردار کے تابع ہوں پس یہ اغلب ہے کہ جہاں کہیں بھی قدیم سرداری مضبوط و مستحکم تھی، وہاں خیالات کا یہ امتزاج پیدا ہوجاتا تھا مگر سردارانہ اقتدار کی اس وسعت کی نسبت یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدیم سیاسی نظمہائے معاشرت کی یہی معمولی حالت تھی، اور اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ کوئی قبیلہ (عفریتی خاندان سے نہیں بلکہ) کسی واقعی پدری خاندان سے ترقی کرکے بنا تھا، تو بھی اس سے یہ نتیجہ نہ نکلے گا کہ اس کے سردار کو اس کا اختیار محض اس وجہ سے حاصل تھا کہ اس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ بہ حیثیت خلف اکبر کے وہ اس خاندان کے باپ کی "نمائندگی" کرتا ہے جس نے بڑھتے بڑھتے قبیلے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ نمائندگی کا یہ تصور مجھے اس سے زیادہ مصنوعی و نازک معلوم ہوتا ہے کہ ارتقاء کے ایسے قدیم زمانہ میں اسے اتنی قطعی قوت حاصل ہوگئی ہو، اور یہ تو یقینی ہے کہ ازمنۂ مابعد کی جن صورتوں کا علم ہمیں تاریخی طور پر حاصل ہے اور جن کی جانب مین نے اشارہ کیا ہے جہاں قرابتداروں کے گروہ کم و بیش ابوی خاندانوں سے ترقی کرکے مشترکہ املاک رکھتے تھے (خواہ یہ املاک خود مختار گروہوں کی حیثیت سے نہ ہو بلکہ کسی وسیع تر سلطنت کے جزو کے طور پر ہو)، وہاں ہم پدری اختیار کا اس قسم کا انتقال نہیں دیکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے اکثر صورتوں میں (مثلاً ہندوؤں کے مشترکہ خاندان میں)، یہ برتاؤ تھا کہ سب سے قدیم سلسلہ کا سب سے زیادہ عمر مرد اگر کامل قوائے دماغی رکھتا ہو تو وہی علی العموم کل معاملات کا سرگروہ بنا دیا جاتا تھا مگر جیسا کہ مین[1] نے قبول کیا ہے وہ محض منتظم ہوتا تھا مگر ان بزرگ نہیں ہوتا تھا اور اگر وہ اپنے فرائض کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا تو اہل خاندان میں سے کوئی زیادہ لائق شخص انتخاب کے ذریعے سے اس کی جگہ مقرر ہو جاتا تھا۔ یہ انتخاب کا بعینہ وہی اصول ہے جو بدرجۂ اقل شاہی خاندان

---

[1] علہ۔ قانون قدیم (Ancient Law) باب پنجم صفحہ ۱۳۶ -

سے حدود کے اندر) موروثی بادشاہ یا سردار اعلیٰ کے تقرر کی نسبت (جہاں اس قسم کے سردار اعلیٰ کا وجود ہو) عام طور پر قبول شدہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض جہاں کہیں ہمارے تصور کے بموجب خاندان کا ادارہ باپ دادا کی حکومت کے تحت میں مستحکم طور پر نظم معاشرت کے اندر قائم ہے وہاں بھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سرداری کے تعین کے لئے شخصی قابلیت کی بنا پر انتخاب کا اصول مردوں کی وراثت کے اصول کے ساتھ ملا ہوا ہے علیٰ ہذا، اس کے ثابت کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ اس قسم کے نظمہائے معاشرت میں جسمانی یا دماغی یا دونوں قسم کا شخصی تفوق سردار کے عہدے کی برقراری کے تعین میں زبردست عنصر تھا چنانچہ، ہومر کے بیان کردہ یونان میں لیرتیس اور پیلیوس نے کبر سنی کے باعث سرداری ترک کردی تھی، اور ہم بوجہ موجہ یہ خیال کرسکتے ہیں کہ اس قسم کی شخصی فوقیت خاصکر فوجی قابلیت بیشمار صورتوں میں نئی سرداری کی اصل وجہ ہوا کرتی تھی۔ ٹیسیٹس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنیوں میں قائد جنگ اپنی بہادری کی وجہ سے منتخب ہوتا تھا، اور ہمیں اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ قدیم جماعتوں میں اکثر یہی صورت رائج تھی اور ایک کامیاب جنگی سردار جنگ کے ختم ہوجانے کے بعد اپنی سرداری قائم رکھتا تھا۔ فوجی شجاعت و جنگی مہارت کے علاوہ اور فوقیتوں پر بھی لحاظ کیا جاتا تھا مثلاً مخصص ربانی عنایت یا دیوتاؤں پر اثر ڈالنے کے ذرائع حاصل ہونے کا خیال، بقول اسپنسر قبیلہ کے دوا بتانے والے شخص کو سرداری تک ترقی کرجانے کا نادر موقع حاصل ہوتا تھا۔ قدیم رومانی تاریخ میں توما کے قصے سے اس قسم کی ترقی کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔

پس من کل الوجوہ، میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ارتقار کی رفتار جس کے ذریعے سے مستقل موروثی بادشاہی قائم ہوئی، اس رفتار میں (جہاں کہیں بھی پر زور دماہرانہ قیادت کی ضرورت خصوصیت سے محسوس ہوئی ہو) قوی ترین شخص کے پسند کرنے کا اصول مختلف اعتبارات سے بیٹے کو باپ کا طبعی جانشین تسلیم کرنے کے میلان سے متحد و متصادم ہوگیا تھا، اور اس میلان کا ان جگھوں میں زیادہ قوی ہونا اغلب تھا، جہاں ذاتی املاک کی وراثت قطعی طور پر اخلاف کو ملتی تھی۔ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ابوی خاندان میں باپ کا اختیار سیاسی اختیار کا اولین نمونہ تھا مگر اس میں شک نہیں کہ خاندان کے ابوی طرز کے مستحکم قیاس سے قبائلی سرداری کے استقرار و استحکام میں بہت بڑی مدد ملی۔

خطبۂ چہارم

خلاصۂ نظریۂ اصل

تقلیب از شاہی ابتدائی

اصل اجتماع سیاسی کے نظریۂ ابوتی کے متعلق مخالف و موافق شہادتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں جن نتائج تک پہونچا ہوں، انھیں میں نے اپنے آخری خطبے میں آپ کے روبرو پیش کر دیا ہے جن کا مجمل سا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ ایک ناقابل انکار اور اہم حقیقت ہے کہ ہمیں جن ہندی جرمانی قوموں سے بالتخصیص بحث و واسطہ ہے، انکی سیاسی جماعتیں جب اپنی تاریخی حیثیت سے پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے گروہوں کی صورت میں منتظم تھیں جن کی بنا حقیقی یا فرضی قرابت پر تھی کم از کم اتنا تو ضرور ہی تھا کہ جماعت کا اصلی عنصر اسی طریقہ پر مرتب و منتظم ہوا تھا، خواہ اس عنصر اصلی کے گرد اور دوسرے عناصر مجتمع ہوکر اسے جس قدر چاہتے بڑھا دیتے۔[۱]

(۲) تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی جماعت کو (مین کی رائے کے موافق) سب سے معمر بزرگ خاندان کی مطلق العنانہ نگرانی میں خاندانوں کا مجموعہ ہونے کے بجائے ایسے عشیرات کا مجموعہ سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا جن میں سے ہر ایک عشیرے میں کئی کئی خاندان شامل ہوں۔ منشا یہ ہے کہ

---

[۱] یہ امر ہمیشہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اگرچہ تمام و اکمل ارتباط کی بنا قرابت ہی پر تھی، اگر اصلی وجہ ارتباط (بالخصوص جنگ کے وقت میں) اتحاد کی ضرورت و آسانی پر اس درجہ مبنی ہوتی تھی کہ اس زمانہ میں اس کا پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ علیٰ ہذا القدیم زمانوں میں جو گروہ اس طرح ممزوج ہوکر ایک ہو جاتے تھے وہ اس امتزاج کے قبل اکثر و بیشتر قرابت دار ہی ہوتے تھے، جیسا کہ روما کے رہنے والوں اور دوسری لاطینی قوموں کے درمیان واقع ہوا، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ بیشمار واقعات ایسے بھی تھے جنمیں اجنبی گروہ جذب کر لئے جاتے تھے۔ مین نے اس پر نظر ڈالی ہے، مگر غالباً اس پر کافی زور نہیں دیا ہے۔

قانون قدیم کی مدد سے جو قدیم ترین صورت حالات ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک عشیرے کے اندر خاندانوں کی جو تقسیمیں ہوا کرتی تھیں ان کی بہ نسبت خود عشائر کی تقسیمیں زیادہ نمایاں ہوتی تھیں۔ جرمنی اور غالباً اطالیہ و یونان میں بھی ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ابتدائی قبیلہ قرابتدار کے گروہوں میں منقسم تھا، جن کی زمینیں زیادہ تر مشترک ہوتی تھیں اور وہ مل کر کاشتکاری کرتے تھے روما اور ایتھنز دونوں جگہ ہمیں عشائر (Gentes) یا گینے (Yeny) کے نام سے اس قسم کے گروہوں کا پتہ چلتا ہے، جنکی بنیاد بالضرور قرابتداری کے تخیل پر قائم تھی اور جو اندرونی طور پر اشتراک عبادت، کسی ایک ہی سردار کی کم و بیش اطاعت، وراثت، املاک کے حقوق باہمی، اور عصبیت، موالنت اور رفع فساد کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ذمہ داریوں کی بنا پر خود سے متحد تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آخری روابط ایک ہی خاندان کے ارکان یا کسی بڑے گروہ کے قریبی رشتہ داروں کے درمیان زیادہ قوی تھے۔ تاہم یہ روابط تمام عشیرے کو وابستہ رکھنے کے لئے پوری طرح موثر تھے، اور مختلف عشائر میں جو حد فاصل تھی ان میں سب سے زیادہ نمایاں خط یہی تھا۔

(۳) لیکن پھر بھی میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ہم عشیرے کی سرداری کی نسبت یہی سمجھیں کہ اس کا ماخذ بالعموم پدرسری یا ابوی خاندان کے بزرگ خاندان کی خانگی نگرانی پر مبنی تھا، اور خاندان پھیل کر عشیرے کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا تو یہ نگرانی سب سے مقدم شاخ اکبر کے سب سے بڑے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھی، کیونکہ میرے نزدیک ہم یہ فرض نہیں کر سکتے ہیں کہ خاندان کی یہ پدرسری یا ابوی صورت ازمنۂ قدیمہ میں ہمیشہ مسلسل قائم رہی تھی۔ چنانچہ میک لینن اور دوسرے افراد نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک ایک عورت کے متعدد شوہر ہونا اور غیر متیقن و عارضی تعلقات ازدواجی کی وجہ سے صرف عورتوں کے وسیلے سے قرابت کے پتہ چلانے کا رواج، یہ دونوں باتیں وسعت کے ساتھ رائج رہ چکی ہیں اور یہ صورت مختلف نسلوں اور مختلف ملکوں میں پیش آتی رہی ہے، جس سے ہندی جرمانی قومیں بھی خارج نہیں ہیں۔ حیوانات کی تشبیہوں سے جس قسم کے ابتدائی خاندان کا نقشہ پیش نظر ہو سکتا ہے اس سے اس توجیہ کو کچھ مدد نہیں ملتی، کیونکہ حیوانات کے خاندان کی بنا شہوانی رقابت اور جسمانی طاقت پر ہے، ان میں سب سے زوردار نر اپنی ماداؤں اور ان کے بچوں پر حکومت کرتا اور ان کی نگرانی رکھتا ہے، لیکن عشیرۂ انسانی کے انتظام کے معاملے میں خاص طور پر قابل غور یہ ہے کہ کیوں بہت سے بالغ انسان کسی ایسے انسان کی

اطاعت کرتے ہیں جو جسمانی طور پر ان سے زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ جن صورتوں میں ابوتی خاندان قائم ہوگئے، اور پھر پھیل کر عشیرے بن گئے ہوں ان صورتوں میں بھی بیٹے کے باپ کا نمائندہ ہونے کا گونہ مصنوعی و نازک خیال اس امر کی تشریح کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتا کہ خاندان جب پھیل کر ایک گروہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں موروثی سرداری کیوں قائم ہو جاتی ہے، خاصکر اس قسم کے ان گروہوں میں جنھیں ہم زیادہ ترقی یافتہ سلطنتوں کے اجزا کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہاں تو بالیقین سرگروہ سلطنت کی طرف نیم پدرانہ اختیارات نسلاً بعد نسل منتقل نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک منتظم کار ہوتا ہے۔ بزرگ خاندان نہیں ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ عشیرے کو جس مفہوم میں میں نے لیا ہے، اس میں پدر سری خاندان کا قیام منصب سرداری کو موروثی بنا دینا بھی ضرور بالضرور ایک اہم عنصر ہوتا تھا۔ سردار کی کوشش یہ ہوتی ہوگی کہ اپنی جائداد کی طرح اپنی حیثیت کو بھی اپنے اخلاف کی طرف منتقل کر دے، اور اس کا یہ فعل دوسروں کی نظر میں ایک طبعی امر معلوم ہوتا ہوگا۔ اگر اس کا بیٹا اس کام کے لئے موزوں ہوتا ہوگا تو سب لوگ اس پر رضامند ہو جاتے ہونگے اور منصب سرداری خاندان کے اندر انتخابی ہوتا ہوگا، جیسا کہ ایک گونہ آیرستانی قبائل کا حال ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ سردار کا اختیار "اقتدار پدری" کا کامل تسلسل تھا، اور اگرچہ ایسا خیال کرنا قرین عقل ہے کہ عشیرے کا سردار تمام مشترکہ املاک کے لئے منتظم کی حیثیت رکھتا ہو، مگر اس کے ساتھ ہی اس خیال کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ اسے ان املاک پر یا عشیرے کے دوسرے ارکان پر اختیار مطلق بھی حاصل ہوتا ہو۔

اگر ہم اس امر پر زیادہ تعمق نظر سے غور کریں کہ جن جن قوموں کے معاشری ارتقا کے قدیم ترین مدارج پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، ان قوموں میں سردار یا بادشاہ کے فرائض اس زمانہ میں کیا رہے ہوں گے تو میری دانست میں مذکورۂ بالا رائے تسلیم کر لی جائے گی۔ جائداد مشترکہ کے انتظام اور الوہیت کے ساتھ فرضی تعلق کو علحدہ کر دینے کے بعد یہ فرائض زیادہ تر حربی و عدالتی تھے۔ سردار کو قانون نہیں بنانا پڑتا تھا۔ کیونکہ ارتقا کی اس منزل میں قانون صرف رواج کی صورت میں ہوتا تھا جس کے بدلنے کا کسی فرد واحد یا کسی جماعت افراد کو کوئی قطعی اختیار نہیں ہوتا تھا، اور ازمنہ مابعد میں جن امور کو اندرونی عاملانہ فرائض کی حیثیت سے ممیز کیا جاتا ہے انھیں ارتقائے سیاسی کے اس ابتدائی زمانہ میں نہایت ہی معمولی حالت میں فرض کرنا پڑتا ہے عشیرہ یا قبیلے کو دوران جنگ میں کسی قائد کی اور دوران امن میں کسی عادل و منصف کی ضرورت

ہوا کرتی تھی، لیکن جیسا کہ مین[1] کا دعویٰ ہے قدیم ترین قانون اور رسوم قانونی کے جو آثار باقی رہ گئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ منصف کا معمولی کام (پنچایتی نوعیت کا ہوتا تھا۔ اسے خاندانوں کے ان تنازعات کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا جنھیں وہ خود اپنی مرضی سے اس کے سامنے پیش کرتے تھے اور خانگی خونریز فسادات کا صلح و آشتی کے ساتھ طے کرا دینا اسی کا کام ہوتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ حربی و عدالتی فرائض کے لئے بہت ہی مختلف اوصاف کی ضرورت ہے۔ عام طور پر کوئی سن رسیدہ شخص جو عشیرے کے رسم و رواج کا ماہر ہو بہترین منصف ثابت ہوگا، اگر جنگ کی رہبری کے لئے بھی وہی سب سے زیادہ موزوں شخص نہ ہوگا۔ اس لئے سرداری کا انحصار جہاں تک خوبی کار پر ہو ہمیں اسی قدر یہ توقع رکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں فرائض اکثر ایک دوسرے سے الگ ہو جائینگے اور جیسا کہ مسٹر ٹائلر[2] کہتے ہیں واقعاً بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ وحشی ملکوں میں مجلسی سردار اور جنگی سردار ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ نیزہ و سنان کی قوت جب ایک مرتبہ قائم ہو جاتی ہے تو پھر وہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

۲۔ ان مفروضوں کو چھوڑ کر ہمیں اب اس "ابتدائی نظم حکومت" کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جسے میں اپنے مقررہ شروط و قیود کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ وہ حکومت کے اس عام طرز کے طور پر قبول کر لی جائے گی جس کا تعلق یونانیوں، رومانیوں اور جرمانیوں کے اس زمانہ کے قبائلی حالت سے ہے جسے معلومات تاریخی میں بہت ہی ابتدائی منزل قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ ان وسیع فرقوں کو مرعی رکھا جائے جو اختلاف ازمنہ و امکنہ کے باعث پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس طرح ارتقائے سیاسیہ کے ہر ایک چشمہ کا عقب کی طرف پتہ لگاتے چلے جائینگے تو آخر ایک حد پر پہنچکر ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ سب چشمے ایک دوسرے سے بہت ہی ملے جلے واقع ہیں۔ پس اب ہمیں ہر ایک چشمے کے علحدہ علحدہ بہاؤ کی طرف چلنا چاہیئے خطبہ موجودہ اور آیندہ کے پانچ خطبوں میں ہمیں زیادہ تر یونانی نظم حکومت کے ارتقا سے واسطہ پڑے گا۔ مگر اس پر بحث شروع کرنے کے قبل میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ازمنہ جدیدہ کی سلطنتوں کی تاریخ کے بالمقابل یونان کے ارتقائے سیاسیہ کے ہیولوں پر غور کرتے ہی ایک خیالی نفع اور ایک

---

[1] قانون قدیم۔ باب دہم

[2]۔ ملاحظہ ہو ٹائلر کی تصنیف علم الانسان باب شانزدہم۔ صفحہ ۴۳۱

حقیقی نقصان پیش آتا ہے۔ نفع تو یہ ہے کہ عمومی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے مثالیں کثرت سے موجود ہیں، البتہ واقفیت درکار ہے، لیکن یہاں یہ یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں صرف یونان خاص ہی کا خیال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ تمدن یونانی کے مرحلہ ابتدائی کے زمانہ میں یونانی تارکان وطن بحر ایجین کے جزیروں میں بھر گئے تھے، جن میں کریٹ کا سا بڑا جزیرہ بھی شامل تھا اور ایشیائے کوچک کے مغربی سواحل پر بھی پھیل گئے تھے۔ ان مقامات میں انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آزاد جماعتیں قائم کر لی تھیں جو رفتار تمدن کے ساتھ ساتھ شہری سلطنتیں بن گئیں۔ زمانہ مابعد میں یونانی نو آبادیاں نظم حکومت کے اس طرز کو اور بھی دور دراز مقامات تک لیگئیں، انھوں نے اسے بحر ایڈریاٹک کے سواحل تک پہنچایا، اور جنوبی اطالیہ کو "یونان کبیر" بنا دیا، سسلی کے بہت بڑے حصہ پر پھیل گئے۔ شمال میں کریمیہ تک پہنچ گئے، مشرق میں بحر یوکسین (بحیرۂ اسود) کے سواحل کو گھیر لیا۔ جنوب میں لبیہ (طرابلس) میں داخل ہو گئے۔ انتہا یہ ہے کہ مغرب میں مارسیلز تک جا پہنچے۔ اس سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آزاد شہری سلطنتیں سینکڑوں کی تعداد میں وجود پذیر ہو گئی تھیں، اور ان کے نظمہائے حکومت کا باہمی مقابلہ، عام نتیجہ اخذ کرنے کے لئے زرخیز زمین مہیا کر دیتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر سلطنتوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت ہی خفیف و جزوی قسم کے ہیں۔ جن دساتیر کا ہمیں کسی قدر کامل علم حاصل ہے وہ صرف اسپارٹا اور ایتھنز کے دساتیر ہیں۔ دوسری سلطنتوں کے متعلق میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم غالباً ان کے نہایت ہی اہم آئینی تغیرات سے آگاہ ہیں، لیکن اکثر حالتوں میں ہم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ یونانی شہری سلطنتوں کی حکومت کی صورتوں میں جو تغیرات ہوئے ان کی بابت قابل اطمینان طور پر صرف چند ہی وسیع تعمیمات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسپارٹا و ایتھنز کو نمونہ قرار دے کر ہم کہاں تک ان سے عام نتائج اخذ کر سکتے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ ہم قدیم تاریخ کے متعلق کسی حد تک ایسا کر سکتے ہیں کہ اسپارٹا کو ایک ایسی ملت کا نمونہ قرار دیں جس میں ایک فاتح قبیلہ ایک مفتوح ملت پر بہمہ وجوہ حاوی ہو گیا ہو، اور فاتح ایک ایسی حکمران جماعت بن گئے ہوں جس نے تمام سیاسی حقوق کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہو اور دوسری طرف اٹیکا کو ایک ایسی ملت کا نمونہ سمجھیں جو قبائلی حالت سے گزر کر شہری سلطنت کی صورت اختیار کرنے وقت "مجتمع ہو گئی ہو" اور فتح کے کسی اثر کا اس میں پتہ نہ چلتا ہو۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایتھنز کو ایک ایسا نمونہ سمجھنا چاہیئے جس سے ایک بڑی حد تک

پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کی یونانی عمومیت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ ایک حد تک طبعی نقل و تقلید کے اثر سے ہوا ہے۔ لیکن خود اثینہ نتیجہ تھا اس کا کہ چھٹی صدی کے اواخر (یعنی ۵۱۰ء) میں خود سر حکمرانوں کے نکال دینے اور خاصکر پانچویں صدی کے ربع اول میں ایرانی حملوں کے کامیابی کے ساتھ روک دینے کے بعد ایتھنز کی حیثیت و منزلت میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ بحری شہنشاہی کی وجہ سے ایتھنز کو ایک گونہ دار الصدر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس نے اسے دوسرے شہروں سے بہت کچھ ممیز کر دیا تھا۔ ایتھنز کی شان و شوکت کی بڑی وجہ اس کی یہی شہنشاہی حیثیت تھی۔ اور اس کی سیاسی زندگی کے کمال کا یہ زور اس بنا پر تھا کہ اسے اپنی شہنشاہی پر حکمرانی کا کام انجام دینا پڑتا تھا، اور پھر دوسری طرف مالی طور پر اسے اپنے محکوم شہروں کی امداد سے تقویت پہنچتی تھی، مگر جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں اسے پیش نظر رکھتے ہوئے بھی، ہر طرح پر اغلب یہی ہے کہ پانچویں اور چوتھی صدیوں میں جن یونانی سلطنتوں نے عمومیت کی طرف قدم بڑھائے ان پر بہت قوی اثر ایتھنز کی مثال کا تھا اور ان کا میلان یہی تھا کہ ایتھنز کی نقل کی جائے، لیکن اسی طرح یہ فرض کر لینا بڑی غلطی ہوگی کہ اسپارٹا یونانی عدیدیات کا نمونہ تھا۔ اسپارٹا کے دستور کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ اپنی نظیر تھا اور اگرچہ اہل اسپارٹا دوسرے مقامات میں عمومیت کے مقابلہ میں عدیدیات کی پشت پناہی کرتے تھے، مگر وہ ان دساتیر سلطنت کی حمایت نہیں کرتے تھے جو خود انہیں کے دستور سلطنت کے ہم مثل تھے۔

۳۔ اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ جن نسلوں کے متعلق ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، ان کے ابتدائی مدارج ترقی میں قبیلے کی اعلیٰ سرداری یعنی بادشاہی کی جانب کس طرح قدم بڑھے۔ چونکہ قدیم نظم سلطنت میں فرائض حکومت کی سہ گانہ تقسیم بادشاہ، (یعنی سردار اعلیٰ، سرداران ماتحت اور مجلس احرار کے مابین ہوا کرتی تھی، اس لئے اس سہ گانہ تقسیم کی وجہ سے یہ خیال کرنا ایک طبعی امر ہے کہ حکومت کی وہ تین قسمیں جنہیں پانچویں اور چوتھی صدی کے اہل یونان عام طور پر بادشاہی، عدیدی یا اعیانی اور عمومی حکومتوں کے نام سے ممیز کرتے تھے، وہ مختلف اوقات میں اپنے عناصر میں سے کسی ایک عنصر کے غالب ہو جانے سے ظہور پذیر ہوتی تھیں، اور یہ قیاس بھی طبعی ہے کہ ان کا غلبہ یکے بعد دیگرے، واحد، متعدد اور اکثر کی ترتیب میں ہوا کرتا تھا۔ بادشاہی جب آزاد ہو جاتی تھی تو اس کے خلاف تحریک پیدا ہو جاتی تھی

جس سے اختیار سرداران ماتحت میں سے امرا کے ہاتھ میں آجاتا تھا اور جب اپنی باری میں چند اشخاص کی یہ حکومت بھی مردم آزاری پر اتر آتی تھی تو اسی طرح متغیر ہوکر حکومت میں زیادہ عمومیت پیدا ہوجاتی تھی۔

دوسری صدی قبل مسیح کے مورخ پولی بیوس نے دساتیر سلطنت کی طبعی ترتیب کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ درحقیقت یہی ہے پولی بیوس نے یونان پر رومانیوں کے تسلط کو قائم ہوتے دیکھا تھا اور اس وجہ سے ان یونانی مصنفوں کی طرح جنھیں آزاد یونان سے شخصی دلچسپی تھی اس کی نگاہیں بالتخصیص روما کی طرف لگی ہوئی تھیں روما نے (۱۴۶ ق م میں) یونان کو جب پہلی مرتبہ زیر کیا ہے، اس واقعہ کو اس نے بچشم خود دیکھا تھا اور اس سے قبل بحالت جلاوطنی وہ سترہ برس کا زمانہ اطالیہ میں بسر کرچکا تھا، اس لئے ارسطو کے برعکس، جس کی رائے کا ذکر میں بعد کو کرونگا، پولی بیوس نے نظم حکومت کے ارتقا کے متعلق جو عام نتیجے اخذ کئے ہیں وہ روما کے اس غلبے کے زمانے میں لامحالہ روما و یونان دونوں کے تجربے کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی تعمیم کے مطابق، نظم حکومت کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ طبعی طور پر مدارج ذیل سے گزرتا ہے۔ شاہی میں جب خرابیاں رونما ہوتی ہیں تو وہ اسے خودسری کے غار میں گراتی ہے۔ پھر اس خودسر حکمران کی عیش پرستی اور بے حجابانہ بداطواری اسے بدنام و مبغوض بنادیتی ہے اور اعیانی حکومت قائم ہوجاتی ہے۔ پھر جب یہ حکمران جماعت مال و دولت کی طمع اور بدمستی و عیش پرستی میں غرق ہوجاتی اور دونوں صورتوں میں ظلم و ستم پر اتر آتی ہے تو یہ اعیانی حکومت اپنی باری میں عدیدیت کی ذلیل سطح پر آجاتی ہے، اور عوام میں اس جور و ستم کے خلاف مقاومت و انتقام کا جوش پیدا ہوجاتا ہے اور اس سے عمومی سلطنت قائم ہوجاتی ہے، پھر جب عوام بھی اپنی باری میں سرمست و بے قید ہوجاتے ہیں تو عمومیت، انبوہ عامیت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر کوئی بادشاہ قوم پر مسلط ہوجاتا ہے اور وہی دور پھر شروع ہوتا ہے۔

ابتدائی مراحل اور خاصکر جائز بادشاہ اور اعیانیت کے درمیانی زمانے میں مطلق العنان بادشاہ کے غلبہ کی بابت یہ خاکہ روما کی تاریخ سے قطعی مطابقت رکھتا ہے، اور پولی بیوس نے بھی صاف لفظوں میں اسے ظاہر کیا ہے گو روایات میں ہر طرح کا عدم تیقن ہے، پھر بھی ہمیں صاف یہ نظر آسکتا ہے کہ روما میں زمانہ مابعد کی بادشاہی سابق بادشاہی کی بہ نسبت زیادہ جابر اور زیادہ مردم آزار تھی، اور بادشاہوں سے جب ایک مرتبہ گلوخلاصی حاصل ہوگئی تو

پھر وہ واپس نہیں آئے۔ جس شدت وغضب کے ساتھ بادشاہی کا خاتمہ ہوا تھا اس کی وجہ سے عوام کے دلوں میں بغض ونفرت کی جو یاد قائم ہوگئی تھی اسے ان میجسٹریٹوں نے جو بادشاہوں کے بعد حکمران رہے تھے کامیابی کے ساتھ برقرار رکھا۔ بقول موم سن رومانی عوام پر "بادشاہ" کا لفظ وہی اثر دکھاتا تھا جو پاپائیت کے لفظ کا انگریزی عوام پر پڑتا ہے سلطنت روما جبتک شہری سلطنت رہی، بادشاہی کا کہیں ذکر بھی سننے میں نہیں آتا تھا۔ روما جب بڑھ کر ایک ملکی سلطنت بن گیا اور ایک شہنشاہی اس کے تابع ہوگئی اس وقت بادشاہی پھر قائم ہوئی کیونکہ اس جثہ عظیم کو باہم مربوط رکھنے کے لئے بظاہر ایک ایسے ہی کارکن کا ہونا لازمی معلوم ہوتا تھا۔

اسی قسم کے ایک دو شدید ردوبدل کا ذکر ہم یونان میں بھی سنتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ انہیں میں سے ایک واقعہ کا پولی بیوس پر خاص اثر پڑا اور غالباً روما کے واقعات کے ساتھ ملکر یہی اس کا باعث ہوا کہ اس نے مذکورۂ بالا تعمیم قائم کی۔ یہ اکائیہ کی ایک روایت ہے۔ اکائیہ شمال پیلوپونیز میں ملک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو یونان کی شہری سلطنتوں کے درخشاں دور میں بہت ہی گمنام سا تھا، لیکن بعد کو تیسری صدی قبل مسیح میں، اکائیائی لیگ کے عنصر اولین کی حیثیت سے بہت ہی اہم بن گیا ہم یونانی تاریخ کے اوائل میں اہل اکائیہ کا لفظ ہومر کی زبان سے عام اہل یونان کے لئے استعمال ہونا سنتے ہیں، اور آخر زمانہ میں عہدنامہ جدید کے اندر اکائیہ کا لفظ دیکھتے ہیں، مگر درمیانی زمانہ میں ان کا مذکور بہت ہی کم سننے میں آتا ہے۔ بہر حال پولی بیوس[1] یہ کہتا ہے کہ اکائیہ میں بادشاہی کا خاتمہ اس وجہ سے ہوا کہ لوگ آخری بادشاہ کے بیٹوں سے ناراض ہوگئے تھے کیونکہ وہ قانون کے مطابق نہیں بلکہ خودسری کے ساتھ حکومت کرنے لگے تھے، اور اس لئے لوگوں نے حکومت کو "عمومیت" میں بدل دیا۔ اس بیان سے اس عام قاعدہ کے ظاہری استثنا پر کیا اہم اثر پڑتا ہے کہ بادشاہی کے بعد اعیانی حکومت قائم ہوتی ہے اس پر میں ابھی آگے چلکر گفتگو کرونگا۔ اس وقت میں اس کا ذکر صرف اس غرض سے کرتا ہوں کہ شاہی حکومت کی ظالمانہ جبر وتعدی کے انقلابی طور پر بدل جانے کی یہ ایک مثال ہے۔

---

[1] تاریخ پولی بیوس جلد دوم ۴۱۔

اسی قسم کے رد و بدل کی دو ایک اور مثالیں بھی سننے میں آتی ہیں[ع۱] لیکن اگرچہ اپنی نامکمل واقفیت کی وجہ سے ہم تیقن کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، تاہم میرا خیال ہے کہ ان مثالوں کو فی الجملہ مستثنیات سے سمجھنا چاہیئے۔ ایتھنز، تھیبس[ع۲] اور ارگوس[ع۳] میں شاہی طاقت کا انتزاع بالیقین بامن طریق پر بیان کیا جاتا ہے، اور میرے خیال میں ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ تغیر کم و بیش پر امن ہی تھا یا کم از کم یہ کہ عدیدیت میں بدل جانے کے بعد بھی حکومت شاہی خاندان ہی کے اندر رہی۔ وہاں مطلق العنانی کے خلاف یہ تغیر جبر و زیادتی کے ساتھ نہیں ہوا تھا اس کی متعدد مثالیں ہمیں معلوم ہیں۔ کورنتھ میں بکیائی خاندان، ایفی سوس اور ایریتھرائے (واقع ایشیائے کوچک) میں بازیلیائی خاندان، متی لنہ (واقع لسبوس میں) ہنتھی لیائی خاندان اور لاریسہ (واقع تھسلی میں) الیوبائی خاندان کی مشہور عدیدات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ان تمام صورتوں میں جب مدت دراز کی شاہی کا خاتمہ ہوا ہے تو حکومت کے اہم عہدے بدستور شاہی خاندان ہی کے اندر محدود رہے۔[ع۴] اس کا مقابلہ روما سے خاندان ٹارکیوئن کے اخراج کے ساتھ کیجئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ دونوں میں جو فرق ہے اس کے اعتبار سے اول الذکر کو شاہی کے عدیدیت میں بدل جانے کی بامن صورت کہنا چاہیئے۔

پس میرا خیال یہ ہے کہ ہم ان شواہد سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یونان میں شاہی کا عدیدیت میں بدل جانا اکثر تدریجاً واقع ہوتا تھا۔ اور اس میں انقلابی زیادتیوں سے کوئی بڑا صدمہ نہیں پہنچتا تھا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یونانی نظم سیاسی کا جو پہلا ہی تذکرہ سننے میں آتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی طرز کی بادشاہی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر استحقاق خاص کی صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ (ابتدائی طرز کی بادشاہی میں بادشاہ کے فرائض قانون و رواج سے محدود تھے

ع۱۔ ساموس، پلوٹارک، باب ۵، شاید مگارا، پوسانیاس جلد اول باب ۳۶۳، اور آرکیڈیا، پوسانیاس ہشتم باب پنجم ۱۲ (اگرچہ ارکیڈیا کے ان بادشاہوں کے اختیار کی وسعت و نوعیت بہت ہی مشکوک ہے۔

ع۲۔ پوسانیاس جلد نہم باب پنجم ۱۶۔

ع۳۔ پوسانیاس جلد دوم باب نوزدہم۔

ع۴۔ شاہی خاندان کے لفظ کو وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ دو سو سے زائد لوگوں کا ایک وسیع خاندان۔

اور روا جا مجلس خاص اور جمعیت بھی ان فرائض میں شریک تھیں) ہومر کے تحریرات میں جب ہم "ایلیاڈ" سے گزر کر "اوڈیسی" پر پہنچتے ہیں تو یہ قدیمی بادشاہی زوال پذیر نظر آتی ہے، اور جیساکہ میں لکھ چکا ہوں اس حد پر پہنچکر بادشاہ کے لئے "بازی لیوس" کا لقب بھی استعمال ہوتا ہے، حالانکہ یہی لفظ ایلیاڈ میں ہمیشہ بزرگ قوم یا اس کے بیٹوں کے لئے استعمال ہوا ہے[۱۵] مگر جب ہم اوڈیسی تک پہنچتے ہیں تو بازی لیوس میں بادشاہ کے بجائے سردار کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت نظم کے ابتدا ہی میں ظاہر ہو گئی ہے، اور اس فقرہ کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ جہاں تیلیماکوس نے یہ کہا ہے کہ اتھاکا کے اکائیوں کے بہت سے سردار "بازی لیوس" ہیں، حالانکہ (جیساکہ بعد میں ظاہر ہوا) اس جزیرے میں صرف ایک ہی شہر تھا اور اس کے کل باشندے ایک ہی خاندان سے تھے اور ان کی ایک ہی مجلس ملکی تھی۔ اس کے بعد پھر جب اوڈیسیوس اپنے سفر میں تھکے ریا کے پر فضا ساحل پر جا نکلا، جہاں معزز فینیقی رہتے تھے (اور جن کی حالت انتہائی مرفہ الحالی و خوش باشی کی بیان کی گئی ہے) تو ہم ان کے سردار اعلیٰ الکی نوائس کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں بارہ ذی شان سردار ہیں جو اس قوم پر حکومت کرتے ہیں، اور میں خود تیرھواں ہوں[۱۶] اس سے یہ ظاہر ہے کہ بادشاہی عدیدیت کی طرف تبدیل ہو رہی تھی[۱۷]

اگرچہ روما کی بہ نسبت یونان میں بہت ہی کم کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے جس سے یہ واضح ہو کہ عدیدیت کا وقوع پذیر ہونا شاہی طاقت کی ظالمانہ توسیع کے بالمقابل تحریک کا نتیجہ تھا تاہم یونانی نظم حکومت کے ارتقا میں شاہی مطلق العنانی کو اہم منزلت حاصل تھی۔ لیکن وہ عدیدیت

---

[۱۵] - خطبہ دوم صفحہ ا

[۱۶] - "اوڈیسی" جلد ہشتم ۳۹۱ - یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ فینیقیہ میں بازی لیوس ماتحت بادشاہ تھے جو جدا جدا اضلاع پر حکومت کرتے تھے اور ان میں کسی قدر اتحاد باہمی کی صورت وقوع پذیر ہو گئی تھی۔

[۱۷] - اس تغیر کی صورتیں حسب ذیل معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) کبھی تو ایک ہی سردار بالعموم ایک برس کیلئے منتخب ہوتا تھا، اور اس کے فرائض خاصکر مذہبی فرائض گھٹا دئے جاتے تھے۔ (مقابلہ کیجئے ارسطو کی "سیاسیات" سوم ۸۰۹

(ب) کبھی سرداروں کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ مقابلہ کیجئے کائیم (پلوٹارک صفحہ ۲۶) اس (کا یر ۲۵۳ - مٹلین (کا ئر ۲۲۸) جیساکہ گلبرٹ لکھتا ہے میرا یہ خیال نہیں ہے کہ اس میں سرداری پجاری کے فرائض تک محدود تھی۔

کے بعد واقع ہوئی ہے نہ کہ اس کے قبل اور جتنی صورتیں ہمیں فی الواقع معلوم ہیں ان سب میں یہ شاہی طریق ایک بے قاعدہ وغیر آئینی مطلق العنانی ہی کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس بادشاہی کو یونانی لفظ تیرانس (خودسری) سے ہی تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی نوعیت اس کے اسباب، اور اس کے ارتقا پر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بعد کے ایک خطبہ میں بحث کروں گا۔ سردست صرف اس خیال سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یونانی اور رومانی دساتیر کے ارتقا میں جو نہایت اہم فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔ مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونانی ارتقا کی ترتیب میں مطلق العنان بادشاہی کا درجہ کم رواج قدیم شاہی اور عدیدیت کے مابین نہیں تھا، بلکہ عدیدیت اور عمومیت کے درمیان تھا، روما کی طرح یہاں تیرانس (خودسر) کسی قدیم سلسلہ کا بادشاہ نہیں ہوتا تھا جو قدیم قانون و رواج کی حد سے تجاوز کر کے اپنے اختیار کو آزادطریق پر استعمال کرتا ہو بلکہ وہ کوئی بلند حوصلہ رہبر قوم ہوتا تھا جو عامۃ الناس کی تائید و امداد سے شاہی اختیار کو جفاکار عدیدیوں کے ہاتھوں سے نکال لیتا تھا۔

۴۔ ارتقائے سیاسی نے یونانی، رومانی و جرمانی انداز پر جو مختلف راہیں اختیار کی ہیں ان کے عام تبصرے کی تکمیل ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ یونان و جرمنی میں جو نمایاں فرق ہے اب اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کریں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم جرمانی تاریخ میں یہ تحریک شاہی کی طرف مائل تھی، جولیس قیصر نے جرمانی قبائل کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز ان میں بادشاہی کی تنظیم نہیں ہوئی تھی مگر بتدریج اس کا رواج ہر جگہ ہو گیا، اور ایک مرتبہ مقبول ہو جانے کے بعد اسے حیرت انگیز استقامت حاصل ہو گئی، کیونکہ وہ ازمنہ وسطیٰ سے گزر کر دور جدید تک بھی برابر قائم ہے، برخلاف اس کے یونان میں اس کے متعلق جو کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں اس کی رفتار دوسری ہی جانب ہے، ہومر کے زمانے اور اس قدیم ترین تاریخی دور کے مابین جسے واقعی، تاریخی زمانہ کہہ سکتے ہیں یونان خاص کی اکثر بیشتر سلطنتوں میں بادشاہی، عدیدیت کی صورت میں بدل گئی تھی۔ چند مستثنیات میں سے ایک استثنا اسپارٹا تھا، جس کی نسبت میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہاں قدیم ادارات مصنوعی طور پر محفوظ رکھے گئے تھے، لیکن یہاں بھی بادشاہ کی حیثیت موروثی سپہ سالار اعظم کی سی ہو گئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا تھی؟

اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس وقت اہل

جرمنی ہنوز ارتقا کی زیادہ ابتدائی حالت میں تھے، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ یونان میں تہذیب جس روش پر چل رہی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی مربوط سلطنتوں کو ترقی حاصل ہو اور آخرالامر اعلیٰ درجے کی متمدن سلطنتوں میں اس روش نے شہری خصوصیت پیدا کر لی۔ اور "شہر و سلطنت" کا مفہوم ایک ہوگیا۔ برخلاف اس کے جب جرمانیوں نے رومانی شہنشاہی کے اثر میں آکر تہذیب و تمدن کی طرف قدم بڑھائے تو اس وقت ایک مہذب "دستور" کا مفہوم (جس سے وہ اس طرح روشناس ہوئے تھے) یہ تھا کہ سلطنت ایک وسیع قطعہ ارض پر پھیلی ہوئی ہو، اور بلاد اس کے اندر ایک مربوط نظم سیاسی کے عناصر ماتحت کے طور پر داخل ہوں، اور جب شہنشاہی روما کا شیرازہ بکھر چلا اور نئی سلطنتیں بننے لگیں جن میں شہنشاہی کے مفتوح و نیم وحشی اجزا مرتب و مربوط قوموں کی شکل اختیار کرتے جاتے تھے تو ان صدیوں میں "ملکی سلطنت" کا یہی خیال ان کے ارتقا پر غالب و حاوی تھا۔

ازمنہ جدید کی سلطنت کے عناصر کی حیثیت سے "شہر و دیہہ" کے فرق کے جو اہم اثرات ہیں ہم اُن کے خوگر ہوگئے ہیں، مگر ہم اس فرق کی وسیع تاریخی اہمیت پر ہمیشہ پوری طرح غور نہیں کرتے۔ قدیم یورپ کے تمدن کی تاریخ ایک ایسی معاشری زندگی کی تاریخ ہے جس کا مرکز شہر تھا، اور جہاں سے تمدن کی شعاعیں نکل کر مفصلات و دیہات پر دھندلا سا عکس ڈالتی تھیں۔ برخلاف اس کے، ازمنہ جدید کے یورپ کی قرون وسطیٰ (نشاۃ جدیدہ) کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسی فاتح نسل کے عادات نے اس تمدن میں بہت کچھ فرق کر دیا تھا جو بالتخصیص دیہاتی زندگی بسر کرنے کے شائق تھی، اور متمدن ہو جانے کے بعد بھی اس نے مدتوں اپنی خصوصیت کو قائم رکھا تھا۔

پس یونانی سیاسیات اور ازمنہ جدید کی یورپی سیاسیات میں یہ ایک نہایت ہی حقیقی فرق ہے کہ بلند ترین تمدن پر پہنچے ہوئے یونانیوں کا سیاسی مطمح نظر دراصل شہری سلطنت رہا ہے اسی فرق سے بہت سے دوسرے فرق پیدا ہوگئے ہیں، یہ حالت یونانی تاریخ کے اعلیٰ ترین تمدن کے زمانے کی تھی اور کم از کم مقدونوی غلبہ تک تو یہی حالت تھی۔ اس دور کے یونانی ایسی بربری اقوام خاصکر وسیع ایرانی شہنشاہی کے حالات سے بھی بالضرور واقف رہے ہوں گے، جہاں ایک حکومت وسیع ممالک پر حکمرانی کرتی تھی پھر بھی ان کے ذہن میں اس خیال کا آنا دشوار تھا کہ کوئی ایسی قوم و ملت جس کی سیاسی زندگی ایک ہی شہر کے اندر مرکوز نہ ہو وہ کسی قسم کا

اعلیٰ سیاسی نظم ونسق قائم کرسکتی ہے[1]، یہ ضرور ہے کہ ان میں شہر کے حدود سے متجاوز ایک طرح کا قوی احساس موجود تھا، وہ ان روابط کو مانتے تھے جو ایک دوریانی کو دوسرے دوریانی سے یا ایک "ہیلنی" کو دوسرے "ہیلنی" سے وابستہ کرتے تھے، لیکن ایک اچھے شہری میں خاص اپنے شہر کے متعلق حب الوطنی کے جو جذبات موجزن ہوتے تھے ان کے مقابلے میں یہ حسیات بالعموم کمزور سے ہوتے تھے انھیں حسیات کا یہ اثر تھا کہ وہ مذہبی رسوم وتقاریب میں دوسرے یونانیوں (Hellenes) کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے، اور جنگ کے موقع پر غیر ملکی دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرتے تھے، اور شائد ایسے معاقدے بھی قائم کرسکتے تھے جن میں دوام و قیام مدنظر ہوتا تھا مگر بااین ہمہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا سیاسی اتحاد قائم کریں جس میں خاص اپنے شہر کی تفردی حیثیت کے قربان کردینے کا احتمال ہو۔ اس عام بیان کے خلاف مستثنیات اگرچہ بہت سے ہیں لیکن زیادہ تر وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ ان یونانیوں میں پائے جاتے تھے جو سیاسی ومعاشری ارتقا میں سربرآوردہ سلطنتوں سے پیچھے تھے، یا شدائد زمانہ نے مجبور کردیا تھا کہ دل خوش کن خیالات کو خیرباد کہہ کر واقعات پرکاربند ہوں، ایک طرف (بقول فریمین[2]) "ساحل اکائیہ کے قابل وقعت مگر گمنام قصبات ایتولیہ کے قزاق اور اہل اکارنانیہ، فوکس وغیرہ کے ایسے ہیلینی جماعت کے بعض کم ترقی یافتہ ارکان میں (جہاں تک پیچھے ہٹ کر ان کی تاریخ سے سراغ ملتا ہے) نظم حکومت کے کچھ ابتدائی اجزا ایسے پائے جاتے ہیں جن سے بخوبی انہیں اس امر کا مستحق سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کا شمار متفقی دولت عامہ میں کیا جائے۔ دوسری طرف، یونانی تاریخ سے بہت سے ایسے شہروں کے حالات معلوم ہوتے ہیں جن میں یونانی تہذیب پوری طرح دائر وسائر تھی۔ پھر بھی وہ دوسرے شہروں کی حکومت کے مطیع ہوگئے تھے، لیکن یہ اطاعت زیادہ تر بادل ناخواستہ تھی اور اس میں ایک طرح کی پستی کا احساس پایا جاتا تھا۔ بہرحال یونان کے عروج واقبال کے زمانے میں متمدن یونانیوں کی نسبت عام طور پر یہی کہنا صحیح ہے کہ ان میں کا کوئی فرد قومیت کے وسیع حلقوں کا

---

[1] اگرچہ ایک اعتبار سے اسپارٹا ایک شہر نہیں بلکہ پانچ متصل دیہات کا مجموعہ تھا تاہم اس میں ایک ہی شہر ہونے کے سیاسی خصوصیات موجود تھے اسکی ایک ہی مشترک جمعیت ملی تھی اور آپس میں بہت گہرا ربط ضبط قائم تھا

[2] "تاریخ حکومت وفاقیہ" باب دوم صفحہ ۱۲ (طبع ثانی)

کیسا ہی کچھ احساس کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس کا شہر ہی وہ سیاسی کائنات تھی جس کی نسبت وہ ہمیشہ پرزور طور پر یہ سمجھتا تھا کہ وہ خود اس کا ایک جزو ہے۔ خواہ اس کا یہ شہر واقعتاً ایتھنز یا اسپارٹا کے تابع ہو گیا ہو، مگر اپنے اس شہر ہی کی آزادی اس کا دین و ایمان تھی۔

یونان کے منتہائے خیال کے متعلق اس رائے کا پرزور اظہار افلاطون و ارسطو کے ایسے فلاسفہ کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں جلیل القدر ارباب فکر اور مسائل میں ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف الرائے کیوں نہ ہوں مگر اس ایک خیال پر دونوں متفق ہیں کہ سیاسی ہیئت کا منتہائے خیال ایک واحد شہر ہی ہے جس کے ساتھ مضافات کا اتنا حصہ شامل ہو جس سے اس کے باشندوں کے مادی ضروریات پورے ہو جائیں۔ ان کے ذہن میں یہ نہیں آتا تھا کہ ایک آزاد و متمدن ملت پر اگر فی الواقع اچھی حکمرانی کی ضرورت ہے تو پھر اس کا انتظام ایک شہر سے زیادہ حلقے میں کیوں کر ہو سکتا ہے۔

جن مختلف اسباب کے جمع ہو جانے سے یہ نتیجہ پیدا ہوا انہیں ہم اچھی طرح سے ممیز کر سکتے ہیں۔

(۱) دیہات سے علیحدہ ہو کر قصبے یا شہر کے نشو و نما کا اولین سبب بالضرور اقتصادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بنا یہی ہے کہ مجموعۂ دیہات کی بہ نسبت زیادہ لوگ جو ایک دوسرے سے متصل عمارات میں رہتے اور تجارت و صنعت میں مشغول ہوتے ہیں ان میں مبادلے کی آسانی پیدا ہو جاتی ہے مگر

(۲) قصبے کے اندر جس طرح عادتاً ایک دوسرے کے تجربہ و خیالات سے زیادہ استفادہ کے طرح طرح کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ، وسعت معاشرت اور باقاعدہ تقاریب سے دل کھول کر لطف اٹھانے کی عام خواہش جس خوبی سے پوری ہو سکتی ہے وہ بات دیہات میں نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شہری تہذیب دیہاتی تہذیب سے بہت آگے بڑھ جاتی ہے، خاصکر چھاپے کی دریافت کے قبل تو یہ حالت بہت قوی تھی۔ پس لامحالہ یونانی یہی سمجھتے تھے کہ شہروں کے ساتھ مہذب زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، کیونکہ شہر ہی میں وہ بازار، واقع تھے جہاں لوگ روزانہ جمع ہوتے تھے، وہیں نقش و نگار سے آراستہ مندر اور طاق و رواق تھے، وہیں موسیقی اور نظم خوانی کے لئے تھیئٹر تھے اور وہیں ورزشوں کے لئے اکھاڑے تھے۔

لیکن جس توضیح و تشریح کی ضرورت ہے، یہ سب باتیں اس کا ایک جزو ہیں۔
ساری دنیا میں یہی ہوا ہے کہ تہذیب نے شہروں ہی کے اندر نشو و نما پائی ہے۔ یونان
کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہاں شہر (ایک دوسرے سے) آزاد تھے، اور انکی
قومی زندگی پُرزور و مربوط تھی، اور طبعی حالات کے متعلق میں اس سے پہلے ہی توجہ
دلاچکا ہوں کہ اس آزادی کے پیدا کرنے میں اس کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہ طبعی حالت کیا تھی؟
یہ یونان کی ساخت ارضی تھی، خشکی کے راستے سے مختلف مقامات کو ایک دوسرے
سے جدا کر دیا تھا، اور سمندر کی طرف سے وسائل آمد و رفت میں آسانی پیدا کر دی تھی۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی قبائل کی طبیعتوں میں دو خصلتیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی
تھیں۔ ایک طرف تو وہ غیروں سے آزاد رہنا چاہتے تھے اور دوسری طرف خود اپنی قوم
کے اندر اعانت باہمی اور مجموعی عزت و برتری کا پاس و لحاظ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ یہ وہی
خصائل ہیں جو ان تمام کوہستانیوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں ذہنی بیداری پیدا
ہوگئی ہو اور بحر آشنا قوم کے انواع و اقسام کے تجربات انھیں حاصل ہو گئے ہوں۔

(۳)۔ یونانیوں میں سیاسی ارتقا کو شہری زندگی کے ساتھ منسوب کرنے کا جو
میلان تھا اس کے لئے (اس آزادی کے مان لینے کے بعد) ہم ایک تیسری اہم وجہ
یہ قرار دے سکتے ہیں کہ چار دیواری سے گھرے ہوئے شہر، دشمنوں کے حملوں سے
محفوظ رہنے کے لئے بڑا کام دیتے تھے اس سے شہری زندگی، دیہاتی زندگی کے مقابلے
میں نہ صرف زیادہ پر لطف اور زیادہ بلند ہو جاتی تھی بلکہ زیادہ محفوظ بھی ہو جاتی تھی۔
دیہات والے جب کسی حملہ آور دشمن سے میدان میں جم کر لڑ نہیں سکتے تھے تو انھیں
یا تو دشوار گزار پہاڑوں میں پناہ لینا پڑتی تھی، یا چھوٹے چھوٹے حصاروں میں ابتری کے ساتھ
بند ہو جانا پڑتا تھا، جہاں ان کی معمولی زندگی کے کاروبار نہیں ہو سکتے تھے، لیکن شہری
زندگی کی کیفیت یہ تھی کہ جنگ پیلوپونیشیا کے دوران میں ایتھنز کی شہری زندگی پورے
جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی، خواہ یہ دیکھنا کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہوتا ہو کہ
لاکے دیمون والے کسی کے جو کے کھیت اور پھلوں کے درخت کاٹے ڈالتے ہوں،
اور ٹھنڈی راتوں میں نکل کر نگہبانی کا کام انجام دینا ہوتا ہو۔[۱]

---

[۱]۔ لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تمام بڑے بڑے شہروں کا دیواروں سے محفوظ کئے جانے کا عام رواج

اس کے بعد جب یونانیوں کے دلوں میں بتدریج سلطنت کی مجموعی حیثیت کا وہ تصور قائم ہوا جس میں افراد بمنزلہ اجزا کے ہوں اور جس کے مقاصد کے لئے ہر ایک فرد واحد کے مقاصد و اغراض جائز طور پر نثار کئے جا سکتے ہوں اور جس کی مرضی کے مقابلے میں (جس کا اظہار دستور سلطنت یا قوانین کے ذریعہ سے ہوتا تھا) تمام اعلیٰ و ادنیٰ احکام کی مرضی پست و فروتر ہو، اسی زمانے میں شہر کی نسبت یہ خیال پیدا ہوا کہ شہر اسی باطنی سیاسی نظم کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ زیادہ وسیع سلطنت میں یہ اہلیت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ وہ ان مدنی فرائض کو موثر طور پر انجام دے سکے کیونکہ اس قسم کی سلطنت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ تمام باشندے ایک جمعیت میں جمع ہو سکیں، اور ایک نقیب کے اعلان سب سن سکیں "جو زیادہ بلند آواز نہ ہو" اور پھر وہ کیوں کر ایک دوسرے کے خصائل و شمائل سے واقف ہو سکتے تھے، حالانکہ عدالتی معاملات کے تصفیوں اور حسب لیاقت عہدوں کے تقسیم کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی[1]۔

پس جہاں ایک طرف شہر کے مادی اتحاد، اور اس کی وجہ سے ہر طرح کے شغل معیشت کا اجتماع سلطنت کے تصور کے ارتقا اور اس کے ملزومہ عادات وجذبہ حب الوطنی کو ترقی دیتا تھا، وہیں دوسری طرف شہری زندگی کے ساتھ سیاسی زندگی کے اس لاینفک طریق سے وابستہ ہو جانے نے شہری ملت کی نسبت اس یونانی خیال کی تکمیل کر دی تھی کہ انسانی اجتماع کی یہی سب سے اعلیٰ و آخری صورت ہے، شہری ملت سے مراد وہ لوگ تھے جو ایک ضلع کے اندر رہتے ہوں جس کا مرکز ایک شہر ہو۔

۵۔ یہ بھی خیال رہے کہ دیہاتوں سے قصبوں اور چھوٹے قصبوں سے بڑے قصبوں (شہروں) کی طرف منتقل ہونے کی کارروائی اکثر نیم لازمی سی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایتھنز و روما کے حالات میں قصوں اور افسانوں کے غبار میں جو دھندلے سے نشانات نظر آتے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ابتدائی بادشاہوں کی حرص و طمع سے اس کارروائی میں پرزور مدد ملی، کیونکہ اس سے ان کے اعزاز و دولت میں اضافہ ہوتا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بتدریج ہوا۔ چنانچہ خود ایتھنز کا اکروپولس، پی سسترآتوس کے تحت میں حصار بند بنایا گیا۔

[1] "ارسطو، سیاسیات" حصہ چہارم (۷)، فقرہ ۴۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی متفرق جماعتوں کے اندر جو شہری سلطنت بن جانے کی طرف مائل ہوں تمدنی زندگی کا یہی ارتقا زیادہ تر اس امر کا موجب ہوا کہ یونان کے سیاسی اوارات میں شاہی کا تبدل ہوا اور اس سلسلے کے دوسرے مدارج بھی طے ہوتے رہیں۔ جرمانی قبائل کے حالات کا جہاں تک ہمیں علم ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی چند صدیوں میں بادشاہی کا شیوع و ارتقا زیادہ تر اس وجہ سے ہوا کہ اسے قومی اتحاد کے واسطہ و علامت کے طور پر کار آمد سمجھا جاتا تھا، اسی کے برعکس ہیلینی (یونانی) جماعتوں کی قلت اور اجتماعی جائے قیام نے اس واسطہ کو بیکار اور اس علامت کو بے اثر بنا دیا ہوگا۔

یونان میں عددیت کی ابتدا کے متعلق گروٹ نے جو وجہ بیان کی ہے اس کا ماحصل یہی ہے[۱] چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جب موروثی بادشاہ کی شخصی کمزوریاں محسوس ہونے لگیں "تو پھر قوم کے حالات گردوپیش میں کوئی امر ایسا نہیں تھا کہ مرئی و موثر اتحاد کے لئے اس اعزاز کا قائم رکھنا ضروری ہوتا۔ ایک واحد شہر اور ایک چھوٹی سی قریب قریب رہنے والی قوم کے لئے یکجائی بحث و مباحثہ اور عام ضوابط پر دھن کے ساتھ ہنگامی و ذمہ دار حکام بھی مقرر ہوں) بغیر کسی دقت کے عمل کرنا ممکن تھا" پس اس طرح ان ماتحت سرداروں کو جو اولاً بادشاہ کی مجلس شوریٰ کے خدمات انجام دیتے تھے یہ موقع ملگیا کہ وہ بادشاہ کو زیر کر کے انتظامی فرائض کو خود اپنے درمیان میں تقسیم کر لیں۔ البتہ جمعیت عامہ کا انعقاد مثل سابق کبھی کبھی کرتے رہے ہوں، اور عملی اعتبار سے یہ مجلس سابق ہی کی طرح بیکار رہی ہو۔ یونانی سلطنتوں میں اسپارٹا کے سوا عام طور پر جو تغیر واقع ہوتا رہا اس کی حقیقت بس یہی تھی۔ بادشاہی منسوخ کر دی جاتی، اس کے بجائے عددیت قائم ہو جاتی، ایک مجلس مجموعی طور پر بحث و مباحثہ کرتی، عام معاملات کا کثرت رائے سے فیصلہ کرتی اور اپنی ہی جماعت میں سے چند اشخاص کو عارضی و جوابدہ منتظموں کی حیثیت سے منتخب کر دیتی تھی۔ قدیم بادشاہی کے معدوم ہو جانے کے بعد ہمیشہ عددیت ہی کو عروج حاصل ہوتا تھا، عمومی تحریک کا زمانہ ابھی بہت دور تھا اور اس انقلاب سے قوم (یعنی آزاد اشخاص کی جماعت عام) کی حالت میں فوری طور پر اچھا یا برا کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا۔"

---

[۱] ملاحظہ ہو "تاریخ یونان" حصہ دوم باب نہم۔

یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں[عہ] کہ میرے خیال میں گروٹ ابتدائی زمانہ کی مجلس جمعیت ملکی کی اہمیت کو کسی قدر گھٹا کر ظاہر کرتا ہے اور اس کا یہ کہنا کہ قدیم بادشاہی کے بعد ہمیشہ "عدیدیت" ہی قائم ہو جاتی غالباً ضرورت سے زیادہ وسیع ہے۔ ہم ابھی ابھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ پولی بیوس یہ کہتا ہے کہ اکائیہ کے شہروں میں شاہی کے بزور برطرف کر دینے کے بعد فوراً ہی عمومیت قائم ہو گئی اور یہ خیال بآسانی ذہن میں آ سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک جن میں فتوحات نے برہمی نہ پیدا کی ہو اور جو حرفتی و تجارتی ترقی کی عام شاہراہ سے علیحدہ ہوں ان میں اور جگہوں کی بہ نسبت باشندوں کے اندر دولت دطرز ماندوبود میں مساوات زیادہ مدت تک قائم رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بادشاہی کو زوال ہوتا تھا تو از خود ایک معقول عمومیت قائم ہو جاتی تھی۔ میرا گمان یہ ہے کہ آرکیڈیا کے بعض قصبوں میں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی، لیکن جب عمومی حیثیت سے گفتگو کی جائے تو بے تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونان میں سیاسی نظم معاشرت جب قدیم بادشاہی کی منزل سے گزر کر آگے بڑھا تو پھر اس نے ابتدائی عدیدیت ہی کی منزل میں قدم رکھا۔

اس امر پر نظر کرنا چاہیے کہ یہ ارتقا مختلف سلطنتوں میں بہت ہی مختلف اوقات میں واقع ہوا) تھیوسیڈائیڈس کے وقت میں کسی شہری سلطنت کے اندر جس میں ہیلینی (یونانی) تمدن پورے زوروں پر ہوتا کوئی بادشاہ باقی نہیں رہ گیا تھا، مگر یہی مورخ (اپنی تاریخ جلد اول باب سوم میں) وسط پانچویں صدی میں تھسلی کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے اور ہیروڈوٹس (جلد ہفتم ۱۴۹) سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایرانی جنگ کے وقت ارگوس میں موروثی بادشاہ موجود تھے، حالانکہ اس سے بہت ہی قبل ایتھنز میں یہ نام نہاد بادشاہ حکام اعلیٰ کی مجلس کا محض ایک منتخب شدہ رکن رہ گیا تھا۔ کورنتھ اور کالکس جو تجارتی مرکز تھے اور جنہوں نے آٹھویں صدی کے نصف آخر میں اپنے لوگوں کو نوآبادیاں قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا ان کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھیجنے والی ایک تجارتی عدیدیت تھی، روایت کے مطابق، ایتھنز میں بھی اسی صدی کے وسط میں یہی کارروائی جاری ہو چکی تھی۔

عہ۔ خطبہ دوم

اس تغیر کا پتہ سب سے زیادہ قطعیت کے ساتھ ایتھنز میں چل سکتا ہے، اور وہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کارروائی بہت ہی تدریجی طریق سے انجام پاتی تھی پہلے تو شاہی منصب سے ایک جزو اس طرح علٰحدہ کیا گیا کہ بادشاہ سے علٰحدہ ایک پولیمارخ یا سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد ایک تیسرا آرکن یا حاکم مقرر ہوا، جو آخر کار حکومت کے داخلی معاملات کے لئے خاص عاملانہ حاکم ہو گیا، اور اب شاہی منصب موروثی نہ رہا۔ اس کے بعد ان تینوں کے عہدے کی میعاد دس برس کی مقرر ہو گئی۔ پھر حاکم اعلیٰ کا عہدہ جو ابتک شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا، تمام یوپا تریوں یا امرا کے لئے عام ہو گیا، آخر کار (۶۸۳ ق م میں) عاملانہ فرائض نو حاکموں کے درمیان تقسیم کردئے گئے جن کی میعاد ایک برس کی ہوتی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس اثنا میں اکابر کی مجلس نے جو قدیم تر زمانہ میں بادشاہ کے ساتھ فرائض حکومت میں شریک تھی، رفتہ رفتہ اپنے اختیارات بڑھا لئے، کیونکہ جب حاکم اعلیٰ کا عہدہ انتخابی ہو گیا تو اس انتخاب میں بالطبع اسی جماعت کے لوگ منتخب ہونے لگے۔ اس کے بعد جب عہدے کی میعاد ایک برس کی ہو گئی اور مجلس کی خالی شدہ جگہیں بالطبع انھیں لوگوں سے پُر کی جانے لگیں جو حاکم رہ چکے ہوں تو پھر یہ سمجھنا آسان ہے کہ کیونکر اس مستقل جماعت نے اپنے حقوق و اختیارات کو سال بسال کے مقرر شدہ حکام سے بڑھا لیا ہوگا۔ جب تغیر کی یہ کارروائی مکمل ہو چکی ہوگی تو پھر حکومت نے بادشاہی کے بجائے قطعی طور پر خدیدیت کی صورت اختیار کر لی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ تغیر کی اس کارروائی کی نوعیت اور اس کا آخری نتیجہ مختلف ملتوں میں مختلف رہا ہوگا لیکن بادشاہی کم و بیش ہر جگہ غائب ہو گئی تھی۔ غالباً یہ تغیر ایک جماعت سے دوسری جماعت میں نقل و تقلید سے شائع ہوا تھا۔ جب ایک شہر نے اپنے بادشاہ کو ہٹا دیا تو اس کے ہمسایہ کو بھی ایسا ہی کرنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں بادشاہوں کے کبر، ظلم اور کمزوری نے عجلت پیدا کر دی ہوگی اور کہیں ان کی قابلیت اور حکمرانی نے اس میں تاخیر کر دی ہوگی مگر نتیجہ اس قدر عام و یکساں ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے زیادہ، مشترک اسباب کی طرف منسوب نہ کیا جائے؛ اور میرا خیال یہ ہے کہ اس کی وجہ زیادہ تر اس سیدھے سادے اعتقاد کو قرار دیکتے

ہیں کہ جس ملّت نے بہ تدریج اپنے تمدن و اجتماع کو اس درجہ بڑھا لیا ہوگا کہ اس کا اتحادِ انتظام بادشاہ کے بغیر قائم رہ سکتا تھا، اس کے لئے ایک "عطیہ نواز بادشاہ" بیکار کا بار ہوگیا ہوگا۔

خطبۂ پنجم

یونانی شہری مملکتوں میں ابتدائی عدیدیت

سابقہ خطبہ میں ہم یونان کے اندر عدیدیت کی رفتار پر غور کر رہے تھے اور بادشاہ کے ساتھ امرا کے تعلقات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھے، لیکن یہ میں کہہ چکا ہوں کہ بادشاہی کے بعد جو عدیدیت قائم ہوئی وہ مختلف حالات میں مختلف نوعیت کی تھی۔ بعض صورتوں میں حکومت کے خاص اختیارات شاہی خاندان یا عشیرے ہی کے اندر باقی رہ گئے تا آنکہ تیرانس (خودسری) کا دور آگیا۔ (بر سبیل تمثیل) کورنتھ میں یہی صورت پیش آئی جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بکیائی خاندان نے وہاں آٹھویں صدی قبل مسیحؑ کے نصف آخر اور ساتویں صدی کے اول میں نوے برس حکمرانی کی۔ موروثی بادشاہ کی جگہ کے لئے خاندان میں سے ہر سال ایک شخص منتخب کر لیا جاتا تھا، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور بھی متعدد شہری سلطنتوں کے متعلق ہم یہ سنتے ہیں کہ وہاں اسی قسم کے شاہی خاندان عدیدانہ طور پر حکمرانی کرتے تھے یہاں تک کہ تیرانس (خودسری حکومت) کا زمانہ آگیا۔

دوسری صورتوں میں جہاں تک ہمیں علم ہے شاہی کے زوال پذیر ہونے کے بعد اختیار حکومت چند خاندانوں کے اندر منقسم ہو جاتا تھا مثلاً ایتھنز میں یوپاتیری خاندان کا تکس اور ایرتیریا (یوبیہ) میں ہیپوتا کے اسی قسم کے خاندان تھے۔

اب ہمیں اس امر پر توجہ کرنا چاہئے کہ ابتدائی دستور کے تیسرے عنصر

یعنی مسلح آزاد اشخاص کی مجلس میں اگر کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے، اس امر کے فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس طرف اختیار میں اگر کوئی تغیر ہوا ہو تو اس سے شاہی کے اختیار میں لازماً کمی واقع ہوئی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس موقع پر (جیسا کہ ہومر نے اشارہ کیا ہے)، شاہی کا خاتمہ ہونے کے قبل اکثر صورتوں میں دولتمند زمینداروں کا غلبہ مکمل ہو جاتا تھا، بادشاہ نظم معاشرت کی اس عدیدانہ عمارت کا صرف کلس تھا، پھر بھی یہ سمجھنا آسان ہے کہ بادشاہی کی تنسیخ نے اس مجلس کے اندر حکمران خاندانوں کا غلبہ کیونکر اور بھی زیادہ قوی ہو جاتا تھا اور مجلس کی بنسبت ہم گروٹ کے ہم خیال ہو کر یہ قیاس قائم کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے قدیم فرائض کے مماثل کچھ فرائض کے ساتھ برقرار رکھی جاتی تھی، لیکن ماتحت سرداروں یا بزرگوں کے ساتھ بادشاہ کے تعلق میں جو کچھ بھی تغیر ہوا ہو اس سے بالکل علیحدہ ہو کر ہم دوسرے اسباب بھی ایسے دریافت کر سکتے ہیں جو اس مجلس میں عدیدانہ خصوصیت پیدا کرنے کا کام دے رہے تھے یہ اسباب مختلف نوعیت کی سلطنتوں میں کسی قدر مختلف تھے۔

لیکن اس سے بیشتر ضرورت یہ ہے کہ عدیدیت کے متعلق جو کسی قدر موہوم و پریشان سے خیالات قائم ہو گئے ہیں انھیں صاف کر دیا جائے۔ ارسطو نے عدیدیت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ چند دولتمندوں کی حکومت ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ ارسطو کے قریب زمانہ میں عدیدیت و عمومیت کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہی تھا کہ حکمرانی آیا چند دولتمندوں کو حاصل ہو یا آزاد شہریوں کی جماعت عام کو، لیکن صرف یہی ایک طریقہ نہیں ہے جس کے وسیلے سے عدیدیت یعنے قلت کی حکومت پیدا ہو سکتی ہے یا پیدا ہوئی کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ (غلاموں کو خارج کرنے کے بعد بھی) شہریت کے حقوق نہ رکھنے والوں کی تعداد کے مقابلہ میں ان حقوق کے رکھنے والوں کی کل جماعت ایک قلیل التعداد، بہت ہی قلیل التعداد جماعت ہو۔

عدیدیت[1] کا یہ دہرا تصور اس یونانی مملکت کی حالت سے بہت اچھی طرح سے

[1] فریمین نے ابتدائی نظم حکومت کے تین عناصر پر جہاں بحث کی ہے وہاں عدیدیت کا یہ دہرا تصور اس کی نظر سے رہ گیا ہے۔ اس نے ابتدائی دستور کی صورت یہ قرار دی ہے کہ۔

واضح ہو سکتا ہے جس کا دستور قدیم ترین معلومہ دور کے خصوصیات کا بہترین نمونہ ہے، یہ مملکت، اسپارٹا کی مملکت ہے جو یونان میں عدیدیت کی پشت پناہ تھی۔ اہل اسپارٹا میں پیشہ ور جنگجویوں کی ایک جماعت تھی، ایرانی جنگ کے وقت ہیروڈوٹس ان کی تعداد آٹھ ہزار بتاتا ہے اور ارسطو کا بیان ہے کہ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں ان کا شمار دس ہزار تک تھا۔ یہ گویا ایک جنگجو قبیلہ تھا جو اسپارٹا میں فتوحات حاصل کرنے کے باعث لقونیہ و مسینیہ میں مالکان اراضی کی حیثیت سے دائمی طور پر قائم ہو گیا تھا۔ ان میں سخت تعلیم و تربیت، قواعد اور نیم اشتراکانہ ضوابط کا ایک مختص نظم قائم تھا، تاکہ ان میں معاشرت کی سادگی اور فوجی شجاعت و مہارت برقرار رہے۔ ان کا گذارہ زمین کی پیداوار پر تھا جس کی کاشت ہیلوٹ (غلامان وابستہ اراضی) کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور جن کی تعداد ان جنگجویوں سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ ایرانی جنگ کے دوران میں معرکہ پلاٹیہ کے وقت ایک ایک اسپارٹی کی خدمتگری کے لئے سات سات "ہیلوٹ" تھے۔ یہ غلام زمین سے وابستہ تھے نگران سے مطلوب صرف یہ تھا کہ وہ زمین کی پیداوار سے ایک معینہ مقدار داخل کردیا کریں، اور اسی اراضی کے اور باشندے جو شخصی طور پر آزاد ہوتے تھے اور جن کی تعداد ان غلاموں سے سہ چند تک اندازہ کی جاتی تھی وہ بھی سیاسی حیثیت سے انھیں اہل اسپارٹا کے تحت میں تھے۔

جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں[1] یہ "ابتدائی نظم حکومت" ہی اُن کا اولیں دستور تھا۔ اس میں صرف خفیف سی ترمیم کرلی گئی تھی۔ دو بادشاہ ہوتے تھے۔ اس دوئی کا سبب محقق نہیں ہوتا مگر اغلب وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداءً دو جماعتیں متحد ہوئی ہوں گی ان بادشاہوں کی نسبت ہم یہ خیال کرسکتے ہیں کہ ابتداءً انھیں ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

بادشاہ مجلس سرداران آزاد جنگجویوں کی مجلس	برابر ہے محض	شاہی عناصر کے عدیدانہ عناصر " عمومی " "

[1] خطبہ دوم

فرائض تفویض تھے جو ہومر کے بیان کردہ بادشاہوں کے ہوا کرتے تھے، جس زمانہ کا حال ہمیں سب سے زیادہ معلوم ہے اس میں ان کی اہمیت زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ وہ موروثی سپہ سالار تھے، اگرچہ خاص مذہبی امتیازات اور نمایاں مخصوص اعزاز اور بعض عدالتی فرائض بھی انھیں حاصل تھے۔ دوسرے، اکابر کی ایک مجلس سینیات تھی، جس میں ساٹھ سے اوپر کی عمر کے لوگ شامل ہوتے تھے، جن کا انتخاب عمر بھر کے لئے ان شہریوں کی مجلس کی طرف سے ہوتا تھا جنھیں رائے دینے کا کامل حق حاصل تھا، یہ انتخاب ایک عجیب طرح کے انتخاب بذریعہ آواز سے ہوتا تھا جس کا رواج قدیم سے چلا آتا تھا اور جس سے غلبہ کا اندازہ وہ عہدہ دار کرتے تھے جو اس غرض سے متعین ہوتے تھے مگر وہ ایسے موقع پر ہوتے تھے کہ انھیں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کے لئے یہ شور تحسین بلند ہو رہا ہے۔ تیسرے، تیس برس سے زائد عمر کے کامل الحقوق شہریوں کی عام مجلس تھی جنھیں سیناتیوں اور اعلیٰ حکام کے انتخاب کا حق حاصل تھا اور شاذونادر جب کبھی کوئی نیا قانون بنانا پڑتا تھا تو ان کی منظوری درکار ہوتی تھی علیٰ ہٰذا جنگ، صلح اور معاہدوں کی توثیق بھی ان کی منظوری پر مشروط تھی [علہ] عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کامل الحقوق شہریوں کی یہ مجلس ابتداً فاتح قبیلے کے تمام اخلاف پر مشتمل تھی، مگر چونکہ مصارف عام کے اخراجات کے لئے (جس میں ہر ایک کامل الحقوق اسپارٹی کے لئے شرکت لازمی تھی) چندہ دینے کی شرط ایسی تھی جس کی وجہ سے زیادہ غریب لوگ اس سے خارج ہو گئے تھے اور جس قدر وقت گزرتا گیا یہ اخراج زیادہ اہم ہوتا گیا۔

جمعیت ملی کے اختیارات کی ایک نمایاں تحدید کا بیان کرنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تحدید لائکرگس کے ایک صدی بعد ہوئی تھی، وہ تحدید یہ تھی کہ جس صورت میں کہ قوم نے کسی غلط روش پر چلنے کا فیصلہ کیا ہو تو مجلس سینیات کو بشمول حکمرانان یہ چاہیئے

علہ۔ ہیرو ڈوٹس جلد ۶، ۵۶ کا یہ کہنا کہ "بادشاہوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جس ملک سے چاہیں جنگ کریں اور کوئی دوسرا اسپارٹی اس میں کسی طرح سے مارج نہیں ہو سکتا تھا"، میرے خیال میں اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ بادشاہوں کو اعلان جنگ کا حق حاصل تھا بلکہ اعلان جنگ کے بعد مہم کی کارروائی کو وہ جسطرح چاہیں جاری رکھ سکتے تھے، یا یہ کہ ہیرو ڈوٹس سے ایک معمولی غلطی ہو گئی۔ مقابلہ کیجئے تھیوسیڈیڈس جلد اول۔ ۲۰ نیز ہیرو ڈوٹس جلد سوم ۲۶، پنجم ۶۴، ششم ۱۰۶۔

کہ وہ ان کے فیصلہ کو بدل دے؛[1] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے[2] کہ اس تحدید نے مجلس کے فیصلہ کو محض نمائش بنا دیا ہوگا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ بظاہر اس سے کسی تجویز کے متعلق منظوری دینے سے انکار کردینے کے اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا اور اس طرح وہ ہر مجوزہ تغیر کو روک سکتے تھے؛ پس ماحصل یہ ہوا کہ سینیات کو بھی مجلس کی کارروائی کے روک دینے کا مساوی اختیار حاصل ہو گیا تھا؛

یہ تو اصلی و ابتدائی دستور تھا مگر اس کے بعد ہی "ایفور" یا نگرانکاروں کی ایک جماعت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کا انتخاب سال بسال کسی ایسے طریق سے ہوتا تھا جس کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے۔ لیکن افلاطون اس کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ انتخاب قریب قریب قرعہ اندازی کی حد تک پہنچ جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً ان لوگوں کا تقرر کوتوالی کی خدمات بجا لانے کے لئے ہوا تھا اور دوسرے حکام اپنے ادائے فرائض میں غفلت کریں یا اپنے اختیارات کو بیجا استعمال کریں تو اس کا روکنا بھی ان کا کام تھا مگر بتدریج ایفوروں نے اپنے اختیار کو بڑھا لیا اور اندرونی معاملات کے سب سے اعلیٰ عاملانہ حاکم بن گئے اور جنگ میں بھی انھیں ایک معقول حد تک اقتدار حاصل ہو گیا۔ ان کے اختیار کی نوعیت و وسعت، اور اس اختیار کے عملدرآمد میں رازداری اور بے رحمانہ سختی وینس کی "مجلس عشرہ" کے حالات سے کچھ عجب مشابہت رکھتی ہے۔ ان کا کام یہ تھا کہ بددل اہل اسپارٹا، اور بددل غلامان زرعی و تابعین سب کے مقابلہ میں نظام سلطنت کو برقرار رکھیں۔ وہ اسپارٹا کے ہر شخص کو گرفتار و قید کرسکتے؛ یہاں تک کہ حکام کو بھی معطل کرسکتے تھے اور تین بار طلب کئے جانے پر بادشاہ بھی ان کے روبرو حاضر ہونے پر مجبور تھے، اور کاشتکاران وابستۂ اراضی، اور لقونیہ کے ماتحت شہروں کے باشندوں کی زندگی و موت تک کا انھیں اختیار حاصل تھا۔

اس موجودہ دور جدید میں کسی کو بھی اس امر میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اسپارٹی

---

[1]۔ پلوٹارک، لکرگس حصہ ۶،۵۔

[2]۔ ملاحظہ ہو، اسپنسر کی "ادارات سیاسیہ" ۴۸۸ ماخوذ از گروٹے حصہ دوم باب ششم لیکن گروٹے کی رائے وہی ہے جو مین نے دی ہے۔

حکومت عدیدی یا اعیانی حکومت تھی (یہ دونوں اصطلاحیں تقریباً ہم معنی مقصود ہوتی ہیں)، افلاطون و ارسطو نے ان میں جو بین فرق قائم کیا ہے کہ اول الذکر "چند دولتمندوں کی حکومت" تھی، اور ثانی الذکر "ذی لیاقت اصحاب کی حکومت" وہ یہاں مقصود نہیں ہے) لیکن ایسا کیوں تھا اس کی وجہ بیان کرنے میں بڑا اختلاف رائے ہے (۱) ایک وجہ یہ ہے کہ اہل اسپارٹا اپنے کثیر التعداد غلامان زرعی اور رعایا کے مقابلہ میں بہت کم تعداد میں تھے (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اہل اسپارٹا ہی ایسے تھے کہ ان کی کثیر تعداد پر ان کی قلیل تعداد حکمران تھی؟ میرے خیال میں پہلا جواب تو ایسا ہے کہ معمولی طور پر کوئی یونانی یہ جواب نہ دیتا۔ اہل یونان اپنے یہاں کے "ہیلوٹ" کو بالعموم ایسا ہی سمجھتے تھے جیسا دوسرے شہروں میں غلام ہوتے تھے، اور ارسطو نے تو اسپارٹا کے سیاسی نظام پر بحث کرتے وقت ہیلوٹ کے غیر اسپارٹی باشندوں کو بکلی نظر انداز کر دیا ہے، اور اگر ہم اسپارٹی [illegible] کے محض اندرونی سیاسی تعلقات کو دیکھیں تو ان میں صاف عدیدانہ خصوصیت نظر آنے کے بجائے ایک گونہ مشکوک و متلون کیفیت نظر آتی ہے۔ کوئی وقت ایسا ہی رہا ہوگا جب "حقیقی طاقت مجلس سنیات کے ہاتھوں میں رہی ہوگی"[۱] لیکن ارسطو کے وقت میں یہ صاف عیاں تھا کہ اصل اختیار نگرانکاروں کی مجلس یعنی ایفوروں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ بیشک ارسطو سینیاتی عہدے کو بڑی عزت و وقعت کا منصب بیان کرتا اور اسے "قابلیت کا انعام" قرار دیتا ہے مگر اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ظاہر کرتا کہ اس کے ساتھ عدالتی فرائض شامل تھے۔ اس کے برخلاف "مجلس ایفوران" کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "نہایت ہی اہم معاملات کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا اور اسے بہت ہی وسیع اور مطلق العنانہ طاقت حاصل تھی" اور اگرچہ اسی موخر الذکر خیال کی بناء پر گروٹ اسپارٹی حکومت کو ایک ایسی تنگ، بے باک عدیدیت قرار دیتا ہے "جس کی مکمل اطاعت لازم ہوتی ہو" لیکن ہم ارسطو کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یونان کے سیاسی ارباب دانش کی نظر میں اس اقتدار کے متعلق جو ایفوروں کو اہل اسپارٹا پر حاصل تھا "عدیدانہ حکومت" کا لفظ استعمال کرنا کم از کم مشکوک ضرور معلوم ہوتا تھا۔ ایفور کا

---

[۱] دیکھئے پولی[illegible] نظریہ[illegible] کتاب ششم باب (۱)

عہدہ تمام کامل الحقوق شہریوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ انتخاب کے طریقے کا حال اگرچہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہے لیکن یہ متیقن ہے کہ اس میں اس قدر عمومیت تھی کہ دولت اور معاشرتی حیثیت سے اس معاملہ میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ (ارسطو کو یہ شکایت ہے کہ اس میں "غریب و ایمان فروش" امیدوار تک قبول کر لئے جاتے تھے) ارکان مجلس کی میعاد صرف ایک برس کی ہوتی تھی اور جب وہ اپنے عہدوں سے علیحدہ ہوتے تھے تو دوسرے حکام کی طرح وہ بھی جوابدہی کے ذمہ دار تھے۔ اسی وجہ سے ارسطو کی رائے یہ ہے کہ جب ایفوروں کو غلبہ حاصل ہو گیا، تو "دستور سلطنت آہستہ آہستہ اعیانیت سے بدل کر عمومیت کی صورت میں آگیا" عله، یعنی جہاں تک کامل الحقوق اسپارٹی شہریوں سے حکمرانی کا تعلق تھا اس کی ہیئت فی الواقعہ یہی ہو گی۔

پس جس حد تک اسپارٹا کی نسبت یہ سمجھنا صحیح و درست ہو سکتا ہے کہ وہ صریحاً و دائمی طور پر عدیدانہ اصول کو نمایاں کر رہا تھا اور جیسا کہ ارسطو نے تسلیم کیا ہے اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ یونان کے اور مقامات کے متعلق اہل اسپارٹا کی حکمت عملی یہی تھی کہ عدیدیت کو ترقی دی جائے اسی حد تک اس عدیدیت کی وجہ اس تعلق کو قرار دینا پڑے گا جو اہل اسپارٹا کی تمام جماعت کو بہ حیثیت "حکمرانان چند" کے اپنے سے بہت بڑی تعداد کی رعایا کے ساتھ تھا۔ اس نقطہ نظر سے ایفوروں کے طریق حکمرانی کی نسبت بلا شک و شبہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک نمایاں عدیدانہ تنظیم تھی۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ اس امر کے لئے پوری طرح موزوں تھی کہ انقلابات کے مقابلہ میں ایک قلیل التعداد حکمران جماعت کو قائم رکھ سکے خواہ یہ انقلاب ان کی رعایا کی طرف سے برپا ہو یا ان میں کے بد دل ارکان کی طرف سے ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان دونوں نقطہائے نظر کا فرق صاف طور پر سمجھ لیا جائے۔ اگر ہم اسپارٹا کی نسبت یہ سمجھیں کہ اس کے تمام دور تاریخی میں عدیدیت ہی جاری رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ اسپارٹا کے آزاد جنگجوؤں نے سیاسی اقتدار میں اپنا حق زائل کر دیا تھا بلکہ فی الواقع اپنے غلامان زرعی اور رعیت کے ماتحت شہروں کے آزاد باشندوں کے مقابلہ میں قلیل التعداد حکمرانوں کی حیثیت میں

عله۔ ملاحظہ ہو ارسطو کی سیاسیات کتاب دوم باب نہم۔ نیز مقابلہ کیجئے کتاب ششم (چہارم) باب نہم۔

آ گئے تھے۔ صرف اسی نقطۂ نظر سے تمام دورہائے تاریخی میں اسپارٹی حکومت صاف طور پر عدیدانہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعد کے زمانہ میں خود اہل اسپارٹا کے اندر کامل الحقوق شہریوں کی حیثیت قلت کی ہوگئی تھی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ باقاعدہ تربیت کی شرط کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ ضائع ہوگئے تھے اور اس لئے خود کامل الحقوق شہری کل اہل اسپارٹا کے مقابلے میں قلیل التعداد ہوگئے تھے۔

۲۔ اگرچہ اسپارٹا کے لائی کرگس والے ادارات بجائے خود نادر تھے، اگر اس قسم کی عدیدیت جس میں ایک فاتح قبیلے کے مسلح آزاد اشخاص کی ابتدائی مجلس کثیرالتعداد مفتوحین کے درمیان "معدودے چند" کی صورت اختیار کرے، یہ صورت نادر و نایاب نہیں تھی۔ اس کی ایک صاف مثال یہ ہے کہ ارگوس میں دوریانیوں نے مفتوح اہل اکایہ کے ساتھ جو تعلق قائم کیا وہ اس تعلق سے بہت مشابہ تھا جو اسپارٹا کے دوریانیوں میں رائج تھا۔ یہاں بھی فاتحین نے غلامان زرعی کو اپنی ملک بنالیا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ ان کو "ہیلوٹ" کے بجائے جِمنیتیس کہتے تھے، ماتحت قصبوں یا دیہاتوں کے گروہ اسی طرح پر تھے ان دیہاتوں کے باشندوں کو مدنی آزادی تو حاصل ہوتی تھی مگر سیاسی آزادی سے وہ محروم تھے۔ علیٰ ہذا کریٹ[ع] کے قصبوں میں بھی ہمیں نظم معاشرت کے یہی تینوں مدارج ملتے ہیں، دوریانی فاتح، غلامان زرعی، آزاد دیگر ماتحت اہل صوبہ۔

اسپارٹا کی طرح کریٹ کے ادارات میں بھی اہم معاملات کے لئے آزاد جنگجوؤں کی مجلس کی منظوری ضروری تھی مگر ارسطو یہ کہتا ہے کہ اس کے وقت میں اس مجلس کو کچھ حقیقی اختیار نہیں حاصل تھا اور اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں ہے کہ دوسرے مقامات میں بھی دوریانیوں کے فتوحات کے نتایج اولاً ایسے ہی ہوئے ہوں گے۔ یونان کے دوسرے حصص میں بھی جہاں کے سیاسی نظم معاشرت کی انتہائی حد فتح پر منقضی ہوئی تھی (اور جنکا حال تاریخی طور پر ہمیں معلوم ہے)، وہاں بھی جہاں تک ہمیں علم ہے، اول میں نہیں تو آخر میں یہی ہوا کہ ایسی ہی حکومت قائم ہوگئی جو بالکلیہ، سربرآوردہ خاندانوں یا خاندانوں کے ایک چھوٹے سے مجموعے کے ہاتھ میں آگئی تھسلی کا یہی حال تھا، جہاں مختلف شہروں میں

ع۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (الف)۔

اقتدار و اختیار ان امراء کے خاندانوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنا سلسلۂ نسب ہرقل سے ملاتے تھے یقیبس بلکہ عام طور پر بیوتیہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ان کے متعلق ہم جو کچھ سنتے ہیں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عدیدانہ حکومت زمیندار خاندانوں کی ایک موروثی جماعت کے اندر سختی کے ساتھ محدود تھی اور یہ جماعت امتداد زمانہ کے ساتھ اور تنگ و محدود ہوتی جاتی تھی۔ اسی طرح دور یانیوں کی نسبت بھی ہم یہ سنتے ہیں کہ وہاں سیاسی اختیار اپیڈورس کے ۱۸۰ آدمیوں کے درمیان محدود تھا۔ اسی قسم کی تحدید ایلس میں بھی پائی جاتی ہے[۱]۔

مگر صرف فتوحات ہی ایک ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ جماعت جو قبیلے کے آزاد جنگجویوں کے مجموعے کے مرادف ہوتی تھی قسم کی عدیدانہ حیثیت پیدا کر لیتی تھی کیونکہ عام طور پر یونانیوں کی شہری سلطنتوں میں حق شہریت کا انحصار بالعموم وراثت پر ہوتا تھا، غیر ملکیوں کے جوڑے کے مملکت کے اندر پیدا ہوتے تھے وہ بالعموم غیر ملکی ہی رہتے تھے، حق شہریت میں ان کا داخلہ خاص مراعات کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ بجز اسکے کہ تغیر کے نازک وقتوں میں اس کا لحاظ نہ کیا جائے[۱]۔ پس اس مفہوم میں ہر ایک یونانی جماعت جب وہ ایک مختصر سی ابتدائی حالت سے ترقی کر کے ایک فراخ و مرفہ الحال شہر کی وسعت پیدا کر لے تو اس کی تنظیم و ترتیب بہت آسانی کے ساتھ عدیدانہ ہو سکتی تھی۔ شہر کی مرفہ الحالی کی وجہ سے آزاد غیر شہریوں کو شہر میں آکر رہنے کی رغبت ہوتی تھی اور ان کا شمار ان شہریوں سے بڑھ جاتا تھا جن کی تعداد وراثت کے ذریعے سے محدود ہوگئی تھی۔

میرا قیاس یہ ہے کہ نو آبادی کی تاریخ کے نہایت ہی ابتدائی مدارج میں عدیدانہ حکومت اسی طریقے پر وجود میں آئی ہوگی۔ قدیم ترین آباد کاروں نے زیادہ تر اپنی مقبوضہ زمین کو برابر کے حصوں میں تقسیم کر لیا ہوگا کیونکہ ابتدائی آباد کاروں کا باہم مجتمع ہونا مفاہمت پر ہوا ہوگا، جب نو آبادی کی مرفہ الحالی و وسعت میں ترقی ہوئی ہوگی تو ان

---

[۱]۔ لامحالہ اس معاملہ میں وہ لوگ جدید یورپ سے مغائر تھے کیونکہ اس زمانہ میں بالعموم یہی ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں کی اولاد جس ملک میں پیدا ہوتی ہے اسی کی شہری سمجھی جاتی ہے۔

"حصہ داران اراضی"[1] کے اخلاف نے شہریت کے حقوق کو اپنے لئے مخصوص رکھا ہوگا اور شہر کی مرفہ الحالی سے جو تاجر بتدریج وہاں آباد ہونے کی طرف مائل ہو گئے ہوں گے ان کو اور اپنے زرعی غلاموں کو اس حق سے علٰحدہ رکھا ہوگا اور اس طرح آہستہ آہستہ حکومت نے عدیدانہ صورت اختیار کر لی ہوگی[2]

اس کے برخلاف ایتھنز کی طرح کی وہ شہری سلطنتیں جن کا ہمیں تاریخی علم ہے، اور جو "امتزاج واتحاد باہمی" کے ذریعے سے قائم ہوئی ہیں یعنی چھوٹے چھوٹے قصبے جن کی جداگانہ ہستی بدستور قائم تھی، سیاسی طور پر متحد ہو گئے تھے، ان کی نسبت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتحاد ہی بجائے خود اس کا سبب ہوا ہوگا کہ ابتداً، جو اختیار عام اہل شہر کی طرف سے عمل میں آتا تھا، اب وہ ان بڑے بڑے ذی املاک اشخاص یعنی قدیم خاندانوں اور ارباب دولت کے ہاتھ میں آ جائے جنھوں نے فی الواقع مرکزی قصبے میں اپنی بود و باش اختیار کر لی ہو۔ عملاً صرف یہی لوگ پورے سیاسی مفہوم میں شہری رہ گئے ہوں گے کیونکہ اگرچہ چھوٹے چھوٹے صاحبان املاک باضابطہ طور پر مجلسوں سے خارج نہیں کر دئے گئے تھے مگر ان کو شرکت کا موقع بھی بہت کم ملتا رہا ہوگا۔

پس قیاس یہی چاہتا ہے کہ ایک سے زائد طریقے ایسے تھے کہ آزاد اشخاص کی قدیم مجلس کی سیاسی حیثیت میں کسی قسم کا باضابطہ تغیر کئے بغیر رفتہ رفتہ سیاسی اقتدارات ملت کے آزاد اشخاص کی ایک نسبتاً قلیل التعداد جماعت کے ہاتھ میں مجتمع ہوتے گئے ہوں۔

---

[1] "گاموروئی" یا گیوموروئی" سرقوسہ اور ساموس میں یہ لوگ عدیدی تھے لیکن ایتھنز میں انکی نوعیت عدیدی نہ تھی۔

[2] ہمارے زمانہ میں عدیدیت کی اس طرح نشو و نما حاصل کرنے کی ایک مثال ٹرانسوال کی موجود ہے۔

میرا گمان یہ ہے کہ اس قسم کا عمل اپولونیا (واقع ساحل بحر آیونیہ) اور تھیرا میں بھی واقع ہوا ہوگا تھیرا کی نسبت ارسطو ("سیاسیات" میں) یہ کہتا ہے کہ لازماً دولتمند نہیں مگر محض آزاد شہریوں کی ایک قلیل جماعت تھی جو کثیر التعداد جماعت پر حکمرانی کرتی تھی۔ مدتی اعزاز بران خاندانوں نے اپنا قبضہ جما لیا تھا جن کا دعوی یہ تھا کہ وہ مقدم طبقہ امراء سے ہیں کیونکہ وہی نو آبادیوں کے اولین بانی تھے۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے وہ معدودے چند تھے اور رعایا بہت زیادہ تھی"۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر تشریح کروں گا۔ ابتدائی شہریوں کے اکثر اخلاف کے ہاتھوں سے زمین کے نکل جانے اور نتیجۃً کامل مدنی حقوق کے زائل ہو جانے کی وجہ سے حکمران طبقہ کی تعداد علی العموم گھٹتی جاتی تھی۔

۲۔ لیکن اس کے سوا ایک اور بھی اہم سبب تھا، جس کا اکثر صورتوں میں پتہ چل سکتا ہے اور جس کی نسبت ہم یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ وہ بہت وسعت کے ساتھ شائع تھا۔ اس سبب کا میلان ایک ایسی اقتصادی صورت پیدا کردینے کی طرف تھا جو عدیدیت کے حق میں مفید تھی یعنی جائداد کی عدم مساوات کا بڑھا دینا۔ میرے خیال میں اس امر کے لیے ضمنی قسم کی کافی شہادت موجود ہے کہ ابتدائی زمانے میں یونان کے اندر زمین کی کاشت اولاً زیادہ تر مجموعی طور پر ہوتی تھی، یعنی چراگاہ مشترک ہوتے تھے، اور ملت کے ہر ایک فرد کو زمین کے کم و بیش مساوی قطعات دیدیئے جاتے تھے اور غالباً اول اول عارضی طور پر ان کے قبضے میں ہوتے تھے، سرداروں کے لیے خاص طور پر بڑے قطعات مخصوص کیئے جاتے تھے اور کبھی کبھی ان بہادروں کو بھی ایسے قطعات دیئے جاتے تھے جنھوں نے ملت کی کوئی خاص خدمت انجام دی ہو۔

چراگاہوں کی نسبت یہ امر واقعہ کہ ابتدائی زمانے میں قیمتوں کا اندازہ مویشیوں کے ذریعے سے ہوتا تھا قطعی ہے کیونکہ اس کی وجہ قرار دینا مشکل ہے کہ جب تک چراگاہیں مشترک نہوں مویشی کیونکر مبادلے کا آسان ذریعہ قرار پاسکتے ہیں۔ قابل زراعت زمینوں کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہومر کی نظمیں جس زمانہ میں لکھی گئی ہیں اس زمانہ میں ان میں تغیر ہو رہا تھا۔ "ایلیاڈ" میں جہاں ہم مشترک قابل کاشت زمین کا ذکر پڑھتے ہیں وہیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ دولتمندوں کے لیئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی زمیندار کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ دولتمند کی صفت یا تو بھیڑ بکریوں کا بہت بڑا گلہ رکھنا بیان کی جاتی ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ "اس کے پاس سونا بہت ہے، یا تانبا بہت ہے"۔ "اوڈیسی" میں بھی کسی بڑے زمیندار کی نسبت جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے بہت سے قطعات ہیں"۔ یہ تعریف ہمیں اس زمانہ تک پیچھے لیجاتی ہے جب زمینوں کے ٹکڑے مختلف قطعات میں خاندانوں کے درمیان تقسیم ہوتے تھے، یہ ضرور ہے کہ یہ قطعات بالکل ہی مساوی نہیں ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں اسپارٹا اور دوسرے مقامات میں عام ضیافت کا قدیمی دستور بھی غالباً حقیقی یا فرضی قرابتداروں کے گروہوں کی یکجائی ملک ارضی کی یادگار تھا۔

مکمل قبضہ تخصیصی کے بعد بھی، ارسطو کی تحریر سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپارٹا کے مانند بہت سی ایسی سلطنتیں تھیں جن میں کچھ مدت مزید تک زمینوں کے قطعات

کی خرید و فروخت یا تو بالکل ممنوع تھی یا اسے روکا جاتا تھا، صرف مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ملتی تھی۔ پھر بھی مختلف وسعت کے خاندانوں کے اندر وراثت کی تقسیم سے عدم مساوات کا پیدا ہو جانا لازمی تھا اور جب خرید و فروخت کی اجازت کی صورت ہو تو اس کا اثر اور بھی تیز ہو جاتا ہو گا۔

پس اب سولن کے دستور کو روما و جرمنی کے مماثلات کے سلسلہ میں ملا کر ہم بہت اچھی طرح یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ زمین کی شخصی ملک کے پوری طرح پر ترقی کر جانے کے بعد بھی کچھ دنوں تک مدنی حقوق اور ذمہ داریاں ایک خاص مقدار کی زمین کی ملکیت کے ساتھ وابستہ رہیں، آزاد لوگ جن کے پاس زمینیں نہ تھیں اور جنھیں اجرت پر مزدوری کرنا پڑتی ہو وہ اپنے خرچ پر جنگ میں شریک ہونے کے فرض سے بری کر دئے جاتے تھے اور غالباً اسی جہت سے آزاد اشخاص کی مجلس میں ان کا حق شمول بھی باقی نہ رہتا ہو گا۔ بہر صورت بڑے بڑے زمینداروں کی سیاسی طاقت مقبوضات کی ترقی کے ساتھ بڑھتی رہی ہو گی، اور جبتک جنگ میں سواروں کی اہمیت کو فوقیت حاصل رہی اس طاقت کا خاص طور پر نمایاں ہونا لازمی تھا، اور زمانۂ قدیم میں ہر جگہ یکساں طور پر تو نہیں مگر پھر بھی وسعت کے ساتھ یہی حالت تھی[1]۔ اسپارٹا کے سوا اور ہر جگہ پیدل سپاہی ایک مدت تک ایک بے ترتیب غول سمجھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نسبتاً دولتمند رہے ہوں گے وہی اپنے ساتھیوں کے لئے سواروں کا سامان مہیا کر سکتے ہوں گے، پس جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے، اب ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ بادشاہوں کے دور کے بعد یونان میں جو دستوری حکومت اول اول قائم ہوئی تھی وہ کیوں زیادہ تر "نائٹوں (مبارزوں)" کے تحت اقتدار میں آجاتی تھی[2]۔ نائٹ وہی زمیندار تھے جو خود اپنے خرچ

---

[1]۔ مجھے یہاں یہ بیان کر دینا چاہئے کہ جب فن جنگ نے ترقی کی سواروں کا یہ تفوق بھاری زرہ پوش پیدلوں کی طرف منتقل ہو گیا اور پھر اور آگے چلکر قدیم طرز کے سپاہیوں کو یہ دیکھکر حیرت ہونے لگی کہ لڑائیوں کی ہار جیت ہلکے ہتیار رکھنے والے سپاہیوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ جنگ آزمائی کی اسی صورت کی ترقی نے شہری جھگڑوں میں زیادہ غریب شہریوں کو اہم فائدہ پہنچا دیا۔

[2]۔ "سیاسیات"، کتاب ششم (چہارم)، ۱۳۔ دیکھو ضمیمہ التعلیق (ب)

سے سواروں کے رسالے مرتب کرتے تھے، لیکن میرا قیاس یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے زمیندار جو اپنے خرچ سے پیدل سپاہیوں کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اور قدیم خاندان کے شرفا (یوپاتری) کے مقابلے میں ایتھنز میں حصہ دار ان اراضی (گیو موروئی) کہلاتے تھے، انھیں آزاد شہریوں کی مجلس میں شریک ہونے اور انتخابات میں حصہ لینے کا حق باقی رہتا تھا اگرچہ عہدوں اور اصلی قوت کا مرکز شرفا ہی ہوتے تھے۔

ارسطو کا خیال یہ ہے کہ یہ دستور حکومت اولاً برے معنوں میں عدیدانہ نہیں تھا یعنی وہ چند اشخاص کی ستمگارانہ یا خود غرضانہ حکمرانی نہیں تھی اور اگرچہ میں اس قدر قدیم زمانے کے لیئے ارسطو کو کوئی اہم سند نہیں سمجھتا لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ باغلب وجوہ یہ زیادہ تر صحیح تھا کہ چند اشخاص کی یہ ابتدائی حکومتیں "طبعی عدیدات" کے نام کی سزاوار تھیں جس کے معنی یہ ہیں کہ معدودے چند کے ہاتھ میں اختیار اس وجہ سے چھوڑ دیا جاتا تھا کہ "اکثر" اس کے اہل نہیں تھے اور خود کو ایسا سمجھتے بھی نہ تھے۔ پس میرا قیاس یہ ہے کہ عدیدانہ حالات کا غلبہ صرف ایک ہی طرز پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مختلف طریقوں سے ہوتا تھا، کچھ تو اس طرح ہوتا تھا کہ موروثی بادشاہوں کو برطرف کرکے جب ان کے بجائے سالانہ منتخب شدہ حاکم یا مجلس حکام مقرر ہو جاتی تھی تو قدیم مجلس خاص کے اختیارات بڑھ جاتے اور خاص اسی کے ہاتھ میں جمع ہو جاتے تھے، کچھ اس طرح سے ہوتا تھا کہ کامل الحقوق شہریوں کی تعداد اس طرح محدود ہو جاتی تھی کہ (الف) جن مملکتوں کا قیام فتح پر مبنی ہوتا تھا ان میں مفتوحین کو اور نوآبادیوں میں بعد کے آنے والوں کو حقوق شہریت سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ (ب) دوسرے یہ کہ اٹیکا کی ایسی سلطنتوں میں سیاسی امتزاج، اتحاد باہمی اور دولت کی عدم مساوات دونوں جمع ہو جاتی تھیں۔ پس اس طرح آٹھویں ہی صدی قبل مسیح میں ان مملکتوں کے اندر عدیدیت قائم ہو گئی تھی، جو تمدن و تہذیب کی مشہور تھیں، ان میں یونان کے اندر کورنتھ اور کالکس سب سے آگے تھیں۔ یہ تجارتی مملکتیں عدیدیت کی منزل طے کر چکی تھیں، لیکن مختلف ملتوں میں اس کا آغاز مختلف وقتوں میں ہوا تھا اور اس کے بقا کا زمانہ بھی مختلف تھا۔ اس کے بعد ساتویں صدی میں عدیدیت کے خلاف تحریک شروع ہوئی لیکن یونان کے جن حصوں میں زرعی کاروبار کا غلبہ اور تحفظی عادات کا تسلط تھا ان حصوں میں جہاں تک ہمیں علم ہے عدیدیت زیادہ دنوں تک

ہرگز نہ قائم رہی۔

لیکن اکثر ایسا ہوا تھا کہ عدیدیوں اور عوام کے درمیان اختیارات کے لئے جب کشمکش شروع ہوئی تھی تو عدیدیوں کی شکست کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ (معاً) عمومی ادارات قائم ہو جاتے تھے کیونکہ اس پہلی منزل میں عوام ہنوز حکمرانی کے قابل نہیں ہوتے تھے، آزاد شہریوں کے انبوہ میں اتنی فہم و فراست اور اتنا ملکہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ متحد ہو کر زمام حکومت کو مجموعۃً اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ یہ اختیارات اسی حوصلہ مند شخص کے ہاتھ میں چلے جاتے تھے، جس نے اپنی شان و شوکت کے بڑھانے کے خیال سے اس تحریک کی رہبری اختیار کی ہو۔ اس طرح "ترانش" (خودسری حکومت) وجود پذیر ہو جاتی تھی، گویا شاہی کی طرف بازگشت ہوتی تھی۔ لیکن قریب قریب تمام صورتوں میں یہ شاہی غیر آئینی قسم کی ہوتی تھی، اور بلا استثناء اس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ حق و قائم شدہ نظم و ترتیب کی خلاف ورزی ہے، یہاں تک کہ بادشاہ جب نرمی و عمدگی کے ساتھ حکومت کرتا تھا اس وقت بھی یہی سمجھا جاتا تھا۔

خطبۂ ششم

مطلق العنانی

۱۔ میں اس سے قبل "مطلق العنانی" کے واقعہ عجیبہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ خودسرانہ حکومت سے مقصود وہ میلان ہے جو یونانی نظم حکومت کے نشو و نما کے ایک خاص درجے یا بعض مدارج پر پہنچکر پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں آجاتی تھی، جو جابرانہ و بے ضابطہ طور پر اقتدار حاصل کر لیتا تھا، اور مادام الحیات مطلق العنانی کے جتنے خاص واقعات ہمیں تاریخی طور پر معلوم ہیں ان سب میں یہی پایا جاتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایسا شخص نہ صرف اپنی زندگی بھر کے لئے اس اقتدار پر قابض رہنے میں کامیاب ہو جاتا تھا بلکہ اپنے انتقال کے وقت وہ اپنے اس اختیار کو اپنے خاندان کے کسی رکن کی طرف بھی منتقل کر دیتا تھا (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) یہی وہ صورت ہے جو یونانی نظم حکومت کے ارتقا کو رومانی دستور سلطنت کے ارتقا سے ممیز کر دیتی ہے، اور سیاسیات کے طالب علم کے لئے یہ اس نظر سے بھی دلچسپ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں اطالیہ کی بڑی جماعتوں نے جس طرح سیاسی ترقی حاصل کی اس میں اور یونان کی اس حالت میں خاص مماثلت پائی جاتی ہے۔ اطالیہ کی شہری جماعت کی ترقی کے متعلق میں بعد کو توجہ دلاؤنگا۔

میں یونانی لفظ ٹیرانس (Tyrnuis) یا مطلق العنانی کو اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ ایک طرف تو انگریزی لفظ ٹیرنی (Tyranny) سے خواہ مخواہ ذہن اس جانب منتقل ہو جاتا ہے کہ ٹیرانس یا مطلق العنان (Tyrannus)

اپنے اختیارات کو عملاً جبر، خود رائی اور ظلم کے ساتھ استعمال کرتا تھا اکثر ایسا ہی ہوتا تھا مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا اور پانچویں اور چوتھی صدی (قبل مسیح) کے مصنفوں نے یونانی لفظ کو جس طرح استعمال کیا ہے، اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ ارسطو نے جس کی تحریر چوتھی صدی کے ربع آخر کی ہے، اس نے یہ لکھا ہے کہ کسی تیرانس (Tyrannus) کے لئے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو جابرانہ صورت ہے اور اکثروں نے اسی طریقے کو اختیار کیا ہے، اور دوسری مصالحانہ صورت ہے مگر در اصل ارسطو کا مفہوم یہ ہے کہ نرمی و اعتدال سے حکومت کرنے کی وجہ سے کوئی "تیرانس" اس زمرے سے خارج نہیں ہو جائے گا، بلکہ وہ اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔ دوسری طرف لفظ "ڈسپاٹ" یا مطلق العنان (Despot) اور بے ضابطہ ہونے کی خصوصیت کا مفہوم پوری طرح سے مترشح نہیں ہوتا ہے، اور اصولاً یہ ایک نہایت ہی اہم خصوصیت ہے۔ کم از کم مقدونیہ کے غلبہ تک تو ضرور ایسا ہی تھا، آزاد یونان کے جس قدر واقعات معلوم ہیں ان میں سے تقریباً ہر ایک واقعے میں یہ "خودسری" کسی زبردست ناگہانی کارروائی سے وقوع پذیر ہو جاتی تھی، اور بے ضابطہ و خلاف قانون صورت میں قائم رہتی تھی۔ ہمیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہے کہ کسی خود مختار یونانی سلطنت نے کبھی کسی کے حضور تاج پیش کیا ہو۔ البتہ جب اہل قرطاجنہ پر فتح حاصل ہوئی تو اس کے بعد گیلون (Gelon) کو سرقوسہ کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا، یہی ایک استثنا ہے، اور یہ بھی صاف طور پر واضح نہیں ہے اس مطلق العنانی کی وسعت و حالات پر غور کرتے وقت ہمیں مقدم و موخر زمانوں میں امتیاز قائم کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے خودسری کے حسب مطلب خاص یونان میں مقدم دور کا آغاز ساتویں صدی کے نصف اول میں شروع ہوا تھا، اور اجمالاً یہ کہنا چاہیئے کہ سرزمین یونان، جزائر ملحقہ اور یونان کے ایشیائی شہروں میں چھٹی صدی کے شروع ہونے کے قبل ہی اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ (ایشیائی شہروں میں ان شہروں کو شمار نہ کرنا چاہیئے، جو ایرانی حکومت کے تحت میں آگئے تھے) یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مختلف شہروں میں اس کا آغاز و انجام مختلف وقتوں میں ہوا کیا ہے اور کوئی خاص صورت ایسی نہیں ہے جس میں یہ بے ضابطہ مطلق العنانی (خواہ وہ موروثی ہی کیوں نہ ہو گئی ہو) بہت دنوں تک قائم رہی ہو۔ ارسطو کی رائے کے موافق سکیون کی مطلق العنانی

سب سے زیادہ طویل المدت تھی اور یہ کل سو برس تھی، مگر ان اطراف واکناف میں شاہان مطلق العنان کے دور کو کم وبیش ۶۵۰ق م سے ۵۵۰ق م تک سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد پرزور و شاندار جمہوری زندگی کا آغاز ہوا جو جنگہائے ایران کے وقت سے شروع ہوکر مقدونیہ کے غلبہ کے وقت تک قائم رہی، ہم جب یونان کی تاریخ پڑھتے ہیں تو خاص طور پر اسی دور کو پڑھتے ہیں، یہی وہ زمانہ ہے جبکہ یونان میں شہری سلطنت کا سیاسی احساس اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا، اور جمہوری جذبات خواہ اعیانی صورت میں ہوں یا عمومی صورت میں بہ حیثیت مجموعی اس قدر قوی تھے کہ مطلق العنانی کی طرف مائل نہیں ہو سکتے تھے۔

سسلی اور جنوبی اطالیہ کی بعد کی نوآبادیوں میں، قدیم تر خودسری کا دور بعد میں شروع ہوا۔ اور بعد ہی میں ختم ہوا، اس کا آغاز ساتویں صدی کے آخر تک نہیں ہوا تھا، اور سسلی میں اس کا سب سے زیادہ تابناک زمانہ پانچویں صدی کا ربع اول تھا اور یہ زمانہ اس سے بہت ماقبل نہیں ہے جب (۴۶۶ھ میں) عام طور پر مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد ۴۰۵ھ کے بعد ہی جلد تر اس دور کا آغاز ہوا جسے ہم آخری مطلق العنانی کے نام سے ممیز کرتے ہیں مگر اس کی وسعت اتنی نہیں ہوئی جو کسی اعتبار سے سابقہ دور مطلق العنانی کی ہمسری کر سکے، کم از کم مقدونوی غلبے کے قبل تک تو یہ حال ضرور تھا، ان دونوں کے درمیان جو امتیاز ہے، اس پر اس اعتبار سے زائد از ضرورت زور دینے کی حاجت نہیں ہے، کہ دونوں دوروں میں جو طرز رائج تھا ان میں زیادہ قطعی و حتمی فرق تھا، مگر اجمالاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کے اسباب و علل مختلف تھے، سابقہ مطلق العنانی کے اسباب کا تعلق زیادہ تر یونانی شہری سلطنتوں کی داخلی سیاسی ترقی سے تھا، عمومی حکومت کی جانب ابتدائی نامکمل تحریکات کی وجہ سے بالعموم اس کا امکان پیدا ہو جاتا اور اس کے قیام کا موقع ملجاتا تھا، موخر مطلق العنانی کے اسباب بظاہر زیادہ تر اندرونی سیاسی ارتقا سے باہر واقع ہوئے تھے۔ سیاسی بدنظمی ہمیشہ اس کے مفید مطلب حالات پیدا کر دیتی تھی مگر اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اجیر سپاہیوں سے کام لینے کا میلان بڑھتا جاتا تھا۔

ایک دوسری قسم کا سبب وہ تعلق ہے جو کمزور سلطنتوں کو اپنے زیر دست

ہمسایوں کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا اور یہ سبب جس طرح دور ثانی میں اثر انداز تھا اسی طرح دور اول کے آخری حصے میں بھی تھا۔ جن انقطاع ملک کو عملاً توابع کہنا چاہئے ان پر کسی زبردست ہمسایہ کے حکمرانی کرنے کا سب سے زیادہ سہل الحصول طریقہ یہ تھا کہ وہاں کوئی واحد حکمران مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام پر ایشیائے کوچک کے ساحل آیونیہ میں مطلق العنانی رائج ہو گئی۔ اور سکندر کے ایران فتح کرنے کے بعد اور معاقدہ اکائیم کی نشو ونمائے سقیت کی جیسی کچھ ترقی ہوئی اس کے قبل بڑی حد تک اس کا خاتمہ ہو گیا۔

پس اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ خودسری کا دور اس زمانہ سے قبل واقع ہوا تھا جب یونانی شہری سلطنتوں کے باشندوں میں کامل سیاسی احساس نہیں پیدا ہوا تھا۔ بعد میں مطلق العنانی از سرنو اس وقت قائم ہوئی جب پرامن صنعت و حرفت کے عادات نے معمولی باشندوں کی طاقت اور ان کی حفاظت ذاتی کی عادت کو کمزور کر دیا اور اس لئے جیسا کہ ارسطو نے واضح کیا ہے جو شخص مطلق العنان حکمران بنتا تھا، ہر ایک واقعہ خاص میں اس کی نوعیت جداگانہ ہوتی تھی۔ ازمنہ قدیمہ میں جبکہ فصاحت و بلاغت کے فن نے ترقی نہیں کی تھی جو شخص عام پسند تحریک کے سرگروہ کی حیثیت حاصل کرتا تھا وہ بالعموم کوئی نہ کوئی فوجی قابلیت کا شخص ہوتا تھا، اور اس طرح عوام کی سرگردگی سے گزر کر مطلق العنانی تک پہنچ جانا آسان تھا اور دور اول میں زیادہ تر یہی سرگروہ ترقی کر کے مطلق العنان حکمران بن جاتے تھے اس کے برعکس، زمانہ مابعد کے سرگروہ معمولاً جنگجو لوگ نہیں ہوتے تھے اور اس لئے ان میں کسی زبردست ناگہانی کارروائی سے کامیابی حاصل کر لینے کی اہلیت بھی نہیں ہوتی تھی، اور چونکہ بعد کے زمانے کے عامۃ الناس سیاسی حد بلوغ کو پہنچ گئے تھے، اس لئے انھیں فریب دینا بھی علی العموم اتنا آسان نہیں تھا، تاہم اگر ان سے چاپلوسی و خوشامد سے کام نکالنا وقت طلب تھا تو انھیں دھمکی دینا ممکن تھا اور جنگ و پیکار کے اجیرانہ طرز کی ترقی کی وجہ سے فوجی قابلیت رکھنے والے بیباک سربازوں کو تہدید کے خطرناک مواقع حاصل ہو جاتے تھے، خاصکر اس حالت میں جبکہ فرقہ بندی و ناقص حکومت نے آئینی حکومت کے ساتھ وابستگی اور قوم کے موثر ارتباط کو کمزور کر دیا ہو۔

۲۔ قدیمی عدیدیت کے خلاف تحریک کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) ارباب دول کی جانب سے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو تکلیف پہنچی تھی۔ یہ تکلیف کچھ تو عام حقوق کو دبا لینے سے ہوتی تھی، چنانچہ میگارہ میں خودسر تھیاگیس نے دولتمندوں کے ان مویشیوں کو مار ڈالا جو اراضی عامہ میں داخل ہو گئے تھے[۱] اور کچھ تکلیف اس وجہ سے ہوتی تھی کہ تمدن جس قدر ترقی کرتا گیا اسی قدر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے لئے دولتمندوں سے قرض لینے کا خطرناک راستہ وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ قدیم زمانہ کے شدید قانون کے تحت میں دولتمند غریبوں کو اسی طرح ستانے لگے جیسطرح بعد میں روما میں۔

(۲) تجارتی قصبوں میں، قدیم خاندانوں کے محدود گروہ کے باہر نئے نئے دولتمند بنتے اور ترقی کرتے گئے، جس سے کامل شہریت کے نئے دعویداروں کی ایک روزافزوں قوت وجود میں آگئی[۲]۔

(۳) تجارت اور وسائل آمد و رفت کی وجہ سے طبائع میں بیداری پیدا ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ عادات و اطوار کی قدیم سادگی اور قدیم اخلاقی قیود زائل ہوتے گئے جس سے امرا زیادہ قبیح عیش پرستی و رعونت کی طرف مائل ہو گئے[۳]۔

(۴) انھیں اسباب میں ہم ایک سبب کا اور اضافہ کر سکتے ہیں۔ یعنی غیر تحریری قانون، کی طرف سے بے اعتمادی ہوتی گئی کیونکہ جو دولتمند اسے عمل میں لاتے اور اسے نافذ کرتے تھے وہ اسے یوماً فیوماً غریبوں کے ستانے کا آلہ بناتے جاتے تھے۔

اس آخری اور کسی حد تک پہلے سبب کا تدارک تحریری ضوابط کے نفاذ سے کیا گیا۔ ساتویں صدی وہ دور ہے جب ضابطہ ترتیب دینے والے یا مقنن محض افسانے کے علاوہ تاریخ میں پہلی مرتبہ افسانہ سے جداگانہ خودسر حکمران کے دوش بدوش نمایاں ہوئے۔

---

[۱] ارسطو "سیاسیات" کتاب ہفتم، پنجم باب ۵، ۹ (۱۳۰۹ الف)

[۲] ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (ج) متعلقہ قدیمی عدیدیت و تجارت

[۳] ارسطو۔ سیاسیات، (۵)، ۱۰، ۱۹ (۱۳۱۱ ب) کہتا ہے کہ منی لنہ (واقع لسبوس میں) پنتھال خاندان اس وجہ سے معزول کیا گیا کہ وہ شرکوں پر دیا بند اشہریوں کو سونٹھوں سے مارتے پھرتے تھے۔

اول اول نوآبادیوں میں ان کا ظہور ہوا (سنہ ۶۶۲ کے قریب) زالیوکس کا ذکر لوکری کے تحریری وضع قانون کے مصنف اول کے طور پر کیا گیا ہے[ع۱]۔ اور کتانا کا خاروندا اس اس سے کچھ ہی بعد کو ہوا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ مرتب ضوابط نے سلطنت کو مطلق العنانی کے پنجے میں گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ خاروندا اس کے زمانے کے قریب یا اس سے کچھ قبل انیھنز میں ڈراکون نے قوانین وضع کئے تھے، اور اس سے کچھ دن بعد سولن نے قوانین بنائے۔ لیکن موخرالذکر سے مطلق العنانی کی روک تھام نہ ہوئی[ع۲] ہم یہ نہیں جانتے کہ زالیوکوس، خاروندا اس یا ڈراکون کو کس قدر سیاسی اختیارات تفویض ہوئے تھے، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ سولن کو اختیار حاصل تھا اور اس لئے اسے ”اسے سمیسٹ“ کے زمرے میں ایک مثال کے طور پر شمار کرسکتے ہیں[ع۳]، بقول ارسطو، [ع۴] شخصی حکمران یا آمر مطلق ہوتے تھے یعنی انھیں غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے مگر ان کا انتخاب قانون کے موافق ہوتا تھا، یہ انتخاب خواہ زندگی بھر کے لئے ہو یا کچھ برسوں کی میعاد معین کے لئے، سولن کا انتخاب صرف ایک برس کے لئے ہوا تھا یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کا انتخاب کسی خاص کام کے لئے ہو۔ ارسطو نے جو مثال دی ہے وہ متی لنہ کے پتاکوس کی ہے جو دس برس کے لئے مقرر ہوا تھا (سنہ ۵۹۰ سنہ ۵۸۰)۔ ارسطو کہتا ہے کہ اس نے ایک مجموعۂ ضوابط کی ترتیب دی تھی مگر کسی دستور سیاسی کی ترتیب نہیں کی تھی، اغلب یہ ہے کہ اس نے حکومت عدیدی کو تسکین بخش اور قابل برداشت بنادیا تھا۔ بہر حال اتنا تو ضرور ہے کہ اس کے بعد سے ہم کسی مطلق العنان کا ذکر نہیں سنتے[ع۵] لیکن یہ

عله۔ اسٹرابو، ششم ۲۵۹۔

عله۲۔ سولن نے ایتھنز کو مطلق العنانی سے تو نہیں بچایا مگر عمومیت کے عملدرآمد کے لئے زیادہ اچھا سامان تیار کردیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولن کے دستور کے اشکال مطلق العنان کے زمانے کے بعد تک باقی رہے۔

عله۳۔ ارسطو۔ سیاسیات کتاب سوم باب ۱۴، ۹ (۱۲۸۵ الف)؛ ششم (۴) باب ۱۰، ۲ (۱۲۹۵ الف)

عله۴۔ لیکن تپاکوس کا زمانہ ایک خودسرانہ حکومت کے دور کے بعد واقع ہوا تھا، درحقیقت اس نے ایک خودسر ملینکروس کو زیر کر لیا تھا۔ (۶۱۲۔ ۶۰۹ ق م)۔

اسے سیمنٹ کی حیثیت سے ملطیں اپمیندیس کا ذکر کرتا ہے، جس کا تقرر اس وجہ سے ہوا تھا کہ ایک نلیدکر

باقاعدہ مقرر کیا ہوا حاکم مطلق ایک مستثنی شخص ہوتا تھا، اس سے بدرجہا زیادہ کثیر الوقوع عجوبہ مطلق العنانی تھی۔

۳- ابتدائی خودسری کے حالات پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے دل میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یونان کے مختلف حصص کی ترقی میں بہت بڑا تفاوت تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خود یونان اور اس کی نوآبادیوں کے چھوٹے سے خطے کے اندر مختلف خودمختار قومیں ایک ہی وقت میں مختلف مدارج ترقی کی حالت میں تھیں۔

یونان میں تمدن سمندر کے راستے سے داخل ہوا تھا، اور اسی تمدن کی جلو میں سیاسی تغیر کا سیل بھی بڑھ آیا تھا، پس سیاسی ارتقا کے معاملے میں اندرون ملک کی آبادی سواحل کی آبادی سے پیچھے رہ گئی تھی۔ تمدن جنوب و مشرق سے آیا تھا، مصر اور فینیقیہ اور خصوصاً فینیقیہ نے تمدن کی مشعل یونان کے ہاتھ میں دی تھی، لہذا شمال مغرب کے لوگ بلکہ اس کے ساحلی مقامات تک کے باشندے مشرق و جنوب کے باشندوں سے پیچھے رہ گئے، بجز ان مقامات کے جہاں آبادکار کورنتھ سے آئے تھے، جس کی خاص جائے وقوع نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مشرق و مغرب دونوں سے یکساں طور پر تجارت کر سکے۔ ارتقا کے اس عدم مساوات کا اظہار نمایاں طور پر اوقات کے اُن اختلافات سے ہوتا ہے جب یونان کے مختلف حصص نے شہری زندگی اختیار کی تھی۔ یہ نکتہ نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سیاسی نظم معاشرت کا وہ طرز جس میں سیاسی و معاشری زندگی ایک مرکزی شہر میں مجتمع ہوتی تھی یونان میں ترقی تمدن کے ساتھ متمدن نظم معاشرت کا رائج الوقت طرز تسلیم کر لیا گیا تھا، مگر اس سے ہمیں یہ فرض نہ کرنا چاہیے کہ یونان کی چھوٹی چھوٹی خودمختار قوموں نے ہر جگہ ایک ساتھ یہی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک طرف تو یہ صحیح ہے کہ ہومر کے وقت میں یہ انداز پیدا ہو رہا تھا چنانچہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے کو ہار کر خودسر بن گیا تھا، پس اس طرح نلیڈیوں کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا، بظاہر اس کا سبب عدیدیت کی مخالف تحریک نہیں ہے۔ گلبرٹ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اہل میڈیا کے خلاف ایرانیوں کے خروج کے وقت اہیسیس کا ارسٹارکس مطلق العنان نہیں بلکہ "اے سمنٹ" تھا، فی الجملہ اس امر کی شہادت ناکافی ہے کہ "اے سمنٹ" کا قائم ہونا عدیدیت کے خلاف عامۃ الناس کی جد و جہد کے طور پر ہوا تھا۔

اوڈیسی میں نویں یا آٹھویں صدی کے شاعر نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ پنیلوپ کے خواستگار جس طبقہ کے لوگ تھے یعنی اتھاکا کے امرا و شرفا وہ سب جزیرے کے کسی ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور غیر ملکی خواستگاروں کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ وہ دوسرے شہروں کے لوگ تھے[ع۱]۔ دوسری طرف تھیوسیڈائڈس یہ کہتا ہے[ع۲] کہ اس کے وقت یعنی پانچویں صدی کے نصف آخر میں مغربی اہل لوکرس، اہل ایٹولیہ، اہل اکارنانیہ اور بر اعظم یونان کے شمال مغرب کے دوسرے باشندے بدستور اسی قدیم طرز کے چھوٹے چھوٹے غیر محصور دیہاتوں میں رہتے تھے، اور اس لئے ان میں ہتھیار اپنے ساتھ رکھنے کی پرانی عادت بدستور باقی تھی، حالانکہ یونان کے زیادہ مہذب حصص میں روز افزوں امن و طمانیت کی وجہ سے یہ عادت مدتوں قبل ترک ہو چکی تھی، آرکیڈیا کے بہت بڑے حصہ میں "کینٹن" یعنی دیہاتوں کا حلقہ نسبتاً بہت بعد کے زمانے تک معمولی سیاسی فرد بنا رہا تھیوسیڈائڈس نے جن مغربی حصص کا ذکر کیا ہے ان کی نسبت آرکیڈیا کا حال زیادہ تر معلوم ہے اور اس لئے آرکیڈیا کے متعلق اس امر کا سراغ لگانا بھی دلچسپ ہے کہ کس تدریجی رفتار سے نظم دستور سیاسی کے شہری طرز نے کوہستانی اضلاع پر یورشیں کیں، اس کارروائی میں سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ واقعات ہیں جنھیں یونانی "امتزاج" (Synaikism) کہتے تھے، یہ خیال و واقعہ بالکلیہ یونانی تاریخ کے لئے مخصوص ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتوں کی ایک تعداد کو بالارادہ اور مصنوعی طور پر قصبے میں بدل دیا جائے۔ اس کا ایک نمایاں اور مشہور عام وقوعہ یہ ہے کہ چوتھی صدی میں جنگ لیوکترا کے بعد اہل تھیبس کے اشارے سے آرکیڈیا کے جنوب میں ایک "بلدیہ عظیم" (Megalppolis) اسپارٹا کے مدمقابل کے طور پر اور اس سے مامون و مصئون رہنے کے لئے قائم کیا گیا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس "امتزاج" کی دو حیثیتیں تھیں، سیاسی و مادی۔ اصلاً و مقدماً یہ ایک سیاسی تغیر تھا مگر اس کے ساتھ مختلف وسعت کے مادی تغیرات بھی شامل تھے جس امر کا تعین اور جس کا نفاذ ہوتا تھا تو وہ یہی تھا کہ چند دیہات جو اب تک بہت کچھ خود مختار

ع۱۔ اوڈیسی، کتاب ۲۴، ۱۸۴۔
ع۲۔ طوسی ڈیڈس کتاب یکم، ۵۔

ہوتے تھے، ان کی سیاسی زندگی کا اجراء اب ایک نئے شہر کی صورت میں یا پرانے شہر کو وسعت دیکر قرار پاجاتا تھا، حکمران جمعیتوں اور مجلسوں کا اسی شہر میں مجتمع ہونا ضروری ہوتا تھا اور حکمران افراد مستقلاً وہیں قیام کرتے تھے، دیہات کے باقی لوگوں کے متعلق معمولاً یہ ہوتا تھا کہ وہ اگر چاہتے تو اپنے پرانے مکانوں میں رہنے کے مجاز ہوتے تھے، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو انھیں اس امر پر رضامند ہونا پڑتا تھا کہ ان پر مرکزی قصبے ہی سے حکمرانی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم تر زمانے میں "کنیشن" یعنی کسی سیاسی جماعت کو جو دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں منتشر ہو اور جسے ایک معقول حد تک خود مختاری بھی حاصل ہو، شہری سلطنت کی صورت میں "مجتمع" کرنے کی یہ کارروائی نسبتاً کم تصنع اور زیادہ آہستگی کے ساتھ عمل میں آتی تھی مگر کسی نہ کسی شکل میں اس کا سلسلہ یونان کی تمام تاریخ میں جاری رہا۔

میں نے آخری خطبے میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ جہاں تک جمعیت کی ترکیب کا تعلق تھا قدیم تر زمانہ میں یہ تغیر کس طرح اولاً عددیت کی طرف مائل ہوتا گیا، دولتمند نئے یا وسعت یافتہ شہر میں مجتمع ہو جاتے تھے اور غربا میں یہ استطاعت نہ تھی کہ وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر وہاں چلے جائیں، پس بغیر اس کے کہ غربا کو قدیم دستوری حقوق سے باضابطہ محروم کیا جائے علاوہ از خود احرار کی جمعیت عام کی شرکت سے معذور ہو جاتے تھے اور اسی لئے جب شہروں میں حرفتی و تجارتی مستقر کو ترقی ہوتی تو یہی اجتماع جو ابتدائی مدارج میں مطلق العنانی کا موقع پیدا کر دیتا تھا، بالطبع عمومیت کی تحریک کے مفید مطلب بن جاتا تھا۔

لیکن حرفتی عناصر کی یہ نشو و نما بھی حکومت کے ایک مرکز پر مجتمع ہو جانے کے باوجود، مختلف سلطنتوں میں نہایت مغائر یکدگر طور پر وقوع پذیر ہوتی تھی جن انقطاع میں کاشتکاری کو غلبہ حاصل ہوتا رہا وہاں طبیعت کا وہ تحرک جو غیر ملکیوں کے ساتھ سہولت آمد و رفت کی وجہ سے پیدا ہو جاتا تھا، تجارت سے جو مختلف صنعتیں وجود پذیر ہوتیں، اور اسکے ساتھ خواہشوں میں جو وسعت پیدا ہوتی ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی تھی، اور متمول زمینداروں کی قدیم "طبعی عددیت" از خود بہت زیادہ زمانے تک قائم رہتی اور جب ان انقطاع میں عمومی تحریک کا وقت آیا تو اس وقت تک یونان میں مطلق العنانی کے متعلق سیاسی احساس میں تنفر پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ان انقطاع

کے ارتقا میں یہ درجہ ساقط ہو گیا۔

۴۔ اسی وجہ سے ہم مطلق العنانی کے متعلق خود اس زمانہ تک میں جسے خود سروں کا دور کہتے ہیں یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ ایک ایسا درجہ ہے جسے یونانی نظم حکومت نے بلا استثنا بلکہ عام طور پر بھی طے کیا ہو، البتہ یہ ایک ایسا درجہ ضرور ہے جسے ان سلطنتوں نے بالعموم ضرور ہی طے کیا ہوگا جو چند خاص حالات کے تحت میں ترقی کر رہی ہوں گی یقیناً مطلق العنانی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں کہ اگر ہمارے معلومات زیادہ مکمل ہوتے تو ہمیں اور بھی بہت سی مثالیں معلوم ہو جاتیں، لیکن زیادہ قریب سے دیکھنے سے ہم ہیلاس (یونان) اور اس کے مستعمرات (یعنی وسعت یافتہ ہیلاس) میں یہ تمیز کر سکتے ہیں کہ کس جگہ کس خاص دور میں حالات، مطلق العنانی کے زیادہ موافق تھے اور کہاں یہ ناموافق تھے، اور میرے خیال میں اس قسم کی تمیز کا قائم کرنا بہت ضروری ہے۔

ایشیائے کوچک کے ساحل اور سسلی و اطالیہ کے مستعمرات میں یہ طریقہ بہت ہی عام معلوم ہوتا ہے، اور یہی حال قدیم یونان کے ان حصص کا تھا جو تجارت کے اثر میں تھے، (یہ اثرات تمدن آفرین تھے اور اضطراب انگیز بھی) مگر قدیم یونان کے بیشتر حصص کے متعلق ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔

ہمیں اس پر ایک نظر ڈالنا چاہیے، شمال مغرب جہاں دیہی جماعتیں اور معاشرت کے قدیم کیفیات بدستور جاری تھے، وہاں کی نسبتاً کم متمدن و غیر ترقی کن اقوام کو چھوڑ کر ہم تھسلی میں یہ دیکھتے ہیں کہ عدیدی حالات قدیم مطلق العنانی کے دور کے بہت آگے تک چلے جاتے ہیں اور جب بالآخر خودسر کا تسلط ہوتا ہے تو وہ عامۃ الناس کے سرگروہوں کے زمرے سے نہیں ہوتا۔ بیوتیہ میں بھی ہم مطلق العنانی کا ذکر نہیں سنتے، جنگ ایران کے وقت تھیبس میں مستحکم عدیدیت موجود تھی جو صورت حالات کا بقیہ معلوم ہوتی تھی اور جب چوتھی صدی میں پرزور عمومیت کی تحریک کا وقت آیا تو پھر مطلق العنانی کا وقت باقی نہیں رہا اور غالباً بیوتیہ کے دوسرے شہروں کی نسبت بھی یہی صادق آتا ہے۔ جب ہم پیلوپونیز پر نظر کرتے ہیں تو اسپارٹا اور لقونیہ میں فی الواقع کسی قسم کی خودسری نہیں تھی، ارگولس میں بھی مطلق العنانی نہیں تھی، اور غالباً ارگوس اس طرح بچ گیا کہ وہاں تخفیف شدہ اختیارات کے ساتھ بادشاہی باقی رہ گئی تھی۔ ایلیس میں بھی مطلق العنانی کی کوئی

شہادت نہیں ملتی، یہی حال اکائیہ کی چھوٹی اور زیادہ عمومیت پسند جماعتوں اور کوہستانی، آرکیڈیا کے حلقہائے دیہی کا تھا۔

اس کے برخلاف اٹیکا اور خاکنائے (کورنتھ) اور یوبیا کی ساحلی اور زیادہ تجارتی سلطنتیں (سکیون، میگارا، کورنتھ، کالکس وغیرہ) ساتویں صدی کے وسط سے آگے برابر قدیم مطلق العنانی کی مشہور و معروف مثالیں پیش کرتی رہیں، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کچھ زمانے کے بعد نو آبادیوں میں بھی ہم خودسری کا زور و شور دیکھتے ہیں جنمیں ایشیائی ساحل کی وہ شہری سلطنتیں بھی شامل تھیں جو باقاعدہ استعماریت کے شروع ہونے کے قبل یونانی تارکان وطن نے قائم کی تھیں، سسلی کی نو آبادی میں خودسری کو خصوصیت سے سرسبزی حاصل ہوئی جہاں اسے شاندار دور نصیب ہوا۔ بلاشبہ مستعمری نظم بالطبع زیادہ تحریک پذیر تھا[1] اور غالباً یہ بھی تھا کہ مختلف نسلوں کا اختلاط مطلق العنانی کے حق میں زیادہ مفید تھا۔

اب اس سے میرا خیال اس طرف رجوع ہوتا ہے کہ جن مقامات میں خودسری کو فروغ حاصل ہو چکا تھا، وہاں سے بھی بعض حالتوں میں خودسری کا اخراج اس وجہ سے ہوا کہ عددیت کی بنیاد وسیع ہو گئی تھی۔ یہ کوئی ناقابل خطا علاج نہیں تھا مگر یہ حیثیت مجموعی موثر معلوم ہوتا ہے مثلاً پانچ مواقع ایسے ہیں[2] جن میں اگرچہ حکومت بدستور عددی سمجھی جاتی تھی مگر بحث و تمحیص کی اعلیٰ جماعت کی تعداد "ایک ہزار" تھی۔ ان پانچ مواقع میں سے ایک موقع تو ایشیائے کوچک کا تھا، تین اطالیہ کے اور ایک شمالی یونان کا۔ یونان کی شہری سلطنتوں کی وسعت کے تناسب سے جب اس پر خیال کیا جاتا اور ایک ہی ایک خاندان کے یا خاندانوں کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی حکمرانی سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اسے ایک توسیع دادہ عددیت کہہ سکتے ہیں، اور کم از کم ایک صورت میں تو ایسا تھا کہ اس قسم کی عددیت کے قیام کو شہریت کی وسعت کی حیثیت میں بیان کیا گیا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق (د) درباره تقدم مستعمرات در تمدن۔

[2] کیمے واقع ایولس، اوپس اور اس کی اطالوی نو آبادی لوکری، ریجیوم، اکراگس کو بھی اس زمرے میں ہے، مگر میرا خیال یہ ہے کہ وہاں اس قسم کی باضابطہ محدود سیاسی جماعت کے وجود کی شہادت کافی نہیں ہے۔

اب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان پانچ صورتوں میں سے تین صورتوں میں ہم خود سری کا ذکر نہیں سنتے (حالانکہ ان میں سے چار خود سری کی سرزمین میں واقع تھیں)، دو باقی صورتوں میں سے ایک میں خود سر غیر ملکی حکمران آلہ کار کے طور پر باہر سے مسلط کر دیا گیا تھا۔ پس اگرچہ ہمارے معلومات نہایت ناکمل سہی مگر یہ فرض کر لینا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اس وسعت یا فتنہ عدیدیت میں ان بد نظمیوں کے مواقع کم تھے، جن سے آیندہ مطلق العنانی کا موقع نکل آتا تھا۔

علیٰ ہذا ایک یا دو صورتوں میں جہاں ہم یہ سنتے ہیں کہ سیاسی حقوق کی وسعت چھ سو حکمرانوں تک پہنچ گئی تھی وہاں بھی ہم مطلق العنانی کا کوئی ذکر نہیں سنتے[1]۔

۵۔ مطلق العنانی کی بحث کو ختم کرنے کے قبل اس کے اثرات کے متعلق بھی دو چار لفظ کہنا چاہیئے۔ ہمارے لئے ان اثرات پر کوئی حکم لگانا مشکل ہے خاصکر مطلق العنانی کی قدیم تر صورت کے متعلق، کیونکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ قدیم مصنفوں نے ان بیانات پر جیسا سیاہ رنگ چڑھایا ہے اسے کچھ ہلکا کرنا ضروری ہے۔ ہمارے سامنے وہی مثل ہے کہ شیر کا نقش انسان نے بنایا ہے (ولیکن قلم در کف دشمن است) ہم دوسری جانب کے دلائل سے واقف نہیں۔ تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ باوجودیکہ یونان میں عملاً خود سروں کا دور دورہ تھا مگر علمی جہت سے ان کی جانبداری کا کوئی ذکر کہیں سننے میں نہیں آتا۔ مثلاً ہم یہ نہیں سنتے کہ یہ مطلق العنان کبھی نظم و امن یا مذہب کے حامی ہونے کا ادعا کرتے ہوں یا عدیدیت کے ظلم و تعدی کے خلاف قوم کے حقوق کے مربی یا قوم کی مرضی کے ملجا و ماوی بنکر نمودار ہوتے ہوں، ان کی حمایت میں اس قسم کی باتیں زمانۂ حال کے مصنفوں نے لکھی ہیں، مگر مجھے کسی یونانی مصنف کا حال نہیں معلوم ہے جس نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہو، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اگرچہ بہت سے مطلق العنان عامۃ الناس کی سرگروہی کے وسیلہ سے اس مطلق العنانی تک پہنچتے تھے، مگر عام طور پر اس کی نسبت اتنا بھی نہیں کہا جاتا کہ اپنی حکمرانی قائم کر لینے کے بعد انھوں نے محض ظاہرداری ہی کے طور پر عام سرگروہ کی حیثیت برقرار رکھی ہو۔ اس میں

[1] ہرقلیہ، مسالیہ، (ارسطو) سیاسیات، (۵، ۶، ۳) ، مگر چوتھی صدی میں سرقوسہ کا مقابلہ کیجئے۔

شک نہیں کہ علاوہ ایک حد تک ایسا کرتے تھے، خاصکر ابتدائی خودسر (تو ضرور ہی ایسا کرتے تھے)، وہ اپنی سرگروہی کی حیثیت قائم رکھتے تھے، مگر ان کے جانشین علی العموم بادشاہ بن جاتے تھے، چنانچہ سکیون میں سوورس کی مشہور مطلق العنانی کے معاملہ میں کلیستھینیس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس شخص کو تاج پہنایا جس نے ورزشی مقابلہ میں بہ حیثیت حکم کے اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا[۱]، اسی طرح ایتھنز میں پی سسٹراتوس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ کی سماعت کے لئے "اریوپاگوس" کے روبرو حاضر ہوا، علی ہذا کورنتھ میں، کپسیلوس اس امر کے لئے مشہور تھا کہ اس نے اپنے دوران حکومت میں اپنی حفاظت کیلئے کبھی نیزہ برداروں کی جماعت نہیں رکھی، لیکن یہ "شان عمومیت" برابر مٹتی جاتی تھی، اگر پہلے مطلق العنان کی زندگی میں نہیں تو (اگر وہ اپنے اختیار کو موروثی بنانے میں کامیاب ہو جائے) اس کے جانشین کے زمانے میں ضرور ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا، چنانچہ (آخر میں) خودسر حکمران کے اخراج میں عامۃ الناس اکثر بطیب خاطر اور کبھی کبھی پرجوش تنفر کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر دانشمند اور اعلیٰ نسب والوں ہی کو مطلق العنانی سے متنفر ہونے کی خاص وجہ ہوا کرتی تھی، یہ یقینی ہے کہ ارسطو نے خود اس حکومت کے جس "جابرانہ طریق" کا نقشہ کھینچا ہے وہ بالتخصیص خوش حال لوگوں ہی کے لئے تھا، ضیافتوں، بزم گاہوں اور محکومین میں بلندیٔ طبیعت و اعتماد باہمی کے تمام وسائل اور تعلیم کا دبایا جانا اور یہ اصول مسلمہ قائم کرنا کہ خودسر حکمران کی رعایا کو "غریب" و مشغول کار رکھنا چاہئے، ان تمام امور کا اثر عملی طور پر صرف دولتمندوں پر پڑتا تھا، از روے روایت سخت گیری کا یہ طریقہ کورنتھ کے پری آندر کی جانب منسوب کیا جاتا تھا، جو قدیم طرز کے مطلق العانوں میں ایک نہایت ہی مشہور و زبردست مطلق العنان گزرا تھا، اور ہیرودوٹس نے اس کی نسبت جو قصہ بیان کیا ہے[۲] کہ کیونکر اس نے ملطہ کے تھراسی بولوس کے پاس آدمی بھیجکر اس سے حکومت کے حق میں مشورہ طلب کیا، تھراسی بولوس کس طرح اس قاصد کو ایک غلے کے کھیت

[۱] ارسطو، "سیاسیات" ۸ (۵) ۱۲ ۲۷۔

[۲] ملاحظہ ہو واقعہ کورنتھ، کلیس ارسطو، سیاسیات ۸ (۶)، ۱۴

میں لیجا کر اس کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا اور اس گفتگو کے دوران میں اس نے غلے کی سب سے اونچی اونچی بالیں توڑ لیں مگر اور کوئی جواب نہیں دیا اور پری اندر نے اس علامت کے مفہوم کو کس طرح سمجھ لیا، اس سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ "ذی علم و سر برآوردہ اشخاص" ہی وہ لوگ تھے جنھیں بالتخصیص خوف کی وجہ تھی۔ علیٰ ہذا، وہ تغیرات عامہ جن سے ایک سے زائد خودسروں کو شہرت حاصل ہوئی، (اور جس میں الیمپیا کے زیوس کا وہ مندر بھی شامل ہے جسے پی سسٹراٹوس نے تعمیر کیا تھا) ان سے یہ فائدہ مرتب ہوتا تھا کہ غربا کو کام ملجاتا تھا اور اس کے لئے جس قدر محصول کی ضرورت پڑتی تھی اس کا بار خصوصیت سے امرا پر پڑتا تھا، یہی امر جنگ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے، ساموس کے پولکریٹیس کی غارتگری تو بہر نوع اسی قسم میں شامل تھی مگر اغلب یہ ہے کہ کامیاب لڑائیوں کا مال غنیمت نے ان لڑائیوں کو مقبول عام بنا دیا تھا۔

دوسری جانب ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ سلطنت کے اقتدار و اعتبار کے بلند کرنے میں حکمرانوں کو کس درجہ کامیابی ہوئی سکیون کا دور مطلق العنانی ہی اس شہر کی عظمت و وسعت کا واحد زمانہ تھا، اور فریقانہ جذبات سے الگ ہو کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل کورنتھ کو ایک حد تک پری اندر پر اور اہل ساموس کو پولکریٹیس پر ناز ہونا چاہئے تھا، گیلو جس نے اس زمانے میں جب ایرانیوں نے یونان پر حملہ کیا تھا، سسلی میں اہل قرطاجنہ کے مقابلے میں یونانی تہذیب و تمدن کی موافقت کی تھی، وہ اسی طرز حکومت کی ایک نمایاں مثال تھا، اس کی فتح عظیم کے بعد اسے مطلق العنان کہنا دشوار ہے، بلکہ وہ مقبول عام بادشاہ ہو گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ خودسر اکثر اپنے شہر کو زیب و زینت دیتے اور علم و فن کی سرپرستی کرتے تھے۔

مگر اغلب یہی ہے کہ غیر آئینی حکمرانی جسے قوم کے زیادہ مہذب و متمدن حصے نے اخلاقاً ملعون ٹھہرا دیا تھا (اور مقدونوی غلبے کے قبل تو ضرور، یہی حال تھا) تقریباً ہمیشہ آخر میں جا کر پست و مبتذل ہو جاتی تھی۔ بہر نوع یہ قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مطلق العنانی کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں اس کی حکومت کا طرز ہمیشہ ستمگارانہ ہی نہیں رہتا تھا اور اگرچہ بعض اوقات یہ حکمرانی نرم و انصاف پرور بھی معلوم ہوتی ہے جو قوم کی طاقت و شہرت کو ترقی دیتی، جنگ میں کامیاب رہتی، اور اپنے وطن میں علم و فن کی

ہمت افزائی کرتی تھی، مگر با ایں ہمہ چونکہ یہ حکومت ہمیشہ بیضابطہ خلاف قانون اور جبر و تعدی کے ذریعے سے رائج ہوتی تھی اس لئے یونان اسے بلاشک وشبہ ملعون قرار دیتا تھا

ہم لوگ یونانیوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ کو زمانہ حال کے خیالات کی روشنی میں پڑھتے ہیں اس لئے ایک طرف بادشاہی اور دوسری طرف عددیت و عمومیت دونوں کے درمیان جو وسیع امتیاز قائم تھا اس پر ہمارا ذہن آسانی سے حاوی نہیں ہوتا۔ ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ بادشاہی واقعات ناگہانی سے قائم ہوتی تھی مگر اسی طرح عمومیت و عددیت بھی برابر انقلاب ہی کے ذریعے سے قائم ہوتی تھیں اور یہ انقلابات بھی کچھ کم ستمگارانہ ومفسدانہ نہیں ہوتے تھے، خاصکر اس وقت سے تو یہی حالت تھی، جب سے ایتھنز واسپارٹا میں فوقیت کے لئے کشاکش شروع ہوئی اور ہر ایک سربرآوردہ سلطنت ان متضاد سیاسی اصول سے ایک نہ ایک اصول کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور اس کی نمائندگی کرنے لگی۔ مطلق العنانی کے ساتھ مختص بغض وتنفر کی تشریح کرنے کے لئے ہمیں امور ذیل ذہن میں رکھنا چاہئے۔

اول یہ کہ جب عمومیت یا عددیت کی ابتدا یا اس کی امداد، جبر و تعدی سے ہوتی تھی، اس وقت بھی واقعتاً جو نظام حکومت معین ہوتا تھا وہ عام طور پر کسی نہ کسی متفق علیہ مفاہمت باہمی کا نتیجہ ہوتا تھا اور اس لئے باعتبار ظاہر حسب قانون ہوتا تھا، دوسرے یہ کہ بادشاہی (جبر و تعدی کے سوا) کبھی کسی اور طریقے سے قائم ہی نہیں ہوتی تھی، کم از کم ارسطو کے قبل کے زمانے میں جس کا حال ہمیں ہمعصر مورخوں سے معلوم ہوا ہے یہی کیفیت تھی۔

مزید براں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ عددیت وعمومیت کے درمیان جو مباحثہ ہوتا رہا اس میں دونوں جانب کے نظری دلائل میں ناقابل انکار قوت موجود تھی۔ دیگر امور ایک سے ہوں تو یہ امر صاف طور پر قرین عقل ہے کہ کثیر اشخاص کے فیصلے کو چند اشخاص کے فیصلے پر غالب آنا چاہئے۔

علیٰ ہذا یہ بھی قرین عقل ہے کہ عقلمند اور اچھے لوگوں کے فیصلے کو غالب آنا چاہئے۔ خواہ ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ اور ارباب دولت کی جماعت قلیل کو فرصت کے باعث سیاسی فہم و فراست کے حاصل کرنے کی خاص سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور ان

ترغیبات و تحریصات سے وہ خاص طور پر مبرّا ہوتے ہیں جو معمولی جرائم کا خاص باعث ہوتے ہیں، لیکن یہ سیاسی نظریات جس وقت بنے تھے اس زمانے کے لوگوں کے حالات پر نظر کرتے ہوئے اس قسم کی کوئی نظری دلیل اس امر کیلئے نہیں قائم کی جاسکتی کہ ایک شخص واحد کے فیصلے کو اس کے تمام ہموطنوں کے فیصلے پر غالب آجانا چاہئے۔

یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ خود سر کا اقتدار جب اس درجہ عام طور پر ناپسند کیا جاتا تھا تو پھر وہ کس بنیاد پر قائم ہوتا تھا؟ عموماً حکومت کا انحصار یا تو قوم کی عملی ہمدردی و پسندیدگی پر ہوتا ہے یا، اطاعت کی عادت پر، جس میں اگر کل قوم نہ داخل ہو تو کم از کم اس کا اتنا حصہ ضرور ہونا چاہیئے جو باقی کے لئے ہیبتناک بن جائے تو پھر خود سر کی قوت کا انحصار کس امر پر تھا؟ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ علی العموم خود سری کا آغاز اہل ملک کے ایک زبردست جزو (بالعموم زیادہ غریب طبقے کی) مصدقہ تائید سے ہوتا تھا جو موجودہ حکومت سے بیزار ہوتے تھے۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ حکومت قائم ہوجاتی تھی تو پھر اسے اجیر سپاہیوں کی ایک محدود جماعت کے سوا اور کسی کی تائید کی ضرورت نہیں رہتی تھی، اس جماعت کو جب تک تنخواہ مل جاتی تھی اسے اس سے بحث نہیں تھی کہ وہ خود سر کرتا کیا تھا؟ رہ گئے اہل ملک سو وہ عادت، خوف یا اتحاد باہمی کی کمی کے باعث بالعموم مطیع رکھے جاتے ہیں۔

ابتدائی مطلق العنانی کے دور کے گزر جانے کے بعد ہم اس منزل میں داخل ہوتے ہیں جس میں کسی نہ کسی قسم کی جمہوری حکومت عام تھی اور کچھ زمانے کے لئے تو بالکل ہمہ گیر ہوگئی تھی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں شہری سلطنتوں میں کم و بیش ایک صدی تک تقریباً ہر جگہ مروجہ سیاسی احساس مطلق العنانی کے خارج کردینے کے لئے کافی قوی تھا۔ اس لئے اس دور میں تنازعہ عددیت و عمومیت کے درمیان ہوتا تھا، اگرچہ چند قلیل التعداد حالات میں عددیت نے خود کو قائم رکھا تھا اور بیشتر حالات میں "قلیل" و "کثیر" کے درمیان طولانی کشمکش چلی جا رہی تھی جس کا کبھی قطعی طور پر تصفیہ نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ چوتھی صدی کے نصف آخر میں مقدونوی غلبے نے نئے حالات پیدا کردئے مگر ارتقا کی اس منزل کی عام خصوصیت یہی تھی کہ وہ عمومیت کی طرف قطعی طور پر گامزن تھی، میں اس گمان کی طرف مائل ہوں کہ اگر ان سلطنتوں کے داخلی نشوونما میں خارجی تعلقات نے ابتری نہ

پیدا کی ہوتی تو بہ حیثیت مجموعی یہ تحریک عمومیت زیادہ قطعی ہو جاتی اگرچہ اس حال میں بھی اس میں شک نہیں کہ اس کی تکمیل کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوئی لیکن اسپارٹا کے غلبے نے ایتھنز کے توازن پیدا کردینے کے باوجود، جا بجا عدیدیت کی بزور تائید نہیں کی تھی اور خاص کر (۳۷۱ ق م کی) جنگ لیوکٹرا کے قبل۔)

خطبۂ ہفتم

یونانی عمومیت

ا۔ میں اپنے سابق خطبے میں، ابتدائی مطلق العنانی کے متعلق جو کچھ کہنا تھا، اسے ختم کرکے مختصراً اس کشمکش کے خصوصیات بیان کرنے کی جانب متوجہ ہوگیا تھا جو آزاد یونان کے سب سے زیادہ شاندار دور میں عدیدیت و عمومیت کے درمیان جاری رہی تھی اور یہ دور، جنگ ایران کے بعد سے غلبۂ مقدونیہ یعنی ۴۸۰ء سے ۳۳۶ء تک گویا ڈیڑھ صدی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کی سیاسی تحریک کی تمامتر خصوصیت یہ تھی کہ وہ کامل ترقی یافتہ عمومیت کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی تھی یعنی بڑھتے ہوئے عدیدی حالات سے معتدل عمومیت کی طرف اور معتدل عمومیت سے انتہائی عمومیت کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔

لیکن عمومیت کی جانب اس میلان ورجحان کا پتہ رواں و سرسری طور پر چل سکتا ہے یعنی یہ میلان کسی جہت سے بھی یکساں و پائیدار نہ تھا۔ چند صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عدیدیت عمومیت کا کچھ شائبہ لئے ہوئے قائم رہگئی تھی یعنی بعض اغراض کے لئے شہریوں کی مجلسیں برقرار تھیں، لیکن اکثر صورتوں میں ہم انقلابات اور پھر صریحاً عدیدیت کی صورت میں تنزل کرجانے کا حال سنتے ہیں۔ عمومیت کے میلان میں کسی حد تک سلطنتوں کے خارجی تعلقات کی وجہ سے خلل پڑا مثلاً یہ کہ اہم تجارتی مرکز کورنتھ ابتدائی مطلق العنانی کے بعد سے مقدونوی دور تک کے تقریباً تمام زمانہ میں اسپارٹا کے اثر کی وجہ سے، عدیدی بنا رہا۔ یہ بھی

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری اطلاع نہایت جزوی و منتشر ہے تاہم اس میلان و رجحان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا، جن تغیرات کا ہم ذکر کرسکتے ہیں ان کی نسبت اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترقی معکوس بالکل نہیں ہوئی تاہم عمومیت کی جانب اقدام زیادہ اور اس سے انحراف کم تھا۔

عمومیت میں ایک ایسی شان جسے مطابق فطرت کہا جاتا ہے اس وجہ سے ہویدا ہوگئی تھی کہ اس میں سیاسی جوش شامل ہوتا تھا اور قومی تحریک اکثر عمومی تحریک ہو جاتی تھی چوتھی صدی کے حصہ اول میں تھیبس میں عمومیت کا جو مختصر و شاندار دور گزرا اس سے ہم اس بیان کی توضیح کرسکتے ہیں، یہ تحریک عمومی ہونے کے ساتھ ہی قومی بھی تھی اور اس تحریک نے تھیبس کو اس مقتدر حیثیت پر پہونچا دیا جو ۳۷۱ ق م میں جنگ لیوکٹرا کی وجہ سے اسے حاصل ہو گئی تھی، یہی وہ فیصلہ کن جنگ تھی جس نے اسپارٹا کے غلبے اور اس کے بےنظیر فوجی امتیاز کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد ہی دوسری مثال آرکیڈیا کے نشو و نما میں ملسکتی ہے جب اس نے تھیبس کے غلبے کے زمانے میں تھیبس کے سرگروہوں کے زیر اثر اپنے لئے ایک نیا وفاقی نظام حکومت قائم کیا، اور جیسا کہ میں اوپر ذکر کرچکا ہوں[ع۱]۔ اسپارٹا کی زیادہ موثر مقاومت کے لئے چند دیہاتوں کو ملا کر ایک "شہر اعظم" کی بنا ڈالی تو آرکیڈیا کا یہ اتحاد عام لامحالہ عمومی شکل کا تھا، حکمران جماعت میں جنگ کی قابلیت رکھنے والے تمام لوگ شامل تھے۔ علیٰ ہذا، جب سنہ ۳۳۴ ق م میں سکندر نے ایونیا کے شہروں کو ایرانی تسلط سے آزاد کیا تو اس کی یہ کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس نے لابدی طور پر ان کی عمومیت انھیں واپس دے دی۔

یہ میلان ارسطو کے بیان سے بھی صاف واضح ہے اور اس کی نسبت جو وجہ اس نے بیان کی ہے وہ قابل لحاظ ہے، وہ کہتا ہے کہ "اب کہ شہر اس قدر وسیع ہوگئے ہیں، اس کے سوا حکومت کی کوئی اور شکل قائم کرنا آسان نہیں ہے"[ع۲]۔ مزید براں

ع۱۔ خطبۂ ششم صفحہ ۹۲

ع۲۔ سیاسیات حصۂ سوم باب پانزدہم

یہ میلان ایک دوسری صورت میں بھی نظر آتا ہے وہ یہ کہ واقعاً ارسطو کے زمانہ تک عمومیت زیادہ عمومی ہوتی جاتی تھی۔ ارسطو نے نہایت ناموافقانہ طور پر جس شئے کو عمومیت کی انتہائی شکل بیان کیا ہے، جس میں عمومی جمعیت کے فیصلے قانون سے بالاتر ہو جاتے تھے اُس کی نسبت وہ کہتا ہے کہ اس شکل نے تاریخی سلسلہ میں سب سے آخر میں ترقی حاصل کی تھی[1] میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ارسطو یہ لکھتا ہے کہ عمومیت، عدیدیت کے بہ نسبت زیادہ محفوظ و مستقل[1] ہے، نیز یہ کہ عدیدیت اور مطلق العنانی حکومت کی تمام شکلوں میں سب سے کم عمر پاتی ہیں۔[2] میں اس بیان کو اس موخر دور کی عدیدیت کی نسبت سمجھتا ہوں اور اس کا یہ مفہوم قرار دیتا ہوں کہ میلان عمومیت کے اس دور میں عدیدیت کی جانب بازگشت نہایت ہی ہنگامی ہوتی تھی۔

۲۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس دور کی عدیدیت و عمومیت کے طُرق کی ایک عام کیفیت بیان کروں مگر عدیدیت کے متعلق ہمارے پاس شہادت ناکافی ہے۔ ہم اسپارٹا کے دستور سلطنت کے متعلق کچھ حالات جانتے ہیں مگر میں آپ کو پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسپارٹا کا دستور سلطنت بالکل یکتا تھا یا ایک عجیب و غریب باقی تھا اور یونانیوں کی نگاہ میں صاف طور پر عدیدی نہیں تھا، کم از کم نباتی عدیدیت کی حیثیت تو نہیں تھی پس میں جو کچھ کرونگا وہ یہی ہوگا کہ ارسطو نے "سیاسیات" میں قلت و کثرت تعداد کے اعتبار سے اصناف عدیدیات کا جو خلاصہ دیا ہے، انھیں پر مختصر اً نظر ڈالوں[3]۔

عدیدیت کی سب سے زیادہ نرم صورت جسے اکثر املاکیت (Timmcracy) کہا جاتا ہے، وہ صورت تھی جس میں عام جمعیتیں اور کثیر التعداد جوری یا عدالتیں اسی طرح ہوتی تھیں جسطرح عمومیت میں ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ یہ ان لوگوں تک محدود تھیں جن میں صاحب املاک ہونیکا ایک خاص وصف موجود تھا، یہ شرط اتنی بلند ہوتی تھی کہ اس سے

---

[1] سیاسیات حصہ ششم باب ہم
[2] سیاسیات حصہ ہشتم باب دوازدہم
[3] سیاسیات حصہ ششم۔ چہارم) باب ششم ملاحظہ ہو۔ سیاسیات حصہ ہفتم (پنجم) باب ہفتم
ارسطو نے عدیدیت کے مختلف اقسام کی جو ترتیب قرار دی ہے، وہ زیادہ کارآمد ہو جاتی اگر اس میں وہ یہ خیال رکھتا کہ ایک دور میں جو عدیدیت رائج ہوتی تھی تاریخ ارتقاء اسے دوسرے دور کی عدیدیت سے مختلف [illegible] نظام اپنے اپنے [illegible] رکھا۔

یہ فرائض اہل ملک کی ایک قلیل تعداد کے ہاتھ میں آجاتے تھے مگر اتنی زیادہ بلند نہ ہوتی تھی کہ یہ جماعت قلیل بہت ہی مختصر ہو جائے۔

یہ لازمی تھا کہ املاک کی شرط جس قدر بلند ہو جاتی تھی اسی قدر حکومت کی شکل میں عدیدیت کا زور و غلبہ ہوتا جاتا تھا، مگر عدیدیت کو سخت کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں تھا، بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ جنگ و صلح، وضع قانون، انتخاب و نگرانی عمال و دیگر اہم فرائض سلطنت کے متعلق غور و بحث کرنا اور ان پر فیصلہ صادر کرنا، (جو عمومیت میں شہریوں کی عام جمعیت کے اندر انجام پاتا تھا)، اس قسم کی عدیدیت میں جزءً یا کلًّا ایک مختصر سی منتخب شدہ جماعت کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بعض وقت یہ بھی ہوتا تھا کہ اس قسم کی غور و بحث کرنے والی جماعت کی خالی جگہیں بقیہ ارکان کے انتخاب سے پُر کر دی جاتی تھیں اور اسطرح دستور سلطنت کی عدیدی خصوصیت اور بڑھ جاتی تھی۔ آخری امر یہ ہے کہ بعض وقت اس قسم کی جماعت کی رکنیت موروثی کر دی جاتی تھی اور اس طرح عدیدیت انتہائی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

اسی طرح عدیدیت میں حکام کا انتخاب بھی جائداد کی شرط سے محدود تھا، اور کل حکام یا اُن کا زیادہ حصہ بالعموم قرعہ اندازی سے نہیں بلکہ انتخاب سے مقرر ہوتا تھا، صرف عدیدیت کی شدید ترین صورت میں حکام کا عہدہ بعض خاندانوں میں موروثی بنا دیا جاتا تھا۔

ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض وقت جمعیتوں میں رائے دینے کا حق حسب ضابطہ اس سے زیادہ وسیع تھا جتنا عملًا وقوع میں آتا تھا، یہ ایک عدیدانہ تدبیر تھی کہ دولتمندوں کی غیر حاضری کے لئے جرمانے کے ظاہرا سخت قانون کے ذریعے اُن کے غلبے کا تیقن کر لیا جاتا تھا، یہ بھی عدیدیت کی ایک خصوصیت تھی کہ غور و بحث کی مجلس میں جو کارروائی منظور کرانا ہوتی تھی اس کے ابتداءً پیش کرنے کے لیے ایک مختصر سی مجلس شوریٰ بنالی جاتی تھی، حالانکہ عمومیت میں اسکے خلاف ہوتا تھا چنانچہ ایتھنز میں ۵۰۰ آدمیوں کی مجلس (Boule) ہوتی تھی۔

۳۔ اب ہمیں عمومیت پر غور کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، جسکے متعلق

ہم ایتھنز کی علمی شان کی وجہ سے زیادہ وقفیت رکھتے ہیں، عمومیت کے متعلق بھی یہ مسئلہ ارسطو کے صریحی بیان سے صاف ہوجاتا ہے کہ عمومیت کی طرف جو میلان و رجحان تھا وہ پوری ترقی کردہ یا انتہائی عمومیت کی جانب تھا،[1] اور ایتھنز کی چوتھی صدی کے دستور سیاسی کو ہم اس طرز عمومیت کا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

پانچویں صدی میں ارتقا کی کارروائی ایتھنز میں جاری رہی، اور چوتھی صدی میں ان کا مکمل نتیجہ ہمارے سامنے آیا۔ ایتھنز کے دستور سلطنت کے متعلق جو تحریر حال میں دستیاب ہوئی ہے اور جسے ارسطو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور یہ تو صاف

[1] ارسطو چار قسم کی عمومیت میں تمیز قائم کرتا ہے، اور خوبی کے اعتبار سے اس کی ترتیب تاریخی ترتیب سے اس درجہ برعکس ہے کہ بہترین قسم بلاشک وشبہہ قدیم ترین قسم تھی (دیکھو سیاسیات حصہ ہفتم (ششم) باب چہارم، اور بلاریب کہ بدترین قسم آخری قسم تھی (سیاسیات حصہ ششم (چہارم) باب ششم) اس نے غالباً نقص کے اعتبار سے اوسط قسم کو وقت کے اعتبار سے بھی اوسط خیال کیا تھا مگر ان کا تصور گونہ مبہم سا قائم کیا گیا ہے بہترین قسم کے متعلق اس کا زیادہ تاریخی تخیل صاف طور پر سولن کے زمانے کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم میں تمام آزاد شہریوں کو عہدہ داروں کے انتخاب کرنے، ان سے جواب طلب کرنے اور فیصلہ کرنے کا حق ہوتا تھا مگر حکام کے عہدوں کے ساتھ جائداد کی قید لگی ہوئی تھی، اور جہاں لوگ بیشتر کاشتکاری میں مصروف رہنے کی وجہ سے اسقدر مشغول رہتے تھے کہ زیادہ مجلسیں منعقد نہیں کر سکتے تھے، اور عملاً اس قدر مصروف کار ہوتے تھے کہ جوری کی خدمات انجام نہیں دے سکتے تھے، وہاں ان دونوں میں سے کسی کام کے لئے کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔

ارسطو عمومیت کی بہترین قسم کی مثال کے طور پر مین ٹی نیا کی عمومیت کو پیش کرتا ہے، یہ عمومیت بہت مدت تک خالص زرعی رہی اور ہروڈوٹس اور پولی بیوس دونوں اس کی اعلیٰ شہرت کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہاں حسب دعویٰ ارسطو مجلس، عہدوں کے لیے انتخاب نہیں کرتی تھی، یہ کام ایک جماعت انجام دیتی تھی جو تمام شہریوں کی طرف سے منتخب ہوتی تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس قدیم طرز کی دوسری عمومیتیں اور کس قدر تھیں۔ پولی بیوس کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اکائیا نے اسکی مثالیں مہیا کی ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ یہ تحریر اسی کے زمانہ کی ہے، اس سے یہ مسئلہ بین طور پر صاف ہو جاتا ہے، صاحب تحریر کا خیال ہے کہ سنہ ۴۰۳ میں جو دستور قائم تھا وہ بعینہ ویسا ہی تھا جیسا اوس کے زمانہ میں چوتھی صدی کے ربع ثالث کے آخر میں تھا، وہ اسے شمار میں گیارہواں قرار دیتا ہے اور سابق کے دس مدارج میں سے کم از کم چھ کا تعلق پانچویں صدی سے سمجھتا ہے، اس صدی کا آغاز کلس تھینس کی معتدل عمومیت سے ہوا تھا، گر کلس تھینس کے اصلاحات سے ایتھنز کی عمومیت قطعی طور پر "عدیدی سرپرستی" سے خارج نہیں ہوگئی تھی[1]، اور حقیقت میرے خیال میں یہ ایک قابل اعتماد تاریخی تعمیم ہے کہ "عدیدی سرپرستی" مشکل سے فنا ہوتی ہے۔ "عدیدی سرپرستی" سے مراد یہ ہے کہ کسی نظم معاشرت میں اس قلیل التعداد جماعت کا اثر ہو جسے دولت کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم و تہذیب اور سیاسی تجربہ و عمل کے روایات بھی ورثہ میں ملے ہوں، اور یہ یقینی ہے کہ یہاں (ایتھنز میں) ایسا ہی ہوا تھا۔ کتاب "دستور ایتھنز" کے مصنف کے بیان کے موافق ایریوپاگس کی مجلس نے بغیر کسی باضابطہ اظہار رائے کے جنگ ایران کے نازک موقع پر اپنے خدمات کے وسیلہ سے دوبارہ اختیار حاصل کر لیا تھا اور سترہ برس (یعنی سنہ ۴۶۲ ق م) تک اس اختیار کو قائم رکھا اور یہ کہ یہ مجلس بزور طور پر عدیدی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ ایفیالتیس اور فارقلیس نے اس پر حملے کئے[2] اس وقت سے صدی کے اختتام تک کامل عمومیت کی تحریک تیزی سے بڑھتی گئی مگر اس وقت

عله۔ یہ فقرہ مسٹر وارڈ فاولر کا ہے مگر انھوں نے جو رائے اختیار کی ہے وہ اس سے مختلف ہے ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "یونان و روما کی شہری سلطنت"، صفحہ ۱۲۱

عله۔ اس مجلس میں ہر سال نو حکام اعلیٰ شامل کئے جاتے تھے۔

ان حکام کے معاملہ میں بھی تدریجی ترقی ہوئی۔ سنہ ۵۱۲ میں مطلق العنان حکمرانوں کے نکالے جانے کے بعد چوبیس برس تک ان کا تقرر انتخاب سے ہوتا رہا نہ کہ قرعہ سے، پھر اس کے بعد ایک نامعلوم زمانہ تک کلس تھینس کے دسوں قبیلوں میں سے ہر قبیلے کے پہلے سے پسند کردہ لوگوں کی ایک تعداد میں سے بذریعہ قرعہ اندازی ان کا تقرر ہوتا رہا، آخر میں یہ سابقہ پسندیدگی بھی قرعہ کے ذریعہ سے ہونے لگی۔ یہ تغیر کب ہوا اسکا ہمیں علم نہیں ہے مگر یہ ہم جانتے ہیں کہ سنہ ۴۵۷ کے بعد ہی یہ ہوا کہ عہدہ ارخنی میں دو سب سے بلند صاحب املاک طبقات کے سوا اور کسی کا داخلہ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ کچھ زمانہ بعد ان عہدوں کو غیر قابل معاوضہ بنا کر مقابلہ بند کر دیا گیا تھا۔

تک تکمیل کو نہیں پہنچی جبتک کہ ملکی حکام کے تمام عہدوں کے دروازے کل اہل ملک کیلئے نہ کھول دئے گئے، اور مجلس شوریٰ اور مجلس ملکی اور نیز عدالتوں کی حاضری کے لئے معاوضہ نہ ملنے لگا۔ اس آخری نتیجہ کا آغاز فارقلیس کے شاندار زمانہ میں ہوگیا تھا۔ جوری اپنے معاوضوں کے لئے اسی کی منت کش تھی، مگر مجلس ملکی کی حاضری کا معاوضہ اس کے بعد کے زمانہ کا ہے۔ خلاصتہً میں مکرر یہ کہتا ہوں کہ پانچویں صدی مسلسل تغیر کا دور تھی اور جنگ پیلوپونیز کے اختتام پر عدیدیت کے مختصر و بدنام دخل کے بعد (چوتھی صدی کے آغاز تک) عدیدیت کو استحکام نہیں حاصل ہوا۔

ہم حقیقی طور پر یہ نہیں جانتے کہ ایتھنز کے ادارات کس حدتک نیابتی تھے مگر ارسطو کے بیان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چوتھی صدی کی یونانی عمومیت میں حسب ذیل خصوصیات وسعت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ اولاً ایک جمعیت ہوتی تھی جس کا دروازہ ایک خاص عمر کے تمام کامل الحقوق شہریوں کے لئے کھلا ہوا تھا، یہ جمعیت محض حکمرانوں کا انتخاب اور ان کی نگرانی ہی نہیں کرتی تھی بلکہ فی الواقع خود حکمرانی کرتی تھی۔ ایتھنز میں اسی اعلیٰ حکمران جمعیت کے اندر (جس کا انعقاد شدید ضروریات کے غیر معمولی اجتماع کے علاوہ، سال میں چالیس مرتبہ باقاعدہ ہوا کرتا تھا) حکومت کے تمام اہم فیصلے ہوا کرتے تھے جن میں سلطنت کی کل غیر ملکی حکمت عملی کا انتظام و انصرام بھی شامل تھا اور ہر ایک شہری جسنے حق رائے دہی سے محروم ہونے کا کوئی فعل نہ کیا ہو، اس جمعیت میں تقریر کرسکتا تھا۔ ہمیں ارسطو کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں یونان میں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں عمومیت کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ حکومت کے اعلیٰ کارکن کے طور پر غور وبحث کی کوئی ایسی جماعت ہو جس میں تمام اہل ملک داخل ہوں، وہیں یہ بھی تھا کہ یہ جماعتیں واقعی جس حدتک حکمرانی کرتی تھیں ان میں بہت اختلاف تھا، عمومیت کی نہایت ہی معتدل صورت میں اس جماعت کا فرض یہ تھا کہ وہ حکام کا انتخاب، حسابات کی تنقیح، مسائل جنگ وصلح و محالفہ کا تصفیہ کیا کرے اور نظم و نسق کے دوسرے معاملات کو منتخب شدہ حکام اور مجلس شوریٰ کے اوپر چھوڑ دے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ارسطو کے وقت تک ارتقا کا میلان عمومیت کی انتہائی صورت کی طرف تھا، جسمیں یہ جمعیت تمام اہم معاملات کے آخری فیصلہ کی بالطبع دعویدار ہوجاتی تھی۔

ایتھنز میں عمومیت کی جو شکل تھی، اس میں حکام اور حکمران مجلس بوئلے (جو جمعیت کے لئے امور زیر بحث مرتب کرتی تھی) دونوں کے اختیارات بالکل زیردست ہو گئے تھے، اس لئے ان عہدوں کے لئے اس اصول پر عمل کیا جاتا تھا کہ "ہر شخص کی خوبیاں تقریباً مساوی ہوتی ہیں" اور صورت یہ اختیار کی گئی تھی کہ تمام شہری جوان عہدوں کیلئے درخواست کریں اور جن پر کوئی داغ بدنامی نہ لگا ہو، ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا تھا۔ صرف وہ عہدے اس سے مستثنیٰ تھے جن میں صریحاً خاص اوصاف کی ضرورت ہوتی تھی، جیسے فوجی عہدے یا زیادہ اہم مالی عہدے، ان عہدوں کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ استعمال کرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔

اس غرض سے کہ غربا واقعی طور پر حکومت کے کاموں میں شرکت کر سکیں ایتھنز میں مجلس شوریٰ کی حاضری کا معاوضہ دیا جاتا تھا، اور آخر میں جمعیت کی حاضری کا بھی معاوضہ دیا جانے لگا اور یہ اس لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ عمومیت کا حقیقتاً موثر ہونا قطعی ہو جائے۔ اگرچہ یہ امر ذہن میں ملحوظ رہنا چاہئے کہ ایتھنز اور دوسری جگہوں کے طبقہ عوام سے پست تر ایک طبقہ غلاموں کا بھی ہوتا تھا اور اس لئے ان عامۃ الناس میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کا وہ بڑا حصہ شامل نہیں ہوتا تھا جنھیں زمانۂ موجودہ کی عموماً نہ حکومت رکھنے والی سلطنت میں کثرت و غلبہ حاصل ہوتا ہے، پھر بھی ارسطوفانیس کا تو کیا ذکر خود ارسطاطالیس کے شکایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان عامۃ الناس میں ان چھوٹے چھوٹے سوداگروں اور صناعوں وغیرہ کی ایک کثیر جماعت شامل ہوتی تھی جنھیں ان کی غربت کی وجہ سے اتنا وقت نہیں مل سکتا تھا کہ وہ فرائض عامہ کو پرزور طور پر انجام دے سکیں۔ بے معاوضہ کی حاضری میں یہ اندیشہ تھا کہ اس میں بہت کم لوگ حاضر ہونگے اور پھر جمعیت پر دولتمندوں اور ان کے غاشیہ برداروں کا تسلط ہو جائے گا۔

عدالت کا انتظام بھی عمومی تھا، اور انھیں وجوہ سے اس کا بھی معاوضہ دیا جاتا تھا، ایتھنز میں مقدمات کا تصفیہ وسیع و مختلف التعداد عمومی جوری کے ذریعہ سے ہوتا تھا، گو معمولی تعداد، خاصکر اہم مقدمات کے لئے ۵۰۱ کی تھی۔

ایتھنز کی عمومیت جب پوری طرح ترقی کر گئی، اس وقت اس میں ایک دوسری اہم خصوصیت بھی پیدا ہوئی۔ عمومی جمعیت بذات خود قانون سازی کا

کام انجام نہیں دیتی تھی یا یہ کہیئے کہ مسلمہ و مسلسل طور پر اپنے احکام سے قانون کو باطل نہیں کرتی تھی اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ عام جوش کے اثر سے عملاً اکثر ایسا واقع ہو جاتا تھا۔ وضع قوانین کا واقعی کام قانون سازی کی ایک کثیر التعداد مجلس کے سپرد کر دیا گیا تھا جس کا انتخاب ایک سال کے لئے جوریوں میں سے ہوتا تھا۔ (ان واضعین قانون کی تعداد ایک ہزار اور پانچسو تک سننے میں آتی ہے) یقیناً یہ ماہران فن کی مجلس نہیں ہوتی تھی، تاہم جو جوری حلف اٹھا چکے تھے ان کی اس قسم کی مجلس معمولی جمعیت کے بہ نسبت بدرجہا زیادہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتی ہوگی[1] اور اس ذی اقتدار جمعیت نے خود کو اپنے فیصلوں میں بے قاعدگی سے محفوظ رکھنے کے لئے اس طرح پر سعی کی کہ اس قسم کے (بیقاعدہ) فیصلے کے مجوز پر فوجداری کا مقدمہ چلانا جائز قرار دیدیا[2] لیکن عملاً یہ تحفظ بہت ہی ناکمل معلوم ہوتا ہے۔ ذی اقتدار عامۃ الناس اکثر خود عائد کردہ قیود کا لحاظ نہیں کرتے تھے، یہ صاف ظاہر ہے کہ ارسطو نے جس انتہائی عمومیت کا ذکر کیا ہے

ع۱۔ چوتھی صدی میں جس فکر کے ساتھ اکلیزیا اور نوموتھٹائی کے درمیان وضع قوانین کے کام کی تقسیم کی گئی تھی اس پر غور کیجئے۔

۱۔ ہر سال کی پہلی جمعیت میں مسلمہ مجموعہ ضوابط کے ایک ایک باب پر رائے لی جاتی تھی اور یہ رائے مباحثہ کے بعد لی جاتی تھی جس میں ہر شہری، قانون میں تغیرات تجویز کر سکتا تھا۔

۲۔ اگر کسی باب پر رائے نفی میں آتی تھی تو وہ نوموتھٹائی جوجوری میں سے لئے جاتے، جو ہنوز معمولی اکلیزیا میں مقرر کئے جاتے تھے۔ اس اثنا میں اساسی قوانین کے بموجب تغیر کے مجوز کو قدیم قانون اور نیا مجوزہ قانون عوام میں پہلو بہ پہلو نمایاں کرنا پڑتا تھا، اور اس کی نقلیں معتمد کو بھی دینا پڑتی تھیں جو انھیں درمیانی جلسوں میں علی الاعلان پڑھ دیتا تھا اور چوتھے جلسہ میں قوم، نوموتھٹائی کی تعداد اور ان کے لئے معینہ وقت اور معاوضہ کا فیصلہ کرتی تھی اور موجودہ قانون کی مدافعت کے لئے پانچ "مؤید" مقرر کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم کا یہ فیصلہ "غور سابق" کے بعد ہوتا تھا۔

۳۔ اس کے بعد تغیر کی ہر تجویز پر مجلس شوریٰ کے "غور سابق" کے ساتھ، آخری طور پر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ آیا قانون میں تغیر ہونا چاہیے یا نہیں۔

ع۲۔ مقابلہ کیجئے خطبۂ دوازدہم۔ جلد (۶)

اور جسے کسی قسم کا دستور سلطنت کہنا دشوار ہے بلکہ وہ ایک طرح کی انبوہی خودسری ہے جسمیں ایک حد تک خود اپنے وقت کے ایتھنز کی عمومیت کا نقشہ اس کے پیش نظر تھا، لیکن ان قیود کی تفصیلی نوعیت سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ایتھنز میں سیاسی ادراک رکھنے والوں کے نزدیک اس خاص انبوہی مطلق العنانی کے خارج کرنے کی ضرورت پوری طرح مسلم تھی

۴۔ ترتیب ارتقا کے بیان کے بعد، اب میں نے مقدور ہی نوی غلبے تک، یونانی شہری سلطنتوں کے خاص اشکال حکومت کا مختصر خاکہ تمام کر دیا ہے، اور مختلف مدارج ترقی میں جو اسباب ان کے وجود میں آنے کا باعث ہوے اور جو حالات ان کے مفید مطلب تھے، ان پر بھی مختصراً بحث کی ہے، لیکن ہنوز ایک نہایت دلچسپ سوال باقی رہ گیا ہے، جس پر میں نے اس وقت تک صرف ایک صورت خاص یعنی خودسری کے ذیل میں گفتگو کی ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ حکومت کے یہ مختلف طریقے عملاً کس طرح کام میں لائے جاتے تھے۔ زیر حکم قوم کی بہبود کو وہ کس حد تک محفوظ رکھتے تھے؟ بالتخصیص عمومیت کے متعلق ہمیں یہ سوال کرنے کی خواہش زیادہ ہے کیونکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چوتھی صدی قبل مسیح میں عمومیت کی جانب ویسا ہی میلان باقی تھا، جیسا کہ اس وقت مغربی یورپین سلطنتوں میں ہے، لیکن قلت معلومات کے باعث اس سوال کا قابل اطمینان جواب دینا سوالات زیر بحث سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

لیکن جن سربرآوردہ اصحاب فکر، اور خاصکر چوتھی صدی کے جن ارباب نظر کی تحریریں ہم تک پہونچی ہیں اور جنھیں پڑھکر سیاسی خیالات و نظریات کی جانچ کر کے ہم اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم خیالات افلاطون و ارسطو[علـه] کے ہیں، لیکن میں افلاطون کے استاد سقراط کی طرف بھی رجوع

علـه۔ عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت جدیدہ کے ارتقا کے سلسلۂ عمل کے پتہ چلانے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یونانی سیاسیات کا اثر مقدماً جدید خیالات و تصورات پر پڑا ہے اور روما جدید واقعات سیاسیہ کا خاص تدریجی منبع و مخزن ہے۔ عالم خیال میں ارسطو کی "سیاسیات" نے خاص دلچسپی پیدا کر لی ہے کیونکہ یہی وہ کتابچہ ہے جس سے جدید خیالات نے سیاسی نوامیس کے علمی تجزیہ و ترتیب کے متعلق پہلی منزل میں پہلا سبق لیا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے مطالعہ کے وقت یہ خیال نہ رکھیں

کرونگا جس کی زندگی کا خاتمہ عین چوتھی صدی کے اوایل میں ہوا تھا، نیز افلاطون کے ہم سبق زینوفون (Zenophon) اور مقرر خوش بیان اساکریٹس کے حوالے بھی دونگا جس کی تصنیف سے افلاطون کی تصنیف کی۔ (جسے ارسطو نے بعد کو جاری رکھا) گونہ مخالفت و رقابت ظاہر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس کے سیاسی خیالات کا اصحاب بالا کے سیاسی خیالات سے مقابلہ کرنا اور بھی زیادہ باعث دلچسپی ہے کیونکہ ایک فصیح البیان مقرر ہونے کے علاوہ اسے سیاسی نقطۂ نظر سے صاحب فکر ہونے کا بھی کچھ حق حاصل ہے

افلاطون و ارسطو دونوں نے اشکال حکومت کی تعریف و ترتیب پر بہت زیادہ غور کیا ہے افلاطون کے مکالمات (مقالات) ہمارے سامنے ترتیب کی دو مختلف تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ ایک تو ری پبلک (جمہور) میں اور دوسرے بعد کے مکالمہ اسٹیٹسمین (مدبر) میں۔ ارسطو کی ترتیب زیادہ تر اس دوسرے مکالمہ سے ماخوذ ہے، اور میں ارسطو ہی سے آغاز کرونگا کیونکہ باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ وہ افلاطون کا بہت کچھ زیر بار احسان تھا اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ سیاسی واقعات کے متعلق اس کی وسعت معلومات افلاطون سے بہت بڑھی ہوئی تھی

ارسطو نے جو ترتیب اختیار کی ہے وہ ایک شش رخی ترتیب ہے، اسکی بنا تقسیم کے دُہرے اصول پر رکھی گئی ہے۔ پس اسے ایسا سمجھنا چاہئے کہ ایک سہ شاخہ کو دو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس نے اسی بدیہی و مروج سہ رخی تفریق کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہ یہ سبق ان مختلف دساتیر کو پیش نظر رکھکر مرتب کیا گیا ہے جنھوں نے یونان کی بڑی سلطنتوں میں واقعاً ترقی حاصل کی تھی اور ابتداً و اولاً اس کا اطلاق انھیں دستوروں پر ہو سکتا ہے، تو ضرور ہم اس سے غلط نتیجہ اخذ کرنے لگیں گے۔ لیکن اگر اس امر کو ہم ملحوظ رکھیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ سبق عین اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ جنگ خیرونیا اور کورنتھ کی کانگریس کے بعد اور اس اثنا میں جب سکندر ایشیا کو فتح کر رہا تھا یونانی شہری سلطنتوں کی حقیقی خود مختاری کا دور ختم ہو چکا تھا، اور اس اثنا میں جبکہ سکندر ایشیا کو فتح کر رہا تھا، اور پھر اسکے ساتھ ہی ہم اس کی ترتیب و تقسیم کے عام خاکہ ہی پر غور نہ کریں، بلکہ ان مخصوصات و اشارات پر بھی غور کریں جو ارسطو نے کثرت ان کے ساتھ شامل کر دئے ہیں، تو پھر شہری سلطنتوں کے ارتقا اور خاصکر اس ارتقا کے موخر دور کی نسبت تو بالیقین ویسی ہی غالب درجہ کی اہم دلچسپی حاصل ہوتی ہے جیسی ایک نہایت ہی عمیق و غائر ذہن کا اقتضا ہونا چاہئے۔

اختیار کیا، جس کا اظہار بادشاہی، عدیدیت، اور عمومیت کے اصطلاحات سے ہوتا تھا مگر اس تفریق کو اس نے اس اصول کے ساتھ ملا دیا جو سقراط سے ماخوذ تھی، وہ اصول یہ ہے کہ صحیح حکمراں وہ ہے جو خود اپنے منافع کو نہیں بلکہ محکوم کے منافع کو ترقی دینے کی فکر میں ہو، یہ اصول بھی ویسا ہی ہے جیسے ان بزرگ کے دیگر مخصوص مسلمات ہیں کہ نظری اعتبار سے تو صداقت بدیہہ معلوم ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے میدان عمل میں آکر ایک طرح کا معما بن جاتے ہیں۔ غرض اس طرح جو تفریق پیدا کی گئی ہے اسے قدیم سہ رخی ترتیب کے ساتھ ملانے سے ہمیں "تین صحیح شائستہ" دساتیر سلطنت ہاتھ آتے ہیں جن میں فرد یا جماعت، سقراط کے خیال کے مطابق صحیح طور پر حکمرانی کرتی ہے۔ یہ تین اقسام حسب ذیل ہیں۔

(۱) بادشاہی یعنی اعلیٰ ترین قابلیت کے فرد واحد کی حکمرانی (۲) اعیانیت یعنی ان اشخاص کی حکومت جنہیں حکمرانی کے بہترین اوصاف موجود ہوں (۳) وہ طرز حکومت، جسے ارسطو ایک خاص مفہوم میں پالیٹی (دولت عامہ) کہتا ہے، جس میں اعلیٰ اختیار اہل ملک کی جماعت کثیر کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ دولت عامہ کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ وہ ازدحامی حکومت کے نقائص سے پاک رہتا ہے، انہیں کے متوازی تین "فاسد" صورتیں بھی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) خودسری یعنی ایک شخص کی خودغرضانہ حکمرانی۔ (۲) عدیدیت یعنی دولتمند قلیل التعداد جماعت کی خودغرضانہ حکومت (۳) عمومیت یعنی نسبتاً کثیر التعداد غیر مالکان املاک کی خودغرضانہ حکومت۔ اس تجویز کے حسن تناسب کا صریحی اقتضا یہ ہے کہ عدیدیت کے مانند (جو اعیانیت کی فاسد صورت ہے) اعیانیت میں بھی قلیل التعداد افراد کی حکومت کثیر التعداد افراد پر ہو، اور افلاطون کی رائے یقیناً یہی تھی کہ جو لوگ موزوں طور پر حکمرانی کے اوصاف سے متصف ہوں ان کی حکومت واقعی چند افراد کی حکومت ہوگی، افلاطون و ارسطو دونوں اسی وصف کو اعیانیت کے معنی اصلی سمجھتے تھے۔ افلاطون کہتا ہے کہ "یہ غیر ممکن ہے کہ کسی سلطنت کا گروہ عوام فن سیاست میں مہارت حاصل کر سکے، ہزار آدمیوں کے شہر میں پچاس اچھے نرد کھیلنے والے بھی نہ ملینگے، پچاس ماہران سیاست کا کیا ذکر ہے" عہ ارسطو نے جہاں اپنی تجویز کو پیش کیا ہے وہاں اعیانیت

عہ۔ افلاطون　سیاسیات ۲۹۲

کے متعلق اسی کو مقبول و مسلم رائے قرار دیا ہے کہ عددیت سے اس کی مشابہت تعدادی تعلقات اور صرف اسی تعدادی تعلقات کی وجہ سے ہے[۱]

لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ دقیق مباحث کے بعد ارسطو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ[۲] عام اہل ملک کی جماعت کثیر کو اگر مناسب تربیت دیجائے تو مجموعۃً وہ چند افراد سے زیادہ دانشمند ہو جائیں گے اور اس لیئے اعلیٰ ترین کارہائے شوریٰ و عدالت کے لئے مجموعۃً زیادہ اہل ثابت ہوں گے، البتہ فرداً فرداً وہ عاملانہ حکام کے کام انجام دینے کے لئے موزوں نہوں گے، اس لئے اس نے جہاں اپنی نموذجی سلطنت کا نقشہ کھینچا ہے[۳]، وہاں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تمام اہل ملک کو جب وہ ایک مناسب عمر کو پہنچ جائیں حکومت میں حصہ ملنا چاہیئے مگر ارسطو کے نموذجی دستور سلطنت میں اہل حرفہ، سوداگر بلکہ کاشتکار تک داخل نہیں ہیں کیونکہ دستکارانہ و تاجرانہ زندگی مبتذل اور اعلیٰ اوصاف کے منافی تھی اور زرعی زندگی اگرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستکارانہ و تاجرانہ زندگی کی اتنی پست نہیں تھی مگر اس میں اس فرصت کی کمی تھی جو ارسطو کے خیال کے مطابق ہر ایک کامل اہل ملک میں ہونا لازمی تھی۔ لہٰذا اس کے نزدیک اہل ملک سے مراد زمینداروں کا وہ گروہ تھا جو اپنے حصہ کی زمین کی پیداوار پر فرصت و فراغت سے بسر کرتا تھا، اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ زمین کی کاشت غلام یا نیم غلام کرتے ہیں، پس قوم کے مادی ضروریات کے لئے جسقدر انسانوں کی مجموعی تعداد کی ضرورت تھی اس کے مقابلہ میں یہ تعداد پھر بھی منتخب اور قلیل جماعت تھی۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، اگر ہم اس سہ شاخہ تقسیم سے بنی ہوئی شش رخی ترتیب کی طرف پلٹیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ارسطو حکومت کی ان چند شکلوں کو باعتبار قابلیت کے کس طرح ترتیب دیتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "اخلاقیات" میں جو پہلا مختصر خاکہ کھینچا ہے اس میں یہ تجویز ایک سادی اور معقول تجویز ہے۔ ہمیں پہلی تین قسم کی سلطنتوں کو حسابی

---

[۱] ۔ اخلاقیات حصہ ۸ باب ۱۰ سیاسیات حصہ سوم باب ہفتم۔

[۲] ۔ سیاسیات سوم باب نہم۔

[۳] ۔ سیاسیات چہارم۔ باب چہاردہم۔

تسلسل کی ترتیب میں رکھنا ہے اور دوسرے سہ شاخہ میں اس ترتیب کو الٹ دینا ہے۔ پس قابلیت کے لحاظ سے یہ زینہ اس طرح تیار ہوگا:-

بادشاہی

اعیانیت

دستوری حکومت یا دستوری عمومیت

مساوی یا غیر متوازن عمومیت

عدیدیت

خودسری یا ناجائز مطلق العنانی

اگر ایک شخص ایسے اعلیٰ اوصاف کامل رکھے جو تنہا حکمرانی کے سزاوار ہو تو یہ اس عقدے کا سادہ ترین و بہترین حل ہوگا۔ جہاں اس قسم کا کوئی عدیم المثال فرد واحد نہ ہو وہاں حکومت کے فرائض ان لوگوں کے تفویض ہونا چاہئیں جو ان فرائض کی انجام دہی کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں مگر ارسطو نے بعد کے خیالات میں اس ترتیب میں ترمیم کر دی۔ کتاب سیاسیات ملک پہونچکر اسے بادشاہی اعیانیت سے زیادہ بہتر نہیں معلوم ہوتی اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اعیانیت کے متعلق اس کی رائے افلاطون کی رائے سے مختلف ہوگئی تاہم (اس کے نزدیک) تمام حکومتوں میں خودغرضانہ مطلق العنانی بدترین حکومت ہے اور خودغرضانہ عدیدیت خودغرضانہ عمومیت سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

اس ترتیب کی ہیئت ظاہری تک سے یہ تکلیف دہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ در پردہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ یونان کی شہری سلطنتوں میں جو حکومتیں واقعاً قائم تھیں وہ سب کی سب مردود قرار پا جائیں کیونکہ ان سے فاسد اشکال کے ظاہر کرنے کے لئے وہی اصطلاحات منتخب کئے ہیں جو مورخ معمولاً واقعی حکومتوں کی ترتیب دہی میں کام میں لاتے ہیں[1] اور اس مزید تشریحات نے اس شک کو یقینی بنا دیا ہے کہ ارسطو نے عدیدیت

---

[1] یونان میں عام خیال کے مطابق جو امتیازات مسلم تھے، ارسطو کی ترتیب و تقسیم میں زیادہ تر انھیں کو ایک قاعدہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ایران میں جس سازش کا انجام داریوش دُپرسِس ستسپس کی تخت نشینی پر ہوا، اس کے دوران میں ساتوں سازشیوں کے درمیان ہرودوٹس (کتاب سوم ۸۰ و ۸۲) کے دعوی کے بموجب

وعمومیت کی جو تعریفیں ان الفاظ کے خراب مفہوم میں کی ہیں وہ صرف مجرد و ظاہری تعریفیں نہیں ہیں بلکہ ان سے مقصود مروجہ واقعات سیاسیہ کی تعریف ہے۔ یہ اس سے واضح ہے کہ اس نے کس لکر کے ساتھ اس امر کی تشریح کی ہے کہ عدیدیت وعمومیت میں اصلی فرق محض تعداد کا فرق نہیں ہے (جیساکہ عدیدیت کے اشتقاق سے ظاہر ہوتا ہے) بلکہ اس میں زیادہ تر غربا اور امرا کے درمیان امتیاز مدنظر ہے۔ وہ ہر ایک کی مختلف قسموں کا بیان کرتا ہے جن میں سے بعض بدتر اور بعض بہتر ہیں، وہ یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی حکومت ظاہری شکل کے اعتبار سے عمومی ہو مگر فی الاصل عدیدی ہو لیکن وہ صاف طور پر اس رائے پر قائم ہے کہ موخر دور میں یونان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے اکثر و بیشتر یہی واضح ہوتا ہے کہ بہت سے نظمہائے معاشرت معدودے چند امرا اور کثیر التعداد غربا دو فرقوں میں منقسم تھے، جو اپنے خودغرضانہ مقاصد کے واسطے غلبہ و اقتدار کیلئے کشاکش برپا کئے ہوئے تھے، اور اس کا معمولی نتیجہ یہی تھا کہ ایک فریق کی کامیابی اور دوسرے فریق پر ظلم و ستم لازم و ملزوم تھے۔

۵۔ کامل ترقی یافتہ عمومیت کے متعلق یہ درشت کلامی صرف ارسطو ہی کا شیوہ اور خیال نہیں ہے بلکہ یہ خیال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہم تو تقریباً بلا استثنا، یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تک جو خیال پہنچا ہے وہ صرف یہی خیال ہے بشرطیکہ ہم مقرروں کی تقریروں کو بحث سے خارج کردیں کیونکہ ان کا کام عوام کو دام ترغیب میں لانا تھا، اور اس لئے ان کے لئے دشوار تھا کہ وہ ان سے صاف صاف یہ کہدیتے کہ وہ ناقابل دلآزار ہیں، عمومیت کے ساتھ افلاطون کا عناد، ارسطو کے عناد سے بھی بڑھا ہوا تھا، زینوفون نے اسپارٹا کی جو بے حجابانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عجیب وغریب مکالمہ و مباحثہ ہوا، اس میں واحد، متعدد اور کثیر التعداد اشخاص کی حکومتوں کا مقابلہ کیا گیا تھا اور صحیح بادشاہ اور مطلق العنان کے درمیان اور علی ہذا عاقل و بہترین اشخاص کی حکومت اور چند دولتمندوں کی حکومت کے درمیان جو وسیع فرق ہے وہ عام زبان میں کم و بیش تسلیم کیا گیا تھا۔ پس ششگانہ باقاعدہ ترتیب کیلئے صرف اس امر پر زور دینا باقی تھا کہ کثیر التعداد اشخاص کی آئینی پابند حکمرانی جو اعتدال و انصاف کے حدود کے اندر رہتی ہو) اور عمومیت کی زیادہ انتہائی قسم (جس میں عوام الناس باقاعدہ طور پر دولتمندوں کو ستاتے ہوں) ان دونوں کے درمیان بھی مذکورہ بالا نوع کا فرق موجود تھا۔

جانبداری کی ہے، اس کی وجہ سے گروٹ نے اس پر سخت نفرین کی ہے۔ لیکن یہ حجت پیش ہوسکتی ہے کہ یہ سب کے سب اپنے خیالات میں ایک ہی طریقے کے پیرو تھے، یہ سب سقراط کے اثر میں شریک تھے، مگر اساکریٹس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس نے بھی اپنے سیاسی رسائل میں (جو کم و بیش اسی صدی کے وسط میں سیاسی تقریروں کی شکل میں شائع ہوئے تھے) بے اصول سرگروہان عوام کی رہبری میں بے لگام عمومیت کی نااہلیت آزادی کے متعلق کچھ کم جوش و خروش کے ساتھ گفتگو نہیں کی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ "نہ صرف ہمارے قومی نام کو نظروں سے گراتے ہیں، بلکہ وہ مقدمات چلانے، الزام لگانے اور تباہ کاری کی ہر ایک تدبیر سے کام لیکر خود کو دولتمند بناتے ہیں اور ہمیں تکلیف دہ محصولوں سے پیس ڈالتے ہیں، اور ان کی نااہلیت ان کی اس غارتگیری سے کم نہیں ہے، ان کے زیر اثر ہم خود اپنے دل کا حال ایک دن کے لئے بھی نہیں جانتے اور اگرچہ انفرادی رشوت کی سزا موت ہے مگر نہایت ہی ناقابل لوگ جمعیت عمومی کو بڑی بڑی رشوتیں دے کر ہمارے سپہ سالار بن جاتے ہیں"[عله]

اس میں شک نہیں کہ ان جملہ امور کا تعلق اولاً اقدماً ایتھنز سے ہے، مگر اس امر پر اتفاق عام تھا کہ یونانی عمومیت کی سب سے زیادہ درخشاں مثال ایتھنز ہی کی عمومیت تھی، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس میں تو شک نہیں ہے کہ ایک نمونہ تھا جسکی تقلید عمومیت کے اس عام میلان میں بہت وسعت کے ساتھ کی جاتی تھی، اور اساکریٹس نے صریحاً یہ کہدیا ہے کہ اس نے عمومیت پر جو لعنت بھیجی ہے وہ صرف ایتھنز تک محدود نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ "ہم اس وجہ سے مامون ہیں کہ ہمارے مدمقابل سلطنتوں کی حکمرانی بھی ہم سے کم ناقص نہیں ہے، ہم گویا اہل تھیبز کو بچاتے ہیں اور وہ ہمیں بچاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک دوسرے کی جمعیت عمومی کے ارکان کو معاوضہ دینا خالی از نفع نہ ہوگا"[عله] آرگوس وہ دوسری سلطنت ہے جسے عہد قدیم سے امتیاز حاصل تھا، اور اب وہ مدت دراز سے عمومی ہوگئی تھی، اس کے نسبت اساکریٹس، ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ارگاس والوں کو

عله۔ الیسفرالیس (تقریر ہشتم "متعلق امن و امان"۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک تقریر کے متعلقہ مضمون کا لب لباب ہے

عله۔ اساکریٹس (تقریر ہشتم) "متعلق امن و امان"

جنگ سے جب ذرا سانس لینے کا موقع ملجاتا ہے تو اپنے سے زیادہ با نمود شہریوں کو قتل کرنے کے کام میں لگ جاتے ہیں[1]۔

میرا خیال ہے کہ ہم اس امر کو ایک ناقابل انکار حقیقت کی طرح سے قبول کرسکتے ہیں کہ چوتھی صدی میں یونان میں جس عمومیت کی خوبیوں کا صور پھونکا جا رہا تھا اسے اصحاب خرد کا وہ طبقہ جسکے ملفوظات ہم تک پہونچے ہیں، عام طور پر ناپسند کرتا اور مردود قرار دیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی جہاں ہمارے ان تمام مصنفین کا اس پر اتفاق ہے کہ بے لگام عمومیت ایک خراب شے ہے وہیں وہ سب کے سب اس امر پر بھی متفق ہیں کہ خود غرضانہ عدیدیت یعنی خاص اپنے مفاد کے لئے قلیل التعداد دولتمند اشخاص کی حکومت اور بھی بدتر ہے، اس قول میں اساکریٹس، ارسطو سے پیچھے نہیں ہے کہ "ایک ناقص عمومیت بلائے بد ہونے میں عدیدیت سے کم ہے" ہماری ذلیل و رشوتخوار عمومیت بھی "تیس خودسروں" کی حکومت کے مقابلہ میں آسمانی حکومت معلوم ہوگی، اور اگر ہم یونان کے خاص خاص شہروں میں گھوم کر دیکھیں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ان شہروں نے عدیدیت کے تحت میں اس سے کم ترقی کی ہے جتنی ترقی انھوں نے عمومیت کے دوران میں کی ہے[2]۔" یہ صحیح ہے کہ افلاطون نے "اپنی کتاب" "جمہور" میں عمومیت کو عدیدیت سے بدتر قرار دیا ہے وہ تنزل کی جانب میلان طبعی کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے جسکے بموجب اسپارٹا کا ایسا دستور سیاسی (جسے وہ اپنی نمودجی سلطنت سے دوسرے درجہ پر رکھتا ہے)، حصول زر کے مفر اثر کی وجہ سے عدیدیت کی جانب تنزل کرنے پر مائل ہوتا ہے، بعدازاں عدیدیت، عمومیت کی جانب تنزل کر جاتی ہے اور پھر عمومیت خودسری کے درجہ تک پست ہو جاتی ہے، یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ یورپین تاریخ سیاسی ارتقا کا جو پہلا نظریہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ تنزل کا نظریہ ہے، اور اس میں شک نہیں کہ یونان کی تاریخ سے ایسی بکثرت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس رفتار تنزل کے ہر ایک قدم کا ثبوت مل سکے، لیکن اشکال حکومت کے سلسلہ کی عام ترتیب اس تاریخ کے عام

---

[1] اساکریٹس، دتقریر پنجم "بابت فیلقوس"۔

[2] اساکریٹس دتقریر ہفتم) اریوپاگس

واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی جس میں وہ زمانہ "جود ور خودسری" کے نام سے مشہور ہے خصوصیت کے ساتھ کامل ترقی یافتہ عمومیت سے قبل واقع ہوا ہے، بہر نوع افلاطون نے "مدبر" (Stateman) کے لکھتے وقت ناقابلیت کی اس ترتیب کو نظر انداز کردیا ہے، یہاں اس نے ناقابلیت کی وہی ترتیب رکھی ہے جو ارسطو نے دی ہے یعنے "عمومیت، عدیدیت اور خودسری"

۱۔ افلاطون نے اپنی تجویز مابعد میں عمومیت و عدیدیت کے مابین اس حیثیت اہمی کے قائم کرنے کے متعلق جو توجیہ پیش کی ہے وہ قابل لحاظ ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ کثیر اشخاص کی حکومت فی الاصل ایک کمزور حکومت ہوتی ہے، یہ حکومت کی ایک ایسی صورت ہے جس میں قوم کے اوپر نسبتاً بہت کم حکمرانی ہوتی ہے۔ ایک دانشمند و مضبوط حکومت کے مقابلہ میں عمومیت کی یہ ہیچکارہ خصوصیت افلاطون کی نظر میں ایک نقص معلوم ہوتی ہے لیکن عدیدیوں کی خود غرضانہ تہدید کے مقابلہ میں یہ ایک خوبی ہے۔

اپنے تمام گواہوں کی شہادت سے ہم عمومیت میں بہ حیثیت مجموعی تیقن کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ اسکے سخت ترین مفہوم میں انفرادی آزادی نمایاں طور پر بحال تھی، انفرادی آزادی سے مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہو کہ خطرناک بدنظمی پیدا کئے بغیر وہ جو چاہے کرے، "کثرت کا ظلم" جو ٹوک وِل و مِل کو یورپ کی آنے والی عمومیت میں ایک نہایت ہی شدید خطرہ معلوم ہوتا تھا، وہ ایتھنز کے عامۃ الناس کی نمایاں خصلت کی حیثیت سے یقیناً کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا، اس کے برخلاف ڈیموس تھینس ہم سے یہ کہتا ہے کہ "عمومیت تشدد کے عام فقدان کی جانب رہبری کرتی ہے"، یوریپدیس تقریر کی عام آزادی" کو اس سے منسوب کرتا ہے اور طوسی دیدس کا ممدوح فارقلیس کہتا ہے کہ "ہم میں سے ہر ایک اپنے راستہ پر چلتا ہے اور دوسروں پر ان کے جداجدا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے غراتا نہیں ہے" افلاطون کہتا ہے کہ "یہاں کتے بھی دوسری جگہوں کی بہ نسبت زیادہ گستاخ ہوتے ہیں، اور خران بے تمیز کامل الحقوق شہریوں کی شان سے چلتے ہیں فرضی زینوفون (جس نے ایتھنز کے نظام سلطنت کی ہجو تصنیف کی ہے) کہتا ہے کہ کوئی غلام جو سڑک پر آپ کے راستہ سے ہٹ نہ جائے آپ اسے بھی مارنے

کے مجاز نہیں ہیں "۔

کم از کم یہ تو ایک ایسا الزام ہے کہ ہم اس جدید زمانہ کے لوگ خواہ ہمارے سیاسی عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں عامۃ الناس کے خلاف نہ پیش کریں گے۔ ہم جب یونانی و اطالوی متمدن دنیا کے سیاسی و معاشری انتظام کی عام خوش حالی کے اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو غلامی کا یہ واقعۂ عظیم غمگین پلہ میں ایک بھاری وزن ہو جاتا ہے، اور اس خیال سے گونہ تسلی ہوتی ہے کہ عمومیت نے اس وزن کو کس قدر ہلکا کر دیا تھا۔

مگر یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ دولتمندوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا وہ ہر طرف سہولت و آسانی پیدا کرنے کے اس عام میلان میں ایک استثنا نہیں تھا؟ کیا عامۃ الناس اپنی سیاسی حیثیت سے ان پر غیر مساوی محصول لگا کر انھیں پریشان نہیں کرتے تھے اور پھر اپنی عدالتی حیثیت سے ان پر مذموم و نامنصفانہ مقدمات قائم کر کے جنکی سماعت بھی وہ خود ہی کرتے تھے انھیں لوٹتے نہ تھے، یہ بالکل ٹھیک ہے، اور چونکہ ہمارے اسناد اس پر متفق ہیں اس لئے اس میں شک کرنا مشکل ہے کہ ایک حد تک ان دونوں قسموں کی آزار رسانی جاری تھی، دوسری جانب سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اتنا ہے کہ اس کی کوئی علامت نہیں ہے کہ یہ کارروائی اس حد تک جاری رہی ہو کہ دولتمند اس سے ڈر کر ایتھنز سے راہ فرار اختیار کر رہے ہوں اور اس سے ایتھنز کی صنعتی و تجارتی خوش حالی پر اثر پڑتا ہو۔

عوام کی بڑی بڑی عدالتوں کے متعلق یہ یقینی ہے کہ چوتھی صدی کی عدالتی تقریریں جو ہم تک پہنچی ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے انصاف کے عملدرآمد کے متعلق ان عدالتوں کی قوت عمل کی طرف سے پست خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ فریق مخالف کی نسبت وہ کثیر غلط بیانی اور غیر متعلق الزامات ہیں جو وکلا اپنی تقریروں میں بیان کیا کرتے تھے۔ نیز بغیر کسی قید کے وکلا کا اس امر کا مجاز ہونا بھی اس کا باعث تھا کہ وہ اپنے حسب مطلب جج جن خیالات سے بھی جج پر اثر ڈال سکیں ان سے کام لیں، تاہم ان عدالتوں کے وسیلہ سے جو باقاعدہ و غیر منصفانہ ضبطی ہوتی تھی اس کی وسعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا نہایت دشوار ہے۔ ارسٹوفینس جب مخبر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ وہ ہر طرف قصور وار، نادہند، لحیم، شحیم، شیریں مقال، تنومند، دولتمند اشخاص کو ڈھونڈتا پھرتا ہے

تو اس کا مقصد یہی ہے کہ وہ قاصر ونادہندہ تھے[1] اور جب ہمیں لیسیاس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض وکلا دوران مقدمات میں جوریوں سے یہاں تک کہتے تھے کہ اگر وہ ملزم کو رہا کر دیں گے تو خزانہ میں اتنا سرمایہ نہ رہے گا کہ انھیں تین روبول یومیہ کے حساب سے معاوضہ دیا جاسکے، تو ہمیں یقیناً یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی مجرم مدعیٰ علیہ پر رحم نہ کرنے کی درخواست تھی، نہ کہ کسی بیقصور شخص کے لوٹنے کی علانیہ تائید وتحریک، تاہم ایسا ہونا ہی فی نفسہ برا تھا، علیٰ ہذا اگرچہ اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ عامۃ الناس کے تحت میں عہدہ دار کبھی کبھی رشوت ستانی وجابرانہ کارروائیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ پھر بھی اس امر میں شک کرنا بالکل قرین عقل ہے کہ یہ کسی نہج سے بھی عمومیت کی ممیز ومخصوص صورت تھی۔

محصول کے معاملہ میں زائد از ضرورت بار ڈالنے کے متعلق، یہ خیال رکھنا چاہئے کہ دولتمندوں پر مزید بار ڈالنے کا طریقہ قدیم سے چلا آرہا تھا، اور اس کی کوئی علامت نہیں ہے کہ انتہائی عمومیت نے اسے بدتر بنا دیا ہو اگر ہم یہ سنتے ہیں کہ قوم رقص وسرود اور مشعلوں کی دوڑ میں تباہ ہورہی تھی، تو یہ خیال کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ یہ بالعموم اس وجہ سے ہوتا تھا کہ شان ونمائش کے شوق میں وہ اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتے تھے جتنے خرچ کے لئے وہ قانوناً مجبور تھے۔ ہم ایک شخص کی نسبت یہ سنتے ہیں کہ اُس نے اپنے گانے والوں کو سونے کے گوٹے سے آراستہ کیا اور اس کے بعد خود چبیترے لگائے پہرنے لگا، لیکن گوٹے پٹھے کی یہ فضول خرچی اس نے خود اپنے شوق سے کی تھی۔ عوام نے اسے اس کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔

جنگ کے مصارف کا بار زیادہ سخت تھا اور اس میں زیادہ تکلیف محسوس ہوتی تھی، مگر کسی نکتہ چین نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ عامۃ الناس جنگ کرنے کے اس وجہ سے شائق تھے کہ خود انھیں اس کے مصارف ادا نہیں کرنا پڑتے تھے، کم از کم چوتھی صدی میں جبکہ عمومی میلانات نہایت ہی کامل طور پر ترقی کر گئے تھے، یہ حال نہ تھا بلکہ الزام تو یہ ہے کہ فیلقوس شاہ مقدونیہ کی موزوں مقاومت کے لئے جس قدر اخراجات کی ضرورت تھی عامۃ الناس اس کے لئے پوری مستعدی کے ساتھ کمربستہ نہیں ہوتے تھے

---

[1] ارسٹوفینس! "مبارزہ" ۲۵۹

لیکن جہاں میں ایتھنز کی عمومیت کی مشروط حمایت کرتا ہوں وہیں میں اس حمایت کو عام طور پر یونان کی عمومی سلطنتوں کی طرف وسعت دینے میں پس وپیش رکھتا ہوں۔ ارسطو کے اس بیان کی صداقت میں شک کرنا خالی از جسارت نہیں ہے کہ عمومیتوں کے اندر انقلابات "اکثر سران انبوہ کی غیر معتدل روش کی وجہ سے واقع ہوتے تھے جو ذی املاک طبقہ کے امرا پر مفسدانہ مقدمات قائم کرکے یا عوام کو بہ حیثیت جماعت کے ان کے خلاف بھڑکاکران کو متحد ہونے پر مجبور کر دیتے تھے"۔ اس نے ایک عجیب وغریب مثال جزیرۂ رہوڈز کی بیان کی ہے، جہاں ان دولتمندوں کو جنکے ذمہ جہاز سازی تھی، ان کو عوام الناس کے ان سران انبوہ نے دوسرے شہریوں سے واجبی چندہ لینے سے روک دیا تھا، اور اسلئے جب ان کے قرضخواہوں نے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی دہمکی دی تو اس خوف کی وجہ سے مجبور ہوکر انھوں نے ایک سازش کی اور عمومیت کا تختہ الٹ دیا۔ اسی طرح وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ میگارا میں "ان سران انبوہ نے ضبطی جائداد کا موقع حاصل کرنے کی غرض سے، امرا کی بہت بڑی تعداد کو سلطنت سے خارج کردیا یہاں تک کہ جلاوطنوں کی تعداد اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے وطن واپس آکر اہل عمومیت کے مقابلہ میں صف آرائی کی اور میدان کارزار میں انھیں مغلوب کرکے عددیت قائم کردی"[۱]۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس سے بالیقین یہ معلوم ہوتا ہے کہ میگارا میں دولتمندوں پر ظلم وستم نہایت ہی شدید اور بہت ہی عام تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو ایک مخالف گواہ ہے مگر اس کے دل ودماغ پر ہمیشہ حقیقی علمی جستجو کا غلبہ رہتا تھا (اور اس لئے ہم اس پر تخلیط کا گمان نہ کرنا چاہئے) اور میگارا کے عمومی فریقوں کی زیادتی کے نسبت ہمیں پلوٹارک سے بھی ایک طرح کی تصدیق حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میگارا میں، بادشاہی، عددیت اور خودسری کے معمولی دوروں کے بعد چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول میں ہنگامہ خیز عمومیت کا ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غربا امیروں کے گھروں میں بزور گھس جاتے اور بلالحاظ قیمت ناشتے اور کھانے کے لئے احکام جاری کرتے تھے اور باضابطہ ایک حکم یہ بھی نافذ کردیا تھا کہ قرضوں پر جو کچھ سود ادا ہوچکا ہے وہ واپس کیا

---

[۱] سیاسیات حصہ ہشتم (بہ پنجم) باب پنجم۔

جائے؛ (جیساکہ گروٹ نے اشارہ کیا ہے) اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ دوریانیوں کی فتح کے بعد سے نسل کا جو اختلاف باقی رہ گیا تھا وہی گروہ عام کی اس ظلم و زیادتی کو اور شدید بنانے کا باعث ہوا اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ پے در پے دو مرتبہ عدیدیت قائم ہوگئی مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔

ارگوس کی عمومیت کی پر اشتداد نوعیت کی توضیح بھی اسی طرح پر ہو سکتی ہے اس کا حال ہمیں خاصکر بدنام کن شکوتالسموس یا "عدالت دیوس" کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، جسکے حکم سے سنہ ۳۷۰ق م میں اعلیٰ طبقہ کے بارہ سو افراد جن پر عدیدانہ انقلاب کا منصوبہ قائم کرنے کا الزام تھا، ہلاک کیے گئے اس قسم کے افعال کا منفرد نہ ہونا اس طرز بیان سے مستنبط ہو سکتا ہے جو الیسقراطیس نے (سنہ ۳۴۶ میں) ارگاس کے اختلافات کے ذکر میں اظہار کیا ہے؛ (اور یہ جملہ اوپر درج ہو چکا ہے) با ایں ہمہ پانچویں صدی کے وسط سے قبل تو ارگوس میں عمومیت کا سلسلہ تقریباً غیر منقطع رہا، غالباً اسپارٹا کی رقابت ایک حد تک اس کا سبب تھی؛ جو عدیدی اسپارٹا کے ساتھ متحد ہوتے لوگ حب وطن کی وجہ سے ان کے خلاف ہو جاتے۔ عام الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پر اشتداد عمومیت کی وجہ سے اضطرابی حالت پیدا ہو جاتی تھی، جس سے مملکت دفعۃً عدیدیت یا خودسری کی صورت میں بدل جاتی تھی مگر ان کی زندگی بہت کم ہوتی تھی۔ اگر ہم ایتھنز کے تیس خودسروں کی مختصر تاریخ سے عام نتیجہ اخذ کریں تو یہ کہنا پڑے گا کہ غالباً اس قسم کی عدیدیت کو بدترین عمومیت کے بدترین افعال کی ہمسری سے ننگ نہیں تھا۔

دولتمندوں سے استحصال زر کی ایک شکل "زمین کی تقسیم جدید" بھی[1] تھی؛ اور اس میں اس وجہ سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے کہ یہ طریقہ خود ہمارے زمانے کے بعض انقلابی مقاصد سے مشابہت رکھتا ہے۔ اساکریٹس[2] مقرر نے "شہروں کی معمولی مصیبتوں کا جہاں ذکر کیا ہے (اور اسپارٹا کے ایک طرفدار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ صرف اسپارٹا ان آلام سے پاک ہے) وہاں اس نے ان معمولی مصائب و نوائب "یعنی قرضوں کی تنسیخ" (جو ایتھنز میں سولن کا ایک جلیل القدر کارنامہ شمار ہوتا تھا) اور زمین کی تقسیم جدید

ع۱ ۔ اس باب کا فقرہ (۵) دیکھا جائے۔

ع۲ ۔ اساکریٹس تقریر ۱۲ ۔

کا بھی ذکر کیا ہے[1]۔ ارسطو نے بھی اس کا مذکور اس طرح پر کیا ہے کہ یہ سران انبوہ کے ظلم وستم کا مسلمہ طریقہ تھا[2] مگر اس نے کوئی مثال نہیں دی ہے، اور دور شہنشاہی کے ایک فصیح البیان یونانی مقرر دیون کری سوستوم نے یہ کہا ہے کہ ہمیں مطلقاً اس کا علم نہیں ہے کہ اس قسم کا کوئی فعل سرزد ہوا ہو[3]۔ میں نے بھی اس امر کی بیکار کوشش کی ہے کہ سولن کے تنسیخ قرض کی طرح زمین کی تقسیم جدید کی بھی کوئی ایسی مثال ملجائے جو عمومی کارروائی کی حیثیت سے باامن ونیم قانونی طور پر عمل میں آئی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خانہ جنگی کے دوران میں جبکہ کوئی فریق بزور خارج کردیا جائے، اس وقت اس قسم کے امور کا واقع ہونا بعید نہیں تھا۔ تاہم اس میں بھی مشکل شک ہوسکتا ہے کہ عمومی ظلم وستم کی اس چیرہ دستی کی اور مثالیں بھی ہوں گی اگرچہ یہ باتیں اس سے بکثرت زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ جیسا واقعی عمل میں آتی ہیں۔

یونانی عمومیت کے متعلق ایک اہم اعتراض کو جس کی بنیاد ایتھنز کی تاریخ پر ہے۔ میں نے آخر تک محسوس کیا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جس طولانی کشمکش کا خاتمہ بالعموم تمام یونان پر مقدونیہ کی فوقیت کے قبول کرلئے جانے پر ہوا، اس سے غیرملکی حکمت عملی کے متعلق عمومیت کی ہلاک کم بینی وعدم استقامت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ کہ اہل ایتھنز میں حکومت کی کوئی اور شکل ہوتی تو ممکن تھا کہ اہل ایتھنز کامیابی کے ساتھ فلپ کا مقابلہ کرسکتے۔ میں یہ نہیں خیال کرتا کہ اس امر سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس الزام کی بہت بڑی وجہ موجود ہے، لیکن اگر ہم ایتھنز کی عمومیت کا مقابلہ ان دوسرے اشکال حکومت سے کریں جو یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری قوموں میں، واقعاً انھیں عام حالات کے تحت میں پائی جاتی ہیں جن حالات کے تحت میں ایتھنز کی عمومیت قائم تھی تو عمومیت کے حامی بہت خوبی کے ساتھ اس کے جواب میں یہ سوال کرسکتے ہیں، کہ یونان کے دوسرے شہروں نے اس شکل سے عہدہ برآ ہونے میں کیا مزید قابلیت دکھائی۔ عدیدیت کا نہایت ہی سرگرم مداح بھی اسپارٹا

---

[2]۔ "سیاسیات" ہشتم (پنجم) ۵ پنجم

[3]۔ تقریر ۳۱ ۲۲۳۔

کے لئے بمشکل اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ فیلقوس کے مقابلہ میں اولاً واقعۃً یہ محض عمومیت کا امتحان نہیں تھا کہ وہ اس میں کمزور ثابت ہوئی بلکہ یہ یونان کی شہری سلطنتوں کے زائد از ضرورت خود کامانہ جذبے اور ان کی بیحد محدود حب وطن کا امتحان تھا جس میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ عام یونانیت کے حقیقی و موثر جذبے سے برانگیختہ ہو جائے اور ایک مساوی اور مستحکم متفقیت قائم کرلے، بعد کے زمانہ میں جبکہ متفقیت کے اصول نے اکایا کے گمنام و غیر نمائشی معاقدے کے مختصر آغاز سے ترقی کرکے نمود و سربلندی حاصل کی اور ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس حالت میں بھی ایتھنز علیحدہ تھا اور اسپارٹا اپنے بلند درجہ سے گرچکا تھا اور متفقیت کیا کچھ کرسکتی تھی، تو پھر ہم ارسطو کے ساتھ کم و بیش اتفاق کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ یونانی قوم اگر صرف اتنا کرتی کہ ایک حکومت کے تحت میں متحد ہو جاتی تو وہ اپنے خوش نصیبانہ امتزاج اور متوازن صفات کی وجہ سے ساری دنیا کو فتح کرلیتی۔

خطبۂ ہشتم

ارسطو و افلاطون کی مثالی سلطنتیں

۱۔ اپنے آخری خطبہ میں، چوتھی صدی کے ایتھنز کے دستور سلطنت کا مختصر بیان دینے کے بعد میں یونانی عمومیت کے عملی کام کے متعلق اس متفقہ ناموافق رائے کا ذکر کر رہا تھا جس پر افلاطون، ارسطو، اسا کریٹس، اور زینوفون سب یک زبان ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے، دوسری جانب سے کسی بے لوث شخص نے کوئی ایسا کلام نہیں کیا ہے جس کی کچھ اہمیت ہو کیونکہ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) عامۃ الناس کی مدح و ستائش میں مقرروں کے بیاناتِ شہادت میں اس وجہ سے قبول نہیں کئے جا سکتے کہ ان لوگوں کا تو کام ہی یہی تھا کہ عوام کو راضی رکھیں۔

لیکن یہ حجت نکالی گئی ہے کہ افلاطون اسا کریٹس اور ارسطو صرف اس زمانہ کے ایتھنز کو جانتے تھے جب اس کا بہترین دور گزر گیا تھا اور جب عہد زریں کی ذہین و پرجوش آبادی جنگ دو پایہ کھشکر برائے نام رہ گئی تھی[۱] اور چونکہ ایتھنز والے قلیل تعداد میں رہ گئے تھے اور اس تقلیل سے ان کے دل پست ہو گئے تھے، اس لئے انہوں نے بالطبع حکومت کا کام کتوں کے حوالہ کر دیا تھا، میرے خیال میں اس تشریح سے کام

---

[۱] ۔ وارڈ فاؤلر، "یونانیوں اور رومانیوں کی شہری سلطنت" صفحہ ۱۵۲۔

نکلنا دشوار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اٹیکا کی آبادی گھٹ گئی تھی، چوتھی صدی کے اختتام پر ہم ۲۱۰۰۰ بالغ شہریوں کا ذکر سنتے ہیں حالانکہ پانچویں صدی کے اواخر میں یہ تعداد ۳۰۰۰۰ سے اوپر تھی؛ لیکن یہ گھٹی ہوئی تعداد عمومیت کے ادارات کے چلانے کے لئے یقیناً کافی تھی[الف] اور جنگ پیلوپونیز کی ناقص کامیابی اور اس کے نتیجہ میں بحری شہنشاہی کے ضائع ہوجانے سے اہل ایتھنز کا دل ہمیشہ کے لئے پست نہیں ہوگیا تھا، پست ہونا تو کجا چوتھی صدی کی یونانی تاریخ کے پڑھنے والے اس امر سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اس صدمہ سے بحال ہوجانے اور دوسری شہنشاہی کے قائم کرلینے میں اہل ایتھنز نے کس قدر باطنی قابلیت کا اظہار کیا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ دوسری شہنشاہی پہلی شہنشاہی سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتی تھی۔

اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چوتھی صدی مسلمہ و کامل ترقی یافتہ عمومیت کا دور اور پانچویں صدی منازل ارتقا کے طے کرنے کا زمانہ تھی، اس میں شک نہیں کہ فارقلیس کے عہد جلیل میں شاندار خوشی کا ایک زمانہ گزرا تھا، گو قدیم اسناد کے مطابق اگرچہ اس زمانہ میں انتہائی عمومیت کی جانب ماہرانہ قدم بڑھ رہے تھے مگر ہنوز وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ عمومی ادارات کا پورا پورا اثر نمایاں ہوجاتا، پس کیوں اس زمانہ کی خوشحالی کامل ترقی یافتہ طرز عمومیت کا اثر نہیں سمجھی جاتی، اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے اور دوسری وجہ اس امر کی کہ کیوں پانچویں صدی کے شاندار دور میں ایتھنز کا دستور سلطنت اپنے طرز کا نمونہ نہیں قرار دیا جاتا خود اسی واقعے میں مضمر ہے کہ اس زمانہ میں ایتھنز نمایاں و مقدم طور پر ایک شہنشاہی شہر تھا، اس کی قومی آمدنی کا ماخذ زیادہ تر دوسرے شہروں کا خراج تھا اور اہالی ایتھنز کو فرائض حکمرانی اور تنخواہوں کی جو کثرت و وسعت حاصل تھی وہ زیادہ تر ان کی اسی شہنشاہی حیثیت کے باعث تھی۔

چوتھی صدی کی طرف پلٹ کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جمود، فرقہ بندی اور آپس کی جنگ و جدل کے وہ مصائب جو تمام دور تاریخی میں عام طور پر یونان کی شہری سلطنتوں کی خصوصیت خاص بنے ہوئے تھے، یہ عیوب ایتھنز کی کامل ترقی یافتہ عمومیت میں نہیں

[الف] ارسطو، "سیاسیات" حصہ ۴ (۷)، باب ۴، فقرہ ۴، حصہ دوم، باب ۶، فقرہ ۴۔

پائے جاتے (جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں) یہی آپس کا مناقشہ تھا جسکی وجہ سے ساتویں اور چھٹی صدیوں میں خودسرانہ حکومت کے قیام کا موقع مل گیا۔ ایتھنز میں آپس کی اس جنگ جدال کا دور پانچویں صدی کے آخر تک ختم ہوگیا تھا۔ چوتھی صدی میں فرقہ بندیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ رہی ہوں مگر وہ بدنظمی وزیادتی کی طرف منجر نہیں ہوتی تھیں۔ اہلِ دولت اور ان کے شرکائے کار اور عامۃ الناس کے مابین جو کشمکش اور جھگڑوں میں اس قدر عام تھی اور جس سے بقول افلاطون ایک شہر کے دو شہر بن جاتے تھے جنہیں سے ہر ایک اپنے مخالف فریق کے سرگروہوں کو برابر خارج کرتا رہتا تھا، ایتھنز اس کشمکش سے پاک تھا، لیکن پھر بھی (جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس کی عمومیت سربرآوردہ اہلِ فکر ومصنفانِ سیاسیات کے شدید لعن وطعن سے نہ بچ سکی۔

۲۔ لیکن اگر اصحاب فکر عمومیت کے معائب کا علاج عدیدیت کے بدتر معائب میں تلاش کرنے پر متفق نہ تھے تو پھر ان کا مجوزہ قطعی علاج کیا تھا؟ افلاطون وارسطو دونوں نے اس سوال کا جواب کسی قدر پیچیدہ سا دیا ہے۔

دونوں نے ایک مثالی سلطنت قائم کی ہے اور اس کی نسبت یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ عام طور پر عملی صورت میں نہیں آسکتی، اور پھر دونوں ایک آخری علاج یعنی ایک دوسری بہترین صورت تجویز کرتے ہیں جس کا عملی صورت میں لانا زیادہ اغلب ہو، اور جب ہم دونوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کی مثالی سلطنت اگرچہ افلاطون کی مثالی سلطنت سے بہت ہی غیر مشابہ ہے لیکن افلاطون کی دوسری بہترین صورت کے نمونے کے ساتھ اسے ایک قوی مشابہت ہے۔ پس اس طرح ہم دونوں اصحاب فکر کے تعلیمات کو یکجا کرسکتے ہیں اور ان میں تخیل کے اس مسلسل تحرک کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ وہ بہت ہی نمایاں قسم کے سیاسی تخیل سے جو عملی سیاسیات سے بہت ہی بعید واقع ہوا تھا نسبتاً زیادہ عملی تجربہ آموز تخیل کی طرف گامزن تھا۔

سیاسی مطمح نظر کا جو عنصر اصلی افلاطون وارسطو دونوں میں مشترک تھا وہ اس بنیادی اصول کے اندر پایا جاتا ہے جس پر افلاطون کے استاد سقراط کی مکالماتی تعلیم بنی تھی۔ وہ تعلیم یہ تھی کہ ذاتی معاشرت کے مانند حکومت کے کام میں بھی بہت بڑی احتیاج علم یعنی انسان کی حقیقی بہتری اور اس کے حصول کے ذرائع کے علم کی ہے، جس

شخص میں یہ علم موجود ہوگا جب اسے حکمرانی کے فرائض تفویض ہوں گے، تو اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ محکوم کی بہبود کو کس طرح ترقی دینا چاہیئے اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود اس کی بہبود بھی اس فرض کے صحیح طور پر انجام دینے سے حاصل ہوگی۔ اس قسم کا شخص فی الواقع مدبر ہوگا، خواہ اس کا تقرر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اور اگر ہمیں اس قسم کا کوئی آدمی مل سکے، اور ہم اسے حکمراں نہ بنائیں اور حکمرانوں کے انتخاب کا مسئلہ قرعہ کے نتائج اتفاقی پر چھوڑ دیں تو یہ پوری دیوانگی ہوگی۔ اس کے برعکس، اس جوہر علم کے بغیر تمام بنی نوع انسان کی رائیں بھی کسی شخص کو مدبر نہیں بنا سکتیں۔ ان سادے دفعات میں سقراط کے سیاسی عقیدے کے وہ تخم مخفی تھے، جن سے افلاطون کی مثالی اعیانیت نے نشوونما حاصل کی کیونکہ افلاطون کی رائے میں یہ لابدی علم صرف فلاسفہ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے، اس کے قبل کہ کوئی شخص انسانی زندگی میں اعلیٰ اوصاف سے کام لینے کی توقع کر سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے مجرد ان اوصاف پر غور و فکر کرنے کی تعلیم و تربیت دی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی، ایسے اشخاص جو اپنے مواہب فطری کے لحاظ سے اس قابل ہوں کہ فلسفہ کے حسب ضرورت، طولانی و مشقت طلب تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں ایسے افراد بہتر سے بہتر منظم قوم میں بھی ہمیشہ معدودے چندہی ہوں گے اور ان چند افراد کے منتخب کرنے کی قابلیت بھی صرف فلسفیوں ہی میں ہو سکتی ہے، لہٰذا افلاطون کی اعلیٰ ترین مثالی سلطنت ایک ایسی اعیانیت ہوگی جس کی بنا، انتخاب باہمی پر ہوگی یعنی اس میں فلسفیوں کے ایک ایسے مختصر سے طبقہ کی بے چون و چرا اطاعت ہوگی جن کی تعلیم و تربیت غور و فکر کے ساتھ ہوئی ہو اور جو اپنی تعداد کو ایسے نوجوانوں کے انتخاب سے پورا کرتے رہیں جنھیں وہ تعلیم و تربیت کے قابل سمجھیں۔

ایک ایسی انسانی جماعت کی بقا کے لئے جو اپنے ضروریات کو خود پورا کرتی ہو، جن طبقات کی ضرورت ہے، اس میں سے افلاطون نے اپنی مثالی سلطنت کے بنانے میں جس دوسرے طبقہ کی تعلیم و تربیت کی ضرورت سمجھی ہے وہ صرف جنگجو طبقہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سلطنت کے اندر کاشتکار و دستکار بھی ہوں گے مگر اس کی رائے میں ان لوگوں کو سپاہی پیشہ جماعت سے علیحدہ ہونا چاہیئے۔ افلاطون نے صرف ان سپاہی پیشہ اشخاص ہی کے لئے قواعد و ضوابط کا مشرح طریقہ بیان

کیا ہے، یہی لوگ بشمول فلاسفہ تمام قوم کے مربی و محافظ قرار دیے گئے ہیں۔

وہ جنگ کو انسانی نظم معاشرت کی مثالی حالت کا کوئی حسب معمول واقعہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کے بالکل برعکس خیال رکھتا ہے، لیکن اس کی سلطنت اگرچہ ایک خیالی و تصوری سلطنت ہے پھر بھی اس کا مقصود کسی یوٹوپیا کا قائم کرنا نہیں ہے، وہ کوئی وہمی سلطنت نہیں ہے بلکہ ایک نمونہ کی سلطنت ہے۔ یونانی شہری سلطنتوں میں جو واقعی حالت قائم تھی اسی کو مدنظر رکھکر اس کا خاکہ تیار کیا گیا ہے، اور ان سلطنتوں میں قومی خوشحالی کے لئے یہ ایک لازمی شرط تھی کہ جنگ کے معاملہ میں سلطنت کو مہیب و ہولناک ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ان طبقات کے مقابلہ میں، جو قوم کے مادی ضروریات مہیا کرنے میں مشغول تھے، سپاہی پیشہ طبقات کی اخلاقی فوقیت کے متعلق اس کا خیال بالکل اسی تصور کے مطابق تھا جو یونانیوں نے نکوکاری کے متعلق قائم کر رکھا تھا، اور اس تصور میں شجاعت کو اس زمانہ کے خیال کے بہ نسبت بہت زیادہ نمایاں حصہ دیا گیا تھا، اس سے اس زمانہ کے لوگوں کو حیرت ضرور ہوگی مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کیفیت سیاسی حالات کا ایک بالواسطہ اثر تھا۔ بس افلاطون کی انتہائی رائے میں ارباب حکمت و اہل سیف ہی باہم ملکر مربیوں کا وہ طبقہ بناتے تھے جن کے لئے تعلیم و تربیت فوجی قواعد، اور ضابطۂ زندگی کے لئے ایک مشرح نظام مرتب کیا گیا تھا، یہ نظام اسپارٹا کے طرز پر ڈالا گیا تھا، جس کے دستور سلطنت کو افلاطون، یونان کے واقعی اشکال حکومت میں سب سے اول درجہ پر قرار دیتا ہے مگر اپنے سیاسی دستور کی ترتیب میں اس نے یہ خیال مدنظر رکھا ہے کہ خانگی ضروریات کے لئے خود غرضانہ حصول زر کی خرابیاں زیادہ قطعی طور پر خارج ہو جائیں۔

افلاطون نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ خرابیاں اسپارٹا سے کامل طور پر خارج نہیں کی گئی تھیں کیونکہ لائی کرگس کے دستور میں اگرچہ مردوں کو سخت و سادہ قواعد کی مشق کرائی جاتی تھی اور عورتیں اس مشق سے بالکل کوری رہ گئی تھیں، اور اگرچہ اسپارٹا کی فوجی قیامگاہ کی زندگی اور عام مشترک دعوتوں نے مردوں کے لئے دولت سے لطف اندوز ہونے کو بہت سختی کے ساتھ محدود کر دیا تھا مگر بیوی بچوں کے لئے دولت جمع کرنیکی خواہش کا عملی نتیجہ صرف یہ تھا کہ اہل اسپارٹا حرص و ہوس کی مخرب تحریکات کا شکار

ہوگئے تھے، بس اس غرض سے کہ شہری جذبہ نے اسپارٹا میں جس حد تک ترقی کی تھی اسے اس سے زیادہ قطعی غلبہ حاصل ہو جائے، اور اس غرض سے بھی کہ اہل شہر کی اولاد ہر طرح کامل ہو اور فرائض (ملکی) مناسبت طبعی کے مطابق تقسیم ہوں، افلاطون نے اپنے قائم کردہ مربیوں کے طبقہ کے لئے ذاتی جائداد اور ذاتی خاندان کو بالکلیہ منسوخ کر دینے کی تجویز کی۔

لیکن اس اشتمالیت پر ارسطو نے بہت سختی سے بحث کی ہے اور اپنی تصنیف "سیاسیات" میں اس اختلاف رائے کو اس نے جو نمایاں جگہ دی ہے، اس سے افلاطون کی "دوسرے درجہ کی سلطنت" اور خود اس کے (ارسطو کے) سیاسی منتہائے خیال میں جو گہرا اور اصولی تشابہ موجود ہے، وہ پردہ خفا میں آگیا ہے کیونکہ افلاطون نے خود یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی اشتمالیت عملی سیاسیات کے حد کے اندر نہیں آتی، اس لئے اپنی "دوسرے درجہ کی سلطنت" کی بحث میں (جس کا خاکہ اس نے اپنی تصنیف "قوانین" میں کھینچا ہے جو "ریپبلک" (جمہور) سے کئی سال بعد لکھی گئی تھی) اس نے مناکحت اور ملک شخصی دونوں کے متعلق اشتمال کے خیال کو ترک کر دیا ہے لیکن پھر بھی اس نے اس امید سے ہاتھ نہیں اٹھایا ہے کہ امرا و غربا کے درمیان نظم معاشرت کی مہلک تقسیم کو قانونی مداخلت کے ذریعہ سے روکا جائے۔ اس تقسیم کے متعلق اس نے "جمہور" میں بہت زور دے کر یہ کہا ہے کہ اس سے ایک شہر کے اندر دو متحارب حصے قائم ہو جاتے ہیں[15]۔ اب وہ اسے روکنے کی اس طرح توقع کرتا ہے کہ زمینداروں کی ایک جماعت کو شہری حقوق دیدئے جائیں اور ہر ایک کو زمین کے برابر برابر ٹکڑے دئے جائیں جو ناقابل انتقال ہوں اور اس ٹکڑے کی چار چند قیمت سے زیادہ کی منقولہ جائداد حاصل کرنے کی قطعی ممانعت کر دی جائے۔ ان ٹکڑوں کی خرید و فروخت نہ ہو اور ہر شخص اپنا حصہ اپنے اس لڑکے کے لئے چھوڑ جائے جس سے اس کو سب سے زیادہ محبت ہو۔ اپنے دوسرے لڑکوں کو وہ ان شہریوں میں تقسیم کر دے جنکے اولاد نہ ہو اور جوان لڑکوں کو متبنیٰ کرنا چاہیں[16]۔ حصوں کو مساوی رکھنے کے لئے

---

[15] ۔ ریپبلک (جمہور)، حصہ چہارم، ۴۲۲
[16] ۔ قوانین، پنجم، ۴۷

اور بھی بہت سے قواعد قرار دئے گئے ہیں۔ آبادی اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو بشرط امکان، حکام اسے محدود رکھیں۔ اور اگر یہ ناممکن العمل معلوم ہو تو آخری چارہ کار کے طور پر لوگوں کو کہیں اور نوآبادی قائم کرنے کے لئے بھیجدیں۔

جائداد کی عدم مساوات کو روکنے کی اس تجویز پر ارسطو نے نکتہ چینی کی ہے مگر اسکی یہ نکتہ چینی زمانہ جدید کے اس خیال کی مطابقت میں نہیں ہے کہ اس سے معاشی تقسیم کے فطری قوانین میں ضرورت سے زیادہ مداخلت ہوگی بلکہ یہ نکتہ چینی اس معنی کر کے ہے کہ یہ مداخلت کافی حد تک نہیں رکھی گئی ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ تجویز اس وجہ سے شکست ہو جائے گی کہ خاندان میں لڑکوں کی تعداد کی کوئی معینہ حد نہیں مقرر کی گئی ہے، اس لئے اس نے اپنی تصوری سلطنت میں اس حد کے قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔

اس نے افلاطون کی دوسری درجے کی سلطنت کے بعض اور نکات پر بھی نکتہ چینی کی ہے، لیکن اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے ہم ارسطو کی بہ نسبت زیادہ صفائی کے ساتھ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ خود اس کا تخیل سیاسی اپنے خط و خال میں افلاطون کے تخیل سے کس درجہ یکساں ہے۔ افلاطون و ارسطو دونوں اس رائے پر متفق ہیں کہ اعلیٰ درجہ کے منتظم سیاسی نظم معاشرت کی آخری صورت شہری سلطنت ہی ہے۔ دونوں کی رائے میں سلطنت کو ایک شہر سے زیادہ وسیع نہ ہونا چاہیئے۔ شہر کے ساتھ اتنی زمین ہونا چاہیئے جو اس کے گزر کے لئے ضروری ہو اور یہ حد اس غرض سے رکھی گئی ہے کہ اہل شہر ایک مجلس میں جمع ہو سکیں، جو مؤثر غور و فکر کے لئے ضرورت سے زیادہ بڑی نہ ہو اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس قدر واقف ہوں کہ حکام کا انتخاب خوبی کے ساتھ کر سکیں۔ نیز یونان کے اصحاب فکر کی نظر میں اس شرط کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ انصاف کا انتظام عمدگی کے ساتھ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ارسطو کا تخیل افلاطون کے تخیل سے زیادہ سخت ہے اس نے افلاطون کی دوسری درجہ کی سلطنت کے متعلق (جس میں پانچہزار جنگجو آدمیوں کی جماعت تجویز کی گئی تھی) یہ نکتہ چینی کی ہے کہ یہ تعداد ضرورت سے زیادہ بڑی ہے، دونوں اس خیال میں متفق ہیں کہ مدبر ملک کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ تا حد امکان اہل شہر میں انسانی نیک کرداری اور بہبود کے بہترین اوصاف پیدا ہوں اور دونوں کی رائے میں اس کا بہترین ذریعہ فلسفہ (یعنی حصول علم میں ذہن کی مستعدانہ

مشغولیت) ہے، نیز دونوں اس رائے پر قائم ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی نیک کرداری کے حاصل کرنے اور اس پرکار بند ہونے کی توقع اہل شہر کے صرف ایک منتخب طبقے سے ہو سکتی ہے، جو اپنی گزر اوقات کا سامان مہیا کرنے کی ضرورت سے فارغ اور ایک مشرح و منضبط نظام تعلیم پر کار بند ہونے پر مجبور رہو۔ لہٰذا دونوں کی نظر میں اہل شہر کا مفہوم زمینداروں کی ایک جماعت ہے جو اپنے حصہ کی زمین کی پیداوار پر فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہو اور اس زمین کی کاشت نیم غلام کرتے ہوں اس لیے دونوں نے کاشتکاروں دستکاروں اور خوردہ فروشوں کو شہریت کے حق سے خارج رکھا ہے، دونوں کی رائے میں مرد شہریوں کو جوانی میں جنگ کی پوری پوری تعلیم ملنا چاہیئے اور دونوں اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی فطرت میں یہ بات نہیں ہے کہ مسلح شہریوں کی جماعت فلسفی حکمرانوں کی اطاعت میں سر جھکا دے۔ (افلاطون نے اپنی دوسرے درجہ کی سلطنت میں اس معاملہ کو ارسطو سے کم تسلیم نہیں کیا ہے)۔ اس لئے دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ فوجی زمیندارانہ طبقہ کو سیاسی اقتدار میں اہم حصہ دینا چاہیئے مگر دونوں کے ہاں اس کے طریقے اور درجے مختلف ہیں، افلاطون کی تجویز میں انھیں عاملانہ حکام اور غور و بحث کی اس مجلس کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے جس کی جانب حکام اہم معاملات کو رجوع کریں، اس قسم کی منتخب شدہ مجالس شوریٰ کے وصف و خوبی کو ترقی دینے کے لئے وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ شہریوں کو اسباب جائداد کے چار طبقات میں تقسیم کر دینا چاہیئے اور دستور سلطنت اس طرح مرتب کرنا چاہیئے کہ عملاً اعلیٰ طبقات کی انتخابی قوت بڑھ جائے۔ اس کے برعکس ارسطو کی تجویز یہ ہے کہ اعلیٰ مباحثی فرائض تمام اہل شہر یعنی فوجی حد عمر کے گزر جانے کے بعد تمام زمیندارانہ طبقہ کی ایک جمعیت کو دینا چاہئیں۔ وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ ان اہالی شہر کو عدالتی فرائض بھی دینا چاہئیں اور میرا گمان ہے کہ یہاں اس کا مقصود ان شہریوں سے ہے جو ایتھنز کی بڑی بڑی عمومی جوری کی صورت میں مجتمع ہوئے ہوں۔ پس اگر ہم شہریوں کے اندر صرف تقسیم اختیارات پر لحاظ کریں تو ارسطو کی مثالی سلطنت میں حکومت کی شکل افلاطون کی دوسری بہترین شکل کی بہ نسبت واقعاً عمومیت سے زیادہ قریب ہے، اگر ہماری نظر میں یہ فرق اس امر واقعہ کے مقابلہ میں بالکل غیر اہم معلوم ہوگا کہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ حق شہریت کو ان زمینداروں کے طبقہ تک محدود کر دینا چاہیئے جو نیم غلاموں کی محنت کی پیداوار پر فراغت کے ساتھ

زندگی بسر کرتے ہوں، اس سے میں غلامی کے اس آخری نقطہ پر پہنچتا ہوں جس پر دونوں اصولاً متفق ہیں، دونوں اس رائے پر قائم ہیں کہ غلاموں کا ہونا ضروری ہے، مگر اس کے ساتھ ہی دونوں اس رائے پر بھی قائم ہیں کہ غلام ایسے انسان ہوں جو فطرتاً غلامی کے لئے موزوں ہوں، کسی یونانی کو غلامی میں نہ رکھنا چاہئے[عـه]۔

۳- پس مطلق بادشاہی یعنی عقل و نکوکاری کے اعتبار سے سب سے افضل و اعلیٰ شخص کی حکمرانی کو جسکی نسبت صاف طور پر واضح ہے کہ ارسطو کے زمانہ کی عملی سیاسیات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا، بحث سے خارج رکھکر، سقراط کے اتباع کرنے والے جلیل القدر اصحاب فکر کا اعیانی تصور حکومت بالانحصار وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے افلاطون کی حکومت اعیانی پر خیال کیا جائے تو ہمیں صاف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسپارٹا کے ادارات سے نمونہ کا کام لیا گیا تھا اور اس لئے افلاطون و ارسطو دونوں اسپارٹا کے دستور سلطنت کو حقیقی یونانی سلطنتوں میں اعلیٰ جگہ دینے پر متفق تھے، اس کا تعلق ان سلطنتوں سے تھا جسے ارسطو وسیع مفہوم میں عددیت سے ممیز "اعیانیت" کہتا ہے، یعنی وہ سلطنتیں تھیں جن کے دساتیر کا مقصود اہل ملک کے اندر قابلیت کو ترقی دینا اور سیاسی حیثیت سے قابلیت ہی کو مستحق انعام قرار دینا تھا۔

تاہم، ارسطو کا یہ خیال نہیں ہے کہ جن واقعی شہری سلطنتوں کا اسے علم تھا ان کیلئے اس کے مثالی نظم سلطنت یا اسپارٹا کے مثل کسی اور دستور کی جسے اعیانی کہہ سکیں، عام طور پر سفارش کی جا سکتی تھی۔ اسے یہ تسلیم تھا کہ ان شہری سلطنتوں میں عمومیت کا میلان اس درجہ قوی تھا کہ اگر وہ ان کے لئے کسی ایسے سیاسی دستور کی سفارش کرتا جسے اعیانیت کہنا بجا ہو تو وہ اسے قبول نہ کرتیں، اس نے جس امر کی سفارش کی ہے اسے وہ ایک خاص مفہوم میں "دستوری حکومت" کہتا ہے، جس میں متوسط وسایل کے لوگ امرا و غربا کی دو انتہائی حدوں کے درمیان توازن کو قائم رکھیں اور عددیت و عمومیت کے متخاصم اصول کے درمیان ایک

[عـه]۔ یونان میں واقعاً جو غلامی رائج تھی اس کے ساتھ افلاطون و ارسطو کے تعلق پر بحث کرتے وقت ہم اس پر بالکل جدید نقطۂ نظر سے فیصلہ صادر کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں اور خلاصۃً یہ کہدیتے کہ دونوں غلامی کو قبول کرتے اور اس کے رواج کے حامی تھے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یونانیوں کے غلام بنانے کو مسترد کر کے وہ اپنے زمانہ سے کسقدر آگے بڑھے ہوے تھے۔

طرح کا امتزاج پیدا ہو جائے اس طرز حکومت کو اگر دستوری حکومت کے بجائے دستوری عمومیت کہا جائے تو اس زمانے کے پڑھنے والوں کے لئے غالباً زیادہ قریب الفہم ہوگا۔[1]

یہ امتزاج یا توازن مختلف طریقوں سے عمل میں لایا جا سکتا ہے کہ بعض امور میں یہ موزوں و مناسب ہوگا کہ ایک متوازن سلطنت کے نظام حکومت میں اعیانی و عدیدی دونوں انتظامات شامل کر لئے جائیں یعنی عدیدی سلطنتوں کے رواج کے مطابق امرا پر جوری کے خدمات انجام نہ دینے کے لئے جرمانہ کیا جائے، اور عمومی سلطنتوں کے رواج کے موافق غربا کو ان خدمات کے انجام دینے کا معاوضہ دیا جائے تاکہ دونوں کے شمول و حاضری کا تیقن ہو جائے۔ دوسری صورتوں میں حسب دلخواہ توازن بہترین طور پر یوں حاصل ہو سکتا ہے کہ دونوں طریقوں کے درمیان میں ایک راستہ اختیار کیا جائے، یعنی اعلیٰ مباحثی جمعیت کی رکنیت کی شرط کے طور پر، عدیدی سلطنتوں کے بلند معیار جائداد کے بجائے ایک معتدل معیار قائم کیا جائے جس سے آزاد شہریوں کا کثیر حصہ اس میں شامل ہو سکے یا یہ کہ تقرر کا ایک مرکب طریقہ اختیار کیا جائے، جو کسی قدر عدیدی اور کسی قدر عمومی ہو یعنی عاملانہ عہدوں کا تقرر کسی قدر اظہار رائے کے ذریعہ سے ہو (جسے یونانی قطعاً عدیدی یا اعیانی طریق تقرر سمجھتے تھے) اور کسی قدر قرعہ اندازی کے ذریعہ سے ہو (جسے وہ قطعاً عمومی طریق سمجھتے تھے)۔ یہ ضرور ہے کہ یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ ترازو کے دونوں پلے تمام حالات میں بالکل برابر اور ایک ہی سے ہوں گے بعض آئینی حکومتیں عدیدیت کی طرف زیادہ مائل ہوں گی اور بعض عمومیت کی طرف، لیکن ارسطو نے اپنے زمانہ کی شہری سلطنتوں کے عملی منتہائے کمال کے لئے جس قسم کے دستور سلطنت کی سفارش کی ہے وہ کوئی ایسا ہی مرکب دستور سلطنت ہونا چاہیے جس میں دولتمندوں یا غریبوں دونوں میں سے کسی کو بھی بے روک ٹوک

---

[1] یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپی سلطنتوں کی نسبت اگر "دستوری حکومت" یا "دستور" کا لفظ استعمال ہوتا تو اس سے بالطبع یہی سمجھا جاتا کہ مقصود "دستوری بادشاہی" ہے جدید صورتوں میں دستور کے مرتب کرنے والوں کو جس مسئلہ سے سابقہ تھا وہ یہ تھا کہ ایک بادشاہ تو موجود ہے اب اس کے اختیار کو کس طرح محدود و متوازن بنایا جائے، اسی طرح پر قدیم اہل فکر بالطبع عوام کے اختیار کو مسلم قرار دے لیتے۔

یہ موقع نہ حاصل ہو کہ وہ جسطرح چاہیں کارروائی کریں مگر اس نے افسوس کے ساتھ اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ واقعاً اس کا عمل پذیر ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب میں اسی کے الفاظ میں بیان کرونگا۔

"کیوں اکثر حکومتیں یا عمومی ہیں یا عدیدی؟ اس کے اسباب یہ ہیں کہ اولاً تو ان میں معتدل وسائل کے اشخاص کا طبقہ بالعموم کم تعداد میں ہے، دوسرے یہ کہ عوام اور اصحاب جائداد کے درمیان چونکہ فسادات و مناقشات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے جو فریق بھی غالب آجاتا ہے وہ اس کے بجائے کہ ایک وسیع النظر و مساوی قسم کی حکومت قائم کرے اپنی سیاسی فوقیت کو غنیمتِ فتح سمجھ لیتا ہے اور اس لئے یا عمومیت قائم کر دیتا ہے یا عدیدیت "مزید براں" وہ دو قومیں جنھیں یونان میں شہنشاہی حیثیت حاصل ہے، وہ تمام و کمال اپنے ہی سیاسی مقاصد پر نظر رکھتی ہیں اور اپنے زیر حکومت شہروں کے مقاصد کو اپنے مقاصد کے تابع کر لیتی ہیں۔ پس ایک ان میں سے اپنے تابع شہروں میں عمومیت قائم کرتی ہے اور دوسری عدیدیت۔ ان وجوہ سے حکومت کی درمیانی شکل یا تو وجود میں آتی ہی نہیں اور یا بہت ہی کم اور معدودے چند سلطنتوں میں نفاذ پذیر ہوتی ہے[۱]"

میرے علم میں یہ بیان اس تمام صداقت کا آئینہ ہے جسے مرکب شکل حکومت کے امکان کے خلاف ہیسٹنگس کے وقت سے مختلف مصنفوں نے بدلائل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونانی تاریخ کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حسب دلخواہ توازن کا حصہ بہر نوع مشکل تھا، اس امتزاج میں ایک نہ ایک عنصر کو غلبہ حاصل ہو جاتا اور انجام کار میں یہ توازن غارت ہو جاتا تھا۔ یہ کہنا کہ اس قسم کی مرکب شکل ناممکن ہے میرے خیال میں یہ ایک عاجلانہ تعمیم ہے مگر ارسطو نے یونان کے تجربہ کا جو ملخص کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ باغلب وجوہ یہ صورت نادر الوقوع ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جس امتزاج کو اس نے بہت ہی زیادہ قابل عمل سمجھا ہے وہ عمومیت ہی کی طرف زیادہ مائل ہوگا، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کی اصطلاح "پولی نایا" کا ترجمہ "دستوری عمومیت" کیا ہے، یہ وہ نظام ہے جس میں آخری نگرانی اہل شہر کے حصۂ کثیر کے ہاتھ میں رہیگی

---

[۱] "سیاسیات" حصہ ششم، چہارم، باب یازدہم فقرہ ۱۸، ۱۹، ان دونوں قوموں سے مراد لامحالہ اہل ایتھنز اور اہل اسپارٹا ہیں۔

اپنے زمانہ کی یونانی شہری سلطنتوں میں وہ اس امر کو صریحاً پاپوس کن سمجھتا ہے کہ عامۃ الناس پر یہ اثر ڈالا جائے کہ وہ اس آخری نگرانی سے دست بردار ہو جائیں لیکن یہ ممکن ہے کہ انھیں اس امر پر راغب کیا جائے کہ وہ انضباط و توازن کے مطیع ہو جائیں جس سے چند امراء کثیر التعداد غربا کا ظلم و ستم رک جائے۔ لیکن اسے بھی مستحکم شکل سے قائم رکھنے کی امید وہ اس نظم معاشرت میں کرتا ہے جہاں متوسط وسائل کے لوگ باعتبار تعداد کے آئینی قوت رکھتے ہوں کہ ان کا طبقہ غالب رہ سکے[۱]۔

۴۔ جدید نقطۂ نظر سے یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو مرکب یا متوازن دستور سلطنت کی سفارش میں کبھی اس خیال کی طرف نہ آیا کہ اس امتزاج میں بادشاہی کو بھی ایک عنصر کے طور پر داخل کیا جائے۔ میرے قیاس میں اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وہ جن مدبرین سے واقف تھا ان میں سے کسی کو بھی ایسی یکتا قابلیت کا شخص نہیں سمجھتا تھا کہ اسے مستقل اختیار کا اتنا وسیع حصہ تفویض کر دینا بظاہر قرین عقل معلوم ہوتا اور کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ حقیقی جائز بادشاہی ایک ایسی شئے تھی جو (کم از کم ارسطو کے وقت کے) یونانیوں کے تجربہ کی حد رسائی سے باہر تھی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ارسطو نے ناجائز منصوبہ یا غیر فطری "خودسری" کے علاوہ پانچ قسم کی بادشاہیوں کو تسلیم کیا ہے مگر ان میں[۲] (۱) ایک قسم یعنی اسپارٹا کی بادشاہی کو محض اطلاقاً اس نام سے موسوم کر سکتے ہیں، وہاں بادشاہ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ وہ ایک مستقل سپہ سالار اعظم تھا اور ملکی معاملات میں اس کا اختیار بے حقیقت سا تھا۔ (۲) دوسری نوع یعنی موروثی مطلق العنانی جو بربریوں (غیر یونانیوں) کے لئے گویا فطرت کی طرف سے مخصوص تھی اسے وہ یونان کے معاملہ میں خارج از بحث سمجھتا ہے، (۳) سورماؤں کے زمانہ کی حسب قانون، قدیم بادشاہی اب نسیاً منسیاً ہو چکی تھی اور اس کا اعادہ نہیں ہو سکتا تھا[۳] اور (۴) انتخاب کردہ دائمی امارت مطلقہ تا[۴] جو شرفا و عوام کی کشاکش کے

---

[۱] تیسری صدی میں ارسطو کے تخیل سے کسی قدر قریب پہنچی ہوئی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

[۲] یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ارسطو سورماؤں کے زمانہ کے دستور کو حکومت کی متوازن یا مرکب شکل نہیں سمجھا۔ اس کا خیال یہ ہے کہ بادشاہ کی طاقت قانون یا رواج سے محدود ہوتی تھی مگر وہ یہ نہیں

دورِ اول میں قائم کی گئی تھی، وہ بھی زمانۂ گزشتہ کی بات ہو چکی تھی، بس آخر میں (۵) یکتا قابلیت کے فرد فرید کی حکمرانی رہجاتی ہے جو ارسطا طالیسی ترتیب حکومت میں قابلیت کے معیار میں سب سے مقدم ہے، لیکن کم از کم ارسطو کے دور میں تو یہ محض ایک خالی تصور تھا۔ نہیں ارسطو کے زمانہ میں یونان کے لئے عملی سیاسیات کی حد وسعت کے اندر ایک بھی جائز بادشاہی ایسی نہ تھی جو حقیقتاً اس نام کی سزاوار ہوتی اور میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ وہ بادشاہی کو عمومیت عددیت یا دونوں کے خارج کرنے کی بحث تک درمیان میں لاتا، اور خلاف قانون خودسرانہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کی توازن یا مصالحت کا اشارہ تک آنا بھی مقبولۂ رائے عامہ کی خلاف حد سے بڑھی ہوئی جسارت تھی ۔ ۱۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہتا کہ کوئی مجلس شوریٰ یا جمعیت اس اختیار میں شریک تھی، چونکہ اس میں شک نہیں کہ دستور سلطنت کا خیال اس نے ہومر سے اخذ کیا تھا اس لئے اس اختلاف رائے میں جس کی بحث خطبۂ دوم میں ہوئی ہے ارسطو کی سند گروٹ کی طرفداری میں نقل کیجا سکتی ہے مگر پھر بھی میری رائے اسکے مخالف ہے (ملاحظہ ہو خطبۂ ششم صفحہ ۹۰) مجھے کوئی تاریخی مثال ایسی نہیں معلوم ہے کہ اس قسم کا کوئی آمر مطلق مدت العمر کے لئے منتخب ہو گیا ہو مگر یہ عیاں ہے کہ اس کی مثالیں ارسطو کو معلوم تھیں (سیاسیات حصۂ سوم باب ۱۴) ۔

ع۱۰ ۔ اس امر میں شک کرنے کی وجہ ہے کہ خودسری کے خلاف رواجی جذبات میں ارسطو فی الواقع کس حد تک شریک تھا، مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو صریحی طور پر اس سے علیحدہ نہیں کرتا تھا۔

خطبۂ نہم

یونانی وفاقیت[1]

۱۔ اب ہم چوتھی صدی کے آخر تک یونان کے مختلف طرز ہائے حکومت و تقلیبات پر ان کی ارتقائی ترتیب کے بموجب غور کرچکے ہیں، اور علم سیاسیات کا مقصد ہی یہ ہے کہ مختلف طرز اور ایک طرز سے دوسری طرز کی طرف تقلیب کے عام اسباب کو دوسری مثالوں سے مقابلہ کرکے جہاں تک ممکن ہو صاف کرے، اول ہم نے ابتدائی "نظم حکومت" کی جانچ کی جس کا اگر کچھ نام ہو سکتا ہے تو بادشاہی ہو سکتا ہے، مگر یہیں ماتحت سرداروں یا بزرگوں کی مجلسِ شوریٰ اور آزاد مسلح اشخاص کی جمعیت کے اندر، ان غیر ترقی یافتہ اجزا و عناصر کی دلچسپ کیفیت منکشف ہوتی ہے جس میں سے ایک تو آگے چلکر عدیدیت کی صورت میں نمایاں ہوا اور دوسرے نے عمومیت کا رنگ اختیار کیا، اس کے بعد ہم نے ابتدائی عدیدیت کی تقلیب پر بحث کی ہے جس کی سب سے زیادہ نمایاں ہیئت بادشاہ کے اختیار کا

[1] سابق میں (Federation) کے ترجمہ متفقیت تجویز ہوا تھا اور وہی لکھا جاتا تھا مگر بعد میں مزید غور کے بعد "وفاقیت" زیادہ موزوں معلوم ہوا اس لئے آئندہ وفاقیت لکھا جائے گا، اسی طرح (Confederation) کا ترجمہ "مشترکیت" کے بجائے "عہدیت" ہوگا۔

کم کرنا اور آخر میں اس کے بجائے ایک سالانہ عہدہ نظامت قائم کرنا تھا، اس کے بعد مجلس شوریٰ حکران عنصر بن گئی، جمعیت غالباً قائم رکھی گئی مگر پرانے خاندانوں کے زمیندار اس پر حاوی ہو گئے تھے۔ پھر ہم نے ان مختلف اسباب پر غور کیا ہے جو جمعیت میں عدیدی یعنی فاتحانہ رنگ پیدا کرنے کا باعث ہوئے یعنی بغیر سیاسی حقوق کے جدید آبادی کو خاصکر نو آبادیوں میں ترقی دی گئی، باہمی اتحاد کے طریق کو (جس کے اثر سے چھوٹے چھوٹے زمیندار اور دور کے رہنے والے لوگ جمعیت سے خارج ہوتے گئے) دولت کے عدم مساوات سے ترقی ہوئی، اور غریب تر آزاد اشخاص معاشی غلامی میں پھنس گئے۔ دوسرا امر جس پر غور کیا گیا تھا وہ خودسری یعنی "بادشاہی کی جانب بیقاعدہ و غیر آئینی رجعت" تھی اور غالباً ایتھنز کی طرح اس میں دستوری شکلوں کو بھی قائم رکھا جاتا ہوگا، اور ہم نے اس موخر طرز کو جس میں اجیر سپاہیوں سے کام لینا مفید مطلب تھا اس قدیم طرز سے ممیز کیا تھا، جس نے سران انبوہ سے شروع ہو کر ترقی کی اور جس کے لئے قدیمی عدیدیت کے مخالف رد عمل نے عمدہ موقع پیدا کر دیا تھا، ہم نے یہ بھی دکھایا ہے کہ بعض عہدوں میں رائج طرز مطلق العنانی کا تھا مگر یہ کوئی لازمی منزل نہیں تھی جس سے یونانی سلطنتوں کا گزرنا لابدی ہو۔

اس کے بعد جب بالفاظ عام، قدیم تر خودسری نابود ہو گئی، تو یونانی تاریخ کا وہ شاندار دور شروع ہوا جسے عام طور پر عمومیت کے میلان کی جانب معنون کیا جاتا ہے، ہم عمومیت کی جانب درجہ بدرجہ ترقی کا پتہ ایتھنز میں چلا سکتے ہیں جہاں پانچویں صدی کے آخر میں ایک مستحکم عمومی دستور مختتم طور پر قائم ہو گیا تھا اور جو مقدونیہ کے زیر اثر آ جانے کے وقت تک اصلاً و معناً غیر متغیر حالت میں قائم رہا۔ یونان میں اور جگہوں میں بھی عمومیت کی جانب ایسا ہی میلان نظر آتا ہے، اگرچہ یہ ضرور نہیں کہ ہمہ گیر طور پر اس کا رواج ہوا ہو۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے دو ایک صورتوں میں نظم حکومت کی عدیدی شکل اس تمام دور میں قائم رہی لیکن زیادہ تر ہم یہی سنتے ہیں کہ حکومت کا پلہ کبھی عدیدیت کی طرف جھک جاتا تھا اور کبھی عمومیت کی طرف۔ نیز اجیر سپاہیوں کے کام میں لانے کی عادت کے باعث اس دور کے موخر حصہ میں مطلق العنانی کو ایک مرتبہ پھر سر اٹھانے کا موقع مل گیا تھا، بعد ازاں مقدونوی غلبہ و شہنشاہی نے شہری سلطنتوں کی موثر خودمختاری کے دور کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد ہمیں یونانیوں کے اعلیٰ دماغ کی جدت طرازی کے وہ آخری قابل لحاظ ثمر نظر آتے ہیں جنہیں نظام وفاقی کہا جاتا ہے اور تیسری صدی میں جنکی نمایاں ترقی نے آزاد یونان کی تاریخ کے آخری دور میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، یہ آخری

دور مقدونیہ کے غلبہ اور یونان کے روما کی حکومت کے تحت میں قطعاً جذب ہو جانے کے درمیان واقع ہوا تھا، اس کی دلچسپی صرف علم سیاست کے مطالعہ کرنے والوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام لوگ بھی اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔

حکومت کی ایک شکل سے دوسری شکل کی طرف منقلب ہو جانے کے اسباب پر غور کرنے میں اس وقت تک ہم نے (فتح کو چھوڑ کر) اپنی توجہ زیادہ تر اندرونی اسباب کی طرف مرکوز رکھی ہے لیکن یہ خیال رہنا چاہیئے کہ ان اسباب میں معاشی اسباب کو بھی نہایت اہمیت حاصل ہے مثلاً یہ کہ دولت کے روز افزوں عدم مساوات کا میلان یہ تھا کہ ابتدائی نظم سلطنت کا رخ عدیدیت کی جانب پھر گیا جس سے غریب آزاد اشخاص کا انحصار دولتمندوں پر نسبتاً زیادہ ہو گیا اور پھر زیادہ وسیع پیمانہ پر روپیہ کے چلن کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکار قرض لینے لگے جس سے اس عدم مساوات کی آزار دہی کا احساس بڑھ گیا اور یونان و روما دونوں جگہوں میں ابتدائی عدیدیت کے خلاف تحریکات کا رجحان پیدا ہو گیا۔ نیز ذی امتیاز طبقے سے باہر نو دولتوں کی زیادتی تغیر طلبی کے لئے ایک مزید سبب بن گئی، اور یہ حالت نو آبادیوں اور تجارتی شہروں میں خصوصیت سے زیادہ تھی۔

مگر معاشی اسباب سے علیٰحدہ تغیر کی ایک خاص تحریک اس سادے ایقان کے پھیل جانے سے بھی ہوئی کہ "یہ شخص ایسا ہی اچھا ہے جیسا وہ" یعنی جس گروہ کو سیاسی امتیاز حاصل تھا اس گروہ سے باہر کے لوگ بھی ویسے ہی اچھے تھے جیسے اس گروہ کے اندر کے لوگ۔ یہ ایک ایسا ایقان تھا جس کا عملی اثر نئے خیالات کے راستے نکلتے رہنے اور محض رسم و رواج اور عادت کی قوت کے کمزور ہوتے جانے سے برابر طاقت حاصل کرتا رہا اور تمدن کی تدریجی ترقی اور اس قدر کثیر التعداد خود مختار اقوام کے باہمی ربط و ضبط سے رسم و رواج اور عادت کی قوت کا کمزور ہو جانا لازمی تھا۔ عومیت کے میلان میں یہ ایقان نہایت ہی بدیہی طور پر موثر تھا مگر ہم یہ بھی خیال کر سکتے ہیں کہ نسبتاً زیادہ محدود شکل میں قدیم مزاج میں بھی اس کا میلان موجود تھا۔ مثلاً کورنتھ کے مانند مقامات کے متعلق جہاں بادشاہ کے بجائے شاہی خاندان سے سالانہ ایک یا دو حکام کا انتخاب ہوا کرتا تھا، ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان مقامات میں یہ رائے شائع ہو گئی تھی کہ شاہی نسل کا ایک شخص ایسا ہی اچھا تھا جیسا دوسرا، اور شاید (جیسا کہ ایک آرستانی نے اپنے قصہ میں کہا ہے) "ایک حد تک

بہتر بھی تھا" کیونکہ موروثی بادشاہ کی گاہ بگاہ کی ناقابلیت تغیر کے لئے ایک کثیر الشیوع دلیل ہوگئی ہوگی۔ علیٰ ہٰذا جب حاکم اعلیٰ کے عہدے کا دروازہ عام طور پر امرا کے لئے کھول دیا گیا، تو اس سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ ایقان پھیل گیا تھا کہ قدیم خاندان کا ایک زمیندار اتنا ہی اچھا تھا جتنا دوسرا۔

مگر جب ہم بادشاہ یا حکومت کی قابلیت کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اس خط سے پہلے ہی گزر چکے ہیں جو قوم کے داخلی تعلقات کو اس کے خارجی تعلقات سے جدا کرتا تھا کیونکہ قدیم بادشاہ کی قابلیت کا اندازہ بہت کچھ جنگ کے نقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا۔ درحقیقت جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ "ایتھنز" میں موروثی بادشاہ کے علاوہ سپہ سالار کا ایک عہدہ قائم کیا جانا ہی حکومت کی عدیدی صورت اختیار کرنے کی کارروائی میں پہلا قدم تھا، اور زیادہ عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات حکومت کی صورت میں تغیر واقع ہونے میں جنگ ایک اہم جزو ہوا کرتی تھی اور دوسری جانب بعض وقت جبکہ قائم شدہ حکومت خود کو قابل ثابت کر دیتی تھی تو جنگ اس کی استقامت کا ایک وسیلہ بھی بنجاتی تھی۔

ہم نے اس پر بھی خیال کیا ہے کہ دیہاتی جماعتوں کے قدیم گروہ کی حالت سے نکلکر شہری مملکت کی طرف ترقی کرنے کے وجوہ میں ایک نہایت درجہ موافق وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے زمانے میں شہر پناہ رکھنے والے شہروں کے اندر حفاظت بہت خوب ہوتی تھی۔

آخری امر یہ ہے کہ یونان کی تاریخ کے آخری مدارج میں وفاقیت کا غلبہ خاصکر اس وجہ سے ہوا کہ اہل مقدونیہ کے شہنشاہی ایران کو فتح کر لینے کے بعد مقدونیہ اور ان بڑی بڑی سلطنتوں سے مقاومت کرنے کے لئے (جو سکندر کی شہنشاہی کے ٹکڑے ہو کر بن گئی تھیں) شہری سلطنتوں کی بہ نسبت زیادہ وسیع سلطنتوں کی ضرورت تھی۔ میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں، کہ جنگ کے موقع پر قوی تر مدافعت کی ضرورت ہی وہ وجہ تھی جو قدیم یونان کی طرح ازمنۂ وسطیٰ اور ازمنۂ جدیدہ کے یورپ میں بھی وفاقیت کے قیام کا باعث ہوئی۔

۲۔ مختصر یہ کہ وہ وقت آگیا کہ شہری سلطنتیں ان وسیع تر سیاسی تنظیمات میں منقلب ہو جائیں، جنھوں نے جدید یورپی تاریخ میں خاص امتیاز پیدا کیا ہے، اور جنھیں ہم ملکی سلطنت کہہ سکتے ہیں، تقلیب کے دو طریقے ایسے تھے جن کے ذریعہ سے شہری سلطنتیں ایسی ملکی سلطنتوں میں مبدل ہو سکتی تھیں جو شہنشاہی محض سے ممیز فی الواقع حب وطن کے

جذبات سے متحد ہوں ان میں سے ایک طریقہ تو مساویانہ شرائط پر متفق ہو جانے کا تھا اور دوسرا توسع و تجاذب کا۔ اول الذکر ہی وہ طریقہ تھا جو یونانی تاریخ کے اس آخری دور میں رائج تھا جس دور میں اکائیا اور ایتولیا کی لیگیں مورخین کی خاص توجہ اپنی جانب مائل کرتی ہیں، اور دوسرا وہ طریقہ ہے جسنے روما کو اس قابل بنادیا کہ وہ ساری متمدن دنیا کا سرتاج بن گیا اور جس پر ہم آئندہ کے دو خطبات میں بدقت نظر بحث کریں گے۔ اس تاریخی تقلیب کی علمی دلچسپی زیادہ تر اس امر میں ہے کہ ان دونوں طریقوں کا باہم مقابلہ کیا جائے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ دونوں طریقے اس تقلیب کی صورتیں ہیں جو قطعی قدیم تصور سے (جس کا اظہار Polis یعنے بلدیہ کے لفظ سے ہوتا ہے) اس تصور کی طرف محول ہوا ہے جس سے ازمنۂ جدیدہ کے لوگ نہایت مانوس ہیں۔ ہم لوگ سلطنت کی جائے قرار کے طور پر بالطبع "ملک" کا خیال کرتے ہیں، "شہر" کا خیال نہیں کرتے بلکہ درحقیقت ہم لوگ لفظ ملک کے استعمال میں بہت آسانی کے ساتھ لغزش کر جاتے ہیں اور اسے دہرے اور مرکب مفہوم میں استعمال کرتے ہیں چنانچہ کبھی تو اس سے سطح ارضی کے ایک خاص حصے سے مراد لیتے ہیں اور کبھی اس سیاسی جماعت (قوم) سے مراد لیتے ہیں جو اس حصۂ ارض میں رہتی ہو اور کبھی ان دونوں مفہوموں کو ملا لیتے ہیں۔ پس جب کبھی جذبۂ حب الوطنی کو جوش میں لانا یا اس کا پر زور اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے تو سطح ارض کے جس مخصوص حصہ میں کوئی قوم و ملت آباد ہوتی ہے وہاں کے خصوصیات کو اس معاملے میں نمایاں جگہ دیجاتی ہے۔ حب الوطنی کے لئے کسی مرکز انہماک کے وضع کرنے کے واسطے تخیل کو اس تجسیم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جب ہم "جزیرۂ نگین بحر" "انگلستان"، "پری تمثال فرانس" یا ہرانی "پِتر دیش" کا خیال کرتے ہیں تو ہم اکثر اپنے اس تصور میں قوم کو ملک سے جدا نہیں خیال کرتے بلکہ دونوں کو ایک ہی میں ملا دیتے ہیں اور ایک سے زیادہ واقعے ایسے ہوئے ہیں جن میں اس امتزاج کا یہ اہم سیاسی اثر پڑا ہے کہ کوئی حصۂ ملک جو نمایاں طبعی حدود کے ذریعے سے باقی قطعۂ ارض سے علیحدہ ہو اس کا ایک ہی سلطنت کی قلمرو ہونا طبعی اور جائز معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی استعجاب سے خالی نہیں ہے کہ جس طرح ہم جدید زمانے کے لوگوں کو لفظ "ملک" کے تصور کے عناصر مخلوطہ اس قدر طبعی اور مانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ان عناصر میں تمیز کرنے کے لئے کسی قدر فکر و کوشش کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح ہم لفظ

"پولس" (Polis) کا تصور نہیں کرتے بلکہ یونانیوں نے اس لفظ کا جو مخلوط تصور قائم کر رکھا تھا اسے مشکل و پیچیدہ سمجھتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ زمانۂ جدید کے بہت سے لوگ جب یونانی زبان سیکھنا شروع کرتے ہیں تو انھیں کسی قدر حیرت ہوتی ہے کہ جو زبان دقیق و نازک امتیازات سے اس قدر پُر ہو اس میں "بلدیہ" اور "سلطنت" کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہو۔

بہرحال تیسری صدی قبل مسیح کے سیاسی واقعات کی طرح سیاسی خیال کے تغیر و تبدل کی بھی یہ ایک دلچسپ شہادت ہے کہ پولی بیوس کی تاریخ اکائیائی لیگ کی تاریخ میں اکثر لفظ "ایتھنوس" (Ethnos) (قوم) لفظ "پولس" (Polis) کے بجائے استعمال ہوا تھا اور ہر ایک یونانی قوم (Ethnos) کا معمولی دستور سیاسی وفاقی دستور سلطنت ہو گیا تھا، اور اب قوم (Ethnos) ہی جذبہ حب الوطنی کی اولیں موضوع بن گئی تھی

۲۔ سرسری قسم کی وفاقیت ابتدائی تاریخ کی مختص خصوصیت ہے، درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونان اور نیز جرمانیہ میں قبائلی حالت میں بڑا سے بڑا سیاسی نظم معاشرت قبائل زیرین یا کینٹن (Canton) کی ایک بہت ہی نامربوطی وفاقیت ہے جس کا سیاسی اتحاد تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ قبیلہ زیریں یا کینٹن کو ایک طرح پر مواضعات کی وفاقیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہیں سے وہ قدیم طریق "اجتماع" (سیونوسے کیزموس) نکلا جس نے مجموعۂ مواضعات سے شہری سلطنت بنادی اسکے بعد یونان میں شہری سلطنت، کے نشوونما نے مزید اختلاط کو روک دیا بلکہ آرکیڈیا وغیرہ کی ایسی بعض صورتوں میں تو وسیع تر قومی اتحاد کو بھی روک دیا۔ پس یونان کی تاریخ کے شاندار دور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے پسماندہ حصوں ہی میں وفاقیت کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مورخین سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکائیا اور ایتولیائی لیگوں کے علاوہ یونان کے عروج و اقبال کے زمانے میں اس قسم کا ایک اتحاد اہل اکارنانیا اور اہل ایپروس میں بھی موجود تھا اور جس اتحاد کو تاریخی حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ اہل بیوتیا کا اتحاد تھا، لیکن اس آخری مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وفاقیت کی واقعی و موثر ترقی سے کس قدر گہری مخالفت پیدا ہو گئی تھی اور یہ مخالفت اس زمانے میں اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ سیاسی تہذیب کی ترقی نے جذبہ حب الوطنی کو ایک ہی شہر پر مرکوز کر دیا تھا، یہ جذبہ ہر قسم کے اتحاد کی مخالفت کی طرف مائل نہ تھا کیونکہ دوسرے شہروں کو اپنے زیر فرمان رکھنے میں شہری

سلطنتوں کے احساس سیاسی اور ان کے جذبۂ حب الوطنی میں ایک شان پیدا ہو جاتی اور اس قسم کے موقع سے فائدہ اٹھانے میں انھیں مسرت ہوتی تھی لیکن مساویانہ سطح پر اتحاد و یکجہتی کی جانب سے اسے سخت تنفر تھا اور وفاقیت کی روح در اصل یہی ہے۔ پس جہاں تک ہمیں معلوم ہے بیوٹیا کی لیگ میں چھوٹے چھوٹے شہروں کی حیثیت برابر گرتی رہی، یہاں تک کہ وہ ایک حقیقی وفاقیت کے ارکان ہونے کے بجائے تھیبس کے ماتحت آگئے، اور جنگہائے ایران کے بعد اتھنز نے جو لیگ قائم کی اس کی نشو و نما میں بھی یہی تماشا نظر آتا ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مقدونوی غلبے کے قبل یونانی جماعت کے انھیں حصص میں صحیح وفاقیت موثر طور پر قائم ہوئی جو زیادہ پسماندہ تھے اور خاصکر ان حصص میں جہاں دیہاتی کینٹن (مجموعہ مواضع) سے بلدیہ کی حالت تک پوری طرح ترقی عمل میں نہیں آئی تھی۔ بقول فریمین ایتولیا کی لیگ موخر متفقی دور میں بھی کینٹوں (مجموعہائے مواضع) کی لیگ تھی شہروں کی لیگ نہ تھی۔

اس امر کا سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ یونانی نسل کی پسماندہ و قدیم شاخیں اس ارتقا میں اپنے زیادہ کامیاب و مستعد بھائیوں سے کیونکر گوئے سبقت لیگئیں جو قبائل اہل ایتولیا یا اکارنانیا کی سی حالت میں ایک کم آباد ملک میں دیہاتوں کے اندر پھیلے ہوئے تھے، ان کا سیاسی احساس غیر مکمل طور پر ترقی پاتا تھا، اس لئے جسطرح وہ آسانی کے ساتھ متفرق ہو جاتے تھے، اسی طرح آسانی کے ساتھ متحد بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن شہر جو سلطنت کا کالبد مادی تھا اس کے نشو و نما کے ساتھ جس نسبت سے سلطنت کے خیال کی اہمیت بڑھتی گئی اسی نسبت سے اتحاد زیادہ مشکل ہوتا گیا۔

۴۔ اکائیا کی قدیم لیگ انھیں وفاقی اتحادات میں سے نسبتاً غیر اہم شہری سلطنتوں کی ایک لیگ تھی اس لئے بعد کی لیگ اکائیا کی مخصوص دلچسپی یہی ہے کہ وہ ایسے شہروں کی لیگ تھی جس میں قدیم شہری سلطنتوں کے تفرد کو مغلوب کر دیا گیا تھا اور پھر بھی اس کے ممتاز خصوصیات بدستور باقی تھے، یہ صحیح ہے کہ اسپارٹا اور اتھنز بالکل علیحدہ رہے اور انھوں نے وفاقیت کو قبول نہیں کیا، اور قبول بھی کیا تو بہت ہی روا روی اور برداشتہ خاطری کے ساتھ، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ کورنتھ، میگارا، ارگوس، اور آرکیڈیا کے جدید "شہر اعظم" کے ایسے قدیم امتیاز کی دوسری سلطنتوں نے بطیب خاطر اسے قبول کر لیا تھا

اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ فعل موخر مقدونوی غلبے کے خلاف جدوجہد لے جاری رکھنے کی غرض سے تھا اور یہ جدوجہد ایک وقت میں کسی قدر کامیاب بھی رہی۔

بالفاظ فریمین "یونانی آزادی کا یہ نمونہ بعد[1] سنہ ۳۲۲ ق م کی ا جنگ لامیا کے چالیس برس بعد میں یعنی سنہ ۲۸۱ سے شروع ہوا۔ اس جنگ کے بعد سے یونانی آزادی کا قدیم دور ختم ہوگیا اور سکندر کے انتقال کے بعد اسی جنگ میں یہ بیکار کوشش کی گئی تھی کہ مقدونیہ کے غلبہ کو برطرف کر دیا جائے۔" مسٹر فریمین ہی[2] کہتے ہیں کہ "جانشینوں کی لڑائیوں کے اثناء میں یونان متخاصم حکمرانوں کی معرکہ آرائی کا خاص میدان بن گیا یہ ضرور تھا کہ اکثر مختلف شہروں کی خوشامد اور چاپلوسی کی جاتی تھی، چنانچہ پہلے پولیس پرخول لے اور اس کے بعد دیمیتریوس نے خود کو یونان کے آزاد کنندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان دونوں نے شہروں کو صرف اس لئے آزاد کر دیا کہ وہ خود ان کے مالک بن جائیں۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ یونان کا ہر ایک شہر ایک قلعہ بن گیا تھا جس کے لئے کشاکش برپا تھی اور ان نودولتوں میں سے جو خالص شخصی جھگڑوں میں یورپ و ایشیا کو ویران کر رہے تھے، کبھی ایک کبھی دوسرا ان شہروں پر قابض ہو جاتا تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اکائیا کی قدیم لیگ کی تجدید سنہ ۲۸۱ میں ہوئی، مگر شہری سلطنتوں کے تفرد کو زیر کرنے کی شدید کارروائی تیس برس بعد تک شروع نہیں ہوئی، سنہ ۲۵۱ میں سیاسی قابلیت کے ایک شخص ارائوس نے سکیون کے قدیم شہر کو داخلہ کی درخواست کرنے پر راغب کیا، اس وقت تک لیگ کے شہر فرو افرو اً بے حقیقت سے تھے مگر سکیون کو تاریخی امتیاز حاصل تھا، اس وقت سے لیگ نے ترقی شروع کی۔ کورنتھ اس میں سنہ ۲۴۳ ق م میں شامل ہوگیا اور اس کے بعد میگارا اور شمالی مشرقی پیلوپونیز کی دوسری سلطنتوں نے شمولیت کی۔ اس کے بعد ارکیڈیا کے "شہر اعظم" میگالوپولس اور دوسرے شہروں نے شمولیت کی (شہر اعظم" کے خودسر حکمراں نے خود انخلاع کر دیا تھا) بعد ازاں سنہ ۲۳۵ میں خودسروں کا خود اپنی مرضی سے مزید انخلاع واقع ہوا، اور لیگ میں قدیم شہر ست

۱؎ "حکومت وفاقی" صفحہ ۱۷۷ (طبع دوم)

۲؎ حسب بالا صفحہ ۱۸۰

رکھنے والے شہر ارگوس کا اضافہ ہو گیا۔[ع۱]

(سنہ ۲۲۱ ق م میں) اسپارٹا کے ساتھ ایک بد قسمت معرکہ ہونے کے بعد لیگ اکائیا کی کمزوری اور مقدونیہ پر انحصار کا دور شروع ہوا۔ گر صدی کے ختم ہونے کے قبل پھر اس نے عروج حاصل کیا اور جب روما کی ناقابل مقاومت طاقت نے یونان میں غلبہ حاصل کرنا شروع کیا تو جس طرح شمال یونان میں ایتولیا کی ایک سربرآوردہ سیاسی جماعت کی حیثیت رکھتی تھی، وہی حال جنوب میں اکائیا کی لیگ کا تھا۔ اس دور میں ایتھنز سیاسی حیثیت سے کالعدم تھا، اور اسپارٹا میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ وہ لیگ کی ہمسری کرسکتا۔

عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ وفاقیت کا اساسی اصول یہ تھا کہ جو سلطنتیں اس لیگ کے اندر شامل تھیں وہ لیگ کے باہر کی قوموں کے تعلقات کے لحاظ سے ایک سلطنت ہو جاتی تھیں مگر تمام داخلی معاملات میں وہ اپنی قدیم آزادی اور اقتدار کو قائم رکھتی تھیں۔ اکائیا کی ایک قوم تھی، اور اس کی ایک قومی جمعیت تھی[ع۲]، جس میں وفاقیت کی ہر ایک ریاست کو ایک رائے کا حق حاصل تھا، ایک قومی جماعت عاملانہ تھی اور اس کے ساتھ قومی عہدے بھی تھے، جنکی براہ راست اطاعت اکائیا کے ہر ایک شہری پر اسی طرح واجب تھی جس طرح خود مجلس کی اطاعت۔ "کوئی ایک شہر خود اپنے اختیار سے صلح و جنگ" یا دوسری سلطنتوں سے معاہدہ نہیں کرسکتا تھا، اور لیگ کے عام قانون کے موافق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی شہر باہر سفیر نہیں روانہ کرسکتا تھا، مگر لیگ کے بعد کے زمانہ میں جبکہ غیر رضامند شہر بزور لیگ میں شامل کر لئے گئے تھے، اس قاعدے کی خلاف ورزی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ دوسری طرف ہر ایک شہر کامل آزادی کے ساتھ اپنے سیاسی دستور سلطنت اور اپنے قوانین کا تعین کرتا تھا، اور اس میں مرکزی حکومت کی طرف سے مطلق مداخلت نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفاقیت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہو گیا تھا کہ اس کے ایک شہر کے شہری لیگ کے دوسرے شہروں میں شہریت کے ذاتی حقوق میں داخل کر لئے جاتے تھے یعنی وہ آپس میں شادی بیاہ کرسکتے اور جائداد

ع۱۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۲ (طبع دوم)

ع۲۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۳

غیر منقولہ رکھ سکتے تھے[1]

قومی حکومت ضابطے کی رو سے عمومی و غیر نیابتی تھی، لیگ کے تمام شہروں کے تیس برس سے اوپر کی عمر کے شہری قومی جمعیت میں شامل ہونے اور اس میں تقریر کرنے کا حق رکھتے تھے اور ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ہر ایک شہر کی واحد رائے اس کے عندالموقع شہریوں کی کثرت رائے سے متعین ہوتی تھی مگر یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کیوں کر محض حالات و ماحول کی قوت سے مجلس نے عملاً پرزور نیابتی و اعیانی حیثیت حاصل کرلی۔ اس سے صرف اس ایک شہر کا عنصر مستثنیٰ تھا جس میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جمعیت کی حاضری کا معاوضہ نہیں ملتا تھا اور دوسرے شہروں کے زیادہ غریب آزاد اشخاص اپنا وقت اور روپیہ قربان کرنے کے لئے بطیب خاطر آمادہ نہیں ہوتے تھے[2]

مزید براں، اگرچہ دستور سلطنت کی رو سے مجلس کو سب سے اعلیٰ قوت حاصل تھی مگر بکثرت جلسوں کے منعقد کرنے کی عملی مشکل کی وجہ سے وہ روزمرہ کے معاملات کا اس طرح پر انتظام کرنے سے معذور تھی جس طرح ایتھنز اور دوسری شہری سلطنتوں کی عام جمعیتیں ان معاملات کا انتظام کرتی تھیں۔ درحقیقت اس کے معمولی جلسے سال میں دو مرتبہ تین تین

عـ۱۔ فریمین، حکومت وفاقی صفحہ ۲۰۱۔

عـ۲۔ [ایک بولے" (مجلس شوریٰ) یا سینیات ، بھی تھی لیکن ہماری اسناد میں اکثر یہی معلوم ہوتا ہے کہ] مجلس شوریٰ اور جمعیت عملاً مرادف تھیں۔ [پولی بیوس کے بعض ٹکروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ دونوں لفظ ہم معنی تھے، بہر نوع میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جمعیت بالعموم صرف "بولے" (مجلس شوریٰ) پر مشتمل ہوتی [دوسرے ارکان اغلباً شریک نہیں ہوتے تھے۔]

ہوڈز وغیرہ کے متعلق جو کچھ ہم سنتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومانیوں کے حلیف کی حیثیت سے بعض یونانی شہروں کی نیم خود مختاری کے موخر دور میں، عمومیت کے اور واقعات بھی ایسے تھے جنہیں شہریوں کی عمومیت کی بافعالہ حکومت محض دکھانے کے لئے رہ گئی تھی [سمر، جمہوریہ حصہ سوم ص ۳۰] سمر کے اس بیان کے ساتھ پالیبس کے بیانات کو ملانے سے اس نتیجے کے نکالنے سے کوئی شخص باز نہیں رہ سکتا کہ مجلس شوریٰ اور جمعیت کے ارکان "عملاً ایک ہی تھے۔

دن کے لئے ہوا کرتے تھے اور اگرچہ فوری ضرورت کے موقع پر غیر معمولی اجلاس طلب کئے جا سکتے تھے مگر ان اجلاسوں کے طلب کرنے کا اختیار حکام عاملانہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے از خود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دس حکام جو سال بسال منتخب ہوتے تھے اور سپہ سالار کے زیر صدارت (جس کا انتخاب سالانہ ہوتا تھا) جماعتِ عاملانہ کا کام انجام دیتے تھے، ان کو جسقدر اختیار حاصل تھا، وہ عملاً اس سے بہت زیادہ تھا جو ایتھنز کے بجائے عموماً شہری سلطنتوں میں عام طور پر کسی جماعتِ حکام عاملانہ کے ہاتھ سے انجام پاتا رہا ہو۔

خطبۂ دہم

روما

۱۔ اب میں اپنے موضوع کے اس حصے پر پہنچ رہا ہوں، جس میں علم السیاسیات کے نقطۂ نگاہ سے اس کے ماسبق اور اس کے مابعد ابواب کے مقابلے میں خاص مشکل کا سامنا ہے۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ تاریخ ہمارے سامنے حکومت اور سیاسی نظم معاشرت کی جو شکلیں پیش کرتی ہے ان کی علمی اور محض تاریخی بحث میں فرق یہ ہے کہ خالص تاریخ میں ہمیں اول واقدم تعلق مخصوص واقعات سے ہوتا ہے اور عام قوانین وطرز ہائے حکومت، اسباب و علل اور رجحانات ومیلانات سے غرض صرف ثانوی حیثیت سے پڑتی ہے۔ اس کے برعکس علم سیاسیات میں ہمیں اول واقدم تعلق عام قوانین وطرز ہائے حکومت سے ہوتا ہے اور کسی خاص واقعے سے تعلق صرف اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ اس شہادت کا ایک جزو ہوتا ہے جس سے ہم اپنے عام نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یونان کی تاریخ کی بحث میں تو اس امتیاز کا قائم رکھنا آسان ہے کیونکہ یونان کی شہری سلطنتوں کے دستوروں سے متعلقہ معلومات میں غور عظیم کے باوجود ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے ہمیں مزید دشواری کے بغیر ان عام نتائج کے اخذ کرنے کا موقع ملجاتا ہے کہ شہری سلطنت کے ارتقا کے مختلف دوروں میں حکومت کے کن کن مختلف طرزوں کے شیوع کی طرف میلان زیادہ تھا اور وہ عام اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے سیاسی دستور، حکومت کی ایک شکل سے گزر کر دوسری شکل اختیار کرلیتا تھا، مگر جب ہم روما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس شہری

سلطنت کے شہنشاہی کی وسعت تک پہنچ جانے کا قدم بقدم پتہ چلائیں تو پھر تعمیم کے وسائل بہم پہنچا دیتے ہیں۔ متوسع، جذاب، فاتح و شہنشاہانہ روما تاریخ میں ایک نادر شئے ہے بقول رومانی شاعر کے اس کا کوئی مثیل و ثانی نہیں ہے "خالص شاہی حکومت کے تحت میں بہت سی عظیم الشان شہنشاہیاں ہوگزری ہیں، مگر ایسی کوئی شہنشاہی نہیں ہوئی ہے جسے جمہوری طرز حکومت کی کسی شہری سلطنت نے قائم کیا اور اپنے قبضہ میں رکھا ہو، اور خود یہ سلطنت اس اثنا میں "ملکی سلطنت" کی وسعت پیدا کرتی جا رہی ہو" اس لئے ایک ایسے نادر وقوعہ کو زیر بحث لانے میں علم السیاسیات کے لئے جس قسم کی بحث موزوں و مناسب ہے اسے معمولی تاریخ کی بحث سے تمیز کرنا دشوار رہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس مشکل میں ہمیں یہ کوشش کرنا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے سیاسیات متقابلہ سے مدد لیں، وہ اس طرح کہ ارسطو نے یونانی سیاسی زندگی کے نوع بنوع واقعات کی تحریر و ترتیب کے متعلق جو خیالات مہیا کر دئے ہیں ان کا اطلاق رومانی نظم حکومت پر کریں اور مشابہات و متغائرات دونوں پر نظر رکھیں۔

عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ارسطو نے جن دستوروں کا مطالعہ کیا تھا، ان میں روما بھی شامل تھا، مگر اس کے متعلق اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب کا سب ضائع ہو گیا ہے، اور اس یقین کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس نے اس معاملے پر خاص توجہ مبذول کی ہو، اس نے یہ پیش بینی نہیں کی تھی کہ اس کے انتقال کے نصف صدی کے اندر اندر وہ یونانی نوآبادیاں جنھوں نے جنوب و مشرقی اطالیہ کو "یونان اعظم" کے نام سے یونان بنا دیا تھا (سنہ ۲۷۲ ق م میں) ٹارنٹم کی حوالگی کے بعد وہ سب کی سب بالکلیہ روما کی قلمرو میں داخل ہو جائیں گی، اور پھر اس کی نصف صدی بعد (یعنی سنہ ۲۲۹ ق م تک)، طاقتور اطالوی جمہوریت" (جو اب بلا ردوکد تمام اطالیہ پر حکمراں ہو گئی تھی) الیریا کے قزاقان بحری کے مقابلے میں یونانیوں کی حفاظت کے لئے مداخلت کرے گی، اور اس لئے وہ خاکنائے کورنتھ کے "کھیلوں" میں، اور الیوسیس کے "اسرار" میں یونانی اقوام کی معاشری اتحاد کے رکن کی حیثیت سے باضابطہ طور پر داخل کر لی جائے گی، اور پھر ایک نسل بعد (۲۰۰ ـ ۱۹۰ ق م) یونان بہ حیثیت مجموعی بڑی سے بڑی دانشمندی اسی میں سمجھے گا کہ مقدونیہ کے مقابلے میں رومانی افواج کا جانبدار ہو جائے اور رومانی سپہ سالار سے جو بانگ دہل یونانی علم و تہذیب کا مداح

تھا "مکمل آزادی" حاصل کرے"۔ "کلی آزادی" اس شرط سے کہتا ہوں کہ دونوں الفاظ اجتماع ضدین نہ سمجھے جائیں) پھر اس پر پچاس برس اور گزر جائیں اور رومانی کورنتھ کو تباہ کر کے عملی طور پر یونانیوں کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیں۔

مگر ہم سے ان واقعات کا تعلق صرف ثانوی و تحتانی حیثیت سے ہے، ہمارے لئے یہ سوال زیادہ موزوں ہے کہ رومانی دستور سلطنت کو جس طرح ہم جانتے ہیں اگر ارسطو بھی اسی طرح اس کو جانتا ہوتا تو وہ اس کی نسبت کیا خیال قائم کرتا، میری مراد اس دستور سلطنت سے ہے جو اس کے وقت میں یعنی چوتھی صدی قبل مسیح کے ربع آخر کے ابتدا میں موجود تھا یعنی جبکہ لیکینیو سکسٹیانی قوانین سے پٹریشین اور پلیب طبقوں کے طولانی منافقے کا عملاً خاتمہ ہو گیا تھا اور روما اپنے قریبی ہمسایوں کو مغلوب کر کے اور کسی قدر ان کو اپنے میں جذب کر کے جزیرہ نما میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے سامنیوں سے آخری معرکہ آرائی کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

سب سے پہلے تو اس پر یہ واضح ہو جاتا کہ "آئینی حکومت" کو جس خاص اصطلاح کے طور پر اس نے استعمال کیا ہے، اس کے وسیع ترین مفہوم میں یہ بھی ایک قسم کی "آئینی حکومت" تھی یعنی یہ ایک ایسا سیاسی دستور تھا جس میں اصول عدیدیت و عوامیت کے درمیان ایک طرح کا امتزاج یا توازن پیدا کیا گیا تھا مگر یہ توازن عدیدیت کی طرف مائل اور اس قسم کا تھا کہ اس لفظ کے عام وسیع استعمال میں اسے "اعیانیت" کہہ سکتے تھے کیونکہ معاملات کا عام نظم و نسق زیادہ تر مجلس سینات کے ہاتھ میں تھا، اور اس میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ سب سے پہلے ان لوگوں سے پر کی جاتی تھیں جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہ چکے ہوں اور ان عہدوں پر ان کا انتخاب جمعیت قومی کی رائے سے ہوا ہو میرا خیال یہ ہے کہ ارسطو یقیناً اس رائے پر قائم ہو جاتا کہ وہ "معدودے چند" اور "کثیر التعداد" کے درمیان جس قسم کے توازن کو پسندیدہ سمجھا تھا، وہ رومانی نظام سلطنت میں حاصل ہو گیا تھا، کثیر التعداد کو معاملات عامہ کے انتظام کا اختیار نہیں حاصل تھا مگر انھیں اپنے حکام کے انتخاب کرنے اور در آں صورت کہ یہ حکام اپنے اختیارات کو نہایت ناجائز طور پر استعمال کریں ان سے جواب طلب کرنے کا اختیار حاصل تھا اور ارسطو کا خیال یہ تھا کہ اگر لوگ آزاد و قانع شہری رہنا چاہتے تھے، تو ان کے قبضے میں اس اختیار کا ہونا ضروری تھا، مگر یہ توازن

جس طرح حاصل ہوا تھا اسے اہم اعتبارات سے ارسطو کی رائے اور خیال سے کچھ بھی مناسبت نہ تھی۔

سب سے پہلے تو ارسطو کو یہ ایک بہت ہی عجیب امر معلوم ہوتا کہ جمعیت عام ایک نہیں بلکہ دو تھیں اور دونوں مختلف طریقوں سے مرتب ہوتی تھیں، ایک تو کل قوم کی جمعیت سنتوریوں کے اعتبار سے تھی اور دوسرے پلیبوں کا جلسہ قبیلوں[1] کے اعتبار سے تھا، ان میں سے اول الذکر کی تنظیم میں موخر الذکر کی بہ نسبت عمومیت کو کم دخل تھا، اس مقدم الذکر کی تنظیم سرویوس تولیوس کی جانب منسوب ہے، اول اول اور غالباً اس زیر بحث زمانہ میں، ایسی تھی جس سے محصول اور فوجی ساز و سامان کا بار ذی املاک اشخاص پر زیادہ پڑتا تھا اور اس کے ساتھ سیاسی اختیار کا زیادہ حصہ بھی انھیں کے ہاتھ میں آجاتا تھا، ان لوگوں کی ترتیب بلحاظ اوصاف جائداد کے زینہ بہ زینہ درجات میں کی گئی تھی، پس اس طرح، فوقیت خوش حال طبقہ کے ہاتھ میں آجاتی تھی، اور وہ رائے بھی اور لوگوں سے پہلے دیتا تھا مگر پلیبوں کے جلسوں سے قدیم خاندان کے شرفا خارج رکھے گئے تھے، ارسطو کو یہ امر نہایت عجیب معلوم ہوتا کہ جہاں اول الذکر جمعیت کو قنصل، پریٹر اور سنسر کے سے اعلیٰ انتظامی عہدوں کے انتخاب کا حق حاصل تھا، وہیں موخر الذکر (پلیبوں کی جمعیت[2]) کو بشمول ان خاص حکام کے جو اس کی رہبری کرتے تھے، یہ آئینی حق حاصل تھا کہ حکام سے ان کی مدت ملازمت کے ختم ہو جانے کے بعد محاسبہ کرے اور ان پر جرمانہ کرے، مگر موت کی سزا کا آخری تصفیہ جمعیت سنتوریہ کے لئے محفوظ تھا مجھے یونان میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہے جس سے حکمراں جماعتوں میں اس قسم کے دو عملی اختیار کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا ہو، ارسطو کی نظر میں ان عمومی حکام کا عہدہ بھی کچھ کم عجیب نہ رہتا جو پلیبین جلسہ کی رہنمائی کرتے تھے اور جن کا انتخاب انھیں پلیبوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا، یہ حکام ٹریبیون کہلاتے تھے، انتظامی اعتبار سے ان کا اختیار اگرچہ بمنزلہ نفی کے تھا مگر جو کچھ اختیار حاصل تھا وہ بالکل غیر محدود تھا۔ ٹریبیون اثباتی طور پر صرف جمعیت عمومی کے

---

[1] قبائل ابتداءً مقامی و انتظامی حصے تھے جنھیں پلیبون کی جمعیت کے اختیارات کی وجہ سے سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی تھی

[2] Concilium plebis

سرگروہ کی حیثیت سے کام کر سکتا تھا، جمعیت سے علیحدہ اسے امتناع کا اختیار حاصل تھا، امر کا اختیار نہیں تھا، اگر کوئی انتظامی کام ایسا نہیں تھا جو اس کی مداخلت سے رد کا نہ جا سکے، اور ان حکام عوام کے ذریعہ سے جو تحفظ حاصل کیا گیا تھا اسے زیادہ کامل طور پر موثر بنانے کے لئے ٹربیون کی ذات ایک ایسے تقدس سے مامون و مصئون کی گئی تھی کہ کسی دوسرے حاکم کو یہ تقدس نہیں حاصل تھا، ٹربیون جب گفتگو کر رہا ہو اس کی گفتگو میں دخل دینا بھی ایک بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔

لیکن یہ دیکھنا اور بھی زیادہ تعجب خیز ہے کہ قوم کی قانون سازی کا زیادہ حصہ آخر الامر اسی بڑھی ہوئی عمومی جمعیت کے ہاتھ میں آ پڑا، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اس جمعیت سے پٹریشین (یعنی قدیم خاندان کے شرفا) خارج رکھے گئے تھے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس وقت سے بہت پہلے ایک قانون یہ منظور ہوا تھا کہ اس جمعیت پلیب کی قرار دادوں کی پابندی تمام شہریوں پر عائد ہوگی جن میں پٹریشین بھی داخل تھے جو اس جمعیت کے رکن نہیں تھے، اور اگرچہ ارسطو کے زمانہ میں پلیب جمعیت کا یہ تشریعی اختیار ہنوز آئینی حیثیت سے کسی نہ کسی طریقے پر جس کی نسبت مورخین میں باہمی اتفاق نہیں ہے سنیاتی یا پٹریشینی نگرانی کے تابع تھا، مگر بعد میں (یعنی ۲۸۷ء ق م) یہ قیود رفع ہو گئے تھے اور اس کے قبل کہ روما بلا شرکت غیرے اطالیہ کا مالک ہو جائے پلیبی جمعیت کی تشریعی قابلیت مکمل ہو گئی تھی۔

ارسطو اگر اس نادر آئینی نتیجہ کی تاریخی تشریح کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ جمہوریہ کی تاریخ کے پہلے دور میں روما کے اندر قدیم خاندان کے لوگوں اور نئے شہریوں یعنی طبقۂ پلیب کے درمیان جس شدت و سختی کے ساتھ کشمکش جاری رہی تھی، یہ اسی کا اثر تھا۔ یہ معرکہ دونوں جانب سے اس شدت کے ساتھ جاری رہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پلیب طبقہ سلطنت کے اندر ایک سلطنت بن گیا تھا۔ اور ان کی خود اپنی جمعیتیں اپنے منتخب کردہ عہدہ داروں کے تحت میں قائم ہو گئی تھیں اور انہوں نے شرفا کو مجبور کر دیا کہ وہ ان عہدہ داروں کا یہ حق تسلیم کریں کہ سنیات یا معمولی حکام کے جس فعل کو یہ عہدہ دار آزار دہ قرار دیں اسے جس حد پر چاہیں روک دیں، اور آخر میں انہیں اس حد تک مجبور کیا کہ ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس پلیبی جمعیت کی قرار دادوں

کو قانونی اقتدار حاصل ہے۔

۲۔ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کے ان باہمی مناقشوں کی طولانی و شدید نوعیت اس وجہ سے اور بھی قابل لحاظ ہے کہ شرفا کے مختصر امتیازات کے شکست کرنے کی کارروائی کا ابتدائی زمانہ گزر گیا تھا اور اس جنگ و جدل کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا اور روما ہنوز شاہی حکومت کے تحت میں تھا۔

رومانی قوم کی ابتدائی جمعیت (یعنے مجلس کیوریہ (Comitia curia) کی تنظیم اس طریق پر ہوئی تھی جسے ہم "اصول عشیرہ" کہہ سکتے ہیں، اور اگرچہ بعد میں طبقۂ پلیب کا دخل بھی اس میں ہو گیا تھا مگر اس کے اندر قدیم خاندانوں کی قوت و طاقت بے بحث و جدل قائم تھی یہ وہی حالت تھی جو ابتدائی عہدیت کے زمانہ میں عام طور پر یونانی سلطنتوں میں پائی جاتی تھی، لیکن اگرچہ اس جمعیت کا وجود قائم رہا، مگر جمہوریۂ روما کی تاریخ کے کسی وقت میں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسے کچھ سیاسی اہمیت حاصل رہی ہو۔ حکام کے منتخب کرنے موت کی سزا دینے، اور ابتدا میں عہ قانون سازی کے فرائض یہ سب مجلس سنتوریہ کے قبضے میں چلے گئے تھے جس کا میں ابھی ابھی ذکر کر چکا ہوں یعنے یہ جمعیت خاندان و عشائر کی جمعیت نہیں تھی بلکہ ان آزاد اراضی داروں کی جمعیت تھی جن پر فوجی خدمت عائد تھی اور اس جمعیت میں پیٹریشین اور پلیب، دونوں تشخیص جائداد کے مطابق طبقات میں ترتیب دئے گئے تھے۔ تشخیص جائداد کا یہ طریقہ کسی قدر اس طریقے کے مطابق تھا جسے ایتھنز میں سولن کے دستور سیاسی میں اختیار کیا گیا تھا، لیکن اگرچہ جمعیت میں پیٹریشین اور پلیب کا فرق رفع ہو گیا تھا مگر پیٹریشینوں کا یہ حق مختص قائم تھا کہ اعلیٰ حکام کے عہدوں پر انھیں کا انتخاب ہوا کرے اور اس فرق و امتیاز سے آخری طور پر نجات حاصل کرنے میں دو صدی کا زمانہ صرف ہو گیا۔ قطعی کارروائی ۳۶۷؁ میں ہوئی جبکہ لیکینیو سلستیانی قانون کی رو سے مختتم طور پر یہ طے پا گیا کہ دو قنصلوں میں سے ایک ہمیشہ پلیب ہوا کرے گا۔ اسی کشمکش کے ابتدائی حصہ میں یہ ہوا کہ پلیبوں نے اپنے خاص حکام یعنے ٹریبیون کی صدارت

عہ۔ یعنی اس وقت تک کہ خالص پلیب جمعیت نے توضیع قانون کا متوازی اختیار نہیں حاصل کر لیا تھا۔

میں، اپنی خاص جمعیت کی صورت میں اپنے کو منتظم کیا اور ان ٹربیونوں کے لئے مستقل حکومت کے قانون کی ممانعت کردینے کا حق حاصل کرلیا۔

میرا خیال ہے کہ رومانی تاریخ کے بہت سے پڑھنے والے اس تحیّر میں پڑے ہوں گے کہ اس دستورِ سلطنت کے تحت میں حکومت کی کل چلنے سے بالکل رک کیوں نہ گئی، اور اس سے بالیقین یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رومانیوں کی قوم ایک ایسی قوم تھی جس میں عجیب و غریب عملی سیاسی قابلیت موجود تھی کہ وہ عملاً ایک ایسی تفہیم باہمی کے چلانے پر قادر تھی جو نظریۃً اس درجہ ناقابل العمل معلوم ہوتی تھی مگر پلیب جب اس آئینی جدوجہد میں کامیاب ہوگئے اور اپنی (پلیبی) جمعیت کی قرار دادوں کے لئے قانون کی قوت حاصل کرلی تو پھر اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فتح کو کامل عمومیت کی حد تک کیوں نہ پہنچایا گیا؟ ایسا کیوں ہوا کہ اس کشمکش کے ختم ہونیکے ڈیڑھ صدی بعد تک جبکہ روما بحر روم کے ارد گرد کی دنیا کو فتح کر رہا تھا، معاملات کا انصرام حقیقتاً اعیانی رنگ میں چلتا رہا؟ اور اس طرح پلیبی جمعیت وضع قوانین کا آلہ بن گئی جو معمولی حالت میں مجلس سینیٹ کی ہمنوائی اور اسی کے زیر اثر کام کرتی تھی، اور ٹربیون کا عہدہ عام مخالفین کی سرگروہی کے بجائے ایک باقاعدہ عہدہ ہوگیا جسے متمول و موروثی امتیاز کے پلیب اس غرض سے حاصل کرتے تھے کہ اس زینہ سے وہ قنصل کے رتبہ اور مجلس سینیٹ کی رکنیت تک پہنچ جائیں، مختصر یہ کہ مدت تک قومی جمعیت اور اس کے حکام اور عوام کی جمعیت اور ان کے حکام کے درمیان فرق صرف ایک گزری ہوی مخاصمت کی یادگار کے طور پر باقی رہگیا تھا اور قوم پر عملی حکمرانی شرفا کی تھی۔

میں اسے زیادہ تر بیرونی کشاکش کے دباؤ کی طرف منسوب کرتا ہوں، جن میں اگرچہ انجام کار میں ہمیشہ روما کو کامیابی ہوتی رہی ہے مگر ان کامیابیوں کے لئے بسا اوقات انتہائی کوشش و قربانی کی ضرورت پڑا کرتی تھی، اس قسم کی کشاکش میں حب الوطنی اور جنگی جوش سے کام لینا پڑتا تھا اور اس طرح ان صفات میں عظمت و شدت پیدا ہوجاتی تھی، اور ایک محب وطن و جنگجو قوم میں، جو یہ سمجھتی ہو کہ اس کی رہبری خوبی و کامیابی کے ساتھ ہو رہی ہے، موجودہ حکومت کی اطاعت کی عادت قوت پکڑتی جاتی ہے۔

مگر میرا خیال ہے کہ اس انقیاد کی توجیہہ کا ایک اہم جزو اس زمانہ کے رومانی

طبقہ پلیب کی ایک دوسری خصوصیت میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ انتھنز کے عامۃ الناس سے نہایت نمایاں طور پر ممیز ہو جاتے ہیں۔ وہ خصوصیت یہ تھی پلیبی جمعیت میں رایوں کا فیصلہ افراد کی کثرت سے نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ فیصلہ اس تقسیم کے مطابق ہوتا تھا جو ابتداءً مقامی و انتظامی تقسیم تھی اور جسے قبائل کہتے تھے، اس تقسیم کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ دیہاتی عنصر نہایت قطعی طور پر خالص شہری عنصر پر غالب آجاتا تھا۔ یہ کہنا حد سے تجاوز کرنا نہیں ہے کہ روما کی کامیابی کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ خوش نصیبی سے سلطنت کی ہیئت ترکیبی میں شہری دیہاتی عناصر کا توازن ایک خاص خوبی کے ساتھ قائم تھا۔ ایک طرف لاطیوم میں روما کی بلند حیثیت تھی جس سے پہلے تو اسے لاطینی عہد نہیت کی سرگروہی حاصل ہوگئی اور پھر بعد کو اس سے وہ اس قابل ہو گیا کہ دوسری لاطینی قوموں کو اپنے میں جذب کرلے، اس بلند حیثیت کی بنا یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے ٹائبر پر اس کا محل وقوع ایسا تھا جو تجارت کے لئے موزوں تھا، اس سے روما میں شہری زندگی کو اس حد تک وسعت حاصل ہوئی کہ کوئی دوسرا لاطینی شہر اس کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔[۱] دوسری طرف روما کے سیاسی نظم میں خالص شہری عنصر خاص طور پر دبا کر رکھا گیا تھا، کم از کم جمہوریت کے زوال کے شروع ہونے تک تو یہی حالت تھی۔ ابتداءً جمعیت قبائلی میں حق رائے دہی ملکیت اراضی پر مشروط تھا، رومانی شہری جن کثیر التعداد قبائل میں تقسیم تھے (اور جو جمہوری دور میں بڑھتے بڑھتے پینتیس تک پہنچ گئے تھے)، ان میں سے ابتدائی شہری آبادی صرف چار قبائل تک محدود تھی اس کے بعد شہر کی ترقی کے ساتھ قوم کے بے زمین ارکان کو جمعیت میں شامل کرنا پڑا تو ایک وقت تک وہ انھیں چار شہری قبائل تک محدود رہے اور اس وجہ سے یہ قبائل امتیاز میں دوسرے قبائل سے پست ہو گئے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کے آخور بن گئے تھے جن میں آزاد آبادی کے سب سے زیادہ نفرت انگیز اجزا (یعنی وہ آزاد شدہ اشخاص جن کے پاس ایک معینہ مقدار سے کم زمین تھی) مجتمع ہو گئے تھے پس جمہوریت کے زمانۂ عروج میں روما کے پلیب کا لا اس قسم کے تھے جیسے لوگ ارسطو

---

[۱]۔ روما کی شہری مرکزیت کی وجہ سے سابینوں کے بالمقابل لاطینوں کو جو عظیم سیاسی قوت تحریک حاصل ہوگئی تھی، اسے موسمن نے موثر طور پر دکھایا ہے۔

کے خیال میں معتدل یا آئینی جمہوریت کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ ایسے لوگ بھی دہقانی کاشتکار تھے جو حکمرانی کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ صرف مفسدہ حکومت سے امون رہنا چاہتے تھے، اور ہم اس میں ایک اور اضافہ کر سکتے ہیں جو ارسطو کی رسائی ذہن سے خارج تھا، وہ یہ کہ صرف رومانیوں ہی کے ایسے عامتہ الناس سے (جو تلوار کے زور سے فتح کرتے مگر اپنے فتوحات پر ہل کے ذریعہ سے قابض رہتے تھے) یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک شہری سلطنت کو ایک مضبوط شہنشاہی ملکی سلطنت تک وسعت دیدینا ممکن کر دکھائیں۔

پس اس طرح یہ ہوا کہ جب ایک طولانی کشمکش کے بعد رومانی قوم نے اپنے حکمراں طبقہ پر قیود و نگرانی کا ایک ایسا موثر نظم قائم کر دیا جس کی نسبت یونانی تشبیہوں کی رو سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ باغلب وجوہ وہ کامل عمومیت تک پہنچ جائے گا اس وقت وہ دو صدیوں تک اس نقطہ پر ٹھہر گئے جس نے مغربی تمدن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ انھوں نے معاملات کے انصرام کو ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جنھیں ارسطو کے اور نیز ہمارے مفہوم میں اعیانی جماعت کہنا چاہئے[۱]۔

۲۔ حکمران جماعت کی ہیئت ترکیبی اور محکوم کے ساتھ اس کے تعلقات کے متعلق، رومانی تاریخ کے مختلف دوروں کے درمیان غور و فکر کے ساتھ فرق قائم کرنا چاہئے بادشاہی کے زوال[۲] کے پچاس برس بعد تک رومانی تاریخ میں جو کشمکش زیادہ نمایاں رہی، وہ پیٹریشین اور پلیب طبقوں کی کشاکش تھی مگر یہ کشمکش معدودے چند اہل دولت اور کثیر التعداد غربا کے درمیان ایک سیدھا سادہ معرکہ نہیں ہے۔ ایک حد تک ایسا ہے مگر ایک بالکل ہی مختلف کشمکش سے اس میں پیچیدگی پڑ گئی تھی، یہ کشمکش قدیم و جدید خاندانوں

---

[۱]۔ میں ایک مختص خصوصیت کا ذکر کر سکتا ہوں جس کے لحاظ سے رومانی حکومت (جبتک کہ وہ فتح کے اثر سے پست اخلاق نہیں ہوگئی اس وقت تک) وہ ارسطو کے اس تصور کے مطابق تھی جو اس نے عددیت کے بالمقابل اعیانیت کے متعلق قائم کیا تھا، یہ خصوصیت پاکیزگی و سادگی اخلاق سے انکا تعلق باور قانون و احتساب کے ذریعہ سے عیش پرستی کے روکنے کی کوشش تھی کہا جاتا ہے کہ ۲۷۵ ق م میں ایک شخص جو دو مرتبہ قنصل رہچکا تھا سینات سے اس وجہ سے خارج کر دیا گیا کہ اس کے پاس کثرت سے چاندی کے ظروف تھے

[۲]۔ جس طرح شاہی سے جمہوریت کا قالب اختیار کرنے کی صحیح نوعیت غیر متیقن ہے، اسی طرح اس زوال کی تاریخ بھی غیر متیقن ہے۔

کے درمیان تھی یعنی دولتمند پلیبی یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ سرکاری امارتوں اور عہدوں میں وہ اپنا حصہ حاصل کر سکیں۔

اس کی بہت نمایاں توضیح و تشریح لیکینیو سکتیانی قوانین سے ہوتی ہے (جنکا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے اور) جو دس برس کی سخت معرکہ آرائی کے بعد ۳۶۷ء ق م میں منظور ہوئے تھے، انھیں قوانین سے پٹریشین اور پلیبیوں کی کشاکش میں نہایت اہم دور نو قائم ہوا، ایک طرف تو ان قوانین کا مقصد یہ تھا کہ دو بلند ترین عہد ہائے سرکاری یعنے مناصب قنفل میں سے ایک عہدہ قدیم خاندانوں کے محدود گروہ کے باہر کے شہریوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے دوسری طرف اس کی غرض یہ تھی کہ سرکاری املاک پر کسی ایک شہری کو جس قدر بھیڑ بکری یا دوسرے مویشی چرانے کا اختیار ہو، اور جس قدر سرکاری زمین کسی ایک شخص کے قبضے میں رہ سکے اسے محدود کر دیا جائے اصولاً تو یہ قبضۂ اراضی عارضی ہوا کرتا تھا مگر عملاً دائمی ہوجاتا تھا اور اس طرح دولتمند شہری سرکاری زمین کو اپنے تصرف میں کر لیتے تھے۔ نیز یہ بھی غرض تھی کہ مالکان اراضی کو مجبور کیا جائے کہ غلاموں کے ایک خاص تناسب سے آزاد مزدوروں کو بھی کام میں لگائیں، اور نیز یہ کہ قرضداروں کو ان کے قرض کے پورے بار سے اس طرح سبکدوش کیا جائے کہ سود میں جو رقم دیجا چکی تھی اسے اصل میں وضع کیا جائے۔ ضوابط کے اس مجموعہ میں صاف طور پر دو متضاد عناصر شامل تھے، ایک عنصر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نودولت قدیم خاندان والوں سے معرکہ آرا تھے اور دوسرے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غربا، امرا سے برسر جنگ تھے۔ چھوٹے چھوٹے دہقانی کاشتکاروں کا جم غفیر یہ چاہتا تھا کہ اسے آزار رساں حرفتی مقابلہ اور بڑے سرمایہ داروں کی مداخلت سے نجات ملجائے دوسری طرف لیکینیوس اور دوسرے سر برآوردہ پلیب اس فکر میں سرگرداں تھے کہ اعلیٰ عہدوں میں ان کے داخل ہونے کا راستہ کھل جائے اس حیرت انگیز واقعے کے بیان سے متضاد عناصر کے اجتماع کا نقش اور بھی دل پر جم جاتا ہے کہ لیکینیوس ہی وہ پہلا شخص تھا جو اپنے ہی مقرر کردہ قانون کی حد اجازت سے زیادہ زرعی زمین پر قابض ہونے کا مجرم پایا گیا۔

اس لئے ہمیں اس امر کے معلوم ہونے سے کچھ حیرت نہیں ہوتی کہ جب فتح ہوگئی تو پھر سر برآوردہ پلیبیوں نے قدیم امرا کے ساتھ اتحاد عمل اختیار کر لیا اور اس طرح

ایک نیا طبقہ امرا کا بن گیا جس میں اعزاز اعلیٰ پٹریشین نسل میں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے اسلاف کی اولاد ہونے کی وجہ سے عطا ہوتا تھا جو اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں کبھی بھی اس حد کی بندش نہیں ہوئی جو قدیم خاندان میں تھی پست رتبہ نسل کے قابل افراد کو موقع حاصل ہو گیا تھا اور وہ اپنی سعی و کوشش سے عہدۂ قنصل تک پہنچ سکتے تھے، خاصکر پلیبیوں کے لئے عہدۂ قنصل پر فائز ہونے کی اجازت کی پہلی صدی میں [جبکہ روما اطالیہ کو فتح کر رہا تھا (۳۶۶ - ۲۶۲ ق م)] تاہم فی الجملہ معدودے چند حکمراں افراد کا میلان نمایاں طور پر موروثیت ہی کی طرف تھا اور بتدریج ایک ایسی صورت حالات پیدا ہو گئی جن میں "قنصلی" و "سینیاتی" خاندانوں کے اسلاف سرکاری عہدوں اور سینیات کی خالی جگہوں کو بلا شرکت غیرے تنہا اپنے قبضہ میں تو نہیں کر لیتے تھے مگر اس کے شریک غالب بن جاتے ہیں[۱]۔

یہی نیا طبقۂ امراء ہے جو اس طرح پر مرتب ہوا تھا اور جس کی نمائندگی مجلس سینات کے ذریعے سے ہوتی تھی، وہی اس زمانے میں جب روما اپنے فتوحات سے شہنشاہی کی طرح اس کے انصرام معاملات پر حاوی و غالب تھا لیکن اگرچہ یہ حکومت غالب طور پر عدیدی حکومت تھی تاہم یہ ان "معدودے چند افراد کی حکومتوں" میں کسی حکومت کے مشابہ نہیں تھی جن کا ذکر ارسطو نے کیا ہے۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ روما کے آئینی نظریے میں آزاد شہریوں کی جمعیت اپنی مخصوص دہری صورت میں، قوم میں سب سے اعلیٰ صاحب اقتدار کی حیثیت سے قائم رہی اور اسے اپنے اقتدار اعلیٰ کا پورا ادراک و احساس بھی تھا۔ جمعیت بدستور یہ قنصلوں، پریٹروں اور سنسروں کا انتخاب کرتی تھی اور کبھی عوام کا کوئی امیدوار طبقۂ امرا کی خواہش کے خلاف کامیاب بھی ہو جاتا تھا اور جب عملاً حکمرانی کرنے والے ذی اقتدار اشخاص کے درمیان کوئی شدید تصادم پیدا ہو جاتا تھا تو قومی جمعیت آخری عدالت مرافعہ کا ہی کام دیتی تھی۔ جارحانہ جنگ کے اعلان کرنے کا حق ہمیشہ تنہا اسی کو حاصل رہا اور مجلس سینات کی یہ عادت تھی کہ صلح و مخالفت کے مشکل و نامطبوع مسائل اسی

---

[۱] ۔ پالس، فاتح مقدونیہ اپنی لیاقت کی وجہ سے منتخب ہوا تھا، اوس کے بابت ممسن کہتا ہے کہ یہ سنہ ۱۶۸ ق م کا ایک نادر واقعہ ہے

کے سامنے پیش کرتا تھا۔ تمام نئے قوانین یا اس جمعیت سے منظور ہوتے تھے یا پلیبیوں کی جمعیت قبائلی سے، اگرچہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں قانون سازی کا کام زیادہ تر پلیبی جمعیت میں انجام پاتا تھا اور اس واقعے سے حیرت انگیز طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس سینیات کا اختیار عوام کی رضا جوئی اور انھیں کے قابو میں رکھنے سے قائم رہتا تھا نہ کہ انھیں دھمکی دینے اور سیاسی حقوق سے خارج کرنے سے۔ اگرچہ پیٹریشنیوں اور پلیبیوں کے قدیم تنازعات عملی طور پر ختم ہونے اور ٹائی بیریس اور گائیس گراکھوس کے آغاز کردہ انقلابی دور کے درمیان تقریباً دو پر از اہمیت صدیوں تک عملاً سینیات ہی اکثر و بیشتر حالات میں یہ تصفیہ کرتی تھی کہ کیا قوانین منظور ہونا چاہئے لیکن اسے سہولت اسی میں معلوم ہوتی تھی کہ وہ اس کام کو خصوصیت کے ساتھ پلیبی جمعیت اور پلیبی حکام کے توسط سے انجام دے (غالباً اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی کارروائیوں کے متعلق عوام کی مخالفت رک جائے) اور اس میں بھی شک نہیں کہ وقتاً فوقتاً اس سے دب کر ایسی کارروائیوں کے منظور ہو جانے کی اجازت دینا پڑتی تھی جو اعیان کے مذاق کے موافق نہیں ہوتی تھیں، اگرچہ ہر ایک ٹربیون کا یہ اختیار کہ وہ دوسرے ٹربیون اور دوسرے حکام کے افعال کو روک سکے، اس کارروائی کے روکنے کے لئے ایک قابل قدر آئینی ہتھیار تھا۔

۴۔ لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا وجہ ہوئی کہ غربا اور امرا کا وہ قدیم تصادم جو پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم طبقۂ امرا اور پلیبیوں کی کشاکش میں ایک نمایاں مستقر بنا ہوا تھا، تیسری اور دوسری صدی میں تفصلی اور سینیاتی خاندانوں کی نئی اعیانی حکومت کے دور حکمرانی میں اسی طور سے جاری نہیں رہا؟ کیوں یہ تصادم اس وقت تک کے لئے فرو ہو گیا جب تک، کہ دوسری صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں برادران گراکھی نے انقلاب کی روح کو برانگیختہ کیا؟

اس کا جواب ان مسلسل کامیاب لڑائیوں کے نتائج میں ملیگا جنھیں رومانے اس دور میں برپا کر رکھا تھا، کیونکہ فتح کے اس دور میں رومانی حکومت نے زرعی بدلی کو حسن تدبیر سے اوپر ہی اوپر اڑا دیا اسی تدبیر سے اس نے اس پیچیدہ و سخت مسئلہ کو بھی حل کر لیا کہ کیونکر ایک شہری سلطنت ایک وسیع شہنشاہی کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھ سکتی ہے (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اطالیہ کو رفتہ رفتہ زیر کیا گیا تھا

اور اس کارروائی کے اثنا میں روما کا طریق عمل یہ تھا کہ مفتوحین سے ان کی زمین کا ایک حصہ بھی بزور لے لیے [1] یہ زمین اولاً قوم کی ملک ہوتی تھی اور اس کے بہت بڑے حصے برائے نام لگان پر امرا کے قبضہ میں چلے جاتے تھے، پھر بھی کبھی کبھی نئے فتح کردہ سرزمین کے بہت ہی وسیع قطعات رومانی شہریوں میں تقسیم کردیئے جاتے تھے اور اس پر انھیں کامل حقوق ملکیت حاصل ہوتے تھے "کلیتہً" نہیں مگر ایک بڑی مدتک نوآبادی قائم کرکے ایسا کیا جاتا تھا لیکن اس میں اور یونان کی معمولی نوآبادیوں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ آبادکار کسی نئی خودمختار سلطنت کی خشت اول کا کام نہیں دیتے تھے [2] کبھی یہ لوگ کامل الحقوق رومانی شہری رہتے تھے، اور اکثر ان کی حیثیت وہ ہوتی تھی جو قدیم ایام میں لاطیوم کے باشندوں کی تھی جو روما کے شہری نہیں تھے، یعنے وہ بعض امتیازات کی وجہ سے روما کے دوسرے تابع حلیفوں سے ممیز تھے۔ ان امتیازات میں سب سے زیادہ اہم امتیاز یہ تھا کہ کسی لاطینی نوآبادی میں کسی عہدے پر فائز ہونے سے رومانی شہریت کے حقوق حاصل ہوسکتے تھے۔ اس طرح ان شہروں کے سب سے زیادہ قابل ور پر حوصلہ عناصر (روما کی) حاوی و غالب شہری سلطنت میں برابر جذب ہوتے رہتے تھے کچھ تو اسطور پر، اور کچھ زبان و نسل کی یکجہتی کے احساس سے ان لاطینی نوآبادیوں کا ربط روما کے ساتھ (خاصکر اس کی سخت ترین وقت کے وقت (یعنی ہانیبال کے حملے کی تاریک ترین ساعت) میں کافی مضبوط ثابت ہوا۔ پس لاطینی نوآبادیوں، نیز وہ رومانی شہری جو بدستور اس حال میں رہے، ان سے قلعہ نشین فوج کا ایک زبردست جال بچھ گیا تھا اور یہ سب رومانیوں کی مشہور عالم فوجی سڑکوں کے ذریعہ سے ملے ہوئے اور اطالیہ کے دیگر حصص میں رومانی تسلط کو قائم کیے ہوئے تھے معہذا وہ ایسے مرکز بن گئے تھے جہاں سے لاطینی زبان اور لاطینی تہذیب بتدریج تمام جزیرہ نما پر پھیلتی جاتی تھی۔ پس جس تغیر نے کنار ٹائیبر کی شہری سلطنت کو ایک ایسی ملکی سلطنت میں بدل دیا جو تمام اطالیہ پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سیاسی دستور کی اس صورت کو بھی قائم رکھا جو ایک شہری

---

[1] معمولاً ایک ثلث اگرچہ اس مقدار میں فرق ہوتا رہتا تھا، کبھی کبھی تو کل زمین ضبط ہو جاتی تھی۔

[2] یہ لوگ اتھنز کے "کلیروخیوں" کے مشابہ تھے۔

سلطنت کے لئے موزوں ہے، یعنے رومانی شہریوں کی جمعیت جو روما کے بازار میں جمع ہوتی تھی آئینی طور پر بدستور حکومت کی اعلیٰ کارکن بنی رہی، اس تغیر کی نمایاں و ناور کارروائی میں ان آبادکاروں نے بھی اہم حصہ لیا۔

نیز جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ رہا تھا یہ نوآبادیاں ایسے منافذ تھے جن کے ذریعہ سے وہ زرعی مطالبات رفع کئے جاتے رہے، جو وقتاً فوقتاً ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں میں پیدا ہو جاتے تھے جن سے رومانی جمعیتوں اور فوجوں کا حصۂ کثیر مرتب تھا، چنانچہ کبھی کبھی اس مطالبے کا کچھ حصہ یوں پورا کر دیا جاتا تھا کہ بعوض فوجی خدمت کے سرکاری زمین کے کچھ قطعات انھیں دے دئے جاتے تھے۔

لیکن رومانی آبادکاروں کی حیثیت و حالت نقصان سے بھی پاک نہیں تھی یہ خود ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ اول تو جن مقامات پر وہ بھیجے جاتے تھے وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کے تعلقات کسی طرح بھی دوستانہ نہیں رہتے تھے۔ یہ قدیم باشندے زیادہ تر جبراً رومانی سلطنت کے رکن بنائے جاتے تھے مگر سیاسی اختیارات انھیں حاصل نہیں ہوتے تھے اور یہ امر کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے کہ ہم کبھی کبھی یہ سنتے ہیں کہ کسی نوآبادی نے بغاوت کر کے ان رومانی دخیلوں کو قتل کر ڈالا یا انھیں خارج کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ قدیم باشندے نئے شہریوں سے متفق ہو گئے، اور اکثر انھیں حق شہریت (Suffragium) مل گیا، پس اس طرح رومانی سلطنت دو قسم کے شہریوں پر مشتمل ہو گئی ایک تو وہ دائمی جماعت تھی جو روما کے گرداگرد قطعات پر آباد تھی اور نئے انجذاب سے برابر وسعت پذیر ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس انتہائی حد پر پہنچ گئی کہ شہری سلطنت کے اردگرد کے قطعۂ ارض کو وسیع کرنا ممکن نہ ہو گیا، دوسرے نوآبادیوں کا جال تھا جس کے باشندے تمام حالتوں میں تو نہیں مگر بعض حالتوں میں رومانی شہریوں کے پورے سیاسی و ملکی حقوق کو محفوظ رکھتے اور انھیں اپنے ورثا کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے۔ البتہ سیاسی حق شہریت اس وقت تک عملاً معطل رہتا تھا جب تک کہ یہ لوگ نوآبادیوں میں قیام پذیر رہتے لیکن اگر کبھی وہ روما میں منتقل

ہو جانے تھے تو اس حق سے وہ کام لے سکتے تھے۔

پس اس طرح مفتوح باشندوں کو جذب کرنے اور خود اپنی جماعت کی توسیع کا موقع نکالنے کی دُہری دہری کارروائی سے کنار ٹائبر کی آبادکاری بڑھتے بڑھتے ایک ایسی سلطنت بن گئی جس میں دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں ۲۸۰۰۰۰ ہتیار بند شہری ہتیار اٹھانیکے قابل موجود تھے ارسطو کی نظر میں تو یہ ایک ہیبت ناک سلطنت تھی۔

اس حد پر پہنچکر اس کی ترقی کچھ زمانے کے لئے رک گئی بلکہ عارضی طور پر ترقی معکوس ہو گئی۔ ۱۷۷ ق م کے بعد ہم باستثنائے پیکے قوم کی ایک نوآبادی ۱۵۷ ق م کے اور کہیں بھی قطعات زمین کے عطا کئے جانے کا حال نہیں سنتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطالیہ میں اب تقسیم کے لئے سرکاری زمین باقی نہیں رہی تھی بجز اس کے کہ جو متمول اشخاص کے قبضہ میں تھی اور یہ لوگ بغیر سخت کشاکش کے اس کے دینے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے مگر زمین کے لئے غریب تر شہریوں کا مطالبہ بدستور جاری تھا اور یہی مطالبہ توسیع کیلئے ایک اہم معاشری سبب تھا پس جب انقلاب کی صدی شروع ہوئی جو ٹائبریس گراکوس کے ٹربیون مقرر ہونے کے وقت سے جنگ ایکٹیم تک جاری رہی اور جو جنگ وجدل، ابتری ومصیبت، حیران و پریشانی ظلم وخونریزی کی صدی تھی اور جس میں سے گزرکر جمہوریہ نے نئی اس شہنشاہی کی صورت اختیار کی جو مشرق میں کسی نہ کسی صورت میں از منہ جدیدہ کے عین آغاز تک چلتی رہی، تو جس سوال سے انقلاب کی اس صدی کا آغاز ہوا وہ وہی پرانا زرعی سوال تھا جو پٹریشنیوں اور پلیبسوں کے درمیان موضوع کشمکش رہچکا تھا گراکوس کا زرعی قانون سمپرونیا لیکینوس کے زرعی قانون کی تجدید تھی جو تقریباً ڈھائی صدی قبل منظور ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قانون سمپرونیا کے عمل میں لانے میں وسیع قطعات ارض تقسیم کئے گئے تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ برسوں کے اندر اندر ہتیار اٹھانے کے قابل شہریوں کی تعداد چار لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ توسیع کی روایتی روش کے مطابق اب مزید وسعت کا امکان دشوار تھا، اب دوسرا اقدام صرف یہی ہو سکتا تھا کہ دوسرے اطالیوں کو جو اس وقت تک زبان وتہذیب میں بالکل ہی رومانی آبادکاروں کے برابر لاطینی ہو گئے تھے اور رومانیوں کے امتیازات ان محروم الحقوق اشخاص کی نظروں میں خلاف عقل وانصاف

ہوئے تھے انھیں بھی حقوق شہریت میں داخل کر لیا جائے یہ کارروائی دوسری صدی کے اختتام کے بعد ہی بہت جلد شروع ہو گئی تھی مگر روما کو جبراً اسے خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر اختیار کرنا پڑا اور اسباب و نتائج کے اعتبار سے اس کا تعلق انقلاب کی طولانی کارروائی سے ہو گیا تھا

۵ ۔ یہ امر میرے احاطۂ فرائض میں داخل نہیں ہے کہ میں اس انقلاب کی کارروائیوں کے ہر جزو کو بیان کروں تاہم میں اس کے بعض خاص صور و اسباب کا مختصراً ذکر کروں گا ۔

اول یہ کہ اس تمام طول طویل تماشہ کے ہر ایک ایکٹ میں ژرف نگاہ مبصر کو بہت صاف نظر آجاتا ہے کہ جو چیز شکست ہو رہی تھی وہ خالصتاً عدیدیت یا اعیانیت کی حکومت نہیں تھی بلکہ وہ ایک ایسی عدیدیت کی حکومت تھی جس کی معمولی اعلیٰ کارکن جماعت (یعنی مجلس سینات) اپنے تمام دور حکمرانی میں ایک عمومی جمعیت کے آخری اقتدار اعلیٰ اور اس کے منتخب کردہ حکام کے عاملانہ اختیار کو تسلیم کرنے پر مجبور رہی تھی لیکن فی الواقع اس نے پھر اس جمعیت سے عملاً یہ کام لیا کہ اسے قانون سازی کا خاص مرکز بنائے رکھا۔ وہ ''اطاعت کی عادت'' جس پر تمام منتظم و باامن حکومتوں کا مدار کار ہوتا ہے اس کی کیفیت رومانی سلطنت میں یہ تھی کہ لوگ ان قوانین کی اطاعت کے عادی ہو گئے تھے جو پلیبیوں کی جمعیت قبائلی نے اپنے ٹربیونوں کی تجویز پر منظور کئے ہوں، یہ عادت ویسی ہی مستمر تھی جیسی سینات کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی عادت تھی پس جبکہ سینات کو انقلاب کے خلاف روایتی امن و نظم کو بحال رکھنا تھا ایسی حالت میں بالتخصیص رومانیوں کی سی آئین پذیر قوم میں یہ امر واقعہ ایک اساسی اہمیت رکھتا تھا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انقلابی دور کے آغاز میں جب ایک متمرد ٹربیون ٹائبریس، گراکھوس نے امرا سے سرتابی کی اور اس کی سرگروہی میں جمعیت عوام امرا کے قابو سے نکل گئی اور ان کے مقاصد کے خلاف بیخ کن تجاویز منظور کیں تو کیوں اس پر غرور طبقہ امرا میں، جو بظاہر اپنی قائم شدہ قوت اور روایتی اختیار میں اس درجہ مستحکم و مضبوط معلوم ہوتا تھا براہ راست مقاومت کی ایسی حیرت انگیز کمی نظر آئی۔ وجہ یہ تھی کہ بلا واسطہ مقاومت یعنی ٹربیبوں پر ہاتھ ڈالنا یا ایسی جمعیت کی مرضی سے بجد و کد مخالفت کرنا جس کا تشریعی اختیار ان کے انتظامی اختیار ہی کی طرح مسلم و قدیم تھا یہ خود

انقلاب کے ہم معنی ہو جاتا اور نظم و امن کے حامی ہونے کی حیثیت سے انھیں جو فوائد قابضہ حاصل تھے انھیں باطل کر دیتا۔ انھوں نے عمومی وضع قوانین کے سیل کو اپنے سر سے گزرنے دیا اور اپنے موقع کے انتظار میں لگے رہے جب گراکھوس کے ایسے لوگ ٹریبیون نہیں رہے تو پھر انھوں نے سخت انتقام لیا مگر اس وقت بھی اس کی جرات نہ ہوئی کہ عوام کے وضع کردہ قوانین کے نہایت ہی اہم جزو کو بدل دیں۔

جمہوریت سے بادشاہی تک تغیر پذیر ہونے کی طولانی کارروائی نے جو صورت اختیار کی اس کے متعین کرنے میں یہ سیاسی حالت ایک اہم جزو تھی مگر جن اسباب نے اس تغیر کو لابدی بنا دیا تھا وہ حکمران طبقہ کی اخلاقی حالت کی گرانی میں مضمر تھے۔ وہ امراء جن میں اتنی ہمت و دانائی موجود تھی کہ بحر روم کے ارد گرد کے متمدن رقبہ کو فتح کر لیں ان میں اس وقت جبکہ یہ ممالک فتح ہو گئے اتنا ضبط نفس باقی نہیں رہا کہ وہ اس پر انصاف کے ساتھ حکمرانی کرتے پر ہوس کے سفیر نے جس جماعت کو شاہوں کی مجلس کہا تھا وہ اب بڑی حد تک وقت پرست و طامع جفاکاروں کا غول بن گئی تھی مگر یہاں بھی اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان کی حکومت کے حالات ایسے تھے کہ ان کی خرابی کے ساتھ جمعیت عوام کی خرابی بھی لازم و ملزوم تھی۔ ہم جب تاریخ کے اس تاریک باب کو پڑھتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف عدیدیت میں پستی آ گئی تھی بلکہ ایک ہنوز نارسیدہ عمومیت میں بھی ابتذال پیدا ہو گیا تھا اپنی قوت کو قائم رکھنے کے لئے صوبوں کے غارتگر اپنی غارتگری میں سے مٹھیاں بھر بھر کر ابنائے وطن کے دامنوں میں ڈالتے جاتے تھے اس کی صورتیں یہ تھیں کہ تفریحوں اور نمائشوں میں روز افزوں شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا غلہ اول اول تو کم نرخ پر اور بعد میں بالکل ہی برائے نام قیمت پر تقسیم ہونے لگا اور انتخابات کے موقع پر بڑی بڑی رقمیں رشوت میں دیجاتی تھیں پس اس طرح پر (اور خاصکر غلہ کی تقسیم سے جبکہ یہ تقسیم باقاعدہ اور فی الاصل مفت ہو گئی تھی) صاحب عزم ایماندار اور فوجی طبیعت رکھنے والے کاشتکار شہریوں کی وہ قدیمی جمعیت جن میں رائے دینے کے لئے یہ لوگ عظیم الشان بازار والے شہر میں ملکی فرائض کے سچے احساس کے ساتھ جمع ہوتے تھے ایسی جمعیت دار الصدر کے غوغائیوں کا مجمع بن گئی تھی جس میں دور دراز کے نہایت ہی ابتر رومانی شہری بھرے ہوئے تھے جو شہر میں اس امید سے پہنچ

جاتے تھے کہ مفت کے ٹکڑے ملیں گے۔[1]

یہ ضرور ہے کہ رومانی سلطنت اور اس کے مشترکی اطالوی حلیفوں کے درمیان جب سنہ ۹۰-۸۹ ق م میں جنگ ہوئی اور اطالویوں کے عام طور پر رومانی شہریت میں داخل ہونے سے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو شہریت کی اس وسعت سے اس تغیر میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی اور اس طرح قبل اس کے کہ تقیب کا زمانہ آئے جو عملاً بادشاہی کے مرادف تھی روما کی جمعیت عوام کا اختیار قانون سازی و انتخاب حکام مجلس سینات کے نظم و نسق سلطنت کے اختیار کے بہ نسبت زیادہ نمایاں و مایوسی افزا طور پر رخصت ہو چکا تھا۔

---

[1] - یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ جن پینتیس قبائل میں رومانی قوم منقسم تھی اون میں سے کسی قبیلہ کی رکنیت اگرچہ اول کسی خاص حلقہ میں رہنے کے ساتھ مشروط تھی مگر مدت سے اس کی صورت یہ ہوگئی تھی وہ موروثی شخص حق کے طور پر ان شہریوں کے خاندانوں میں چلی آتی تھی جسنے ابتداً اس رکنیت کو قیام کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا اور جمہوریت کی تاریخ کے آخری دور میں کسی قسم کی جائداد کی ملکیت کی شرط بھی پیش رہی تھی۔

خطبۂ یازدہم

روما (بہ سلسلہ سابق)

۱۔ اپنے آخری خطبے میں میں نے یہ کوشش کی تھی کہ عددیت و عمومیت کے مابین اس مخصوص توازن کے نشوونما کا مختصراً پتا چلاؤں جسے رومانی دستور سلطنت ہمارے پیش نظر کردیتا ہے؛ یہ توازن تلخ و ناگوار تصادمات اور تدریجاً بنا کردہ مصالحات سے شروع ہو کر شہری جماعت کی خوشحال وسعت پذیری اور شہنشاہانہ حکمرانی کے توسع کے شاندار دور سے گزر کر آخرالامر تنزل اور شاہی کی صورت میں منقلب ہو گیا تھا۔

مگر اس کے قبل کہ ہم اس حکومت کے خصوصیات پر غور کرنے کی طرف توجہ کریں جو قدیم جمہوری دستور سلطنت کو تباہ کر کے تعمیر ہوئی تھی، مجھے یہ اشارہ کر دینا چاہیے کہ پولی بیوس نے اپنے زمانے (یعنی دوسری صدی قبل مسیح کے نصف اول) میں رومانی سلطنت کی جو کیفیت بتائی ہے اس میں اسے ایک "شاہی" عنصر بھی نظر آتا ہے جسے میں نے اس وقت تک پس پشت ڈال رکھا ہے، وہ روما کے دستور سلطنت کو ان تینوں شکلوں کا مجموعہ سمجھتا ہے جو رائج الوقت ترتیب میں مروج تھیں یعنی شاہی، اعیانیت و عمومیت، منشا یہ ہے کہ وہ قنصلوں کو شاہی عنصر کا نمائندہ خیال کرتا اور درحقیقت یہ کہتا ہے کہ تینوں عناصر ایسی موزوں طرح پر منقسم و متوازن ہیں کہ ایک ملکی باشندہ بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا عنصر غالب ہے۔ یہ ایک صاحب

بصیرۃ و بافکر ہمعصر کا اہم فیصلہ ہے، اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ روما میں اعلیٰ ترین حاکم کا اختیار و اعزاز دونوں یونان کی ان تمام شہری سلطنتوں کے ہمپایہ حاکموں سے زیادہ تھا جن کا علم پولی بیوس کو تھا اور یہ اختیار ایک بڑی حد تک شاہی اختیار و اعزاز سے قریب آگیا تھا، لیکن فی الحقیقت اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ یونان میں عددیت کے زیادہ قدیمی طرز میں دستور سلطنت کی ایسی مثالیں نہیں ملتیں جو اس خصوص میں رومانی نظم سلطنت کے مشابہ ہوں مگر ہمیں اثباتی طور پر کسی ایسی مثال کا علم نہیں ہے، اور ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ پولی بیوس کو بھی کسی ایسی مثال کا علم نہیں تھا۔ اس فرق کا تعلق اس واقعے سے ہے جو ابھی ابھی مذکور ہو چکا ہے کہ رومانی قومی جمعیت نے حکمرانی کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اپنے حکمرانوں کے منتخب کر دینے اور انتہائی صورتوں میں ان سے جواب طلب کرنے کے اختیار پر قانع رہی، دوسری طرف مجلس سینات اگرچہ عملی طور پر نظم و نسق کی اعلیٰ کارکن بن گئی تھی مگر نظری طور پر وہ ایک مجلس مشورہ تھی جس سے حاکم اعلیٰ تمام اہم معاملات میں صلاح لینے پر مجبور تھا، وہ ایسی حکمراں جماعت نہیں تھی جس کی اطاعت پر حاکم اعلیٰ آئینی طور پر مجبور ہو۔

برادرن گراکھی کے آغاز کردہ دور انقلاب کے قبل کی حکومت روما پر غور کرتے وقت اس خیال کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مجلس سینات کا عملی اقتدار اس کے باضابطہ اختیار سے بہت بڑھا ہوا تھا، ایک طرف تو جمعیت جن معاملات کا باضابطہ تصفیہ کرتی تھی ان میں وہ بالعموم انھیں فیصلوں کو قبول کرتی تھی جو مجلس سینات کی طرف سے تجویز ہوتے تھے، دوسری طرف حکام جن معاملات میں باضابطہ طور پر آزادانہ کارروائی کر سکتے تھے ان میں مستحکم طور پر یہ عادت قائم ہو گئی تھی کہ وہ مجلس سینات کا ادب ملحوظ رکھتے تھے؛ تاہم عمال و جمعیت متحد ہو کر (خواہ یہ عمال اور یہ جمعیت بلیب ہی کیوں نہ ہو) مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کئے بغیر مجلس سینات کی مرضی کے خلاف بھی نہایت ہی اہم تغیرات کر سکتے تھے، اور جب تک کہ ہم اس امر کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں تو (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ہم اس دور انقلاب کے واقعات عجیبہ کی صحیح طور پر تعبیر نہیں کر سکتے۔

باایں ہمہ، میں یہ خیال نہیں کرتا کہ عہدہ قنصل جیسا کچھ کہ ارسطو یا پولی بیوس کے زمانے میں تھا، اس میں ارسطو شاہی کے خصوصیات کو تسلیم کر لیتا، کم از کم شہریوں کے

ساتھ قنصل کے تعلقات کا جہاں تک واسطہ تھا اس میں تو ایسا نہ کرتا۔ میں شہریوں کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ قنصل قائم مقام قنصل (پرو کانسل) یا قائم مقام پریٹر (پرو پریٹر) کے اختیارات ہم کے سپاہیوں اور رومانی سلطنت کی رعایا پر بہت زیادہ وسیع تھے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ قائم مقام قنصل صوبوں میں اپنی میعاد تقرر کے اندر، شاہانہ طور پر حکمرانی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی (جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے) کہ قائم مقام قنصل کا یہ اقتدار جب مستقلاً ایک شخص واحد کے ہاتھ میں آگیا تو اس سے ابتدائی شہنشاہوں کے اختیار کا خاص عنصر تیار ہوگیا۔

مگر شہریوں کے تعلقات کے لحاظ سے، ارسطو کے زمانے میں اور نیز اسکے بعد قنصلوں کے اختیارات اس سے بہت ہی مغائر تھے جنھیں ارسطو شاہانہ اختیار کہہ سکتا۔ (۱)، نہ صرف یہ کہ دو دو قنصلوں کا ہونا اختیارات کی بہت بڑی تحدید تھی (۲) بلکہ آئینی طور پر ٹریبیون کو روک تھام کے جو اختیارات دیئے گئے تھے ان سے بھی قنصلوں کے اختیارات محدود ہوگئے تھے۔ (۳) مزید براں، چوتھی صدی کے نصف آخر میں قنصلوں سے عدالتی فرائض نکل گئے تھے، یہ فرائض ان سے علحدہ کرکے پریٹروں کو تفویض ہوگئے تھے اور سیناتیوں کی فہرست پر نظر ثانی کرنے کا اہم کام اب سینسروں سے متعلق ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اپنے تمام زیادہ اہم فرائض میں وہ معمولاً محض مجلس سینات کے عامل کے طور پر کام کرتے تھے اور حقیقی طور پر وہ اس جماعت کے ماتحت تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ابتداً قنصلی اختیار کو شاہی اختیار سے زیادہ قریبی مشابہت حاصل تھی اور تقلیب کی ان دو کارروائیوں کو غور سے دیکھنا بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ جو شاہی اختیارات ایک جگہ مجتمع تھے، اولاً انکی قطع و برید سے حکام کو فرداً فرداً وسیع اختیارات عطا کئے گئے اور پھر جب جمہوریت نے شاہی کا قالب بدلا تو جدید شہنشاہی اختیار نے انہیں منقسم عناصر کے بعض اجزا کے اتحاد ثانی سے ملکر ترقی کی، کیونکہ اگرچہ روما میں شہنشاہی حکومت شدید بدنظمی کے طولانی دور کے بعد قائم ہوئی تھی، لیکن اس کی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ہم اسے حقیقتاً اس قدر بیضابطہ و خلاف آئین نہیں سمجھ سکتے جیسی کہ یونان کی مطلق العنانی ہوا کرتی تھی۔ اس کے برعکس آگسٹس کی ان کوششوں سے زیادہ کوئی امر عجیب و غریب نہیں کہ اس نے جدید مطلق العنانی کو آئینی اقتدار کا جامہ پہنانا چاہا اور یہ سعی کی کہ اختیارات کا جو پیچ در پیچ تاریخی نظام پہلے سے قائم تھا اس کو شہنشاہی کے جسم پر چسپت کردے۔

۲۔ پہلے شاہی سے بدل کر جمہوریت کا ہونا اور پھر پانچ سو برس کے بعد جمہوریت کا بدل کر شاہی کی صورت اختیار کرنا، ان دونوں میں سے اول الذکر ارتقا کے حالات تو افسانوں کی نقاب میں اس طرح روپوش ہو گئے ہیں کہ ان پر غائر نظر ڈالنا مشکل ہے۔ (جیسا کہ ہم سابق کے ایک خطبے میں دیکھ چکے ہیں)[۱] مگر اس تبدیلی کے عقب میں، شاہی کے تصور کے متعلق جیسا شدید دیرپا روایتی عنصر پیدا ہو گیا تھا اس سے ہم یہ یقین کر سکتے ہیں، کہ یہ تقلیب اپنے طرز و طور میں نہایت ہی زیادتی آمیز رہی ہوگی، یہ تنفر ایسا تھا کہ عمومیت کے قدیم تر دور میں جب کوئی سرگروہ عوام ہیبتناک حد تک پہنچ جاتا تھا اور اس کی سرکوبی کی ضرورت پڑتی تھی تو اس تنفر کی وجہ سے طبقۂ امرا کو بڑی زور مدد حاصل ہو جاتی تھی، بلکہ پلوٹارک کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت کے اختتام تک یہ کیفیت تھی کہ قیصر کے خلاف سازش کرنے والوں نے عوام کے اس روایتی تنفر پر اعتماد کیا تھا اور ہم یہ بھی یقین کر سکتے ہیں، کہ ایتھنز کے ان اولین حکام کی طرح جو ایک محدود زمانے کے لئے اپنے عہدے پر قائم رہتے تھے، قدیمی قنصل بھی زیادہ تاریخی زمانے کے قنصلوں کی بہ نسبت اپنے حدود اختیار کے اعتبار سے بادشاہوں کی سی شان رکھتے تھے۔ ابتدائی قنصلوں کو عدالتی اختیار بھی حاصل تھا، جو بعد کو (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ان سے علیحدہ کر کے پریٹروں کو دے دیا گیا تھا، جمعیت کا دخل صرف اتنا تھا کہ موت کی سزا میں اس کے پاس مرافعہ ہو سکتا تھا، یہ قدیم قنصل مجلس سینیٹ کی فہرست پر نظر ثانی کرتے تھے، اور خالی جگہوں کے پر کرنے میں انھیں بلاشک و شبہ اس سے بہت زیادہ آزادی حاصل تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں رواجاً محتسبوں کو دی گئی تھی، اور اس زمانے میں ان پر روک ٹوک کرنے کے لئے ٹربیبیوں بھی نہیں تھے۔ ان کے اختیار اور شاہی اختیار میں فرق صرف وہی تھا جو قلیل المیعاد عہدوں سے لازماً پیدا ہو جاتا ہے، جس سے وہ اپنی میعاد کے اختتام پر ان خلاف قانون افعال کے قطعی طور پر ذمہ دار ہو جاتے تھے جو اس دوران میں ان سے سرزد ہوئے ہوں اور ایک روک وہ بھی تھی جسے اہل جرمنی "رفاقت" کہتے ہیں اور جسے میں نے "دوگونگی" سے تعبیر کیا ہے یعنی عہدۂ قنصلی کی شرکت اس میں شک نہیں کہ یہ "دوگونگی" اسی مقصد سے رائج کی گئی تھی۔ پہلے یہ بات رومانیوں کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بلند ترین حاکم پر اس کے عہدے کی میعاد کے دوران

---

[۱] خطبۂ چہارم

میں کوئی خارجی نگرانی (حکومت کے اثر و اقتدار میں مداخلت کئے بغیر) عمل میں آسکتی ہے۔ جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جائے اس وقت اس سے جواب طلب کیا جا سکتا تھا اور اسے سخت سزا دی جا سکتی تھی لیکن اگر نظم و امن کو قائم رکھنا منظور تھا تو قنصل جبتک قنصل تھا، اس کے احکام کی اطاعت ہونا چاہئے تھی خواہ وہ حسب آئین دستور سلطنت ہوں یا نہوں، پس مطلق العنانانہ کارروائیوں کے روکنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ دو قنصل ہوں، جن میں سے ہر ایک کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ دوسرے کے احکام میں دخل دے سکے اور انھیں ساقط العمل کر سکے۔ منقسم حکومت کے خطرے اور خاصکر نازک وقت کے خطرے سے بھی چشم پوشی نہیں کی گئی تھی مگر یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ اس خطرے کو کافی طور پر اس طرح رفع کر دیا گیا تھا کہ ہر ایک قنصل کے لئے یہ اختیار محفوظ رکھا گیا تھا کہ وہ چھ ماہ کے لئے کسی کو حاکم مطلق نامزد کرے۔ لیکن چونکہ دونوں قنصل قدیم خاندانوں کے محدود طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے جمہوریت کی پہلی ڈیڑھ صدی کے اندر اس "دو عملی" سے جو روک پیدا ہوتی تھی اسے پلیبین بالطبع ناکافی سمجھتے تھے اور اس لئے پلیبیوں کو قنصلوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ٹریبیوں کا عہدہ قائم کیا گیا، اسے امتناع کا غیر محدود اختیار حاصل تھا مگر ایجابی حکم دینے کا حق اسے حاصل نہیں تھا۔

پھر (جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں) شاہی اختیار کے دوسرے اہم عناصر بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے نکال لئے گئے اور اسی طرح کے ثنائی یا جمعی جداگانہ انتظام کے تحت میں کر دئے گئے۔ اول مالیات کے انتظام اور موقت طور پر شہریوں کی فہرست پر نظرثانی کرنے اور ان کے مالی وسائل کے اعتبار سے انھیں فوجی و ملکی اغراض کے لئے مختلف طبقات میں ترتیب دینے کے لئے سینسر کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) سینسر کا یہ بھی کام تھا کہ سیناتیوں کی فہرست میں جو جگہیں خالی ہوں ان کو پر کرے اور فاحش بداخلاقی اور انتہائی عیش پرستی کی وجہ سے سیناتیوں اور نائبوں کے اعلیٰ مناصب سے لوگوں کو خارج کرنے کا اہم اختیار بھی اسے حاصل تھا۔ اس نازک فرض کے انجام دینے میں عہدۂ سینسر کی دوگونگی بلاشک و شبہ نہایت اہمیت رکھتی تھی کیونکہ ذاتی عناد و عداوت کے اثر کو اس طرح روک دیا گیا تھا کہ اس نشان تذلیل کے لئے دونوں سینسروں کا متفق ہونا ضروری تھا۔

مزید براں، جب ۳۶۷ ق م کے نازک برس میں قنصلی کا ایک عہدہ پلیبیوں کے لئے

محفوظ کر دیا گیا تو عدالتی فرائض، جہاں تک کہ دیوانی کے اختیارات کا تعلق تھا، اس واشدہ عہدے سے نکال لئے گئے اور یہ فرائض قنصلوں کے ایک رفیق کو سپرد کر دئے گئے، جو پہلے ایک ہی ہوتا تھا اور پریٹر کے قدیم نام سے نامزد ہوتا تھا۔ اس سے ڈیڑھ صدی بعد ایک دوسرے پریٹر کا اضافہ ہوا جس سے غیر ملکیوں یا اہلِ ملک اور غیر ملکیوں کے مقدمات کا تصفیہ متعلق تھا، پھر جب رومانی تسلط اطالیہ کے باہر تک وسیع ہوا تو بتدریج چار اور پریٹر بڑھائے گئے اور کل تعداد چھ تک پہنچ گئی۔ اولاً یہ اضافہ روما کے چار ماورائے بحر صوبوں کے لئے ہوا تھا مگر آخر میں فوجداری کے مقدمات کے لئے خاص مستقل عدالتوں کے قائم ہو جانے سے یہ چھوں پریٹر بلکہ سولا کے بعد آٹھوں پریٹر عدالتی فرائض میں لگ گئے۔ اس طرح صوبے قطعی طور پر نائب قنصل اور نائب پریٹر کے حوالہ کر دئے گئے، (لفظی ترجمہ ان کا قائم مقام حاکم تھا) مگر یہ لوگ حسب معمول قنصل و پریٹر تھے اور ان کا "اقتدار" (Imperium) (یعنی غیر شہری اور زیر خدمت سپاہیوں پر ان کا اختیار) ان کے عہدے کے سال کے ختم ہو جانے کے بعد ایک برس تک اور بڑھا دیا جاتا تھا۔ جس طرح صوبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اسی طرح ان قائم مقاموں سے کام لینے کا دستور بھی بتدریج باضابطہ وسیع ہوتا گیا، پریٹر صرف پہلے چار صوبوں کے لئے مقرر ہوئے تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس اثنا میں ٹریبیوں کا عہدہ بھی قائم ہو چکا تھا اور اس طرح جمہوریت کے شباب کے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قدیم شاہی اختیار، (جس نے شہنشاہی وتمدن کی ترقی کے ساتھ وسعت اور نشو و نما حاصل کر لی تھی) ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف حکام کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہونے لگا تھا، اور جہاں تک اہلِ ملک کے دیوانی اختیار سے تعلق تھا، اس میں "ہم عملی" کا طریق جاری تھا، مگر غیر اہل ملک اور زیر خدمت سپاہیوں پر "اقتدار اعلیٰ" (Imperium) کا نفاذ نائب قنصل اور نائب پریٹر تنہا عمل میں لاتے تھے۔

اس سلسلۂ بیان میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ عاملانہ اختیار کے اس طرح پارہ پارہ کرنے سے مجلس سینات کا عملی اختیار بالطبع بڑھتا جاتا تھا، کیونکہ سینات ہی سے وہ اتحاد عمل حاصل ہوتا تھا جس کی ضرورت ہر ایک موثر حکومت کو اپنے نظم و نسق میں ہوتی ہے۔ یہ ویسا ہی اتحاد عمل تھا جو انگلستان میں کابینہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے

عاملانہ محکموں کے سردفتروں پر کابینہ کا اقتدار بھی سینات کے اقتدار کی طرح یوں ہی ترقی کرتا گیا کہ عملی ضروریات کو پورا کرنا تھا اور نہ باضابطہ آئینی طور پر کابینہ کو کوئی اختیار اس قسم کا نہیں دیا گیا ہے۔ اگر وقت اس کی اجازت دیتا تو مجلس سینات کی تدریجی نشوونما پر بحث کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوتا کہ کیوں کر وہ ایک ایسی مجلس سے جس کے فرائض خالصتہً مشورتی تھے، اور قدیم بادشاہ اور ان کے بعد ابتدائی قنصل رسماً و رواجاً اس سے صلاح لیا کرتے تھے، وہ ترقی کر کے عام نظم ونسق کی عملاً سب سے اعلیٰ کارکن جماعت بن گئی اور قانون سازی پر بھی اس کا اثر حاوی ہو گیا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں انقلابی دور کے شروع ہونے تک یہی حالت رہی۔ یہاں میں صرف اس قدر کہوں گا کہ شہنشاہی کو جس قدر وسعت اور تہذیب وتمدن میں جسقدر ترقی ہوتی گئی اسی قدر مجلس سینات کا اختیار بالطبع بڑھتا گیا کیونکہ کام کی مقدار اور اس کے تنوع کے بڑھنے سے ضرورت تھی کہ ایام قدیم کی بہ نسبت محکموں کی زیادہ باقاعدہ تقسیم وتعیین کی جائے۔ پس مجلس سینات ہی مختلف صوبوں کو حکام ونائب حکام کے درمیان تقسیم کرتی تھی اور ہر ایک کے لئے فوج، روپیہ اور عملے کے سامان کا تعین کرتی تھی، اور اس طرح انجام کار سرکاری مالیات کا تمام اعلیٰ انتظام، ترقی پذیر شہنشاہی کی جملہ حکومت غیر ملکی معاملات کا کل انتظام وانصرام، یہ سب عملاً مجلس سینات ہی کے ہاتھ میں آگیا۔ چونکہ یہ مجلس مادام الحیات رکنیت کے اصول پر زیادہ تر سابق عہدہ داروں سے مرکب تھی اس لئے حکمت عملی کی یکسانی کے قیام اور سیاسی تجربات کے نتائج کے استحفاظ وانتقال کے لئے اس کی یہ ترتیب وترکیب نہایت ہی خوب واقع ہوئی تھی، ورنہ حکام کے سالانہ انتخاب کے طریقے میں ان امور کا برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا۔

۳۔ اب ہمیں اس ارتقائی کیفیت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ ایک شہنشاہانہ دولت عام نے ایسی شہنشاہی کی صورت اختیار کی جس پر شاہی طرز سے حکمرانی ہوتی تھی۔ میں یہ پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ اس تبدیلی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ حکومت کی جو شکل ایک شہری سلطنت کے لئے موزوں تھی وہ شہنشاہی حکومت کے کام کے لئے مکتفی نہیں تھی۔ اس عدم اکتفا کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک (۱) رومانی سلطنت کے شہریوں کے اعتبار سے اور دوسرے (۲) اس کے حلفا اور رعایا کے اعتبار سے۔

جہاں تک شہریوں کا تعلق تھا، یہ انتظام ناکافی ثابت ہوا کیونکہ شہری سلطنت

کے حدود کچھ تو توسیع کی کارروائی سے اور کچھ اپنے ہمسایوں کو گو نہ جبری طور پر جذب کر لینے سے (جس کا بیان سابق کے خطبہ میں ہو چکا ہے) اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ان کا سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نقطۂ نظر سے یعنی روما کو اس کے فاتحانہ و شہنشاہانہ کام کے لئے مادی حیثیت سے کافی مضبوط کرنے کے لئے، یہ وسعت حدود ضروری تھی۔ اگر رومانی سلطنت خود کو انھیں حدود کے اندر محدود رکھتی جنھیں یونانی ارباب فکر موزوں خیال کرتے تھے۔ [اور ایک شہری سلطنت جس کا اعلیٰ اختیار باضابطہ طور پر شہریوں کی اس جمعیت کو تفویض ہو جس کا اجلاس فورم میں ہوتا ہو اس کے سیاسی ادارات کو قابل اطمینان طور پر چلانے کے لئے ایسے ہی حدود مناسب بھی تھے] تو اس صورت میں اہل روما فرداً فرداً کیسے ہی جری و شجیع کیوں نہ ہوتے مگر محض قلت تعداد کی وجہ سے ان کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا کہ وہ شہنشاہی پر قابض ہو کر اسے اپنے قابو میں رکھ سکتے تاہم، روما سے جس کام کو تکمیل کو پہنچانے کی توقع کی گئی تھی اس کے لحاظ سے یہ وسعت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہیں تھی مگر اس سے یہ لازم آگیا تھا کہ اتنی وسعت یافتہ قوم کے لئے حکومت کی یہ صورت ناموزوں ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی جب گراکھوس نے (۱۳۳ ق م میں) انقلابی صدی کا آغاز کیا تو (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) سلطنت دوسرے نقطۂ نظر سے ضرورت سے زیادہ محدود تھی کیونکہ جب لاطینی تہذیب و تمدن تمام جزیرے میں پھیل گیا اور اطالوی حلفا ہنوز غیر ملکی رہے تو پھر اطالیہ کے اندر رومانی شہریوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان یہ سیاسی فرق زمانۂ سابق کی ایک ایسی یادگار رہ گیا جسکے قائم رکھنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں تھی، آخری امر یہ ہے کہ اطالیہ سے باہر جہاں تک روما کے صوبجاتی رعایا کا تعلق ہے حکومت ناکافی تھی اور یہ نتیجہ تھا اس ناکمل نگرانی کا جو مرکزی حکومت ان "قائم مقاموں" پر قائم رکھتی تھی جو اپنے اپنے صوبوں میں شاہانہ اختیار استعمال کرتے تھے اور اپنے اختیارات کو اپنے ذاتی نفع کے لئے اکثر نہایت بے باکانہ طور پر کام میں لاتے تھے۔

بعد ازاں، (جیسا کہ میں آخری خطبے میں تشریح کر چکا ہوں) شہنشاہی کے زیر اثر مرکزی حکومت کی خوبی کار اپنے اعیانی و عمومی دونوں اعتبارات سے یکساں طور پر برابر گھٹتی گئی، صوبوں کی لوٹ کی وجہ سے حکمران طبقہ امرا کی تخریب کے ساتھ ہی ساتھ جمعیت عمومی بھی اس لوٹ میں حصہ لینے کی وجہ سے ابتذال میں مبتلا ہو گئی، اور اس

آخری نتیجے میں اس وجہ سے اور بھی زیادتی ہوگئی کہ شہریت ان حدود سے زیادہ وسیع کردی گئی جن حدود کے اندر یہ ملکی جذبے کے ساتھ ایک پرزور قوم اور روما کی جمعیت میں شہریوں کی قابل لحاظ نیابت قائم رہ سکتی تھی، اور حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ایک نقص کے رفع کرنے سے دوسرے نقص میں اور زیادتی ہوجاتی۔

مختصر یہ کہ جب روما نے اپنی محیط الاطراف مملکت اور اس سے خارج، منورالاعتراف شہریت والی نوآبادیوں کے وسیع جال کے اندر، چار لاکھ شہری سپاہیوں کو اپنے دامن میں لے لیا تو پھر یہ شہری سلطنت اپنی حدِ غایت کو پہنچ گئی، مگر جب آخرالامر رومانیوں اور ان کے اطالوی حلیفوں کے درمیان سیاسی عدم مساوات فی الجملہ رفع کردی گئی اور موخرالذکر شہریت کے حلقے میں بزور داخل ہوگئے اور رومانی سلطنت جزیرہ نما میں برابر پھیلتی گئی، یعنی پہلے دریائے پوتک اور بعدازاں کوہستانِ آلپس تک پہنچ گئی تو پھر دارالصدر کے ازدحامِ عوام کا یہ ادعا کہ وہ اس سلطنت کی نیابت کرتے تھے جواب عملاً ایک ملکی سلطنت ہوگئی تھی، صریحاً ناممکن معلوم ہونے لگا، اور ازدحامِ عوام کی حالت خود بھی اور ابتر ہوگئی۔

مزید براں، اس کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی ایک مہتم بالشان تغیر واقع ہوگیا، جائداد کے بعض شرائط کے ساتھ شہریوں پر جو فوجی فرض عائد تھا اس کا قدیم خیال دوسری صدی کے آخر تک قوت کے ساتھ قائم تھا، شہریوں کی فوج محافظ خود کو یہ سمجھتی تھی کہ وہ رومانی مسلح قوم ہے، ملکی جذبے کے جس رشتے سے فوج کے ارکان ایک دوسرے سے وابستہ تھے وہ ایک حقیقی و مضبوط جذبہ تھا، اور ان کے اجتماعی جذبہ و احساس میں، روما کی آئینی سلطنت سے تعلق رکھنے کا خیال کسی خاص سپہ سالار کی فوج میں ہونے کے خیال سے زیادہ قوی تھا، مگر میریس کے بعد پہلی صدی قبل مسیح میں کچھ کا کچھ ہوگیا۔ حق شہریت کی وسعت سے ملکی جذبہ کم ہوتا گیا، فوج کے وسعت پذیر حصے، یعنی سوار، ہلکے ہتھیار رکھنے والے اور گوپھنوں والے سپاہیوں میں غیر شہری داخل ہوتے گئے۔ پیدل سپاہ تک کے لئے جائداد کی قدیم شرط ترک کردی گئی اور فوج کی ترکیب بلا امتیاز، تمام شہریوں کی رضامندانہ بھرتی سے ہونے لگی، روز بروز اس میں آبادی کا نسبتاً زیادہ غیر مستقل حصہ داخل ہوتا گیا، اور غنیمت کی توقع اور آخر میں زمین کا عطیہ ان کے لئے تحریص کا باعث ہوگیا اور اس کے لئے ان کی نظر اپنے سپہ سالار کی طرف بڑھنے لگی۔ پس اس طرح وہ رشتہ جس سے فوج اپنے سپہ سالار کے ساتھ

وابستہ ہوتی تھی ملکی فرض کے جذبے کی بہ نسبت زیادہ مستحکم ہوتا گیا، اور فوج عسکری مطلق العنانی کے لئے ایک موزوں و مناسب آلہ بن گئی۔

تقلیب کے اسباب میں غالباً یہ سبب سب سے زیادہ قطعی عنصر ہے۔ سولاؔ سے یہ ہو سکتا تھا کہ وہ قدیم اعیانی طریقے کو دوبارہ قائم کردے، اور سینات کو سابق کی بہ نسبت باضابطہ طور پر زیادہ اختیار دے دئے، مگر یہ اس سے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ فوجوں کے سرداران پر شہر (روما) کی حکومت کی فوقیت بحال کردے۔

جب میریس و سولاؔ، پومپیؔ اور سیزر کی مثالوں سے فوجی سرداروں کا یہ لابدی غلبہ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا تو پھر نظم و ترتیب اور شہنشاہی کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نظر آتی تھی کہ فوجوں کی امارت مستقلاً ایک ہی شخص واحد کے ہاتھ میں جمع کردی جائے، لیکن شہنشاہی کے پہلے دور میں کسی کو علانیہ بادشاہ بنا کر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ جن اختیارات کو جمہوریہ کے پرو کانسل قائم مقام کانسل ہمیشہ صوبوں میں استعمال کرتے تھے، انھیں ایک ہی شخص کے ہاتھ میں مجتمع کردیا اور منتقل بنا دیا گیا۔ اس کے بجائے متعدد پرو کانسل قائم مقام کانسل اور پروپریٹر (قائم مقام پریٹر) یکے بعد دیگرے مقرر ہوتے رہتے اور عملی طور پر ان کے اختیارات اپنے اپنے صوبوں میں تقریباً خود مختارانہ حد کو پہنچے ہوتے اور انھیں بظاہر صرف اتنا ہی خوف ہوتا کہ مبادا ان کی واپسی کے بعد ان پر مقدمہ چلایا جائے، اور اس کے بعد وہ پھر نئی حرص و ہوس کے ساتھ تھوڑے زمانے کے لئے صوبوں کو لوٹنے کے لئے پہنچ جایا کریں، یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ ان سب کے بجائے ایک اعلیٰ پرو کانسل مقرر ہو جائے جس کے اختیارات تمام صوبوں اور تمام فوجوں پر وسیع ہوں۔ اس میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ باوجود ان تمام دشواریوں کے جو شہنشاہی کے مشتبہ انتخاب سے پیدا ہوتی تھی اس تغیر سے ابتدائی شہنشاہی کے دور میں صوبوں کو بہت نفع پہنچا، شام، مصر، ہسپانیہ، گال، افریقہ ان سب کے لئے ابتدائی شہنشاہی صریحی و نمایاں بہبود کا زمانہ تھی۔

پس ابتدائی شہنشاہی اقتدار کا اولین عنصر اس پر مشتمل تھا کہ قائم مقام قنصل کے اختیارات ایک جگہ مجتمع و منتقل ہو جائیں شہنشاہ، رومانی شہریوں کا بادشاہ نہیں بلکہ رومانی شہریوں کے تمیس لشکروں کا امیر تھا اور یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس قسم کا تغیر روما کے آئینی جذبے کے لئے اس سے بہت کم باعث آزردگی تھا کہ آگسٹس دائمی قنصل (جیسا کہ اس کا

پہلے ارادہ تھا یا حاکم مطلق بن جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ قائم مقام قنفصل کا اختیار صرف اہل صوبہ وزیر خدمت سپاہیوں پر نافذ ہوتا تھا، اور اس اختیار کے نسبت ہمیشہ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ شہر روما کے حکام کے اختیار کے بہ نسبت بہت زیادہ غیر معین و دیرپا ہے۔ اس تقلیب کو اور بھی زیادہ نرم کرنے کے لئے آگسٹس نے یہاں تک فکر کی کہ جن صوبوں کا انتظام سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد کے بغیر ہو سکتا تھا انھیں سیناتی صوبے قرار دیدیا تاکہ ان پر نائب قنفصل اور نائب پریٹر اسی طرح حکمرانی کرتے رہیں جیسے جمہوری زمانے میں کرتے تھے۔ البتہ اس کے وسعت دادہ امپریم (اقتدار اعلیٰ) (Imperium) میں غیر ملکی معاملات، صلح، جنگ و معاہدات وغیرہ پر غیر محدود نگرانی شامل تھی اور آئینی طور پر یہ امور زمانۂ قدیم سے جمعیت تعلق رکھتے تھے تاہم خانگی معاملات میں شہنشاہی کی پہلی صدی میں اطالیہ اور صوبوں کے درمیان عام طور پر فرق قائم رکھا گیا تھا[1] روما پر بظاہر اب بھی سینات، قنفصل اور پریٹر کی حکومت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹس کے تحت میں ان عہدوں کے انتخابات کسی حد تک واقعی آزادانہ طور پر عمل میں آتے تھے، رومانی شہریوں سے متعلق شہنشاہ معمولاً جو اختیار استعمال کرتا تھا وہ زیادہ تر ٹربیون کے اختیارات تھے۔ اس کے سوا آگسٹس میں اور اوصاف بھی تھے۔ جب ضرورت ہوتی تھی وہ احتسابی اختیار سے بھی کام لیتا تھا، مذہبًا وہ مستقل طور سے سب سے بڑا امام تھا اور قنفصلی عہدے کی شان بڑھانے کے لئے کبھی کبھی قنفصل بھی ہو جایا کرتا تھا، مگر وہ خود کو رومانی قوم کے سامنے سب سے اول و اقدم اس حیثیت سے پیش کرتا تھا کہ اسے سال بسال ٹربیون کے اختیارات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ٹربیون کے نام کے ساتھ عامۃ الناس کا شغف و تعلق، اس عہدے کی خاص تحریم و تقدس اور کم از کم امتناعی حیثیت میں اس کے اختیارات کارروائیاً غیر محدود ہونا، یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے آگسٹس نے تقلیب کی ضرورت کے لئے اس عہدے کو منتخب کیا۔

مگر ان سب امور سے بالا و برتر، شہنشاہ کو صراحتاً یہ غیر معمولی اختیار حاصل تھا کہ سلطنت کی عزت و بہبود کے لئے وہ جو کارروائی مناسب سمجھے اسے

---

[1] ۔ میں اطالیہ اور صوبوں میں فرق کے لئے عام طور کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ بعض ہور دعنایت صوبجاتی شہروں کو رومانی شہریت کے خاص امتیازات حاصل تھے جیسا کہ انجیل کی کتاب "اعمال" سے معلوم ہوتا ہے۔

عمل میں لائے اور اس میں شک نہیں کہ اول ہی سے اس کی مرضی ناقابل مقاومت معلوم ہوتی تھی۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ نیم جمہوری ادارات کے زینے توڑ دیے گئے اور غیر محدود الاختیار بادشاہ کے سامنے سے پردہ اٹھ گیا اور وہ تمام اعلیٰ تشریعی، عاملی و عدالتی اختیار میں رومانی قوم کے جائز جانشین کے طور پر جلوہ نما ہو گیا۔ اس کے بعد جب تیسری صدی مسیحی کے آغاز میں کاراکالا کے تحت میں رومانی شہریت کے حقوق روما کی تمام رعایا کو عطا کر دیے گئے تو اطالیہ اور صوبوں کے فرق امتیازی کے یہ آخری آثار بھی محو ہو گئے اور قدیم شہری سلطنت آخر الامر شہنشاہی کے اندر فنا ہو گئی۔

خطبۂ دوازدہم

حکومت کے فرائض اور یونان و روما میں حکومت سے قانون کا تعلق

۱۔ اب میں یونانی و رومانی نظم حکومت پر ایک دوسرے ہی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں اس وقت حکومت کی شکل اور خاص کر اس کے اس حصے کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا جس میں اعلیٰ اقتدار مرکوز ہوتا ہے اور جس کے متعلق عام ترتیب و تقسیم یعنی عددیت و عمومیت وغیرہ کے تحت میں بحث کی جاتی ہے، بلکہ اس وقت میں حکومت کے فرائض اور خاص کر قانون کے ساتھ اس کے تعلق پر غور کرنا چاہتا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یونانی رومانی نظم سلطنت کے اندر فرائض حکومت کا جو عام تصور قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق ایک خیال وسعت کے ساتھ شائع ہے اور اس میں صداقت بھی بہت کچھ موجود ہے مگر جیسا کہ بارہا بیان ہوچکا ہے یہ خیال یکطرفہ و گمراہ کن ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ "جدید دستوری حکومتوں کے برعکس "قدیم مختار مطلق حکومتیں" "سلطنت کے حقوق کے مقابلے میں انفرادی حقوق کو جانتی ہی نہ تھیں" اور نیز یہ کہ افراد کو قطعی طور پر سلطنت کے تابع رکھنے کے بارے میں یونان کروما سے ایک ذرہ برابر بھی کم نہ تھا"[۱] یہ ملحوظ رہے کہ اس قسم کے مقابلے میں ہم "جدید دستوری سلطنت" سے محض وہی سلطنت

۱۔ مسٹر وڈرو ولسن کی کتاب "مملکت" صفحہ ۶۱۴ اور بلنچلی کی کتاب "نظریۂ مملکت" کتاب اول باب ششم دیکھنا چاہیے۔

مراد نہ لیں جس میں حکومت کی ہئیت کسی ایسے سیاسی دستور کے ذریعے سے معین کر دی گئی ہو جسکے بموجب حکومت کے اندر قوم کو براہِ راست اپنے نمائندوں کے ذریعے سے دخل دینے کا موقع دیا گیا ہو، بلکہ ہمارا مقصود اس حکومت سے ہوگا جس میں حکومت کا اختیار انفراداً اہل ملک کے بعض اساسی حقوق سے محدود کر دیا گیا ہو (مثلاً آزادی مطابع، آزادی جلسہ، آزادی اعمال مذہبی وغیرہ وغیرہ) اگرچہ انگریزی دستور سلطنت کے اندر جس میں بادشاہ، امرا و عوام (پارلیمنٹ) کے اختیار کی کوئی معین حد تسلیم نہیں کی گئی ہے، یہ حقوق صریحاً مسلم نہیں ہیں مگر ممالک متحدہ امریکہ اور مغربی یورپ کے دستوروں میں یہ حقوق صریحاً تسلیم کر لئے گئے ہیں۔

لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ افرادِ قوم کی زندگی کی تہذیب و ترتیب کی نسبت قوم کے اختیار پر اس قسم کی کوئی قطعی حد بندی قائم کرنا، یونان و روما دونوں جگہ کی سلطنتوں کی تخیل سے قطعاً منافی تھی[۱]۔ یہ نہیں ہے کہ افلاطون یا ارسطو سلطنت کی کوئی غایت افراد کے بہبود سے بالاتر قرار دیتے تھے، لیکن وہ حکومت کی نسبت یہ خیال نہیں رکھتے تھے کہ محکوم کے بہبود کی ترقی دینے میں افراد کے اساسی حقوق کی وجہ سے جائز طور پر اس کی کوئی ایسی حد تھی جس میں دخل نہ دینے پر وہ مجبور ہو، اور فلسفیوں خاصکر افلاطون کے خیال میں تو افراد کی خانگی زندگی میں بہت ہی وسیع و تفصیلی مداخلت مناسب سمجھی جاتی تھی۔

لیکن جب ہم نظریئے سے گزر کر واقعات کی طرف پلٹتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ یونانی یا رومانی حکومتوں نے واقعاً کیا کیا، تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسپارٹا سے باہر فرائض حکومت کے قدیم و جدید تصور کے درمیان عملی فرق بہت ہی کم تھا، یہ یقینی ہے کہ اسپارٹا کے شہریوں کے ضوابطِ زندگی جدید کیفیت و حالت سے نہایت ہی نمایاں طور پر مختلف تھے اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) فی الحقیقت اسپارٹا ہی وہ نقطۂ اتصال ہے جو فلسفیوں کو اپنے تصور کی ہئیت ظاہری قائم کرنے کے لئے عالم واقعات میں ہاتھ آتا ہے۔ (مثلاً) ہمیں یہ معلوم ہے کہ اسپارٹا میں اگر کوئی شخص تاخیر سے عقد کرتا، یا خراب طرح پر عقد کرتا یا تجرد کی زندگی بسر کرتا تو

---

[۱] ۔ اگرچہ بہ حیثیت انسان، انسان کے حقوق طبعی کا تصور، جن پر یہ تحدیدات مبنی ہیں، کسی حد تک اس کی غایت یونانیوں کے اس فلسفہ پر مبنی تھی جو انھوں نے رومانی قانون کے متعلق قائم کیا تھا، چنانچہ آگے چل کر اس کا حال معلوم ہوگا۔

ان سب باتوں کے لئے اس پر مقدمہ قائم کیا جا سکتا تھا اور افلاطون نے (اپنی کتاب قوانین) میں یہ تجویز کی ہے کہ اگر کوئی شخص پینتیس برس کی عمر کے بعد بھی شادی نہ کرے تو اس پر جرمانہ ہو سکتا اور اسے اور بھی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ مگر ازمنۂ تاریخی کے یونان میں اسپارٹا کی حالت سب سے علیحدہ سی ہے۔ اگر ہم ایتھنز کو لیں تو اس کا اثر دل پر کچھ اور ہی پڑتا ہے اور ہم اس بارے میں افلاطون کی دلیل پہلے درج کر چکے ہیں کہ عمومیت عمدہ حکومتوں میں بدترین اور خراب حکومتوں میں بہترین حکومت ہے مطلب یہ ہے کہ اس میں حکمرانی بہت کم ہوتی ہے۔ یہ امر بالتخصیص اسپارٹا کے برعکس تھا۔[1]

زیادہ قریب سے دیکھنے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو قدیم و جدید سلطنتوں میں دو عام فرق ہیں جن کی وجہ سے سلطنت کو دو طریقوں پر زیادہ مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ (۱) (قدیم سلطنت میں) مذہب و سلطنت کے فرق کا پتا نہیں تھا، اس لئے بالطبع یہ خیال ہوتا ہے کہ مذہبی رسوم کا اجرا و انضباط عام حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ ارسطو پجاریوں اور دوسرے مذہبی کارکنوں کو لازماً سلطنت کے عہدہ داروں میں شامل کرتا ہے اس سے از خود یہ بات پیدا ہوئی کہ "عدم احترام مذہبی" ایک ایسا معاملہ تھا جس کے لئے عام جرم کے طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔[2] (۲) جنگ کا زور، اور اس لئے شہریوں کے جنگی فرائض کا (خاص کر صنعت و حرفت کے مقابلے میں) غلبہ، اس کی رفتار زیادہ تر تمدن کے پست تر درجہ پر تھی جس میں جنگ کی ناکامیابی کی وجہ سے بہت زیادہ مصائب کا پیش آنا ممکن تھا۔ بایں ہمہ، یونانی سلطنتوں کا انگلستان یا ممالک متحدہ امریکہ سے مقابلہ کرتے وقت اگرچہ یہ فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے لیکن مغربی یورپ کی براعظمی سلطنتوں کے مقابلے میں یہ فرق بہت زیادہ قوی نہیں ہے خاص کر جبکہ چوتھی صدی میں اجیر سپاہیوں سے کام لینے کی وجہ سے عام شہریوں کے دلوں سے لڑنے کا خوف اٹھ گیا تھا۔

---

[1] خطبہ ہفتم

[2] سقراط کا مقدمہ اسی نوع کا ہے تاہم، ارسطو فانیس یہ ظاہر کیا ہے کہ احترام کا فرض مذہبی کسی سختی کے ساتھ ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

مذہب و جنگ کو علیحدہ کرکے، اگر ہم اہل ملک کی پر امن دنیاوی زندگی میں قومیت و وقعت کی طمانیت کے لحاظ سے، اور جائداد، معاہدہ و وراثت کے معاملات میں، حکومت کی مداخلت پر غور کریں تو کوئی ایسا اصولی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ جب ہم ایتھنز کے سرکاری و شخصی کاموں کی فہرست یا وہاں کے عہدہ داروں کی فہرست پر نظر کرتے ہیں یا ان عہدوں کو دیکھتے ہیں جنھیں ارسطو نے حسب معمول قرار دیا ہے تو ہمیں کسی حد سے بڑھے ہوئے قدغن کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ ہم بازاروں کے نگران (یعنی محتسب) کا ذکر سنتے ہیں جس کا کام دغا و فریب اور بدنظمی کو روکنا تھا، اس میں شہر کے کمشنر (مامور) کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جس کا یہ کام تھا کہ سرکاری سڑک کو لوگوں کے ذاتی مکانوں میں دب جانے سے بچائے رکھے لیکن دغا و فریب بدنظمی اور سرکاری سڑکوں کے دبا لینے کی روک تھام یہ ایسے معاملات ہیں جو نہایت ہی سخت انفرادی نظم کے اندر بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ دخل دہی کے انواع و اقسام میں ایتھنز میں صرف ایک اہم صورت ایسی تھی جسے زمانۂ جدید کے انفرادی خیالات سے نمایاں طور پر مختلف قرار دے سکتے ہیں، وہ صورت یہ تھی کہ مصنوعی طور پر سامان زیست کے وافر حصول کے لئے نہایت مشرح و شدید ضوابط مقرر کئے گئے تھے۔ غلے کی درآمد ممنوع قرار دیگئی تھی، ایتھنز کے سوا کسی اور بندرگاہ کی طرف غلہ بھیجنا ایک ایسا جرم تھا جسکی سزا موت تھی ایتھنز کے بندرگاہ پرائیوس میں جو غلہ غیر ملکی جہازوں پر آتا تھا اس کا دو ثلث ایتھنز میں فروخت کرنا ضروری تھا، بازار میں غلے کی خریداری یا اس کی قیمت بڑھانے کے متعلق سازش کرنے کی سزا موت تھی، وہاں "ناظران غلہ" درآمد غلہ کی یادداشت تشریحی مرتب رکھتے اور یہ دیکھ بھال کرتے رہتے تھے کہ اجناس مناسب قیمت پر فروخت ہوں، چکی والے جو کے آٹے کی قیمت ایسی لیں کہ وہ جو کی قیمت سے مناسبت رکھتی ہو اور نان بائی روٹی کے دام گیہوں کی قیمت سے مناسب رکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ضابطہ اتنا سخت و شدید تھا کہ جدید یورپ میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی تاہم آدم اسمتھ کا اثر پڑنے کے قبل تک، جدید یورپ کا اقتصادی خیال بھی اسی طریقے کے عام انداز کی کلی تائید میں تھا۔

بہرحال جہاں تک عام شہری زندگی (معاشرت) اور معاملات کا تعلق ہے، ان کے متعلق، جن حکومتوں کو زمانۂ قدیم کی "مختار مطلق" حکومت کہتے ہیں، ان کے اور زمانۂ جدید کی حکومتوں کے عملدرآمد میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ہے۔

۲۔ لیکن جب ہم قدیم و جدید خیالات کے مطابق حکومت کے ساتھ قانون کے عام

تعلق پر بحث کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس مقابلے کا نتیجہ کچھ اور ہی برآمد ہوتا ہے حکومت کے لئے قانون سازی کا جدید خیال، قدیم خیال کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے، تہذیب کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس تعلق کا عام خیال بھی مختلف مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ ارتقا کے مدارج سابقہ کے مقابلے میں مدارج مابعد میں یہ تعلق مختلف اور زیادہ قریبی نظر آتا ہے حکومتی فرائض کے متعلق اپنے اس زمانے کے خیال کے مطابق ہم عام طور پر (۱) تشریعی (۲)، عاملانہ[ع۱] اور (۳) عدالتی فرائض کے امتیازات قائم کرتے ہیں اور جس حصے[ع۲] سے مقصد اول پورا ہوتا ہے اسے بالطبع اعلیٰ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس حصے سے ان قواعد کا تعین وتشخص ہوتا ہے جن پر حکام عدالت کاربند ہوتے اور حکام عاملانہ انھیں نافذ کرتے ہیں اور طبعاً یہ حصہ ہمیشہ مشغول بکار رہتا ہے، بیشک ہم یہ فرض نہیں کرتے کہ کوئی خاص مجلس وضع قوانین جسقدر تغیرات عمل میں لائے گی وہ ان تغیرات کے مقابلے میں جو پہلے سے چلے آرہے ہیں کوئی بڑی نسبت رکھتے ہوں گے مگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ از روئے آئین اس مجلس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قدیم قوانین کے جس حصے کو چاہے بدل دے، یہ حق خواہ معمولی مجلس وضع قوانین کو حاصل ہو یا جماعت مرتب نظام سلطنت کو ہو[ع۳] اور نیز یہ کہ معمولی مجلس وضع قوانین جسے گاہ بگاہ جماعت مرتب دستور، نظام سلطنت سے امداد ملتی رہتی ہو، اس کا عام فرض یہ ہے کہ حالات ظاہری کے تغیر یا خیالات واحساسات کے تبدل سے نظم معاشرت کی ترقی جن تغیرات کی متقاضی ہو انھیں برابر جاری کرتی رہے۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ جو قانون غیر مبدل رہتا ہے اس کی نسبت مناسب طور پر یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ اس کا قیام اس وجہ سے ہے کہ مجلس وضع قوانین یا جماعت دستور ساز جسے اسکے بدلنے کا اختیار ہے وہ اس میں تبدیلی نہیں کرنا چاہتی،

ع۱ - میں یہاں پر ان فرائض حکومت کے داخلی فرائض کی نظر سے بحث کرتا ہوں غیر ملکی معاملات کے لئے "عاملانہ" کا لفظ ایک ناقص لفظ ہے، غیر ملکی معاملات میں بہت کم معاملات عام قواعد کے تحت میں منضبط ہو سکتے ہیں۔

ع۲ - اس فرق کو بالعموم جدید سلطنتوں میں ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کچھ اساسی قواعد یا اصول ایسے ہوتے ہیں جو سیاسی دستور سلطنت کے جزو ہوتے ہیں اور کچھ عام قواعد ہوتے ہیں۔ انگریزوں کو اس پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا دستور سب سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جس میں یہ فرق باضابطہ طور پر داخل نہیں کیا گیا ہے

اور اس طرح ہم آسٹن کے تصور تک پہنچ جاتے ہیں کہ قانون ایجابی، ان احکام و قواعد کے مرادف ہے جو کسی فرد واحد، کسی جماعت یا کسی مجموعۂ جماعات نے صادر کئے ہوں اور آخر میں وہ سب پر حاوی ہو گیا ہو، پس اس طرح قانون و حکومت کے اساسی تخیلات میں باہم عمیق و ناممکن التفریق تعلق موجود ہے۔

مگر قانون اور مقتدر اعلیٰ یا حکومت اعلیٰ کے عمیق تعلق کا یہ خیال ارتقا کے زیادہ قدیم مدارج پر عائد نہیں ہوتا ہے، مین کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ امر اچھی طرح واضح و روشن ہے کتاب "قانون قدیم" باب اول و دوم سے ارتقائے قانون کی بحث میں اس کے برعکس مفہوم پیدا ہوتا ہے اور "ادارات کی تاریخ قدیم" کے باب دوازدہم و سیزدہم میں آسٹن پر تنقید کرتے ہوئے زیادہ صاف الفاظ میں اس کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ مین نے یہ دکھایا ہے کہ آریہ نسل کی ابتدائی حالت میں "وہ جماعت کار کن جو ابتدائی گروہوں میں بمنزلہ ہماری مجلس وضع قوانین کے ہوتی تھی، وہ دیہی تھی، کبھی تو یہ جماعت گاؤں میں بسنے والے تمام لوگوں کو جواب دہ ہوتی تھی اور کبھی کسی موروثی سردار کا اقتدار و اثر اس پر حاوی ہو جاتا تھا مگر کلیتہً ناپید کبھی نہیں ہوتی تھی"[عہ] لیکن جیسا کہ اس نے تشریح کی ہے، جب ہم گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دیہی مجلسیں حقیقت میں قانون ساز نہیں ہوتی تھیں "مجلس دیہی کو انواع و اقسام کے جو اختیارات سپرد کر دئے جاتے تھے، وہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتے تھے اور نہ صاف طور پر یہ عیاں ہوتا تھا کہ قانون بنانے، قانون کے اعلان کرنے اور قانون کے خلاف ارتکاب جرم کرنے والے کو سزا دینے میں کیا بین فرق ہیں، اگر اس جماعت کے اختیارات کو جدید اصطلاحات میں ظاہر کرنا ضروری ہو تو جو اختیار سب سے زیادہ پس پشت نظر آئے گا وہ تشریعی اختیار ہو گا اور جو سب سے زیادہ نمایاں ہو گا وہ عدالتی اختیار ہو گا۔ جن قوانین کی اطاعت ہوتی تھی ان کی نسبت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ سے قائم ہیں، اور جو رواج واقعی نئے ہوتے تھے ان کو واقعی پرانے رواج کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا تھا، پس دیہی جماعتیں جب تک کہ وہ قدیم اثر کے تحت میں رہتی تھیں، اصلی قانون سازی کے اختیار کا استعمال نہیں کرتی تھیں"[عہ]، اور یہ آخری بیان ان وسیع تر جماعتوں

عہ۔ "ادارات کی تاریخ قدیم" صفحہ ۳۸۸۔

عہ۔ "ادارات کی تاریخ قدیم" صفحہ ۳۸۸-۸۹

کی نسبت بھی صحیح ہے جو حقیقی یا فرضی قرابتداروں کے جدا جدا آباد کاریوں میں زیادہ قریبی ارتباط پیدا کر کے قائم کی جاتی تھیں، جیسا کہ یونان کی شہری سلطنتوں کے آغاز تاریخ میں نظر آتا ہے۔ وہ عام قواعد جو اہل قبائل کے معاشرتی عادات و اطوار پر حکمراں ہوتے تھے وہ کسی حکمراں فرد یا جماعت کے عام احکام نہیں ہوتے تھے، بلکہ قدیم ترین وقت میں جسکی جھلک ہومر کی نظموں میں نظر آتی ہے، ہنوز یہ امور درحقیقت قطعی طور پر عام قواعد سمجھے ہی نہیں جاتے تھے، بقول مین، "حق و باطل کا باقتدار بیان صرف وہ عدالتی فیصلہ ہوتا تھا جو ظہور واقعات کے بعد[1] قدیم زمانے کے بادشاہ کی طرف سے جو واضع قانون کی حیثیت سے نہیں بلکہ جج کی حیثیت سے صادر ہوتا تھا۔

تاریخی دور کے آغاز کے وقت یہ حالت گزر چکی تھی، اور جیسا کہ میں خطبۂ چہارم میں بیان کر چکا ہوں جب یونان میں قدیم بادشاہی کے بجائے ابتدائی عدیدیت قائم ہوئی تو اس وقت ملک قطعی طور پر اس زمانے میں پہنچ گیا تھا جسے مین "قانون رواجی کا دور" کہتا ہے، یہ قانون غیر تحریری ہوتے تھے مگر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ حکمران طبقے کو وہ قطعی طور پر معلوم تھے، اور معدودے چند حکمرانوں نے اپنے عدالتی فیصلوں کے اندر (جن میں اس رواجی قانون کا اعلان و نفاذ ہوتا تھا)، اسے کتنا ہی اپنے جماعتی مفاد کی طرف کیوں نہ پھیرا ہو پھر بھی یہ صاف عیاں ہے کہ خود ان کو یا ان کے زیر حکم رعایا کو کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ان قوانین کا وضع کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔

بعد ازاں، جیسا کہ میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں، غیر تحریری قانون کے عدیدی انتظام سے بد دلی اور (باضافہ مین)، فن تحریر کی اشاعت کی وجہ سے، ان جماعتوں میں تحریری ضوابط کا عام رواج ہو گیا[2] مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قانون کو کوئی ایسی شئے سمجھا جاتا تھا

---

[1]۔ قانون قدیم صفحہ ۸۔

[2]۔ دیکھئے خطبۂ ششم صفحہ ۹۸-۱۰۹، مقابلہ کیجئے مین: "قدیم قانون"، باب اوّل۔ مین سے میں اس امر میں اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان مجموعہائے قوانین میں عام طور پر نیا قانون نہیں شامل ہوتا تھا، مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سولن نے کس قدر جدت طرازی کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے نئے اضافوں کو مبالغہ سے بیان کیا گیا ہے مگر اس گمان کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں، اس کے طبعزاد قانون کو مطلق دخل نہیں ہے۔

جس میں از روئے دستور، حکومت آنکھ بند کرکے رد و بدل کرنے کی مجاز تھی، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے دل و دماغ میں اس خیال نے کبھی بھی کامل طور پر جگہ پائی ہو۔ ارسطو تک کے خیال میں قانون سازی کو وہ جگہ نہیں حاصل ہے جو اسے حکومتی فرائض کی زمانہ جدید کی کسی تجویز میں حاصل ہوگی۔ ارسطو، حکومتی فرائض میں قانون سازانہ، عاملی اور عدالتی فرائض کے امتیازات نہیں قائم کرتا بلکہ وہ ان فرائض کو مباحثی، عاملی یا ناظمی اور عدالتی فرائض میں منقسم کرتا ہے، اور مباحثی جماعت خواہ کسی عمومیہ کے شہریوں کی جماعت عام ہو یا کسی عدیدیہ کی جماعت محدود ہو، دونوں میں اس کے فرائض کے اندر اگرچہ قانون سازی کا ذکر آگیا ہے مگر اسے کوئی بلند جگہ نہیں دی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "مباحثی عنصر کو جنگ و صلح کے معاملات میں مخالفوں کے انفساخ و توکید میں اقتدار حاصل تھا، وہ قوانین کی منظوری صادر کرتا، موت، جلاوطنی، ضبطی جائداد کی سزائیں دیتا، اور حکام کے حسابات کی تنقیح کرتا تھا"[عله] صاف عیاں ہے کہ یہاں پر وضع قوانین کی حالت بالکل ثانوی ہے، اور ارسطو نے کسی دوسری جگہ اس کے متعلق دلیل بھی دی ہے کہ کیوں ترمیم قانون کا اختیار (جسے صاحب اقتدار اعلیٰ کے سپرد ہونا چاہیے) علی التسلسل عمل میں نہ آنا چاہیے؟ وہ کہتا ہے کہ "گاہ بگاہ، خاص خاص صورتوں میں قوانین میں تغیر ہونا چاہیے، مگر اس میں بڑی حزم و احتیاط کی حاجت ہے، کیونکہ سہل طریقے پر قانون کے بدل دینے کی عادت ایک خرابی ہے، اور جبکہ اس کا نفع کم ہو تو شارع کی بعض غلطیوں کو بدستور چھوڑ دینا بہتر ہے، اس تغیر سے اہل ملک کو اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا صاحب اقتدار کی عدم اطاعت کی عادت سے نقصان ہوگا۔ فنون سے اس کی مشابہت غلطی میں ڈالنے والی ہے، کسی فن کے قواعد میں تغیر اور ہی چیز ہے اور قوانین سلطنت کا تغیر ایک دوسری ہی شئے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قانون کی قوت کا انحصار اطاعت کی عادت پر ہے، اور یہ عادت مرور ایام ہی سے پیدا ہو سکتی ہے چنانچہ قدیم قوانین کو بدل کر نئے قوانین نافذ کرنے کے لئے آمادہ رہنے سے قانون کی قوت میں ضعف آجاتا ہے"[عله]

دیکھنا یہ چاہئے کہ ارسطو نے قانون کے تغیر کا اس طرح ذکر کیا ہے گویا کہ وہ حکومت کی

عله۔ "سیاسیات" کتاب ۶ (۴) باب چہاردہم۔

عله۔ "سیاسیات" کتاب ۲۔ باب ہشتم۔

عدم اطاعت کے مترادف ہے'۔ اس سے میرے خیال میں پرزور طور پر یہ فرق ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارے نظم معاشرت میں وضع قوانین کو سیاسی زندگی کا ایک معمولی عنصر خیال کیا جاتا ہے، اور ارسطو کی تصنیف کے مطالعہ کرنے والے بالطبع اس کی نسبت کچھ اور ہی رائے رکھتے تھے۔ اگرچہ ایتھنز اور یونان کی دوسری شہری سلطنتوں میں قوانین برابر بدلتے رہتے تھے پھر بھی قانون کے متعلق اہل یونان کا خیال اس سے بہت دور تھا کہ وہ اسے محض مرضی عامہ کا ماحصل سمجھے' درحقیقت ارسطو کی رائے ایک طرح کی دلچسپ درمیانی رائے ہے' ایک طرف وہ دور ہے جب قدیم غیر تحریری رسم و رواج کو قانون کی منزلت حاصل تھی یا کچھ تحریری قواعد ایسے تھے جن میں محض تاویل کے پیرایہ میں تبدیلی ہو سکتی تھی' اور دوسری طرف ہماری قانون سازی کا یہ جدید دور ہے جس میں حکومتِ اعلیٰ کو معمولی طور پر قوانین میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ارسطو کی رائے ان دونوں کے بین بین ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک جانب تو وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ مباحثی جماعت (اور عمومیت میں ایک ذی اقتدار جمعیت عوام) وضع قوانین کے معاملات میں سب سے اعلیٰ ہوتی ہے' اور دوسری جانب وہ اس عمومیت کو بدترین قسم کی عمومیت قرار دیتا ہے جس میں جمعیت عوام کے فیصلے مسلمہ قوانین پر غالب آجاتے ہوں حقیقت یہ ہے کہ کامل ترقی یافتہ عمومیت کے دور یعنی چوتھی صدی میں ایتھنز کے ادارات قانون کے متعلق اس رائے و خیال کے موافق تھے کہ قانون کوئی ایسی شئے ہے جس میں تغیر تو ہونا چاہئے مگر سہل طور پر اس میں ترمیم کرنا خطرناک تھا۔ اولاً (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں[1]) اگرچہ صرف اہل ایتھنز کی جمعیت ہی قانون میں تغیرات کی ابتدا کر سکتی تھی مگر آخری فیصلہ اس جمعیت کا نہیں ہوتا تھا' آخری فیصلہ مقننین کی ایک منتخب جماعت کو سپرد ہوتا تھا جو دس سال کے پابند سوگند جوریوں میں سے اس موقع کے لئے مقرر کی جاتی تھی۔ ثانیاً یہ کہ اس سے زیادہ حیرت افزا یہ ہے کہ کسی غیر مصلحت آمیز قانون کا پیش کرنا قابل مواخذہ جرم تھا' جس کے لئے ایک سال بعد تک مقدمہ چلایا جا سکتا تھا' اس زمانۂ جدید کے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال اس درجہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ ایک ممتاز عالم ماڈوگ نے اس کے غیر ممکن ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ قانون کی غیر مصلحت آمیزی ایک خارج از بحث سوال تھا' جسے فیصلہ صادر

[1] ۔ خطبۂ ہفتم۔

کرنے والی عظیم التعداد عام جوری پر اثر ڈالنے کے لئے یونانیوں کے انداز میں شاعرانہ طور پر زیر بحث لایا جاتا تھا ورنہ اصل مقدمہ کی بنا صرف یہی ہوتی ہوگی کہ وضع قوانین کے لئے قانوناً جو طریقہ معین تھا اس کی تطبیق میں کوئی کوتاہی ہو جاتی ہوگی، مگر ایتھنز کے دستور سلطنت کے جو حالات ادھر حال میں دریافت ہوئے ہیں ان سے کوئی شک اس امر میں باقی نہیں رہتا کہ قانون کی غیر مصلحت اندیشی باضابطہ طور پر مقدمہ کی بنا تسلیم کی جاتی تھی[1]

۳۔ اب ہم روما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہاں ہم زیادہ کمل طور پر یہ پتا چلا سکتے ہیں کہ حکومت کے معمولاً و مسلسلاً تشریعی ہونے کا خیال و واقعہ کس طرح سے صورت پذیر ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ پہلا درجہ جس میں "قانون"، رواج کے بہ نسبت زیادہ تر "عادت" تھا، اس کا پتا تاریخی طور پر اتنا نہیں چلتا جتنا ہم اسے فرض کر لیتے ہیں[2]، یہ وہ حالت تھی جس میں خاندان، جائداد اور معاہدے کے ادارات اصلاً و واقعاً بھدی شکل میں تھے، جس میں قبیلے کے ارکان معمولاً ان باہمی ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے جو ان ادارات کے ہوتے ہوئے لازم تھے مگر انھیں یہ احساس و ادراک نہیں ہوتا تھا کہ ان کا ایسا کرنا کسی قاعدے کے تحت میں ہے، جب ان مستور قواعد میں سے کسی قاعدے کی نمایاں طور پر خلاف ورزی ہوتی تھی اور مناقشہ برپا ہوتا تھا صرف اس وقت اس کے تصفیے کے لئے کسی مسلمہ رواج کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، اور جب قواعد کی خلاف ورزی نہایت درجہ سخت و شدید سمجھی جاتی تھی، اس وقت اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس خلاف ورزی کرنے والے کو قوم کے خلاف ارتکاب جرم کا ملزم قرار دیا جائے۔ بیشک اس قانونی حکم سزا کا صدور بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا، جس کے داخلی فرائض غالباً اور جگہوں کی طرح یہاں بھی ابتدا میں زیادہ تر عدالتی ہوتے تھے۔ یہیں سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس عادت سے بتدریج ان صریحی غیر تحریری رواج یا قوانین کے احساس و ادراک نے نشو و نما پائی جنھیں اہل روما احترام و افتخار کی نظر سے دیکھتے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ رواج و قوانین ان کی خاص ملک اور ان کے دوسرے ہموطنوں کی زیادتی، تحکم، ظلم و ستم کے مقابلے میں ان کا خاص ذریعۂ حفاظت ہیں، مگر جب تک کہ قانون غیر تحریری رہا اس وقت تک اس امر کی حفاظت

---

[1] ۔ "دستور ایتھنز" ۵۹

[2] ۔ مقابلہ کیجئے مین کی تصنیف "قانون قدیم" صفحہ ۸ ۔

کافی ووافی نہیں ہوتی تھی کہ حاکم کو یہ ترغیب نہ ہو کہ جس طبقے سے اس کا تعلق تھا اس کے مفید مطلب رواجی قانون میں تاویلات کردے یا اپنے طبقے کے کسی ستمگار رکن کی جانبداری کا میلان ظاہر کرے۔ یہیں سے ایک مجموعۂ ضوابط کا تقاضا شروع ہوا جس کا انجام ۴۵۱ ق م کے قریب ”بارہ تختیوں“ کے قانون پر ہوا، جسے ”عشاریہ“ کے مشہور کمیشن (امور یہ) نے مرتب کیا تھا۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ مشہور مجموعۂ ضوابط غیر تحریری قانون کو بعینہ تحریری جامہ پہنا دینے پر بس نہیں کرتا تھا جیسا کہ مین کا خیال ہوگا (قانونِ قدیم صفحہ ۱۴ - ۱۵)، بلکہ اسمیں غیر تحریری قانون سے کچھ باتیں زیادہ تھیں اور کچھ کم۔ کم اس وجہ سے کہ متعدد شاخہائے قانون جن کی نسبت (ہمارے خیال میں) کوئی شدید بحث نہیں پیدا ہوئی تھی صرف اتفاقی و جزوی طور پر زیر بحث لائے گئے تھے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ادارات خاندان، وراثت کے قوانین اساسی (وغیرہ)، اور قانون انتقال جائداد، معاہدہ و قرضہ کی قانونی طرزِ تحریر کے ایسے نہایت ہی اہم اور مانوس عام قوانین کا علم عام طور پر لوگوں کو ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ بارہ تختیوں کا عملی مقصد یہ تھا کہ طبقہ پلیب جن خصوص قوانین کے متعلق غیر مساویانہ، ناقص یا اپنے لئے آزاردہ ہونے کی شکایت کرتے تھے ان کا اعتماد عود کر آئے، اور جن معاملات کے متعلق قانونی قواعد وضع ہوئے ان کا تعین اس عملی مقصد کو پیش نظر رکھکر ہوا تھا، لیکن دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ حق کے متعلق رومانیوں کا احساس، رسم و رواج اور روایاتِ قدیمہ کے ساتھ اس قدر مضبوطی کے ساتھ وابستہ تھا کہ ان کے لئے بیرونی دنیا کی کسی بڑے یا اہم تغیر کا قبول کرنا بعید تھا، پھر بھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مجموعہ ضوابط کے مرتب ہونے سے قبل ایک وفد یونان اور جنوب اطالیہ کے یونانی شہروں کو اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے قوانین کا مطالعہ کرے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بارہ تختیوں میں سولن کے وضع کردہ قوانین کی تقریباً لفظی نقل شامل ہے، تو پھر میری رائے میں یہ خیال کرنا دشوار ہے کہ اس وفد کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ رواجی قانون جو ناقابلِ تبدیلی سمجھا جاتا تھا، اسے کس طرح بیان کیا اور ترتیب دیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ سابق کے مسلمہ قانون میں کچھ رد و بدل قبول کیا گیا تھا، اور رومانی اس قانون کے نفس مطلب اور اس کی شکل ظاہری دونوں کے متعلق یونانیوں کی دانش سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ دس اشخاص کا وہ امور یہ جسے ترتیب ضابطہ کا کام سپرد ہوا تھا، اس کی نسبت یہ سمجھنا چاہئے کہ کسی حد تک اسے قانون سازی کا بھی اختیار دیا گیا تھا، اگرچہ

اس میں شک نہیں کہ جو تغیرات داخل کئے گئے تھے وہ مجموعی تناسب کے لحاظ سے زیادہ نہیں تھے۔ ایک قوم جس نے (تقریباً ۵۰۹ ق م میں) اپنے رواجی قانون عامہ میں اس قدر عظیم تغیر کیا ہو کہ بقول مین "شاہی کو محض ایک ماثورہ مرکب کی حیثیت دیدی ہو" اور اس طرح اس نے اس آئینی تغیر کی زندگی میں قدم رکھ دیا ہو جس پر ترتیب ضابطہ کے وقت تک پچاس برس سے زائد گزر گئے تھے، ایسی قوم کی نسبت درحقیقت یہ خیال دل میں لانا مشکل ہے کہ وہ ہنوز اپنے شخصی قانون (یعنی اہل ملک کے باہمی تعلقات) کے انضباطی قانون کی بابت یہ سمجھتی ہو کہ یہ قوانین (اہل مدیہ اور ایرانیوں کے قوانین کے مانند) بالکل ہی ناقابل تغیر تھے اور اگرچہ اس مجموعۂ ضوابط کی اشاعت کے بعد دو صدی سے زائد تک شخصی قانون میں بہت کم تبدیلی کی گئی پھر بھی یہ طریقہ بالکل معدوم نہیں ہو گیا تھا، چنانچہ ہم، ایسے قوانین کا حال پڑھتے ہیں جن کا تعلق ازدواج، سود، دستاویزی قرضہ، مقدمات قرضہ کے تغیرات، اور جائداد وغیرہ کے نقصان کے معاوضے سے تھا۔

۴۔ بایں ہمہ، اگرچہ قوانین کسی قدر بنتے رہتے تھے لیکن اس دور بلکہ فی الحقیقت اس کے بعد کی کئی صدیوں تک قوانین کا وضع کرنا وہ وسیلہ نہیں تھا جسکے ذریعہ سے معاشرتی حوائج واحساس کے تغیرات کے حسب خواہ، قانون کا نشوونما عمل میں آتا رہا ہو، دو صدیوں سے زائد تک قانون میں تغیر کرنے کا خاص طریقہ تاویل کے پردے میں "علما کے جوابات" پر چلتا رہا، ابتداً ائمۂ مذہبی سے یہ کام لیا جاتا رہا بعد میں پیشہ ور مفتی اسے انجام دینے لگے۔ مین ارتقا کے اس طریقے کو اُس طریقے کے مثل قرار دیتا ہے جس سے انگریزی قانونِ عامہ میں عدالتی فیصلوں کے ذریعے سے ترمیم ہوا کی ہے، فرق صرف یہ تھا کہ انگلستان میں جو جج حقیقتاً قانون میں تغیر کرتا مگر ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ قانون کی تشریح کر رہا ہے، وہ خود ایک اول درجے کا ماہر قانون ہوا کرتا تھا اس کے برعکس، روما میں جو حاکم قانونی کارروائی کا نگران ہوتا تھا وہ قانون داں ہونے کی بہ نسبت زیادہ تر مدبر ہوتا تھا، [چنانچہ ۳۶۷ق م تک قنصل اور اس کے بعد پریٹر (Pruetor) اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں۔] پس اس دور اول میں بقول مین، "روما میں حقیقی تغیر کن اثر وکلا کا تھا نہ کہ منصفوں کا" اور جس قدر تہذیب و تشخص میں ترقی ہوتی گئی، اسی قدر ذی علم مشیرانِ قانونی روز بروز مفتیوں کا ایک پیشہ ور طبقہ بنتے گئے۔

یہ عیاں ہے کہ تاویل کے پردے میں قانون کے اس طرح بدلنے کا طریقہ خود

اپنی ہی کامیابی کی وجہ سے محدود و محدود تر حلقے میں مقید ہوتا گیا کیونکہ تاویل کے ذریعے سے ابتدائی غوامض جسقدر یکے بعد دیگرے صاف و مشخص ہوتے گئے، اسی قدر معتدبہ تغیرات کا امکان مزید گھٹتا گیا۔ پس اگرچہ مشیران قانون (مقننین) کی محنت بڑھتی جاتی تھی اور فی الحقیقت روز بروز یہ کام ماہرین کا ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ روز بروز یہ کام حقیقتاً تاویل ہی کا کام ہوتا جاتا تھا، اور اس ذریعے سے قانون میں اہم رد و بدل نہیں ہوتے تھے۔

جب صورت حال اس حد تک پہنچ گئی تو پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طرز تبدیل وضع قوانین ہی ہو گیا ہو گا اور جمہوری دور کے اختتام کے قریب جمعیت عامہ کی قانون سازی نئے قوانین کا ایک زوردار سرچشمہ بن گئی ہوگی، مگر اس سے قبل انگریزی قانون کی طرح رومانی قانون میں بھی ایک دوسرا طریقہ زور کے ساتھ عمل میں آ رہا تھا، یعنی حکام اپنی معدلت گستری کے عمل سے قانون کو بہت کچھ زیر کر دیتے تھے۔ روما میں، جمہوریت کی تاریخ کے آخری حصے میں، اس کا خاص آلہ پریٹر کے فرامین ہوا کرتے تھے جن میں ہر سال یہ اعلان ہوا کرتا تھا کہ پریٹر اپنے دوران کارگزاری میں کن کن مفاسد کا کیا علاج کرے گا۔ یہ فرمان اگرچہ قطعی طور پر صرف ایک ہی برس کے لئے نافذالعمل رہتا تھا مگر عملاً ایک حاکم سے دوسرے حاکم کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور انسان اپنی عقل و رائے سے جس امر کو حق و صواب سمجھتا تھا، اس کے موافق قانون میں تغیر کرنے کا یہ ایک مسلسل ذریعہ تھا۔

اور اس میں شک نہیں کہ حاکم غیر ملکیاں Praetor peregrmus کے ہاتھ میں جا کر اس کارروائی میں قانون اجانب (Jus gentium) کے نشو و نما سے مدد ملگئی تھی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ حاکم غیر ملکیاں وہ حاکم تھا کہ جس کا تقرر اواسط تیسری صدی قبل مسیح کے بعد ہی اس خاص اختیار کے ساتھ عمل میں آیا تھا کہ غیر ملکیوں یا رومانیوں اور غیر ملکیوں کے مابین جو قانونی تنازعات پیدا ہوں ان کا تصفیہ کرے۔ ادھر رومانی قانون بلدیہ میں حاکم بلدیہ Praetor urbans کے فرامین سے ترمیمات ہو کر ترقی ہو رہی تھی اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شخصی قانون کے ایک ایسے منتظم طریق کے عمل میں لانے سے جس کا نفاذ غیر ملکیوں اور رومانیوں دونوں پر ہوتا ہو (اور جو ان قدیم شہری سلطنتوں کی تاریخ میں ایک نیا امر تھا)، اس کا اثر بازگشت ان بلدی قوانین کی ترقی پر بہت ہی اہم ہوا تھا۔

۵۔ یہ صاف عیاں ہے کہ اس قسم کے قانون کی ترقی جسے بعد میں "قانون اجانب"

(Jus gentium) کہنے لگے تھے، تمامتر عملی ضروریات کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی، اور ہم اس کا تعلق رومانی تجارت کے نشو ونما کے ساتھ قرار دے سکتے ہیں۔ فتوحات سے جس قدر روما کی قوت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اسی قدر اس کی تجارت میں ترقی ہوتی جاتی اور اس کی وسعت وسمت بڑھتی جاتی تھی۔ صور۔ قرطاجنہ، یونان، سسلی، مسالیہ وغیرہ کے غیر ملکی تاجر روما میں کاروبار قائم کرنے کے لئے آ گئے تھے، اور غیر ملکیوں کی اس آمد سے اجنبیوں کا شمار یوماً فیوماً برابر بڑھتا جاتا تھا۔ بعد ازاں تیسری صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے دوران میں یونانی اثر کی وجہ سے روما میں اجنبیوں کے متعلق زیادہ وسیع الخیالی پیدا ہوئی اور اسے قوت حاصل ہوتی ہوگی۔ اس لئے قانون اجانب کی ترقی کے لئے یہ دور ایک طبعی زمانہ رہا ہوگا اور اس قانون کی بنا لامحالہ ایسے اصول پر رہی ہوگی جنھیں ان مختلف اقوام کے ارکان جن کے لئے یہ قانون وضع ہوا تھا عام طور پر قابل پذیرائی سمجھتے رہے ہوں گے۔[1] ابتداً اس کی نسبت کسی نہج سے یہ خیال نہیں تھا کہ یہ روما کے ملکی قانون سے فائق تھا، بلکہ اس کے برعکس یہ موخر الذکر قانون شہریوں کا امتیاز خاص تھا، اور روایتی خیال کے موافق دوسری سلطنتوں کے شہری محض معاہدے کے ذریعے سے جزءاً اس میں شرکت کر سکتے تھے۔

---

[1] قانون اجانب کے متعلق میں نے اپنی تصنیف "قانون قدیم" کے باب سوم میں، مختلف اطالوی قوموں کے حالات پر نظر کرکے کسی قدر زائد از ضرورت دانستہ تحقیق واستقرا کا خیال ظاہر کیا ہے، مگر میرے خیال میں یہ عمل اس طرح پر نہیں ہوا ہے، وجہ یہ ہے کہ (۱) ہمیں اطالیوں کے ساتھ ہی ساتھ یونانیوں اور قرطاجنوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ حاکم غیر ملکیاں کے تقرر سے بہت پہلے سے روما، قرطاجنہ سے ایک معاہدہ کر چکا تھا، اور (۲) یہ کارروائی کسی باقاعدہ تحقیق واستقرا کی صورت میں نہیں ہوئی تھی، انصاف کرنے کی کوشش نے انھیں اس راستہ پر لگایا کہ قانون کے عنصر مشترک پر توجہ کریں۔ قانون اجانب کی ترقی کو تمام وکمال حاکم غیر ملکیاں کے کام کی طرف منسوب نہ کرنا چاہئے۔ قانون اجانب کے نفاذ کے عملیات کا بہت بڑا حصہ ملکی تھا، محض اعزازی نہیں تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ایک بڑی حد تک اس کے اصول قانون ملکی کے اصول سے ماخوذ تھے۔ بایں ہمہ، حاکم غیر ملکیاں کے اثر کے اہم ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

لیکن محض اسی وجہ سے کہ مختلف اقوام کے معاملات پر جس قانون کا عملدرآمد ہوتا تھا وہ لامحالہ مختلف اقوام کے تاریخی خصوصیات سے معرا تھا، اس لئے وہ دقیانوسی ظاہر پرستیوں اور دقیانوسی پابندیوں کے اثرات باقیات سے بھی پاک تھا، لہٰذا رومانیوں اور ان کے ہمعصر قوموں کے اذہان حق طبعی و انصاف کے تخیلات کی جس منزل پر پہنچ گئے تھے اس کا اظہار اس قانون کے ذریعے سے زیادہ سادگی اور زیادہ تکمیل کے ساتھ ہوتا تھا اس لئے قانونِ ملکی کے مقابلے میں قانون اجانب آہستہ آہستہ فروتر حیثیت سے نکلکر برتر حیثیت پر پہنچ گیا۔ اولاً یہ کہ رومانیوں نے اصول پر نظر ڈالے بغیر یا قانون و مملکت (Res publica) کے حقیقی تعلق کے قدیم خیال کو کسی طرح پر ترک کئے بغیر اپنی قانون سازی کی عملی ذہانت کو ان ضرورتوں پر عائد کیا جو غیر ملکیوں کے روابط کی وجہ سے حقیقتاً محسوس ہونے لگی تھیں اور ایک بین الاقوام شخصی قانون مرتب کر لیا، اس کے بعد یونانیوں اور خاص کر رواقیوں کے فلسفے کے اثر سے ایک ایسے قانون فطری کے تصور کو غلبہ ہو گیا جو انسان پر بہ حیثیت انسان کے عائد ہوتا ہو اور جو مخصوص سلطنتوں کے احکام سے بالاتر ہو۔ آخری مرحلہ یہ تھا کہ، جب روما نے ترقی کر کے عالمگیر حیثیت پیدا کر لی، اور رومانیوں کے زیادہ باعمل دلوں پر یونانی خیالات کا اثر پڑا، تو قانون طبعی اور قانون اجانب کے تصورات متحد ہو گئے اور رومانی قوانین کے بعد کے تغیرات کے لئے بہت بڑا مخزن مہیا ہو گیا۔ سیسرو کے وقت سے قبل اس امتزاج کا شروع ہونا معلوم نہیں ہوتا، پس پہلی صدی قبل مسیح سے اس کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ سیسرو کے رسالہ میں قانون فطری اور قانونِ اجانب کا تعلق بہت ہی ابتدائی حالت میں ظاہر ہوتا ہے، اور فی الحقیقت وہی پہلا شخص معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے یونانی فلسفہ کو روما میں قبول عام حاصل ہوا، اگر اس کے وقت سے یہ فلسفہ برابر ترقی کرتا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی شہنشاہی کے مقنن کی تصانیف پر اس کا زبردست اثر پڑا ہے۔

علہ - مین کے اس خیال کو مشتبہ سمجھتا ہوں کہ رومانی ایک قانون فطری کے تصور کی وجہ سے یونانی قانون کے نقائص سے بچ گئے۔ نہ مجھے اس کی کوئی صاف شہادت نظر آتی ہے کہ بے حس و حرکت صلابت سے رد کرنے میں قانون فطری کا نظریہ کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ شہری سلطنت کی سیاسی عدم استقامت اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے کافی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ رومانی تاریخ دستوری سے ثابت ہوتا ہے۔

لیکن فی الواقع یہ امر میرے حدود بحث کے اندر داخل نہیں ہے کہ قانونِ اجانب نے پریٹر کے فرامین کے ذریعے سے نافذ ہو کر جو تغیر کن اثر پیدا کیا میں اس کے مکمل بیان کا کوئی سرسری خاکہ بھی کھینچ سکوں، مگر اس قانون کے عمل کے متعلق دو خاص شکلوں پر نظر ڈالنی چاہیے، جنکی توضیح و تشریح مین کے آخری ابواب میں ہوئی ہے۔
(۱) ورثہ کی تقسیم میں "رشتۂ خون کا لحاظ"۔ اس کی وجہ سے غالباً شہنشاہی دور کے اوائل میں، پریٹروں نے (بزرگ خاندان کے اقتدار سے) آزاد اولاد کو غیر پابند اولاد کے مساوی قرار دیا اور قدیم صلبی وراثت کے اصول کے مقابلے میں ذوی الارحام کے حقوق کو بھی تسلیم کیا۔ (۲) معاہدے یا دوسرے قانونی معاملت کے نفس مضمون کے متعلق ان کے ضابطے کے الفاظ سے جداگانہ، فریقین معاہدہ کے اصلی منشا پر لحاظ کیا جاتا تھا، جیسا کہ مین نے وصیت و معاہدہ دونوں کے بارے میں واضح کیا ہے۔ یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ ان دونوں اصول میں سے ہر ایک اصول اور خاص کر موخر الذکر اصول، ان غیر ملکیوں سے متعلقہ نفاذ قانونی میں اغلباً پہلے شائع ہو جائے گا جو معاہدے اور وصیت کے متعلق رومانی ضوابطِ ظاہری سے واقف نہیں تھے یا اس سے کام نہیں لینا چاہتے تھے اور جن میں صلبی وراثت کا قدیم قاعدہ یا تو کبھی رائج ہی نہ تھا یا انھوں نے اس سے اپنی گلو خلاصی کر لی تھی۔

شائد یہ خیال ہو کہ میں نے ان معاملات پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا ہے جو ارتقائے نظم سلطنت کے مطالعہ کرنے والے کی بہ نسبت قانونی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انجام کار میں جو تصور، رومانی عدالت گستری پر حاوی ہو گیا تھا وہ اگرچہ رومانیوں کے لئے محض قانونی اہمیت رکھتا تھا مگر ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں[1] اسے بہت وسیع سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ قانون عدالت گستری کا یہ تصور تھا کہ قدرت کا ایک قانون اور کچھ فطری حقوق[2] ایسے موجود ہیں جو بہ حیثیت انسان کے انسان کی ملک ہیں اور طبیعی قوانین و حقوق ان قوانین و حقوق قانونی سے زیادہ ارفع و واثق ہیں

---

[1]۔ جس مفہوم کو لاطینی میں (Jus) فرانسیسی میں (Droit) اور جرمن میں (Recht) کہتے ہیں اس کے لئے انگریزی میں الفاظ موجود نہیں ہیں لفظ (Laws) سے اکثر کام لیا جاتا ہے مگر اس لفظ کا مفہوم حقوق و فرائض کا وہ مجموعہ مرکب ہے جو از روئے قانون قائم ہوا ہے۔

[2]۔ مختصر الفاظ میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ جس طرح روما کے نشو و نما میں اس کا اثر قانون ملکی کی حدود میں اہمیت

جو کسی خاص سلطنت نے خود اپنے لئے مرتب کئے ہوں۔ درحقیقت یہ تصور خیالات کی اس تحریک کا ایک اہم جزو بن گیا تھا جس کا انجام انقلاب فرانس پر ہوا کیونکہ اس قانون قدرت کے اصول یہی ہیں کہ انسان از روئے قدرت آزاد ہیں" اور انسان از روئے قدرت مساوی ہیں"۔

یہاں میں ایک نکتے پر نظر کروں گا جس کے متعلق مین کے بیان میں کچھ قید لگانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "قانون قدیم" کے باب سوم میں یہ کہا ہے کہ "قانون اجانب اور قانون قدرت دونوں عملاً ایک دوسرے کے مترادف تھے اور اس میں شک نہیں کہ تقریباً تمام حالات میں یہ صحیح تھا لیکن مخصوص اس مقابلے میں جس کا علم سیاسیات کے مطالعہ کرنے والے کی حیثیت میں ہم سے خاص تعلق ہے، قانون قدرت اور اقوام کے حقیقی مسلمہ قوانین کے درمیان رومانی مقننوں نے نہایت توضیح وقطعیت کے کے ساتھ ساتھ تخالف وتصادم کو تسلیم کیا ہے۔ اس قانون قدرت سے میری مراد اس اصول سے ہے کہ تمام انسان از روے قانون آزاد ہیں۔ سب اس امر پر متفق ہیں کہ "قانون اجانب" کی رو سے غلامی جائز ہے، اور میرا خیال ہے کہ وہ سب کے سب ایسے ہی اتفاق عام کے ساتھ اس کے بھی مقر ہیں کہ یہ امر قانون طبعی کے خلاف ہے، اور اس تضاد وتخالف پر وہ کسی قسم کی رنگ آمیزی کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے تھے[عه]۔ یہ صحیح ہے کہ حقوق واقعی کے متعلق رومانی مقننوں کا جو خیال تھا اس کے لحاظ سے یہ "فطری آزادی" ظاہری نتیجے سے محروم رہ جاتی تھی۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کرتے تھے کہ غلامی کو فوراً

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رکھتا ہے اسی طرح ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں اس کی اہمیت بین الاقوامی و آئینی قانون کے حدود میں ہے۔ (خطبات بست وچہارم تا بست وششم دیکھنا چاہئے) تاہم قدما کے خیال میں بھی بلند وثوق قانون قدرت کا تصور سلطنت کے خود اپنے قانون بنانے کی ہمہ گیری میں ایک طرح کے نظری توازن کا کام دیتا تھا؛ اس کا اطلاق ابتدائی شہنشاہی پر ہوا اور پھر قسطنطین کے بعد کلیسا نے اس کی جگہ لے لی۔

عه۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ تعلیق ک

یا جس قدر جلد ممکن ہو منسوخ کر دینا چاہیے"، مگر ان کے ازمنۂ وسطیٰ کے شاگردوں پر اس کا اثر بہت ہی مختلف پڑا، اور مسیحی جذبات کے پر زور اتحاد عمل سے ملکر اس اصول نے غلامی کی تنسیخ میں اس زمانے سے بہت ہی قبل اہم اثر پیدا کر لیا تھا جب کہ اس کا اثر ملکی قانون کی حد سے گزر کر دستوری قانون تک پہنچا، اور سنہ ۱۷۷۹ کے اصول میں سے یہ بھی ایک اصول ہو گیا۔

خطبۂ سیزدہم

تقلیب بہ جانب تاریخ ازمنۂ وسطیٰ

ا۔ پچھلے خطبے میں میں نے روما میں ارتقائے قانون کے متعلق مختصراً تحقیق و بحث کی ہے اور اس میں خصوصیت کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ فی الجملہ کتنے زمانے تک یہ قانون حکومت کی مداخلت سے آزاد رہا۔ جس منزل میں قانون کی حالت بقول مین رسم و رواج کے بہ نسبت عادت سے زیادہ تعلق رکھتی تھی اس منزل سے شروع کر کے ہم نے غیر تحریری رسم و رواج تک اس کا پتا چلایا، پھر جب یہ محسوس ہونے لگا کہ اس سے ظلم و جور کے لئے بہت زیادہ موقع ملنے لگا ہے، تو سنہ ۴۵۰ قبل مسیح کے قریب اس رسمی قانون کے اہم اجزا کا مشہور و معروف انضباط عمل میں آیا۔ اس کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ کس طرح ایک مدت مدید تک ماہران قانون "وکلا" کے تاویلات کے پیرایہ میں قانون میں تغیر ہوتا رہا اور مین جیسے "رومانی نصفت شعاری" کہتا ہے اس کی ترقی کیونکر ہوتی رہی، بعد ازاں روما کی تجارتی نشو و نما کی وجہ سے غیر ملکیوں کے آپس کے یا غیر ملکیوں اور رومانیوں کے باہمی مقدمات کے فیصلے کے لئے مختلف اقوام کے مشترک و مساوی اصول کی رو سے ایک نظم قانون بنام قانون اجانب کیونکر تیار ہو گیا پھر کچھ زمانے کے بعد یونانی تخیلات کے زیر اثر انسان پر بہ حیثیت انسان کے قانون فطرت کے قابل نفاذ ہونے کا تصور کیونکر مضبوطی سے قائم ہو گیا

اور کس طرح ان دونوں تصورات کے تحت میں جن میں سے ایک عملی اور دوسرا نظری تھا، اور جو آخر الامر ایک دوسرے میں بالکل مدغم ہو گئے'' رومانی قانون کے دقیانوسی عناصر مغلوب ہو گئے اور یہ حالت زیادہ تر پریٹروں کے ان سالانہ فرامین یا "سوانح قانونی" کی وجہ سے صورت پذیر ہوئی جن میں پریٹر یہ اعلان کرتے تھے کہ کس قسم کے مقدمات و عذرات قابل قبول ہوں گے اور زیادتیوں کے لئے کیا تدارک اختیار کیا جائے گا۔

شہنشاہی کے دور اول یعنی آگسٹس سے ڈیاکلیشین تک کے زمانے میں، قوانین کے اندر منبع تغیر کی حیثیت سے توضیع قانون کو روز بروز غلبہ حاصل ہوتا جاتا تھا اور اگرچہ کچھ زمانے تک شہنشاہ کا اقتدار جمہوری اوضاع ظاہری کے اثرات یا باقیات کے پردے میں پنہاں رہا پھر بھی اس توضیع قانون میں شہنشاہی رنگ روز بروز زیادہ صاف طور پر نمایاں ہوتا گیا اور پردہ آہستہ آہستہ اٹھتا گیا۔ جمعیت عمومی کی قانون سازی جو جمہوریہ کی آخری صدی میں بہت سرگرم کار رہ چکی تھی اس کی توضیع قوانین ماند پڑتی گئی اور آخر میں بالکل غائب ہو گئی، اور حقیقت رومانی قانون اب جس دقیق حد کو پہنچ گیا تھا اس کے لئے یہ جمعیت کچھ زیادہ موزوں نہیں رہی تھی۔ آگسٹس اپنے تشریعی تجاویز بدستور اس جمعیت کے سامنے پیش کرتا رہا مگر ٹائبریس کے عہد تک پہونچ کر یہ طریقہ بند ہو گیا اور مجلس سنیات وضع قوانین کا ظاہری ذریعہ بن گئی، لیکن جسے ہم "مسودہ قانون" کہتے ہیں اس کی ترتیب شہنشاہ کی مجلس شوریٰ ہی میں ہوتی تھی، اور دوسری صدی عیسوی کے اختتام تک یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان مسودات قانون کا منظور کیا جانا اس درجہ بدیہی الوقوع سمجھ لیا گیا تھا کہ لوگ ان "ملفوظات" کے حوالہ دینے کے عادی ہو گئے جن میں شہنشاہ مجلس سنیات کی قرار داد کے بجائے قانون کے متعلق اپنا ارادہ بیان کیا کرتا تھا اس دوران میں قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار شہنشاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا، مشکوک مقدمات کی ہدایت کی درخواست کے جواب میں اس کے "مکاتب" اور عدالتی حیثیت سے جو مقدمات اس کے سامنے آتے تھے ان کے "فیصلے" ججوں کے لئے نظائر لازمی کا کام دیتے تھے گو یہ ضرور تھا کہ فیصلے اہل فن قانون دان تیار کرتے تھے، بہ حیثیت حاکم اعلیٰ کے اس کے "فرامین" بھی اگرچہ اول اول صرف اسی صورت میں لازمی ہوتے تھے کہ اس کے مرنے کے بعد ان کی تجدید کی جائے مگر بتدریج قانون اور ان فرامین میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا یہاں تک کہ ڈیاکلیشین کے بعد (یعنی ۳۰۵ء سے)

عاملانہ و عدالتی اعلیٰ اقتدار کے ساتھ ہی ساتھ تمام تشریعی اقتدار بھی شہنشاہ کے دائرہ اختیار میں تسلیم کیا جانے لگا۔

اسی کے پہلو بہ پہلو "اجوبہ علما" کا سلسلہ بھی جاری رہا، یہ وہ علما تھے جن کے قابل اسناد ہونے کے متعلق اگسٹس نے ایک طریقہ قرار دیا تھا۔ بعد میں ان کے اجماع کو قانون کی قوت حاصل ہو گئی تھی، لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس دور میں ان کا کام زیادہ تر تاویلی و تنظیمی تھا، صریحی تغیرات مجلس سینیٹ و شہنشاہ کے احکام سے عمل میں آتے تھے۔ پریٹر کے فرامین جن سے قانون کا ایک کم و بیش ناقابل انتظام و بے ترتیب انبار جمع ہو گیا تھا، ان کی ترقی بھی رک گئی تھی۔ ہیڈرین کے زمانہ میں سالویوس جولیانوس نے ان فرامین پر نظر ثانی کر کے انھیں، ایک صورت میں مرتب کیا، پھر اس کے بعد سے اس میں بہت کم تغیر ہوا۔

اس طرح قانون کا جو مرکب مجموعہ تیار ہو گیا تھا، اس کا مطالعہ اس اثنا میں برابر زور و شور کے ساتھ جاری رہا۔ ہیڈرین اور ایشونین کا دور حکومت رومانی فلسفہ قانون کا زرین زمانہ تھا، اس دور کا خاتمہ ۲۳۵ء میں الگزنڈر سیورکیس کی موت پر ہوا۔ اس کے بعد وہ پریشانیاں پیش آئیں جنسے شہنشاہی کے مغربی حصے کو کبھی کامل طور پر بحالی نصیب نہیں ہوئی اور انھیں پریشانیوں میں ہر طرح کی تعلیم پر زوال آگیا اور اصول قانون بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا مشرقی شہنشاہی میں اس میں دوبارہ جان پڑی مگر اب اسے مواد قانونی کے طومار سے عہدہ برآ ہونے کی دشواری پیش آئی۔ اسی کے تدارک کے لئے جسٹینین کی جلیل القدر تصنیف کی تجویز ہوئی اور اسے مرتب کیا گیا۔ اس تصنیف نے ہمیشہ کے لئے یہ طے کر دیا کہ شہنشاہی کے قانونی نظریہ کے بموجب قانون سازی کا اختیار ہمیشہ کے لئے تمام و کمال شہنشاہ کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔

مگر جب ہم جسٹینین (۵۲۷ء — ۵۶۵ء) تک پہنچتے ہیں تو ہم اس تغیر عظیم سے گزر چکتے ہیں، جو پانچویں صدی میں مغربی یورپ میں واقع ہوا یعنے عام خیال کے بموجب غیر متمدن اقوام نے شہنشاہی کو فتح کر لیا تھا۔ مغربی شہنشاہی کے تمام حصص میں اس جدید سلسلۂ عمل کا آغاز ہو چکا تھا جس کا نتیجہ ہزار برس بعد یہ نکلا کہ یورپ کی موجودہ اقوام کی ساخت عمل میں آئی۔

۲۔ رومانی شہنشاہی کی نسبت عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے قدیم تاریخ

سے ازمنۂ وسطی و ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ کی طرف ارتقا ہونے کا کام دیا اور میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ہے، اگر خطبات کے اس سلسلہ میں جو نقطۂ خیال مدنظر رکھا گیا ہے اس میں اس ارتقا کا صرف ایک جزو بیش نظر رہے گا۔

یورپ میں معاشرۃ سیاسی کی شکلوں کے نشو و نما کے مطالعہ کرنے میں جس ارتقا کو مقدم اہمیت حاصل ہے وہ اس دور کا ارتقا ہے جس دور میں کہ مہذب و متمدن نظم معاشرت کے حاکمانہ تصور کا اظہار یونانی لفظ "پولس" (بلدیہ Polis) کے اندر شہر و سلطنت" کے تخیلات کے امتزاج سے ہوا کرتا تھا۔ یہ نظم معاشرت ایسی تھی کہ اس کے وہ ارکان جنھیں شہریوں کے کامل حقوق حاصل تھے وہ اپنے نہایت اہم مشترک معاملات کا تصفیہ کرنے کے لئے اپنے مرکزی قصبے کی کسی کھلی جگہ میں واقعی طور پر جمع ہو سکتے تھے۔ رومانیوں نے اگرچہ شہر و سلطنت کے خیالات کو اس طرح برسمو نہیں دیا تھا لیکن رومانی نظم حکومت میں عام شہریوں کو سیاسی اختیار میں جو حصہ دیا گیا تھا اس کا عملدرآمد بھی صرف ایسی ہی حالت میں ہو سکتا تھا جیسی کہ یونان کی حالت تھی مگر جیسا کہ ارسطو نے ظاہر کیا ہے اس قسم کے دستور سلطنت کے موزوں و مناسب عملدرآمد کے لئے ضرورت تھی کہ شہریوں کی تعداد کا اوسط ایک معینہ حد سے آگے نہ بڑھے لیکن جب رومانی سلطنت بڑھتے بڑھتے چار لاکھ شہریوں تک پہنچ گئی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اطالوی حلیفوں کو اپنے میں شامل کر لیا تو پھر ازمنۂ جدیدہ کی "ملکی سلطنت" کی طرف منقلب ہونے کی کارروائی فی الاصل وقوع میں آگئی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوریت سے شہنشاہی کی طرف متغیر ہونے کے اسباب قطعیہ میں اس ارتقا کو بھی ایک اصولی اہمیت حاصل تھی، اس طرح پر جو شہنشاہی ملک بنا وہ شہری سلطنت کی قدیم شکل سے تجاوز کر جانے کے باعث اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے تغیر شدہ حالات کے حسب خواہ ایک نئی جمہوری شکل کو ترقی دے سکے۔ بدنظمی پیدا کرنے والی اندرونی و بیرونی قوتوں کے مقابلے میں شہنشاہی کی مدافعت کے دشوار گذار مرحلے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پرانے سادے طریقے کی طرف عود کیا جائے کہ کل اختیار ایک شخص واحد کو حاصل ہو جائے۔

دیوکلی تیان اور قسطنطین کے مضبوط ہاتھوں میں شہنشاہی میں جیسی صریحی غیر محدود و مطلق العنانی نمایاں ہو گئی جس طرح گو نہ جمہوری روایات کے اثر کی وجہ سے

ایک منتظم ومنضبط سپہ، حکمرانی کے حصول میں اسے کبھی کامل کامیابی نہیں ہوئی (کیونکہ افواج کا کسی مختار کل (امپریٹر) کے مقرر کرنے کا حق، ہمیشہ اغتصاب کے لئے عمدہ موقع مہیا کرتا اور ملکی جنگ وجدل کا مخزن بنا رہتا تھا)، جسطرح شمال کے نیم وحشیوں کے خلاف اور تجدید شدہ ایرانی شہنشاہی کے مقابلے میں بحیرہ روم کے گرداگرد کی مہذب دنیا کی مدافعت کا کام حد سے بڑھ گیا اور نظم ونسق ملکی کی وہ تقسیم وقوع میں آگئی جو تدریجا اس طرز پر قائم ہوگئی کہ یونانی تمدن لاطینی تمدن سے جدا ہوگیا اور آخرالامر جس طرح پانچویں صدی میں نیم بربریوں کے خروج نے شہنشاہی کے مغربی نصف حصے کو زیروزبر کرکے اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا، یہ سب ایسے مباحث ہیں کہ میری محدود وسعت مجھے ان پر نظر ڈالنے کا بھی موقع نہیں دیتی۔ چونکہ ہماری دلچسپی اس دستور سلطنت کے زیادہ پیچیدہ اشکال پر مرکوز ہے جسے ہم نظم حکومت کہتے ہیں، اس لئے ہم یورپی تاریخ کے اس حصے کو نظرانداز کئے دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ رومانی شہنشاہی کے تخیلات واوارات کے اثرات باقیات نے مغربی یورپ کی ان ملکی سلطنتوں کی تکوین میں کیا کام دیا جو انہدام وتعمیر جدید کے اس طویل دور میں، جسے ہم ازمنۂ وسطیٰ کہتے ہیں بتدریج قومی اتحاد کی جانب قدم بڑھاتی چلی جارہی تھیں۔

پس اسی نقطے پر پہونچ کر ہم قدیم شہری سلطنت کی نسبتاً تیز رفتار ترقی سے پلٹ کر اس جدید ملکی سلطنت کی سست تر ترقی کی جانچ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا ابھی ہم نے صرف ایک جزوی رخ دیکھا ہے کیونکہ فی الواقع اس کا عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی ارتقا کے ان دونوں سلسلوں میں ایسے تشابہات ملیں گے جنھیں غیر اہم نہیں کہہ سکتے مگر ہمارے لئے آغاز کی سہولت اسی میں ہے کہ ہم اولاً ایک اختلاف پر نظر ڈالیں جو بدیہی ہونے کے ساتھ ہی اصولی بھی ہے یعنے اول الذکر صورت کے بہ نسبت موخرالذکر صورت میں جائز بادشاہی کو جو بہت زیادہ وسیع منزلت حاصل ہے اس پر نظر کریں۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں یونانی شہری سلطنتوں میں ارسطو کو اپنے وقت یا اپنے سے قریبی زمانۂ گزشتہ میں جس واقعی بادشاہی کا علم تھا وہ بے قاعدہ، خلاف قانون اور ظالمانہ خودسر حکومت تھی۔ اگر ہم اسپارٹا کے دستور کو نظرانداز کردیں، جہاں نام نہاد بادشاہ زمانۂ قدیم سے یوں ہی چلے آرہے تھے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کو جائز بادشاہی کا علم یا تو نہایت ہی قدیم زمانے کی بادشاہی کا تھا یا نیم بربریوں کی بادشاہی کا تھا، یا یہ کہ اس کے ذہن میں اس کا ایک خیال تھا

جو عمل میں نہیں آسکتا تھا کہ کسی بے نظیر قابلیت کے فرد واحد کی حکومت ہو جیسے وہ واقعتاً ان لوگوں میں نہیں پاتا تھا جن کا اسے تجربہ تھا مگر جب ہم یورپ کی ملکی سلطنتوں کی تاریخ پر نظر کرتے ہیں تو صورت حال بہت ہی مختلف معلوم ہوتی ہے جائز بادشاہی ہر جگہ کا قاعدہ عام ہے اور خالص جمہوری ادارات نادر مستثنیات میں سے ہیں لیکن جائز بادشاہی سے میری مراد غیر محدود بادشاہی سے نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد حکومت کی وہ شکل ہے جس میں ہر نوع اقتدار اعلیٰ کا کچھ نہ کچھ پر از اہمیت حصہ ایک شخص واحد کے ہاتھ میں ہو اور وہ اس قسم کے تغیر پذیر قاعدہ و اطاعت کے تابع نہ ہو جو جمہوری حکمران کی حقیقی خصوصیت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ متمدن ممالک یورپ کی تاریخ کے بیشتر زمانہ میں ان ممالک کے اکثر حصص میں بادشاہ کے اختیارات اصولاً و عملاً کم و بیش محدود تھے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے اہل ملک کی عادت اطاعت پر تھا مگر ان میں غیر مشروط اطاعت کی عادت نہیں تھی۔ بادشاہ کو ان قوانین سے موافقت کرنا پڑتی تھی، جنھیں وہ بدل نہیں سکتا تھا، اور جن جماعتوں اور گروہوں کو اختیار حکومت میں کچھ نہ کچھ آئینی شرکت حاصل تھی ان سے بادشاہ کو کشمکش یا افہام و تفہیم کی نوبت پیش آتی رہتی تھی مگر جمہوری حکام کی طرح سے اسے یہ نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی سرکاری منزلت سے دست بردار ہو کر دوسرے شہریوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہو اور اس سے ان کاموں کی حساب فہمی کی جائے جنھیں وہ اپنے اختیار کی رو سے عمل میں لایا ہو۔

میرا خیال ہے کہ شہری اور ملکی سلطنتوں کے متعلق ہم اس وقت بھی جس تشبیہ سے کام لے سکتے ہیں، خود اس تشبیہ سے ان دونوں قسم کی سلطنتوں کے ارتقا کا فرق بین و مفید طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ میں ہمیں ایک دور ایسا ملا جو خودسروں کا عہد کہلاتا ہے۔ یہ دور، اُن دو زینوں کے درمیان واقع تھا جس میں سے پہلا زینہ یہ تھا کہ قدیم ترین بادشاہی کے بعد عدیدیت معتدل حالت میں نظر آتی تھی اور دوسرا زینہ وہ تھا جب بہت سی سلطنتوں میں عمومیت کا رواج ہو گیا تھا اور عمومی حکومت کی طرف عام میلان صاف نمایاں تھا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا زینہ تھا جس میں بے ترتیب قسم کی بادشاہی کی طرف پلٹنے کا میلان پایا جاتا تھا۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ میلان ہمہ گیری کی حد تک پہنچا ہوا تھا مگر اس کا شیوع اس درجہ ہو گیا تھا کہ ایسے خاص حالات میں (معمولی) نتیجہ خیال کر سکتے تھے۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ارسطو اور عام طور پر مورخوں کی تحریر

کے مطابق خود سرانہ حکومت کا یہ ظہور حکمران امرار کے خلاف عمومی تحریک کی اولین شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرگروہان عوام ہی نے ترقی کرتے کرتے اس ابتدائی خودسری کا جامہ پہن لیا تھا۔ ان پیشواؤں کا اقتدار اس طرح قائم ہوا کہ عوام کو اپنے قدیم ستانے والوں کے مقابلے میں رہبر و محافظ کی ضرورت محسوس تو ہو رہی تھی لیکن ہنوز ان میں حقیقی عمومیت کے حاصل کرنے کی پختگی نہیں آئی تھی مگر ملکی سلطنت کے ارتقار میں ہمیں (یونانی مفہوم میں) خودسری کا کوئی زمانہ نہیں ملتا۔ البتہ ایک دور ایسا ملتا ہے جس میں مطلق العنان بادشاہی یا کم از کم شاہی اختیارات کی بہت بڑی وسعت کا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ دور اپنے آغاز و امتداد کے لحاظ سے مختلف سلطنتوں میں مختلف رہا ہے اور یونان ہی کے مثل یہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہی اختیار کی یہ ترقی کسی حد تک عوام کی تائید پر منحصر تھی اور اسی تائید سے اس کا امکان پیدا ہوا۔ جن مقامات پر مطلق العنانی کی جانب یہ ارتقا بہت ہی تدریجی طور پر ہوا اور جن جگہوں میں یکایک اور دفعتاً واقع ہوا دونوں جگہوں میں، یہ امر عجیب یکساں طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ فرانس اس معاملے میں سب سے مقدم ہے اور وہاں اس کارروائی کا قدم بقدم پتہ چلتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ خاندان "کاپے" محض برائے نام صاحب تاج و تخت ہوا اور ایک وقت وہ آیا کہ لوئی چاردہم کی نسبت یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ یہ کہا کرتا ہے کہ "میں ہی سلطنت ہوں" جملہ مورخین اس امر کے معترف ہیں کہ بادشاہ کو امرا کے مقابل، طبقہ سوم کی تائید سے کس قدر نفع حاصل ہوا، حالانکہ بادشاہ اور متوسط درجہ کے اہالی شہر کے درمیان مختلف طرح کے اتحادی تعلقات قائم ہوتے رہے اور یہ تعلقات بھی ہر حال میں غیر منقطع نہیں رہے۔ دوسری طرف جب ہم نظر غائر سے یہ دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۶۶۰ء میں ڈنمارک ایک ہی زبردست وار میں، حکومت کی اس صورت کو (جو عدیدیت سے بہت ہی قریب تھی) پامال کر کے مطلق العنان بادشاہی کے درجے پر پہنچ گیا تو یہاں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ حکمران امرار کے خلاف بادشاہ اور عوام کا اتحاد ایسا ہی واضح و نمایاں ہے جیسا کہ یونان کی کسی خودسرانہ حکومت کے آغاز میں ہوا کرتا تھا۔

بہرحال سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں یورپی سلطنتوں کے بیشتر حصے میں جس قسم کی مطلق العنانی قائم ہوئی اور جیسے وقت میں قائم ہوئی اس کے مدارج میں اور (یونان کے) دور خودسری کے درمیان ہم ایک طرح کا مبہم سا شائبہ پاتے ہیں، (یورپ) میں اس مطلق العنانی کا قیام ان دو زمانوں کے درمیان واقع ہوا جس کے قبل کا زمانہ وہ ہے

جب بادشاہ کے رقیب کی حیثیت سے امرا کی طاقت نہایت ہی خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی اور جس کے بعد کا زمانہ وہ ہے جس میں ہم اس وقت موجود ہیں اور جس میں روس کے علاوہ یورپ میں اور ہر جگہ نیابتی عمومیت نے حکومت میں بہت بڑا حصہ حاصل کر لیا ہے۔ ترقیوں کے ان دونوں مدارج عمل میں یہ بھی مشابہت موجود ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں جب وہ دور ختم ہو گیا جو مطلق العنان بادشاہی کے لئے بالتخصیص مفید و موزوں تھا تو نئے دستوروں کا میلان، عمومی خصوصیات کی طرف اس سے زیادہ ہو گیا جتنا اس سے قبل کی خودسرانہ حکومتوں یا مطلق العنان بادشاہی کے دستوروں میں تھا۔ جو واقعات ہمیں معلوم ہیں، ان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ باوجود کوشش کے بھی امرا کے قدیم غلبہ و فوقیت کی تجدید کسی طویل زمانہ کے لئے تو قطعاً ناممکن ہو گئی مزید براں، جہاں کہیں عمومیت کا تمام اشتداد اور عدم استقلال کے ساتھ ہوا، وہاں قدیم و جدید دونوں حالتوں میں ہمیں ان موخر قسم کے جابروں کے نمونے ملتے ہیں جو عمومیت کے بعد ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس موقع پر اس مثال میں بہت زیادہ گہری مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس قسم کے بادشاہوں نے قدیم و جدید دونوں زمانوں میں بالعموم خلاف قانون و جابرانہ ہی طریقے پر اقتدار حاصل کیا ہے، جیسا کہ فرانس اور جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں ہوا۔

۳۔ لیکن یہ مشابہت اگرچہ کسی حد تک جائز و معنی خیز ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شہری سلطنت کے بہ نسبت ملکی سلطنت میں بادشاہی کی جانب میلان بدرجہا زیادہ قوی تھا کیونکہ موخر الذکر سلطنت کے عدیدی دور کے اثنا میں جہاں کہیں عدیدیت بہت کچھ مستحکم ہو چکی تھی، وہاں بھی حکمران افراد نے اپنے بادشاہ سے گو خلاصی نہیں حاصل کر لی تھی، انھوں نے بادشاہ کو قائم رکھا اور کچھ نہ کچھ بلکہ بالعموم معتدبہ اختیارات بھی اس کے ہاتھ میں رہنے دیئے۔ مختصر یہ کہ ہم حقیقی دور تاریخ کی یونانی شہری سلطنتوں کی زندگی کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ جائز بادشاہی (تقریباً) کہیں بھی اور کسی وقت میں بھی نہیں پائی جاتی تھی، اس کے برعکس یورپ میں جو ملکی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں اور رومانی شہنشاہی کے وقت سے ان میں قومی زندگی پیدا ہو گئی تھی ان کی نسبت ہم کم و بیش یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں جائز بادشاہی ہر جگہ اور ہر وقت میں پائی جاتی ہے۔ قلیل التعداد اہل دولت اور قدیم خاندان والوں کی حکمرانی اور عامۃ الناس کی حکمرانی ہر ایک اپنے اپنے مناسب موقع پر غلبہ حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتی رہی مگر یہ غلبہ صرف جزوی ہوتا تھا اور ہر وقت اس میں جزر و مد کی کیفیت پائی جاتی تھی مگر بادشاہی اپنی جگہ پر قائم تھی۔

آخر اس امر عجیب کے اسباب کیا ہیں؟ میرے خیال میں اس کا خاص سبب وہی ہے جس کا ذکر میں یونانی شہری سلطنتوں کی ابتدائی بادشاہی سے منقلب ہونے کی بحث میں ضمناً کر چکا ہوں[۱]۔ یعنی بادشاہ کی ذات سے جو اتحاد پیدا ہوتا ہے وہ ملکی سلطنت میں ایک ایسا رابطۂ ضروری اور ایک ایسا نشان اتحاد و وابستگی ہے کہ جو شہری سلطنت کے بہ نسبت ملکی سلطنت میں زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے، کیونکہ شہری سلطنتوں میں شہریوں کا باہم ملنا جلنا اور اتحاد و اجتماع زیادہ آسان ہوتا ہے اور اس پر ہم یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ اجتماعی ہستی کا یہ موثر و عیاں نشان و رابطہ ان شہروں ہی میں پایا جاتا تھا جن کے اندر ہی ان کے بازار اور معابد موجود ہوتے تھے۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ملکی سلطنت کی تکوین کی کارروائی بہت ہی سست رفتار کارروائی ہوا کرتی ہے، میرا مطلب اس کارروائی سے یہ ہے کہ سلطنت کو حقیقی ذی حیات قومی اتحاد کی اس حد پر لایا جائے جس حد پر ہم مغربی یورپ کی سر برآوردہ سلطنتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جو قوتیں ارتباط کی طرف مائل ہوتی ہیں، ان کا مقابلہ ان قوتوں سے رہتا ہے جن کا میلان انتشار کی جانب ہوتا ہے اور اس میں انھیں کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکامی اور اسی طرح صدیاں گزر جاتی ہیں۔ پس جس قدر قومی اور اک اور احساس میں ترقی ہوتی جاتی تھی اور اتحاد و انتظام کی حاجت جس قدر شدت سے محسوس ہوتی جاتی تھی اس حاجت کو بروئے کار لانے کے لئے بادشاہی کی ضرورت بھی اسی زور و قوت کے ساتھ محسوس ہوتی جاتی تھی۔ اس کا جواب بالعموم یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ جمہوری انتظام قائم ہو جائے بلکہ متصادم قوتیں سلطنت کے پرزے پرزے کر ڈالتی تھیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فرانس کی قدیم تاریخ میں جب کارولنجی خاندان شاہی سے کاپیٹی خاندان کی طرف منقلب ہوتے وقت بادشاہ کا اختیار عملاً انتہائی پستی کو پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ امرائے عظام یہ کوشش کرتے کہ کوئی عدیدیت قائم ہو جائے اور وہ بہ حیثیت ایک جماعت کے فرانس پر حکمران ہو جائیں بلکہ ان کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا ایک بے ترتیب گروہ بن جانا چاہتے تھے جس میں ہر ایک اپنے اپنے ضلع میں بادشاہی اختیارات عمل میں لائے۔

لیکن اگرچہ میری دانست میں بادشاہی کی برتری اور فوقیت کا خاص سبب یہی معلوم ہوتا ہے، تاہم دوسرے اسباب بھی اس کے ساتھ عمل کر رہے تھے اور ان میں سے خاص سبب خود رومانی شہنشاہی کا وجود سابقہ تھا۔ مغرب کی رومانی شہنشاہی پانچویں صدی

[۱] خطبۂ چہارم ص ۱۰۱

میں ختم ہوگئی تھی مگر شہنشاہی کے خیالات اس سے بہت زیادہ زمانے تک زندہ رہے اور مطلق العنان بادشاہی کے دور کے قائم ہونے تک یورپ کے ارتقائے مابعد پر اثر انداز ہوتے رہے۔ اولاً یہ کہ جب پانچویں صدی میں بربریوں نے متمدن دنیا کو پامال کرنا شروع کیا، اس وقت یہ متمدن دنیا مطلق العنان بادشاہی کے تحت میں تھی اور جن چار صدیوں میں بربریوں کو اس مہذب دنیا سے واقفیت ہوتی رہی، اس تمام دوران میں وہاں مطلق العنان بادشاہی کا دور دورہ رہا تھا اس لئے جب رومانی صوبوں کے بجائے وحشیوں کی نئی شاہیاں قائم ہوئیں، تو ان صوبوں کی زیادہ مہذب آبادی نے مطلق العنان بادشاہی کے خیالات و عادات بربریوں تک پہنچائے۔ بربریوں کا اپنے سے فائق تر تمدن کے ذہنی اثر کے سامنے کسی حد تک سر جھکا دینا لازمی تھا، اور انھوں نے جس حد تک سر جھکایا ان پر اس بادشاہی کے طرز کا ہی اثر پڑا۔ فرنگی بادشاہی کے معاملے میں ہمیں یہ اثر بہت صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے اور جدید یورپ کے سیاسی اوارات کے بنانے میں اس بادشاہی کو مقدم جگہ حاصل ہے ہم فرانس میں قدیم ترین مروونجی بادشاہی کے اوائل زمانے تک میں اس اثر کو دیکھتے ہیں، اگرچہ اس موقع پر ایسا ہوا کہ فتح کی وجہ سے شاہی اختیار کے بڑھانے کا جو جوش پیدا ہو گیا تھا وہ حکومت کے کام میں (جو فتوحات کی وجہ سے بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا) موروثی بادشاہ کی عدم قابلیت کی وجہ سے بہت جلد دب گیا، چارلس اعظم جس نے واقعاً تاج شہنشاہی زیب سر کیا اس کی بادشاہی کے زمانے میں یہ اثر اور بھی زیادہ نمایاں طور پر دوبارہ ظاہر ہوا، اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ رومانی شہنشاہی کے جس اثر کی اس طرح تجدید ہوئی وہ اسی طاقت تک محدود نہیں رہا جو حکمرانوں کے اس سلسلے کو حاصل تھی جنھوں نے شہنشاہی تاج سر پر رکھا تھا۔ اگر کلیم اتنا ہی ہوتا تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ جس جرمانی بادشاہی کے ساتھ یہ شہنشاہی منصب مدغم کر دیا گیا تھا اس کی موثر قوت بڑھنے کے بجائے گھٹ گئی تھی مگر ہمیں یہ لحاظ کرنا ہے کہ خیالات پر اس کا اثر پر زور طور پر اس کے برعکس ہوا تھا، اس نے لوگوں کی چشم دل کے سامنے ایک قدیم عزت و اختیار والی بادشاہی کو اس حیثیت سے قائم رکھا کہ وہی عام طور پر حکومت کی اعلیٰ ترین شکل سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد بارہویں صدی میں رومانی قانون کے مطالعے کی تجدید سے شہنشاہی کے خیالات نے قانون پیشہ گروہ کے وسیلے سے ایک نئی اور اہم صورت میں زور پکڑا۔ اس دور جدید کے اہل قانون جنھیں رومانی مقننوں سے تعلیم حاصل ہوئی تھی ان کا میلان

برابر یہی رہا ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ قانون کے تعلق کی نسبت وہی خیال قائم کریں جو روما نی مقننوں کا تھا اور اس طرح تا حد امکان جدید بادشاہ کی حیثیت کو قدیم شہنشاہ کی حیثیت کے ہم پلہ قرار دینے کے لئے برابر ناواجب میلان قائم رکھیں۔

میرے خیال میں بادشاہی کے جانب کے ان اثرات کے ساتھ جن کا تعلق رومانی شہنشاہی سے ہے مسیحی کلیسا کے اثر کے اہم جزو کا بھی اضافہ کرنا چاہیے، لیکن اس بیان کو محدود و مشروط کر دینا چاہیے کیونکہ یہ اثر پیچیدہ اور تغیر پذیر قسم کا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے ہمیں دو امور میں امتیاز کرنا ہے یہاں ایک طرف تو وہ قوت تھی جس کا نفاذ کلیسا ایک منتظم جماعت کی حیثیت سے کرتا تھا اور ان میں اسے اپنے مادی اغراض کی حفاظت کرنا پڑتی تھی، دوسری طرف وہ سیاسی خیالات و جذبات تھے جن کا میلان قدیمی عیسویت کے ساتھ وابستہ ہو جانے کی طرف تھا اور جن کی اشاعت کے لئے پادری واعظ دورہ کرتے پھرتے تھے۔ اس امتیاز کی ضرورت یہ تھی کہ یہ دونوں قوتیں اکثر ایک دوسرے سے مختلف راستے اختیار کر لیتی تھیں۔ تاریخ یورپ کے تمام دور میں یہ ہوتا آیا ہے کہ کلیسائی عضویت کی حیثیت سے مذہب کیتھولک کے ساتھ اکثر مختلف یورپی ممالک کی شاہی حکومتوں کا سخت تصادم برپا ہو جاتا تھا اور جب ایسا ہوتا تھا تو کلیسا نظم معاشرت کی دنیاوی تنظیم کے ان عناصر و میلانات کے ساتھ ہو جاتا تھا، جو شاہی یا کم از کم مطلق العنانی کے خلاف ہوتے تھے تاکہ وہ اس معرکے کو زیادہ خوبی سے سر کر سکے، لیکن اپنی مادی تنظیم اور اس سے متعلقہ جذبات سے علٰحدہ ہو کر مذہب کیتھولک اپنا اثر نظم و انتظام اور اس لئے بادشاہی کی جانب سے کام میں لاتا تھا۔ وہ عام الفاظ میں "موجود الوقت طاقتوں" کے مطیع رہنے کا حکم دیتا تھا، مگر ان طاقتوں کی نسبت اس کا روایتی تصور شاہی کا تھا۔ اس کا نشو و نما مطلق العنان شاہی کے زیر سایہ ہوا تھا، اور اس طرح تخیل و تصور کے جو عادات اس میں راسخ ہو گئے تھے، انھیں عادات کو اس نے اس دور تک پہنچایا جب بربریوں کے حملے کے بعد سیاسی نظم کی شکست و ریخت اور تعمیر جدید ہونے لگی تھی، اور اسی وجہ سے کلیسا کا میلان یہ ہو گیا کہ وہ شاہی کی مخالف قوتوں کو بدعمل و غداری سمجھنے لگا۔

ان تمام اسباب کے جمع ہو جانے کا آخری نتیجہ بالعموم مغربی یورپ کے اقوام میں یہ ہوا کہ صحیح معنی میں ازمنۂ جدید کی تاریخ کا اولین دور، وہی دور رہا ہے جسے مطلق العنان

بادشاہی کا دور کہہ سکتے ہیں (ازمنۂ جدید کی تاریخ سے مراد اس زمانے کی تاریخ سے ہے جب مغربی یورپ کی سلطنتیں کامل طور پر مہذب نظم میں آگئیں)، اس زمانے میں، حکومت کے ذرائع عمل کا تمام نظم ایسے موروثی بادشاہوں کے تحت اقتدار میں آگیا کہ وہ اپنی مرضی کو جس جگہ بھی کام میں لانا چاہتے کوئی وہاں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا اور یہی نظم نہ صرف واقعتاً حاوی و غالب طرز ہو گیا بلکہ بہت وسعت کے ساتھ اسی کو سیاسی تنظیم کی وہ شکل سمجھا جانے لگا جو منتظم تمدن کے برقرار رکھنے کے لئے موزوں تھی۔ مغربی یورپ کی سلطنتوں کو بالعموم یہ درجہ سترہویں صدی میں نصیب ہوا یعنی ان مذہبی جنگوں کے بند ہو جانے کے بعد جنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسیات سے ازمنۂ جدید کی سیاسیات کی طرف منقلب ہونے کے معاملے میں ایسا سخت طوفان برپا کر دیا تھا۔ فرانس اس جدید شاہی کا مقدمۃ الجیش تھا۔ اسی نے اسکے طرز و طور کو ڈھالا اور اسی نے اس کے خیالات کو شائع کیا، مگر اور ملکوں کے حالات بھی کافی حد تک فرانس ہی کے مثل تھے، جس سے اس مطلق العنان بادشاہی کو تمدن یورپ پر طبعاً غلبہ حاصل ہو گیا۔

۴۔ اس کے بعد خطبات کا جو سلسلہ آتا ہے ان میں میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ اس عمل کو درجہ بدرجہ بیان کروں جسکے وسیلے سے یہ عام نتیجہ حاصل ہوا تھا۔ میں اس کی ابتدا اس کے خاص خاص مدارج کے نشان دینے سے کروں گا اور کوشش کرونگا کہ ترقی پذیر نظمہائے معاشرت کے ان خاص عناصر کے نمایاں خصوصیات امتیاز بیان کروں جنھیں مختلف دوروں میں قوت و اہمیت حاصل تھی۔

ان عناصر پر بحث کرنے میں ہمیشہ اس امر کو مدنظر رکھنا ضروری و اہم ہے کہ یورپ کی ملکی سلطنت کے سیاسی حالات یونانیوں کی شہری سلطنت کے حالات کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یونانی سلطنت میں ہمیں ایک ایسی قوم نظر آتی ہے جسکے ابتدائی حالات بہت زیادہ زرعی نوعیت کے تھے، وہ ایک ایسی زرعی قوم تھی جس میں مزروعہ زمین پر شخصی ملک کے قائم ہو جانے کے بعد کامل الحقوق شہری ایسے زمیندار بن گئے جو خود اپنی زمین کی پیداوار پر بسر کرتے تھے (خواہ وہ خود اس زمین کو جوتتے بوتے ہوں یا دوسروں کے ذریعے سے ایسا کرتے ہوں) اور جنگ میں خود اپنے خرچ سے شریک ہوتے ہوں، لہٰذا وہاں جب جائداد کی عدم مساوات کا رواج ہوا تو بڑے زمیندار دکل

میلان یہ ہوگیا کہ وہ سیاسی اختیار کو ہضم کرلیں اور وہ اقتصادی حیثیت میں چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو ستانے لگیں۔ لیکن جو قومیں تجارت وتمدن میں پوری تیز رفتاری کے ساتھ گامزن تھیں ان میں آہستہ آہستہ شہری حالات وکیفیات، زرعی حالات وکیفیات پر غالب آگئیں۔ یہ متمول زمیندار نصیلدار شہروں کے سربرآوردہ باشندے بن گئے اور بعد میں شہریت کے لئے ارضی ملکیت کی شرط لازمی او صاف سے ساقط ہوگئی۔ قوم کی مذہبی و دنیاوی دونوں زندگیاں شہر کی مادی ہیئت مجسمہ کی وجہ سے یکساں ہوگئیں۔

ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ کی تحقیقات میں، قدیم شہری سلطنت کے ابتدائی دور کی طرح ہمیں ارتقا کا خاص رشتہ وہی تعلق نظر آئے گا جو اتنی مدت تک سیاسی اختیار اور ارضی ملکیت کے درمیان قائم رہا تھا اور اسی کے ساتھ وہ تغیرات بھی ہوں گے جو اس تعلق کو اس تمام زمانے میں پیش آتے رہے، جب قوم جاگیری دور میں داخل ہوئی اور پھر اس میں سے گزر گئی لیکن اس ترقی کا ایک دوسرا رشتہ بھی ہے جو کبھی تو اس سابقہ رشتے کے برابر رہتا اور کبھی کبھی اس میں الجھ بھی جاتا تھا، یہ ملکی سلطنت کے اندر ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری رکھنے والے شہروں اور قصبوں کا ترقی پانا ہے۔ علیٰ ہذا، ازمنۂ وسطیٰ کی یورپی تاریخ کی مخصوص ہیئت کے طور پر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ بہ حیثیت ایک جماعت کے پادریوں کی جداگانہ منتظم موجود تھی جس کی ہیئت ومشغلہ زندگی اگرچہ دنیاوی حکومت کی ہیئت اور قوم کے سیاسی نظم کی زندگی میں ملی ہوئی تھی، پھر بھی اس سے ممیز تھی۔ ان میں سے ہر ایک صورت میں تاریخ کے عالمانہ مطالعہ کرنے والے کو ان عناصر کے سیاسی ارتقا کا جدا جدا پتا چلانا اور بہ حیثیت مجموعی قوم کے ارتقا کے ساتھ ان کے تغیر پذیر تعلقات کا بھی سراغ لگانا ہے۔ کلیسا اور بلدیہ دونوں نے جدید یورپی سلطنتوں کی تکوین میں مدد دی ہے اور یہ مدد سیاسی اہمیت رکھتی ہے مگر ان میں سے ہر ایک عنصر خاص خاص مواقع اور خاص زمانے میں ایک ایسی قوت بن جاتا تھا جو قومی اتحاد کی ترقی میں سد راہ ہوجاتا۔ کلیسا تو اس طرح سد راہ ہوتا کہ اس کا میلان مذہبی حکومت قائم کرلینے کی طرف تھا اور شہروں نے یہ دقت ڈالی کہ انھوں نے تنہا یا دوسرے کے ساتھ متفق ہوکر ایسی خود مختاری حاصل کرلینے کی کوشش کی جو قومی اتحاد و ارتباط کے منافی تھی۔

پس جبکہ میں نے ابھی ابھی یورپی بادشاہی کی یہ خصوصیت قرار دی کہ وہ عہد بدعت کے انتشار انگیز و بدنظم میلانات کے مقابلے میں گویا اتحاد ونظم کی نمائندہ تھی، تو میں نے اس کی حالت

کی یہ ایک ناکمل صورت پیش کی ہے، کلیسا نے جب ایک غیر ملکی حکمران کے زیر اثر اپنے حکومت مذہبی کے ادعا کو انتہائی حد پر پہنچا دیا، تو اس وقت کلیسا کے خلاف بھی بعض مواقع پر سلطنت کو اس قسم کی مقاومت کی ضرورت پیش آئی، اور شہروں اور ذی اختیار بلدیات نے جب ادعائے خود مختاری کو حد سے آگے بڑھایا تو ان کے مقابلے میں بھی ایسی ہی ضرورت لاحق ہوئی۔ بادشاہ کے منصب کو تقویت اس امر سے تھی کہ جب مختلف و متصادم عناصر قوم کی خود مختاری و ارتباط میں دراندازی کی طرف مائل ہوتے تو ان کے مقابلے میں بادشاہ قومی اتحاد و تنظیم کا نمائندہ بن جاتا تھا۔

۵۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں شہروں کا نشو و نما خطبات مابعد کا موضوع ہوگا۔ یہاں میں صرف اس قدر بیان کروں گا کہ جہاں اس نشو و نما کو نہایت درجہ کمال و نمو حاصل ہوا وہاں اسے یہ موقع جدید یورپی سلطنتوں کے پیچ در پیچ حالات کے ایک دوسرے عنصر یعنی مقدس رومانی شہنشاہی کی وجہ سے میسر آیا۔ میں ان خیالات کا ذکر کر چکا ہوں جو قدیم رومانی شہنشاہی کے بعد ذہنی قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے اور جن کا زور بادشاہی کی جانب بڑھ رہا تھا، اور میرے خیال میں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شہنشاہی لقب کی تجدید سے اس عام رائے کے قائم رکھنے میں مدد ملی کہ ایک اعلیٰ و برتر شخص کی مرضی کے مطابق حکومت کا ہونا ایک طبعی و معتدل حالت ہے لیکن (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) اس میں بھی شک نہیں ہے کہ مقدس رومانی شہنشاہی بجائے خود شاہی کے لئے تقویت کا باعث ہونے سے زیادہ ضعف کا سبب بن گئی تھی۔ اوٹو اعظم کے عہد سے ان دونوں ملکوں کا یہی حال رہا جن میں القاب شہنشاہی کے دامن دولت سے وابستہ بلند بانگ اور گونہ تہی باطن دعاوی نے قومی بادشاہی کو پست کر دیا تھا۔ اگر مقدس رومانی شہنشاہی نہ ہوتی، یعنی اگر جرمانی بادشاہوں کو جرمنی کا بادشاہ رہنے سے زائد کچھ طمع نہ ہوتی، اگر ان کی توجہ برابر اطالیہ کے مہمات کی طرف منعطف نہ ہوتی رہتی اور ان کے خزانے انھیں لڑائیوں میں خالی نہ ہوتے رہتے، تو پھر مجھے کوئی صاف وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ختم ہونے تک فرانس وانگلستان کی طرح جرمنی نے بھی بادشاہ کے تحت میں قومی اتحاد کیوں نہ حاصل کر لیا ہوتا۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا کہ آغاز تاریخ جدید کے وقت ہم اسے جس حالت میں پاتے ہیں وہ حالت نہ ہوتی یعنی وہاں چھوٹی بڑی امارتوں کی وہ کثرت نہ ہوتی جس سے عقل حیران ہو جائے اور جن کے اتحاد باہمی کا وسیلہ اسی نام نہاد شہنشاہی کا ناکمل رشتہ ہو۔ ٹیوٹنی قومیں باہم ملکر یقیناً اتنی بڑی سلطنت قائم کر لیتیں جتنی بڑی سلطنتیں ان کے شمالی رشتہ داران اہل اسکنڈنیویا نے قائم کر لی تھی۔

اگرچہ اس میں نسبتاً شک کا پہلو زیادہ غالب ہے مگر ایک متحدہ اطالیہ بھی اس طرح قائم ہو سکتی تھی یا کم از کم ایک شمالی اطالیہ ہوتی اور ایک جنوبی اور غالباً پوپ کے علاقے سے یہ تقسیم واقع ہوتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہونے کے بجائے جو کچھ واقعاً پیش آیا اس کا تعلق عجائبات تاریخ کے اس بڑے حصہ سے ہے جسے ہم محض امر اتفاقی کا نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہیں، یعنی ہم صاف طور پر ایسے عام اسباب کا پتا نہیں چلا سکتے جن سے یہ نتیجہ ظہور پذیر ہوا ہو اور جنکی قوت عملاً ناقابل مدافعت ہو۔ اگر ۸۰۰ء میں ایسی نادر، دبر زور قابلیت کا ایک بادشاہ موجود نہ ہوتا کہ ہم اسے محض ایک امر اتفاقی سمجھنے پر مجبور ہوں، تو بظاہر اسباب اس توقع کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس سال مغرب میں رومانی شہنشاہی کی تجدید وقوع میں آتی، اور اگر چارلس اعظم کی ذات سے مقدس رومانی شہنشاہی نہ قائم ہوگئی ہوتی تو اس خیال کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اس کا قیام کسی وقت میں بھی ہوا ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں جب کہ مغرب کی رومانی شہنشاہی کو تازہ تازہ زوال ہوا تھا، اس وقت کلیسا نے شہنشاہی کو دوبارہ قائم کرنے کی متواتر کوششیں کی تھیں، اس نے وحشی بادشاہوں سے یہ التجائیں کی تھیں کہ وہ رومانی شہنشاہ بن جائیں رومانی شہنشاہ کے حقوق اختیار کریں اور کلیسا کے ساتھ وہی تعلقات قائم کریں، جو رومانی شہنشاہوں کے تھے۔[1] لیکن بربریت کی حملہ آوریوں میں، قدیم تمدن جس قدر زیادہ شکست ہوتا گیا، اسی قدر یہ کوششیں بھی فنا ہوتی گئیں، اور جب دسویں صدی کے اختتام کے قریب نظم معاشرت و کلیسا دونوں ساتھ ساتھ اس حالت سے نکلنے لگے تو اس وقت تک مغرب کی رومانی شہنشاہی ایسی گزری بیتی ہو چکی تھی کہ اگر چارلس اعظم کے زبردست ہاتھوں سے فرنگی بادشاہی اس جلیل القدر وسعت کو نہ پہونچ گئی ہوتی اور نیز چارلس نے رومن کیتھولک مذہب کا حامی بنکر شاہی میں یہ وسعت نہ حاصل کی ہوتی تو رومانی شہنشاہی کی تجدید کا قابل العمل سمجھا جانا بہت دشوار تھا۔ پس اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں

---

[1] ملاحظہ ہو گیزو کی "تاریخ تمدن یورپ"۔

کہ اگر چارلس اعظم نہ ہوتا تو اوٹو اور اسکے جانشین محض جرمانی بادشاہ ہوتے۔

یہ ملحوظ رہے کہ (میرے قول کے مطابق) یہ امر اتفاقی شاہی مطلق العنانی کے اس وسیع وعام نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا جو اسے سترھویں صدی کے آخر میں حاصل ہوئی۔ صرف جرمنی اور شمال اطالیہ میں شاہی اختیارات ان متعدد چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ذریعہ سے عمل میں آتے تھے جنھوں نے جرمنی میں عملاً خودمختاری حاصل کرلی تھی اور اطالیہ میں باضابطہ خودمختار ہوگئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض آزاد شہری بادشاہیاں بھی ان میں باقی رہگئی تھیں، جو ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعتوں کے ارتقائے عظیم کے نتائج تھیں اور جنکی نسبت میں خطبات مابعد میں آپ کی توجہ منعطف کروں گا۔ لیکن حکومت کے مروجہ طرز کے لحاظ سے انجام کار جرمنی واطالیہ کے اندر بھی نتیجہ حقیقتاً تاہم ہی ہوا جو اور مقامات پر ہوچکا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس کارروائی سے یہ نتیجہ حاصل ہوا وہ اصولاً مختلف تھی۔ شہنشاہی کے باہر جس قوت کو فتح حاصل ہوئی وہ مرکزی قوت تھی۔ امرائے عظام کو سر جھکا کر (وابستگان شاہی) میں داخل ہونے پر قناعت کرنا پڑی (اس کے برخلاف) جرمنی میں انھوں نے شاہی یا امارت عظمیٰ کے تاج خود اپنے سروں پر رکھ لیئے [1]

۶- پس عام طور پر مغربی یورپی سلطنتوں کے متعلق عناصر کی مذکورہ بالا پیچیدگی کو ذہن میں محفوظ رکھکر ہمیں تغیر کی کارروائی کے ان مدارج کی مختصر طور پر جانچ کرنا چاہیئے جو ان سیاسی ادارات میں واقع ہوئے جو بربریوں کے حملوں سے شکست ہوکر رومانی شہنشاہی کے اجزائے طور پر باقی رہ گئے تھے (نیز ان جدید ممالک میں بھی اس کی جانچ کرنا چاہیئے) جو زیادہ تر مسیحیت کے پھیلنے کی وجہ سے اس ترقی پذیر تمدن میں شریک ہوگئے تھے جس میں قدیم وجدید عناصر ملے ہوئے تھے۔ ارتقا کی مختلف روشوں میں اس کارروائی کا سراغ لگاتے وقت خاصکر فرانس

[1] شمالی اطالیہ کی سلطنتوں میں یہ نتیجہ بلدی جمہوریت کی ایک دوسری کارروائی سے حاصل ہوا۔ یہ بلدی جمہوریت اول ہاول تو جاگیریت پر غالب آئی اور پھر وہ (مطلق العنانی) کے آغوش میں جا پڑی اور یہ مطلق العنانی ترقی کرکے موروثی بادشاہی بن گئی مگر اسکے مطلق العنانانہ وصف میں کچھ کمی نہ ہوئی۔

داہین کے مقابلہ میں جرمنی واطالیہ کے معاملہ میں اس امر کے زیر نظر رکھنے سے مدد ملتی ہے کہ بالعاظ عام یہ مختلف طریقے گھوم پھر کر صرف اس نتیجۂ واحد پر نہیں پہنچ جاتے کہ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں مطلق العنان بادشاہی قائم ہو گئی تھی بلکہ ہر ایک قوم میں دنیاوی طاقت کے خاص مخزن کے لحاظ سے ان کی ابتدا بھی ایک ہی طرح سے ہوتی تھی یعنی یہ طاقت قدیم ٹیوٹنی قوم سے حاصل ہوئی جیسا کہ میں اپنے دوسرے خطبے میں بیان کر چکا ہوں۔

میں پہلے یاد دلا چکا ہوں کہ اس قوم کا جو ابتدائی حال ہمیں معلوم ہوا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ اختیار مسلح آزاد اشخاص کی قبایلی جمعیت کو حاصل تھا اسی جمعیت میں صلح و جنگ کا تصفیہ ہوتا تھا شدید جرائم کے لئے سزا دیجاتی تھی، مقامی حلقوں کی صدارت کے لئے سرداروں کا انتخاب ہوتا تھا اور جنگ کے لئے سپہ سالار انھیں سرداروں میں سے منتخب ہوتے تھے بعض صورتوں میں جنگ کی سپہ سالاری کا تعلق کسی بادشاہ کی ذات سے ہوتا تھا لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ٹیسیٹس کے زمانے میں بہت کم ایسا ہوتا تھا۔ بادشاہ بھی انتخاب سے ہوتا تھا لیکن عام طور پر وہ ایک ہی خاندان سے لیا جاتا تھا اور جنگ و صلح دونوں میں وہی مستقل سردار ہوتا رہتا تھا۔ چونکہ ہمسایہ رومانی تمدن کے زیر اثر جرمانی قبایل کا مجموعہ زیادہ تھا اس لئے برضا و رغبت یا کم و بیش جبر و اکراہ سے بادشاہی کو وسعت ہوتی جاتی تھی کیونکہ ان مجموعات کو باہم متفق رکھنے کے لئے اسی رشتے کی ضرورت تھی۔ بعد ازاں چونکہ رومانی فوج میں یہ بربری روز بروز زیادہ داخل ہوتے جاتے تھے اور اسی طرح جرمانیوں کو متمدن طریقے کی جنگ سے خود رومانی فوجوں کے اندر اور اس کے بالمقابل تربیت حاصل ہوتی جاتی تھی، اس سے رومانی فوجیں اور رومانی شہنشاہی کی متمدن دنیا روز بروز جرمانیوں کے لئے شکار بنتی جاتی تھی آخر کار یہ سد اس درجہ کمزور ہو گئی کہ وہ جرمانیوں کو روکنے کے قابل نہ رہی اور وہ صوبوں میں پھیل گئے۔ اول اول ان کا داخلہ نہ تو فاتحانہ حیثیت سے ہوا اور نہ شہنشاہی کے مسلمہ دشمن کے طور پر بلکہ زیادہ تر یہ لوگ شہنشاہی کی فوقیت تسلیم کرنے اور شہنشاہی اگر سامان بہم پہنچا دے تو اس کے فوجی مددگار بن

کے طور پر کام کرنے کے لئے بھی بالکل آمادہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پانچویں صدی کے اوائل میں یہ بھی صاف طور پر واضح ہوگیا تھا کہ شہنشاہی کے مغربی صوبوں میں ان جرمانیوں کے بہت بڑے بڑے گروہ ٹھیرنے کی نیت سے آگئے تھے۔ کچھ جور و زیادتی اور کچھ آپس کی قرارداد اور افہام و تفہیم سے یہ آنے والے اکثر آہستہ آہستہ ایسے معاونین کی حیثیت سے (جن کے قیام و آرام کا انتظام باشندگان صوبجات کے ساتھ کردیا گیا تھا) ایسے فاتح بن گئے جنھوں نے ان صوبوں کے باشندوں کے لئے خود ان کے املاک میں سے کم و بیش ایک معقول حصہ چھوڑ دیا ہو۔ مغربی یورپ کی رومانی حکومت میں اس قسم کا جو انقلاب اور آپس کا جدال و قتال برابر جاری رہا وہ سب اس کارروائی کے لئے مؤید و باعث سہولت ہوگیا۔ آہستہ آہستہ یہ عیاں ہوگیا کہ ان ممالک میں فوجی قوت کا غلبہ بہت زور کے ساتھ وحشیوں کی جانب میں ہوگیا ہے۔ شہنشاہی کا اختیار خاص رفتہ رفتہ فنا ہونے لگا اور کم از کم کوہ آلپس کے پار تو بالکل ہی درہم و برہم ہوگیا اور پانچویں صدی کے ختم ہونے کے قبل ہی ان بربری بادشاہوں نے دریائے رائن سے بحر اوقیانوس تک اور بحر جرمانی سے صحرائے افریقہ تک جرمانیوں کے ساتھ رومانیوں پر حکومت کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیلیا۔

اب ہم اپنی توجہ فرینکی بادشاہی پر مرکوز کرتے ہیں کیونکہ بعد میں اسی بادشاہی کے چارلس اعظم کی شہنشاہی کی صورت میں وسیع ہوجانے کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی ادارات کے تعین میں اس کو تقدم حاصل ہوگیا تھا۔ میں یہ کہ سکتا ہوں کہ فرینک جب کلووِس کے تحت میں حاوی و غالب ہوگئے تو گاتھ اور برگنڈی وغیرہ کے ایسے دوسرے وحشیوں کے بہ نسبت انھوں نے رومانی خو بو کم اختیار کی اور ان کے دستور سے نمایاں طور پر ابتدائی دولت عامہ کے خصائص ظاہر ہوتے رہے۔ نئی بادشاہی کے بننے کا اولین نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا اختیار و اعزاز بڑھ گیا۔ مختلف قوموں کے لئے وہی واحد رشتہ اتحاد ہوگیا۔ سابق رومانی رعایا کے لئے وہ شکستہ و افتادہ رومانی شہنشاہی کے بمنزلہ ہوگیا اور بہتوں کے لئے بلکہ خود جرمانیوں تک

کے لئے وہ ایک فاتح کی حیثیت میں آگیا۔ تمدن فرینک انتشار کی وجہ سے سیاسی طور پر کمزور ہو گئے اور اگرچہ فوج نے اس امر کو یاد رکھا کہ وہ مسلح بردار آزاد اشخاص کی ایک جمعیت ہے اور گاہ بگاہ سیاسی نازک وقتوں میں موثر طور پر مداخلت بھی کرتی رہی تاہم قوم کے معاملات کے انصرام میں معمولی آزاد اشخاص کا شریک ہونا بند ہو گیا۔ جنگ جویوں کی شاذ ونادر جمعیت ہی عملاً محض فوجی معائنہ ہو گئی اور مقامی حلقے منتخب شدہ عہدہ داروں کے بجائے شاہی عہدہ داروں کے زیر نگرانی آ گئے۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ عام آزاد اشخاص کے ہاتھ سے جو قوت اس طرح نکل گئی تھی اس پر زیادہ تر قدیم جماعت امرا نے قبضہ کر لیا ہو بلکہ اس کا میلان زیادہ تر یہ تھا کہ وہ قوت ان امرا (کاؤنٹوں اور ڈیوکوں) کے ہاتھوں میں باقی رہی جو میرووَنجی بادشاہوں کے تحت میں اس زمانے میں فرینکی بادشاہی کے صوبوں کا انتظام کرتے تھے جب یہ بادشاہ نظم وارتباط کے قائم رکھنے کے ناقابل ہو گئے تھے لیکن یہ امرا (کاؤنٹ اور ڈیوک) بھی بادشاہ کے خدام ہی میں سے لئے جاتے تھے اور اولاً ان کا منصب محض بادشاہ کے نمایندے کے طور پر تھا۔ ملک کا انتظام بادشاہ کے ملازمان محل کے ہاتھ میں تھا اور جب موروثی بادشاہ اس درجہ کمزور ہو گیا کہ وہ حکمرانی کے قابل نہ رہا تو ناظر محلات شاہی وہ شخص تھا جو بادشاہ کو ہٹا کر خود اس کی جگہ متمکن ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ "اس کو ہٹا کر اس کی جگہ پر متمکن ہو گیا" وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس طرح قدیم ٹیوٹنی بادشاہی کی طاقت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو فتوحات کے پیدا کردہ وسیع الحدود مختلف الاحوال مجموعہ پر حکمرانی کرنے کے لئے درکار تھیں مگر اس میں اتنی قوت نہیں آئی کہ وہ اس کام کے لئے کماحقہ کافی ووافی ہو سکے۔ خاندان کا تغیر بھی پوری طرح اس کی تلافی نہ کر سکا کئی صدیوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ مغربی یورپ کا تمدن نہت نئی بدنظمیوں کے ساتھ تکلیف وہ کشمکش میں مبتلا ہے اور کوئی واقعی راستہ اسے نہیں ملتا، اس میں اگر کوئی وقفہ پڑا تو وہ خاندان کارولنجی کی پرزور حکمرانی کا مختصر زمانہ تھا۔ اسے اگر ہم مدارج ارتقا میں سے کوئی درجہ قرار دیں تو یہ دوسرا درجہ ہوگا۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم معاشرت کے اس خطرے کے زمانے میں بادشاہ یا حاکم کی اطاعت کرنے کی عادت، مذہبی تنبیہات کا احترام، مشترکہ شہریت کا احساس اور مشترکہ اغراض کے اتحاد عمل کا جوش ان میں سے کوئی قوت بھی اتنی زبردست نہیں تھی کہ متمدن نظم معاشرت کو ہیولانی حالت سے نکال لیجائے جس قوت نے نظم معاشرت کو مربوط کر رکھا تھا وہ عام و خاص سرکاری و شخصی حقوق و فرائض کا ایک مخصوص امتزاج یعنی زمین کی مشترکہ ملکیت سے جو روابط باہمی پیدا ہوتے تھے انہیں شخصی روابط کے ساتھ اس خاص طور پر متحد کر دیا گیا تھا جسے ہم نظم جاگیرداری کے نام سے یاد کرتے ہیں -

خطبۂ چہاردہم

جاگیری و نیم جاگیری نظم

میں نے سابقہ خطبہ میں یہ کوشش کی ہے کہ مغربی یورپ کا جو حصہ چارلس اعظم کی شہنشاہی حکومت کے تحت میں متحد تھا، اسکے اسوقت تک کے خصوصیات مختصراً دکھاؤں جب وہاں وہ حالت پیدا ہوگئی جو جاگیریت کے نام سے مشہور و معروف ہے (اور یہی حصّہ مغربی یورپی دستور سلطنت کے مطالعہ کرنے والے کے لئے خاص طور پر بڑا اہم ہے)، ہمیں اب لازم ہے کہ اس موخر ارتقا اور اس کے نتائج کا تجزیہ زیادہ دقت نظر سے کریں۔

میرے خیال میں جاگیری نظم کو مذکورۂ ذیل میلانات کے اجتماع و ارتباط کیجانب منسوب کیا جاسکتا ہے، ان میلانات میں ہر ایک کا پتا اس نظم سے علیحدہ اور اس سے قبل چل سکتا ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں (۱) جب بدنظمی کی انتشار انگیز قوتوں کے مقابلے میں آزاد شہریوں کا وہ رشتۂ اتحاد جو اسے اپنے ہم شہروں اور اپنی ملّت کے ساتھ تھا، زائد از ضرورت کمزور ثابت ہوا تو اس تعلق پر سرداری و ماتحتی کے زیادہ قوی و قریبی شخصی تعلق کے غالب آجانے کا میلان پیدا ہوگیا۔ یہ دونوں مختلف تعلقات یعنی ایک طرف آقا و ملازم کا تعلق اور دوسری طرف آزادوں کا باہمی تعلق، قدیم ٹیوٹنی قوم میں ہمیشہ سے چلا آرہا تھا،

بلکہ شاید ٹیوٹنی قوم کے بجائے یورپی قوم کہنا بجا ہوگا کیونکہ یہ تعلقات روما میں بھی صاف نظر آتے ہیں[1] البتہ روما میں ہمیں یہ ٹیوٹنی رواج نہیں ملتا کہ قبائلی سلطنت کے اندر سردار ایسا کر سکتے ہوں کہ نیم آزاد ماتحتوں کے ساتھ ہی ساتھ آزاد ماتحتوں یعنی برضائے خود قومی خدمت کرنے والوں کو بھی اپنی خدمت میں رکھیں کیونکہ ان میں یہ لازمی میلان نہیں تھا کہ جو تابعین ان خدمات کو انجام دیتے ہوں ان کا ادنیٰ طبقے کی طرف تنزل کر دیا جائے۔ یہ تعلق جاگیریت کے تخموں میں سے ایک تخم تھا۔ یہ ایک طبعی امر تھا کہ پرآشوب زمانوں میں ادنیٰ و اعلیٰ آزادوں کا یہ تعلق اس خواہش سے بہت کچھ بڑھ جائے کہ ایک طرف کمزور یہ چاہتے ہوں کہ وہ کسی زبردست کی حفاظت میں آجائیں اور دوسری طرف زبردست یہ چاہتے ہوں کہ وہ نئے تابعین کے ذریعے سے اپنی قوت کو بڑھالیں۔

(۲) جاگیریت میں ایک دوسرا امتیازی عنصر یہ تھا کہ یہ میلان بڑھتا جاتا تھا کہ افراد کے سیاسی تعلق کا تعین ان کے اس تعلق سے کیا جائے جو زمین کے ساتھ انھیں حاصل ہو۔ قدیم ٹیوٹنی قوم میں آزاد شہری کو زمین کے لئے اپنے حصے کا استحقاق ملک کی حیثیت سے اس درجہ حاصل نہیں ہوتا تھا جس درجہ اس حق کی وجہ سے حاصل ہوتا تھا جو شہریت کامل کا لازمہ تھا۔ اولاً اس قسم کے حصے عارضی ہوتے تھے ٹکڑے اوقات معینہ پر دوبارہ تقسیم ہوتے رہتے تھے اور جب یہ طریقہ بند ہو گیا اس کے بعد بھی کچھ زمانے تک اگرچہ بیٹا فطرتاً باپ کا جانشین ہوتا تھا پھر بھی حصے قابل تقسیم نہیں ہوتے تھے یعنے وہ صحیح معنی میں قابل انفکاک یا قابل توریث نہیں تھے۔ جب قابل حصول زمین پر بالکلیہ قبضہ ہو گیا تو بتدریج توریث، تقسیم اور اس کے نتیجے میں عدم مساوات نے رواج پکڑا اور اگرچہ قبضہ زمین کے ساتھ شہریت کا واسطہ درابطہ بدستور باقی رہا۔ مگر علت و معلول کا معاملہ منقلب ہو گیا۔ بے زمین آدمی کے حقوق شہریت زائل ہو گئے اور اگر وہ نظم معاشرت میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو اسکے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے لئے کوئی آقا پیدا کرے۔ اسلئے وہ کسی نہ کسی صورت میں کسی بڑے زمیندار کی ملازمت میں داخل ہو جاتا تھا

[1] روائی شہریوں کا شہریوں سے (Clens + Patronus) اور ماتحت کا آقا یا سردار سے Civis-Civis تعلق سمجھا جاتا تھا

وہ روپے یا خدمت کے عوض اس سے حق حفاظت حاصل کر لیتا تھا، اور اکثر لگان پر اس کی زمین کے کسی جزو کا کاشتکار بھی بن جاتا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ (صحیح معنی میں) جاگیریت کے رواج کے قبل انگلستان میں یہ میلان نارمن فتح کے ذریعے سے قطعی صورت میں مروج ہو گیا تھا۔

پہلے ان دونوں میلانات کا جداگانہ اجزا کے طور پر تصور قائم کیجئے اور پھر ان دونوں کو ذہن میں جمع کیجئے۔ ان دونوں کے اختلاط سے شخصی خدمت اور قبضۂ اراضی کا وہ امتزاج پیدا ہوا جو جاگیریت کے لئے شرط لازمی تھا۔ یہاں مجھے ان دو قسموں کے تعلقات کا فرق بھی دکھانا ہے جس میں سے ایک تو جاگیری امراء کا تعلق اپنے اُن زیر دستوں کے ساتھ تھا جو کلیۃً نہیں مگر مقدماً و خاصتہً اس کے لئے فوجی خدمت کے پابند تھے اور دوسرا تعلق اس کی زمین کے ان اصلی آزاد کاشت کاروں کے ساتھ تھا جن کے خدمات غیر فوجی تھے۔ یہ موخر الذکر تعلق اگرچہ جاگیریت کا ایک لازمہ تھا مگر قطعاً جاگیری نہیں تھا، قطعی جاگیری طریقہ وہی تھا جو تابع کا اپنے آقا کے ساتھ ہوتا تھا۔ قانونی الفاظ میں یہ تعلق شخصی و حقیقی (جائیدادی) دونوں تھا، تابع اپنے آقا کے لئے ایک ماتحت آزاد شخص کی خدمت اور خاص کر جنگ کی خدمت کا پابند ہوتا تھا مگر یہ پابندی اس پر زمین کے ایک حصے کے مشترکہ حق کی وجہ سے عائد ہوتی تھی۔ جسے آخر الامر جاگیر کہنے لگے تھے۔

مگر جاگیریت کی نمایاں سیاسی خصوصیت اسباب و علل کے ایک تیسرے اجتماع کی زیر بار احسان تھی۔ ایک مزید امتزاج یہ پیدا ہوا کہ زمینداری اگر وسیع ہوتی تھی تو علی العموم اس زمین پر بسنے والے آزاد اشخاص کے متعلق اہم حکومتی فرائض بھی، زمینداری کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ پھر یہ آخری امتزاج بھی دو تحریکوں کے متحدہ نتائج کی وجہ سے پیدا ہوا (۱)۔ بڑے بڑے زمینداروں نے

یہ کوششیں کیں کہ ان کے علاقوں میں جو آزاد خواہ غیر آزاد اشخاص رہتے ہوں ان پر انھیں خود مختارانہ عدالتی اختیار مل جائے، اور اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے فرینکی شہنشاہی کے وہ منتشر اجزا جو خالص جاگیریت کے مسکن اولین تھے ان میں اس تحریک کا آغاز کلیسا نے کیا اور علمانی اشخاص انھیں کے اتباع میں چلے۔ (۲) وہ ڈیوک اور کاؤنٹ جو ابتدأً سرکاری عہدہ دار ہوتے اور جنہیں ایسے فرائض تفویض ہوتے تھے جو بادشاہ کی مرضی سے علیحدہ کیئے جا سکتے تھے اور اس کے ساتھ آمدنی کے سرکاری وسائل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے، ان لوگوں نے یہ کوششیں کیں کہ ان کے فرائض موروثی سمجھے جائیں اور سرکاری وذاتی آمدنی کے فرق کو مٹا دیا جائے وہ بھی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ پس اس طرح پر عام زمینداروں کے حکومتی فرائض کے اختیار کر لینے اور سرکاری عہدہ داروں کے اپنے اختیارات و امتیازات کو ایک طرح کی موروثی جاگیر بنا لینے سے قبضۂ اراضی کی بنا پر ذاتی و سرکاری حقوق و فرائض کے امتزاج پر دونوں طرف سے بار پڑ گیا اب اس کے ساتھ یہ تصور بھی قائم کیجئے کہ امراء کے وہ تابعین جو ان کے لئے فوجی خدمت کے ذمہ دار تھے (اور جن میں سے بعض نیم غلامی کی حالت سے ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچے ہوں گے) اور وہ لوگ جو ان امرا کی زمینوں پر کاشت کرتے اور انھیں لگان ادا کرتے یا غیر فوجی خدمات انجام دیتے تھے (اور جن میں سے بعض بعض ابتدأً آزاد رہے ہونگے) ان دونوں قسم کے لوگوں میں بھی نمایاں معاشری فرق قائم ہو گیا تھا اب سیاسی تعلقات کا عام جاگیری تصور مکمل ہو گیا۔

(۲) ہمیں چاہیئے کہ سلسلۂ عمل پر فکر کو ترک کر کے نتیجۂ حاصلہ (یعنی ایک ایسے نظم معاشرت کی سیاسی و معاشری ہیئت) کے اہم خصوصیات پر غور کریں جس میں جاگیریت قائم ہو چکی ہو، اور سردست قسیول کے طبقے کو چھوڑ دیں اور شہروں کی اس آزاد ہیئت و حکومت خود اختیاری سے بھی غرض نہ رکھیں جس نے جاگیریت کے ابتدائی مدارج کے زمانے میں اکثر اضلاع میں بہت ہی کم نشو و نما حاصل کی۔

ہم ایک ایسا نظم معاشرت دیکھتے ہیں جسکے ارکان ایک دوسرے کے ساتھ مختلف مدارج کے معیار سے وابستہ تھے اور یہ مدارج تعلقات اراضی کے معیار کے بموجب قائم و مستحکم ہوئے تھے۔ اس معیار میں سب سے زیادہ نمایاں تقسیم وہ تھی جو بالائی یعنی فوجی حصے کو زیریں خصوصاً کسانی حصہ سے جدا کرتی تھی سپاہی یا زمیندار یا اجیٹ جو کچھ بھی اس کا درجہ ہو کو ہر حال میں کسان سے برتر تھا، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، اس معیار کے بالائی حصہ پر (یعنی اس فوجی طبقہ پہ جو اپنی زمین کی پیداوار پر بسر کرتا اور اس کا مالک ہوتا تھا مگر خود کاشت نہیں کرتا تھا) ایک مقررہ اندازے کے ساتھ (جس کا تعین رسم و رواج سے ہو گیا تھا) اپنے سے قریب تر بالادست کے لئے فوجی خدمت لازمی تھی کیونکہ یہ لوگ اپنے بالادست کے ساتھ شخصی وفاداری کے روابط سے وابستہ ہوتے تھے اور اس وفاداری کا قیام و استحکام حلف وفاشعاری سے ہوتا تھا۔ علاوہ ان عام ذمہ داریوں کے کہ تابع اپنے آقا کو یا اسکی ذات، خاندان یا جائداد کو کسی نہج سے نقصان نہ پہنچائے گا وہ خاص طور پر اس امر کا بھی پابند ہوتا تھا کہ جنگ میں اس کے ساتھ شریک ہو گا، اسکی عدالت میں حاضر ہو گا اور بشرط طلب عمل در آمد انصاف میں شرکت کرے گا اور اسکی عدالت کے فیصلوں کو قبول کرے گا۔ گاہ بگاہ جو رقوم عاید ہونگے انہیں بھی ادا کریگا خاص کر جب جاگیر وراثت میں جائے تو "نذرانہ" دینا ہوگا تھا، اور جاگیر کی علٰحدگی کی صورت میں جرمانہ، اور آقا کی بعض خاص ضرورتوں کے وقت میں "امداد" بھی دینا پڑیگی تھی ؂۱۔

یہ ہو سکتا تھا کہ ان تابعین کے ادنیٰ ترین طبقے کا آقا بادشاہ یا کوئی ڈیوک ہو جو شہنشاہ کے سوا اپنے سے کسی اور بالاتر شخص کا تابع نہ ہو مگر اکثر و بیشتر صورتوں میں جاگیری و وفاشعاری کی زنجیر میں بہت سی کڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے تابعین جن پر ایک مدت تک

؂۱ اس کے مسلمہ اوقات مختلف دوروں اور مختلف جگہوں میں مختلف تھے انگلستان میں منشور اعظم کی رو سے وہ تین اوقات کے لئے مخصوص تھے یعنی جب لارڈ کا بڑا بیٹا نائٹ بنایا جاتا تھا، جب اس کی بڑی لڑکی کا عقد ہوتا تھا اور جب خود لارڈ کو قید خانہ سے رہا کرانے کی ضرورت ہوتی تھی

شہنشاہ فرانس کو برائے نام حق شاہی کے سوا اور کچھ اختیار نہ تھا۔ ایک بڑی حد تک ان کے بھی تابعین تھے جو اپنی باری میں دوسرے تابعین کے آقا تھے۔ جب جاگیریت اپنے پورے زوروں پر تھی، اس وقت میں اس کے دو نتائج نظم سیاسی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مہلک ثابت ہوئے (۱) ایک تو یہ کہ تابعین کی وفاداری اپنے سے قریب ترین آقا کے لئے تھی اور اس لئے معمولی حالات میں بادشاہ تک یہ وفاداری اسی کے ذریعے سے پہنچتی تھی اور کبھی کبھی اس سلسلے میں ایک سے زاید کڑیاں ہوتی تھیں بادشاہ کو اس کا حق نہ تھا کہ اپنے براہِ راست تابعین کے سوا اور کسی سے حلف وفاداری لے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر بادشاہ اور اس کے کسی بڑے باجگزار میں تنازعہ پیش آجاتا تھا تو موخر الذکر کو بالعموم یہ اعتماد ہوتا تھا کہ اس بغاوت میں اس کے فوجی ماتحت اسی کا ساتھ دینگے (۲) دوسرے یہ کہ ابتداً اس نظم میں تجویز یہ تھی کہ ایک تابع کی صرف ایک ہی جاگیر ہونا چاہیئے مگر حرص و ہوس نے اس قاعدے کو بیکار کر دیا اور نوبت بایں جارسید کہ ایک ہی امیر ایک ہی وقت میں دو متخاصم بادشاہوں کا تابع ہوتا تھا یا کہ خود مختار بادشاہ اپنی اس خود مختاری کے باوجود کسی دوسرے بادشاہ کا تابع بھی ہوتا تھا۔ بس اس قسم کی پیچیدگیوں سے ہر جگہ یہ میلان پیدا ہوا کہ رشتۂ وفاشعاری ایک خیالی شے ہو کر رہ گیا۔

ان نتائج میں سے پہلا نتیجہ نہایت ہی اہمیت رکھتا تھا، اور نارمنڈی کے ولیم کی پرزور حکومت کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اگرچہ اس نے انگلستان میں جاگیریت کو رواج دیا مگر اس نتیجے کو اس سے الگ رکھا۔ یہاں میں اسٹبز کی عبارت نقل کرتا ہوں "سالزبری کی ۱۰۸۶ء والی مشہور مجلس کے موقع پر ہمیں "اخبار سیکسن" The Chronicle سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے تمام ذی اثر زمیندار خواہ وہ کسی کے بھی تابع رہے ہوں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور سب نے اس کی اطاعت قبول کی، اور اس کے تابع ہو گئے اور یہ حلف وفاداری اٹھایا کہ تمام دنیا کے مقابلے میں وہ اس کے

(یعنی بادشاہ کے) وفادار رہیں گے [1] قدیم قانون کے بموجب براعظم تک میں یہ مقدر سمجھا جاتا تھا کہ کسی نیچے درجے کے آقا کی حلف وفاداری سے بادشاہ کے متعلق جو فرض تھا وہ محفوظ رہتا تھا اگر اس تحفظ کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا اور فرانس و جرمنی میں جاگیریت کے دورعروج میں جاگیری اخلاقیات کے اندر یہ تحفظ نقش برآب ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی اپنے اتباع عظام پر شہنشاہ کا اقتدار اعلیٰ اور کچھ دنوں کے لئے شاہ فرانس کا اقتدار اعلیٰ بھی ہوا ہوگا جنگ و صلح ضرب سکہ جات جملہ امور عدالت غرض کوئی بھی حق فرمانروائی ایسا نہیں تھا جس پر یہ لوگ اپنی آزادانہ صوابدید کے بموجب عمل کرنے کے دعویدار نہ ہوگئے ہوں۔

اب ہمیں اس معیار کے درجہ ادنیٰ یعنی کاشتکاروں کی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں کے حقوق حیثیت کے متعلق کسی قسم کی تعمیم اس وجہ سے دشوار ہے کہ ان میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا اور اکثر ازمنہ و امکنہ میں وہ نامعلوم سے ہیں لیکن مگر عام اجمالی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے غلام تھے جو بتدریج غلامان وابستہ اراضی (سرف) کی حیثیت کو پہنچ گئے تھے (اور یہ زیادہ تر کلیسا کے اثر سے ہوا) اور اگرچہ قانونی نظریئے کی رو سے یہ لوگ غیر محدود صورت سے ادائے محصول اور جبری خدمت کے لئے مجبور تھے مگر تبدریج انھوں نے حقوق حاصل کر لئے تھے اور ان کی ذمہ داریاں رسم و رواج کے ذریعے سے محدود ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد دوسرے درجے میں وہ آزاد تھے جو معاشری معیار میں گر گئے تھے اور جو کبھی کبھی (خاصکر نویں اور دسویں صدی کے پرآشوب زمانے میں) کسی دنیاوی امیر اور بالعموم کسی اسقف یا ریئس خانقاہ کے زیر حفاظت ہو جایا کرتے تھے (اور کبھی کبھی اپنی ذات کے ساتھ اپنی زمین کو بھی سلسلۂ تحفظ میں شامل کر دیتے تھے) اور اس طرح زیر حفاظت آکر اس تحفظ کے عوض میں ادائے رقوم کی چند معینہ

---

[1] تاریخ دستوری جلد اول باب نہم صفحہ ۲۶۶۔

شرائط کے ساتھ باجگذار ماتحت کی حیثیت قبول کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ انھیں اس حالت کے قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہوگا لیکن علی العموم وہ لوگ برضائے خود ایسا کیا کرتے تھے اگرچہ بعد میں اکثر ایسا ہوا ہوگا کہ انھیں زیادہ تکلیف دہ شرائط کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو کیونکہ مختلف ازمنہ وامکنہ کے اختلاف رفتار کے باوجود بظاہر عام میلان یہی تھا کہ کاشتکاروں کے دونوں طبقوں کو ایک کر دیا جائے۔ پس اس طرح ایک عنصر تو غلامی کی حالت سے ترقی کر کے غلامان وابستۂ اراضی کی حیثیت تک بلند ہو گیا اور دوسرا اس حیثیت کی جانب تنزل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ غرض بظاہر آزاد کاشتکاروں کی نسبت بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ زمین کے ساتھ وابستہ ہونے میں وہ غلاموں سے کم نہیں ہیں اور ان کے آقا کی طرف سے جو عدالتی احکام صادر ہوتے ہیں ان کی نسبت ان کاشتکاروں کو اکثر و بیشتر کسی قسم کے قانونی مرافعے کا حق نہیں حاصل تھا۔ع‌ا

ع‌ا کاشتکاروں کے ساتھ فوجی زمیندارانہ طبقہ کے تعلق کا مقابلہ یونان میں اہل اسپارٹا کے اس تعلق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو انھیں ہیلوتوں (غلامان وابستۂ اراضی) کے ساتھ تھا۔ درحقیقت بعض وقت تو اس جاگیریت کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ بربریوں کا کوئی قبیلہ یا غول ان متمدن لوگوں پر مسلط ہو گیا تھا (خاصکر فرانس کی نسبت بعض کا یہی خیال ہے) فاتح بربری مفتوحین کی زمین لے لیتے اور اس پر آرام سے بسر کرتے اور مفتوح زمین جوتتے تھے۔ اس طرح امیرانہ طبقہ اور جنگجو طبقہ ایک ہو گیا۔ اس بیان میں بہت کچھ صداقت ہے مگر اس میں ضرورت سے زیادہ سادگی سے کام لیا گیا ہے کیونکہ محض ایسی فتح سے کہ فاتح زمین کو اپنے تصرف میں لے لیں جاگیریت کا سیاسی خیال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مثلاً اسپارٹا کے معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نسبتاً کم متمدن فاتح قبیلہ یونان کے ایک ایسے حصّہ پر حاوی ہو کر جس کی تمدنی حالت اس سے برتر تھی آرام طلب زمیندار و جنگ آور بن گیا مگر اس فتح سے قبیلہ کے اندرونی سیاسی تعلقات میں کوئی ایسا فرق نہیں آیا۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں اسپارٹا کے نظم حکومت میں ابتدائی خصوصیات بہت نمایاں طور پر باقی رہے مگر جاگیریت میں اس صورت کا وقوع نہایت ہی بعید ہے۔ جاگیریت وہ قدیمی ٹیوٹنی نظم سلطنت نہیں ہے جو رومانی تمدن پر اوپر سے مسلط کر دیا گیا ہو قدیمی نظم حکومت کے حقیقی خصوصیات اساسی طور پر بدل گئے تھے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ قدیم دستور کی صورتیں نئی صورت حالات پر مطابق نہیں آتی تھیں اور رومانی شہنشاہی کے ادارات کا بہت بڑا اثر پڑ رہا تھا۔

جس نظم کا میں نے یہ مختصر خاکہ کھینچا ہے اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالکر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نظم پر جب سیاسیات متقابلہ کے نقطۂ نگاہ سے خیال کیا جائے۔ تو بعض دوسرے لوگوں کے مباحث میں جو خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے یعنی اس کی فوجی خدمت کے ساتھ قبضۂ اراضی، وہی اس میں سب سے کم ممیز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فوجی خدمت اور قبضۂ اراضی کا تعلق نظم معاشرت کی ان حالتوں تک میں پایا جاتا ہے جو جاگیریت کے زمانے سے بہت دور دراز واقع تھیں جس کی ایک مثال اسپارٹا ہے۔ اپنے موجودہ نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے ہمیں زیادہ ضرورت ان امور پر زور دینے کی ہے کہ (۱) اپنے سے بالاتر کی شخصی وفاداری نے مشترک شہریت کے رشتے کی جگہ لیلی تھی اور (۲) قبضۂ اراضی کے ساتھ بہت وسیع پیمانے پر حکومتی حقوق کا امتزاج ہو گیا تھا، یعنی بڑے بڑے جاگیری امرا کو اپنا خاص سکہ چلانے، اپنے طور پر جنگ کرنے، آزادانہ طور پر باقاعدہ محصول لگانے، ابتدائی اختیارات عدالتی کو کلیتہً خالصتہً عمل میں لانے کے حقوق حاصل ہو گئے تھے۔ جس قوم میں اس قسم کے حکومتی اختیارات وامتیازات چند بڑے بڑے زمینداروں کو (بہ حیثیت زمیندار ہونے کے) حاصل ہوں، صاف عیاں ہے کہ اصولاً اس قوم کا ارتباط ناکمل ہوگا اور اسلئے اغلب یہی ہے کہ عملاً بھی اس میں نظم وامن نہایت ہی ناقص ہوگا اور واقعی تھا بھی ایسا ہی۔

اس نظم کے حق میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے تمام اصولی نقائص اور عملی عدم تکمیل کے باوجود اس نے شخصی وفاداری کے زبردست احساس اور قبضۂ زمین سے متعلق مستحکم تعلقات کو باہم ملا کر نظم وامن کا ایک ایسا عارضی قالب تیار کر دیا جس میں نسبتاً زیادہ صحیح قومی زندگی نشوونما پا سکتی تھی اور اگر فی الحقیقت ہم یہ خیال اپنے ذہن میں رکھیں کہ ان ممزوج حقوق کے قابضین میں مختلف حد تک تخدید مسیحی اخلاق کا جوش بھی موجود تھا تو اس امتزاج کے بہت سے خطرات باطل ہو جاتے ہیں۔ ایک سچے مسیحی کے لئے شخصی جائداد کے مالک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

کہ اس پر معاشری فرض عائد ہوتا ہے اور وہ عام بہبود کے لئے کوشش کرے جس کا اسے اسی سختی کے ساتھ حساب دینا پڑے گا جس سختی کے ساتھ حکومتی اختیار پر قابض ہونے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ جاگیری صورتوں نے جس اثر انگیز اسلوب پر اس اعلیٰ تخیل کا خیال پیدا کیا، اسی کی وجہ سے پرجوش قدردانوں کو نظم جاگیری کی طرف ایسی توجہ ہوئی لیکن اس تخیل اور اوسط درجے کے انسانی طبائع کے امکانات میں بہت ہی بون بعید تھا کم از کم یہ کہ ارتقا کی اس منزل میں تو ضرور ہی ایسا تھا عملی نتیجہ بہت کچھ باغ کی رکھوالی بکری والی جرمانی مثل کے مترادف تھا اور جب ہم جاگیری بادشاہی کا ذکر کرتے ہیں (جیسا کہ جائز طور پر ہونا چاہیئے) تو ہمیں دل میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بادشاہی کی قوت اور انجام کار اس کے غلبے کا راز اس حقیقت میں مضمر تھا کہ اس تمام دوران میں اسے جس حد تک حکمران جاگیری طبقے کے اندر سمجھا جاتا تھا اسی حد تک اسے اس طبقے سے باہر بھی خیال کیا جاتا تھا کیسے ہی دھندلے اور نامکمل طور پر ہو مگر بادشاہی کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ سلطنت کی غیر منقسم قوت اور بلند تر و مساوی تر انصاف کا منبع ہے (جس کے حضور میں معاشری نظم کے تمام طبقات اسفل مرافعہ کر سکتے ہیں) اور وہ ایک ایسے اقتدار کی نمائندہ ہے جسے قانونی طور پر یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ وہ حکمران طبقہ کے درمیانی مدارج کی جنگ و جدل کے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

(۳) جس جاگیریت کا میں یہ بیان کر رہا ہوں، اس کا حیطۂ عمل وہ ممالک تھے جو چارلس اعظم کے تحت میں متحد رہ چکے تھے۔ فرانس کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یہ طریقہ دسویں صدی میں مستحکم و مربوط ہو چکا تھا۔ جرمنی میں اس کی ترقی کسی قدر بعد کو ہوئی، اس وجہ سے کہ رائن کے دوسری جانب قدیم ادارات و رسوم زیادہ مستحکم طور پر رائج تھے۔ شہنشاہی کے اثر کے وسیلے سے ڈنمارک میں بھی اس کا شیوع ہوا اور نارمن فتح نے اس کے ایک اہم جزو یعنی فوجی خدمت کی شرط کے ساتھ قبضۂ اراضی کو نہایت ہی کمل صورت میں انگلستان میں بھی رائج کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس سیاسی انتشار کو خارج رکھا جس کا اس درجہ تباہ کن اثر ہم براعظم کی جاگیریت میں دیکھ چکے ہیں۔

اس سے میری عنان توجہ اس اعتراض پر غور کرنے کی طرف منعطف ہوتی ہے جو میرے اس مضمون زیر تشریح کے تصور عام کی نسبت پیدا ہوگا۔ یہ کہا جائے گا کہ "جاگیریت" یا "جاگیری بادشاہی" اور اس سے بھی بڑھ کر "فرینکی بادشاہی" (اپنے قبل از جاگیری مدارج کی صورت میں) ایسے تصورات ہیں جن میں اس قدر تعمیم نہیں پیدا ہوئی ہے کہ وہ سیاسیات کے مقاصد پورے کر سکیں جس کی نسبت میں پہلے ہی یہ واضح کر چکا ہوں کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ خاص مثالوں کے مقابلہ واستقرا سے تاحد امکان عام انداز و میلان کے قطعی تصورات قائم کرے۔ اب مناسب طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرینکی بادشاہی حکومت کا محض وہ طریقہ تھی جو جاگیریت کے قبل اس سلطنت عظیمہ کی مخصوص صورت میں پیش آئی، جسے پانچویں صدی کے اختتام میں کلودس کے فتوحات نے قائم کیا تھا، اور آٹھویں صدی کے اختتام کے قریب چارلس اعظم نے اسے بڑھا کر ایک شہنشاہی بنا دیا۔ مگر انگلستان، اسپین، اور اسکینڈنیویا میں تو کوئی فرینکی اور خاصکر کرولنجی بادشاہی نہیں تھی، اور ارتقا کی عام رفتار کے پتا ملانے میں ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ ایسے ہی عام تصورات ہیں جو اگرچہ یکساں طور پر نہیں مگر کم و بیش متعدد صورتوں پر عائد ہوتے ہوں۔

اس اعتراض کا جواب دیتے وقت یہ امر لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ "فرینکی بادشاہی" حکومت کی ایک خاص تاریخی شکل کا نام ہے نہ کہ حکومت کے کسی ایسے طرز عام کا جو متعدد مثالوں کی تجرید سے (خود ہو) مگر اس کا جواب الجواب یہ ہو سکتا ہے کہ خود رومانی شہنشاہی کا بھی یہی حال ہے پھر بھی اس سے مفر نہیں کہ یورپ کے سیاسی ادارات کے ارتقا میں رومانی شہنشاہی کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس سے اساسی اہمیت کے ایک خاص درجہ کا اظہار ہوتا ہو۔ مغربی یورپ کی جدید سلطنتوں میں سے اگرچہ صرف چند ہی سلطنتیں قدیم رومانی شہنشاہی کے اجزا سے مرتب ہوئی ہیں پھر بھی جن اسباب وعلل نے دوسری سلطنتوں کو ان کی موجودہ حالت پر پہنچایا ہے انھیں

ایک اہم جزو یہ رومانی شہنشاہی بھی ہے اگرچہ اس کا اثر بالواسطہ پڑا ہے۔ صرف ایک ہی قسم کے اثر کو لیجیے کہ مغربی یورپ کی تمام سلطنتوں کے اندر ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے تمام دوران میں فرقۂ تسیتس منقسم وفاداری کا اعتراف کرتا رہا ہے یہ فرقہ کسی خاص سلطنت کی حکومت کے تحت میں صرف جزواً تھا اور جزواً وہ اس خود مختار فرمانروا کے تحت میں تھا جس کا دربار روما میں تھا اور جو تمام عالم عیسوی میں پادریوں کے درمیان انصاف کرنے اور ان پر محصول لگانے کا دعویدار تھا۔ اس امر واقعہ کی تشریح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس سے قبل کی روما کی دنیاوی شہنشاہی پر اسے محول کیا جائے ہابس نے بہت ہی خوب کہا ہے کہ پاپائیت رومانی شہنشاہی کا گویا بھوت ہے جو تاج پہنے ہوئے اس کی قبر پر بیٹھا ہوا ہے۔ بہرحال اگرچہ بالکل اسی حد تک نہیں مگر بالکل اسی طرز پر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ فرینکی شہنشاہی کا وجود مغربی یورپ کی سلطنتوں کی تاریخ میں بالعموم ایک مقدم و مرکزی واقعہ ہے یہاں تک کہ اس کا اثر نہ صرف (فرانس، جرمنی، و شمالی اطالیہ کے) ممالک کی ترقی مابعد میں اہمیت کا درجہ رکھتا ہے جو خود اس شہنشاہی سے لوٹ کر بنے بلکہ دوسرے ممالک پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ فرینکی شہنشاہی کے اندر جس طرح رومانی و جرمانی عناصر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جاگیریت ظہور میں نہ آتی جو صرف فرانس و شہنشاہی تک محدود نہیں رہی بلکہ شہنشاہی کے اثر سے ڈنمارک میں اور نارمن فتح کے ذریعے سے انگلستان بلکہ اسکاٹلینڈ تک پہنچی اور جنوبی اطالیہ میں بھی داخل ہو گئی۔ لہٰذا کلووس اور اس کے جانشینوں اور اس سے زیادہ چارلس اعظم کے تحت میں فرینک کے سیاسی ادارات نے یورپ کے اندر ایسی مرکزی اہمیت حاصل کر لی تھی جو اور کسی ادارے کو حاصل نہیں ہوئی مثلاً اگبرٹ و الفرڈ اور اڈگر و کینوٹ کے تحت میں انگلستان کے متوازی مدارج کے سیاسی ادارات کو یہ مرتبہ نہ حاصل ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی یورپ کے بیشتر و مقدم حصص میں جو جاگیریت رائج ہوئی اس کے بعض ممتاز خصوصیات ایک خاص طریقے پر فرینکی شہنشاہی کے مختص حالات

سے مربوط ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں کسی حد تک مذکورۂ بالا اعتراض کی قوت کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ ہرچند کہ دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک مغربی یورپ میں جاگیریت کا زور شور رہا تاہم صحیح جاگیریت اس وقت بھی ایک گونہ عجائبات ہی سی رہی، اور میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ صحیح جاگیریت کے حدود سے باہر کی سلطنتوں کے ارتقا کو بھی ہم نظر غور سے دیکھیں تاکہ کامل جاگیری و غیر جاگیری حالات کے مقابلہ کرنے سے ہم ان مدارج ارتقا کی وسیع تر خصوصیت پر پہنچ سکیں جن کی نمائندگی فرانس و جرمنی میں فرنگی و جاگیری بادشاہوں سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لئے بعض امتیازات سے انگریزی تاریخ کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ مناسب و موزوں ہے کیونکہ نارمن فتح کے قبل ہمیں انگلستان میں ایک ایسی رفتار ارتقا کے تصور کا موقع ملتا ہے جو زیادہ تر اسی جانب چل رہی تھی جس کی انتہا فرانس و جرمنی میں جاگیریت پر ہوئی مگر ہنوز اس کا نتیجہ قطعی جاگیریت کی صورت میں نہیں ظاہر ہوا تھا حقیقت یہ ہے کہ گیارھویں صدی میں انگریزی ادارات جس حد پر پہنچ گئے تھے ان میں اور اس جاگیریت میں جسے نارمنوں نے رائج کیا (اسٹبز کی رائے کے مطابق) بہت ہی اہم و اصولی فرق تھا مگر دونوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ بہت زیادہ عمیق و وسیع نہیں تھی چونکہ خالص جاگیریت انگریزوں کے درمیان غیر ملکی لباس میں آئی اس لئے وہ اس کے استرداد کی طرف مائل ہو گئے اور انجام کار ہیں شدت و مدت دونوں لحاظ سے اس کے اثر کو اس درجہ گھٹا دیا کہ وہ برّاعظم کی جاگیریت سے ایک بہت ہی مختلف شے بن گئی۔

(۴) پس سوال یہ ہے کہ ہم سیاسی ارتقا کے ان مدارج میں جن کی خاص مثالیں "فرنگی" "جاگیری" بادشاہیاں ہیں زیادہ عمومی رنگ پیدا کرنے کی سعی کس طرح کریں، میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم جاگیریت خالص کے حدود سے دور تر نظر دوڑانے کی کوشش کریں اور ان سب کو ایک وسیع تر تعمیم کے اندر شامل کرلیں تو پھر ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ سب ایک طویل سلسلۂ عمل کے مدارج ہیں، جن کے میلانات حسب ذیل ہیں؛ قدیم نظم حکومت کا عمومی عنصر یعنی سلاح بردار آزاد شخصوں کی

جمعیت کا اعلیٰ اقتدار مختلف اسباب کے جمع ہو جانے سے زوال پذیر ہو گیا۔ ان اسباب میں ایک سبب یہ تھا کہ وسعت ملکی کی وجہ سے بادشاہ کو زیادہ اختیار و امتیاز حاصل ہو گیا، دوسرا سبب یہ تھا کہ قوم جب زیادہ وسیع رقبے پر پھیل گئی تو شہری ہونے کا رشتہ کمزور ہو گیا۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ اتنی وسیع جماعت کی حکومت کے لئے غیر نمائندہ جمعیت ناموزوں ثابت ہوئی۔ پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو اختیار اس طرح قوم کے ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ بادشاہ کے ہاتھ میں آجائیگا، وہ زیادہ صاحب اعزاز و منزلت ہو گیا تھا، قوم کا امن بادشاہ کا امن اور قوم کی زمین بادشاہ کی زمین ہو گئی تھی پھر بھی، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحریک قطعی طور پر بادشاہی کی تقویت کی طرف گامزن تھی۔ چنانچہ اسٹبز نے انیگلو سیکسن نظم کے متعلق یہ لکھا ہے کہ شاہی اختیار کی ترقی عملی ہونے کے بہ نسبت زیادہ تر نظری تھی، ایک طرف اس نے نفع حاصل کیا تو دوسری طرف نقصان اٹھایا۔ بادشاہ انصاف کا منبع و ماخذ، اپنی قوم کا آقا و مربی اور سرکاری زمینوں کا مالک ہو گیا مگر اس طرح جو اختیارات حاصل ہوئے ان کے حقیقی نفاذ سے اسے بہت ہی جلد دست بردار ہونا پڑا[عہ۱]۔ حکومت کا کام چلانے کے لئے ماتحت سرداروں کو کسی قدر اختیارات دینا پڑے اور ان اختیارات نے انھیں بادشاہ کا خطرناک رقیب بنا دیا۔ نتیجہ بہ حیثیت مجموعی یہ نہیں ہوا کہ شاہی کو تقویت حاصل ہو جاتی بلکہ شاہی و عدیدیت میں سے کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کا، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) یہ عدیدیت انتشاری قسم کی تھی جس کا میلان یہ تھا کہ طاقتور امراء کو ضرورت سے زیادہ شخصی آزادی مل جائے۔ جیسا کہ میں فرینک قوم کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی کہہ چکا ہوں قوم کے زیادہ وسیع ہو جانے سے شاہی پر جو مزید بار پڑا اسے سرانجام دینے کی ضرورت نے شاہی میں ترقی پیدا کر دی مگر اس میں اتنی ترقی نہ ہوئی کہ وہ اس کام کو کاملاً انجام دے سکتی، اسے ماتحت حکومتوں کے اس میلان سے دست و گریباں ہونا پڑا کہ یہ حکومتیں مورثی و نیم آزاد ہو جائیں یعنی ہر ایک حکمران اپنے اپنے ضلع میں چھوٹا سا بادشاہ بن جائے[عہ۲]

عہ۱۔ تاریخ دستوری جلد اول صفحہ ۲۰۷
عہ۲۔ بکثرت اس قسم کا تنازعہ اسکینڈینیویا کی تاریخ میں ہمارے سامنے آیا تھا۔

بس اس دور میں (جس کی وسعت سرسری طور پر بارھویں یا تیرھویں صدی تک سمجھنا چاہیئے) سیاسی نظم کی نہایت ہی عمومی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہ بادشاہی کی طرف مائل تھی نہ عدیدیت کی جانب بلکہ ان دونوں کے درمیان اسکے پلے حرکت کرتے رہتے تھے۔ جاگیر طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرداری و ماتحتی کا تعلق ان تعلقات پر غالب آجاتا تھا جو قبیلے یا قوم کے معمولی شہری یا آزاد رکن کو اپنے ہم شہروں یا قوم کے ساتھ ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی جیسا کہ اسٹبز نے انگلستان کی صورت میں بیان کیا ہے شخصی تعلقات کی جگہ پر ملکی تعلقات قائم ہوتے جاتے تھے۔ معاشرت قدیم کا اساسی اصول یہ تھا کہ قوم کے ہر آزاد و کامل الحقوق رکن کو قومی زمین میں حصہ پانے کا حق حاصل تھا، اور افراد کی سیاسی حیثیت و منزلت سے اس کے تعلق اراضی کا تعین ہوتا تھا، لیکن بعد کے زمانے میں جس پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں یہ اصول الٹ گیا، اس زمانے میں افراد کی سیاسی حیثیت کا انحصار ان کے اراضی سے تعلق رکھنے پر ہو گیا۔ ایک طرف تو بے زمین شخص کو کسی نہ کسی آقا کے پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی اور دوسری طرف حکومتی فرائض کا ایک اہم جزو یعنی مختلف درجے کے عدالتی اختیارات ملکیت اراضی کے جزو لاینفک ہو گئے اور قومی عدالتیں بڑے بڑے زمینداروں کی عدالتیں بنتی گئیں۔

غرض، یہ میلانات صحیح جاگیریت کے حدود سے باہر بھی صاف نظر آتے تھے اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کو سب سے زیادہ نمایاں اظہار کا موقع اسی نظم میں ملا۔

میں اس طرح پر اس کی توضیح اور زیادہ کر سکتا ہوں کہ خاص انگلستان کے معاملے میں فتح کے قبل کے نیم جاگیری حالات اور نارمنوں کی جزدی جاگیریت کے فرق کی جانچ پرتال زیادہ غائر نظر سے کروں، پہلے تو وابستہ اراضی فوجی خدمت کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نارمنوں کے قبل ہی سے اس کا سلسلۂ عمل جاگیریت کی طرف رواں تھا، مگر ہنوز کوئی قطعی قانونی نتیجہ نہیں حاصل ہوا تھا۔ فوجی خدمت کی بنا پر زمین کا قبضہ اس قطعی صورت میں رائج

نہیں ہوا تھا، جیسا کہ فتح کے بعد ہوا جب کہ ملک "نائٹوں کی جاگیروں" یعنی ایسے قطعات میں تقسیم کر دیا گیا تھا، جن میں ہر قطعے سے یہ توقع تھی کہ جاگیری فوج کی طلبی کے وقت ایک نائٹ حاضر ہو گا۔ لیکن (صورت سابقہ میں بھی) عملاً بہت زیادہ زمین کا قبضہ اسی طرح کا تھا کیونکہ امراء کے ماتحتوں کو بھی زمین مل گئی تھی اور وہ بدستور ماتحت رہے، نیز کسی سردار کی حفاظت کا نفع حاصل کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ماتحت بن گئے۔ ان سب پر اپنے آقائے اعلیٰ کی خدمت واجب تھی اور بوقت طلب اس کے حشم و خدم کی حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، تاہم اس قسم کی خدمت ہنوز ان کے قبضۂ اراضی کی قطعی و معینہ شرط نہیں تھی۔

اس پر بھی نظر رہے کہ قومی فوج محافظ میں خدمت کرنے کے اس ملکی فرض کو نارمن بادشاہوں نے بھی قائم رکھا اور اسے ترقی دی، اور یہ ایک خاص اہم تدبیر تھی جس کے ذریعے سے انھوں نے جاگیریت کے ان سیاسی اثرات کو روکا جو شاہی و قومی ارتباط کو کمزور کر دیتے تھے، پس یہ اصول انگلستان میں کبھی بھی تسلیم نہیں ہوا کہ تابع اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے بلاواسطہ آقا کے ہمراہ جنگ میں جائے خواہ یہ جنگ خود بادشاہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور خانگی جنگ اور امرا کی گراہیوں کی وجہ سے جن خرابیوں نے فرانس میں جڑ پکڑ لی تھی وہ انگلستان کی تاریخ میں محض ہنگامی ابتری کا موجب ہوئیں۔ علیٰ ہذا شخصی سکہ سازی جو اسٹفن کے تحت میں عام ہو گئی تھی ہنری دوم کے عہد میں سختی کے ساتھ بند کر دی گئی، عدالتی انتظامات کے متعلق بھی ایسا ہی ہوا، فتح کے بہت قبل سے مصاحبان شاہی اور کلیسا کو جو زمینیں عطا ہوئی تھیں ان کے ساتھ عام طور پر عدالتی اختیارات بھی مل جاتے تھے، ہنڈرڈ کی معمولی عدالت سے اور بعض وقت صوبے کی عدالت سے بھی استثنا حاصل ہو جاتا تھا، چنانچہ فتح کے قبل "حق انصاف رسانی" قبضۂ اراضی کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا، مگر قدیم قومی عدالتیں بدستور باقی رہیں عدالت کا انتظام کلیتہً جاگیری نہیں ہو گیا۔ اس سے بھی نارمن بادشاہوں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ گیا جس سے انھوں نے بیرنوں کی کشاکشی میں خوب ہی کام لیا۔

خطبۂ پانزدہم

ازمنۂ وسطیٰ کی حکومت مذہبی

میں نے آخری دو خطبوں میں مختصراً ان مدارج کا قدم بقدم پتا چلایا ہے جنھیں طے کر کے مغربی یورپ (جس سے مقدم مراد یورپ کا وہ حصّہ ہے جس میں چارلس اعظم کی شہنشاہی یعنی فرانس، مغربی جرمنی اور شمال اطالیہ شامل تھے) رومانی شہنشاہی کے دور سے نکل کر، جاگیریت کے دور میں داخل ہوا، اور میں نے اس میں یہ اشارہ کیا ہے کہ جاگیریت کا سرچشمہ کارولنجی شہنشاہی تھی اور یہیں سے یہ سیل پھیلا تھا، اسی شہنشاہی کے وسیلے سے جاگیریت مشرقی جرمنی اور ڈنمارک میں پہنچی، جنوبی فرانس کے اثر سے اس کی رسائی اسپین کے اس مسیحی حصّہ میں ہوئی جو آہستہ آہستہ عربوں سے واپس لیا گیا تھا، نارمنی فتوحات کے ذریعے سے اس کے قدم جنوبی اطالیہ اور (بعض قیود کے ساتھ) انگلستان میں پہنچے۔ اگرچہ قطعی مفہوم میں تمام یورپ پر جاگیریت کا رنگ نہیں چھایا تھا، پھر بھی وسیع معنی میں ہم اسے جاگیری دور کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں فتح نے جن وحشی بادشاہوں کو صاحب اقتدار و امتیاز بنا دیا تھا، جاگیریت نتیجہ تھی انھیں کی اس کوشش کا کہ وہ ایسے آدمیوں سے متمدن نظم و نسق کا کام لینا چاہتے تھے جن میں قدیم ٹیوٹنی خیالات و عادات اور قبائلی قوم کے ایسے رشتے موجود تھے جسے فتح کے اثرات نے کمزور کر دیا تھا، پس جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں نظم سلطنت کی شکل میں اس کا نتیجہ یوں بیان ہو سکتا ہے کہ بادشاہی اور ایک طرح کی انتشار انگیز عدیدیت میں

کشمکش جاری تھی جس میں کبھی ایک کو غلبہ ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کو (اس عدیدیت کو انتشار انگیز کہنا یونانی شہری سلطنتوں کی قدیم عدیدیت کے بالمقابل ہے) جیسے ہم جدید ملکی سلطنت کہہ سکتے ہیں، وہ اسی جاگیری دور میں تیار ہو رہی تھی، اس میں ناکمل ارتباط اور ناکمل تعین کا میلان پیدا ہو چلا تھا کیونکہ حکومتی اختیار اور زمینداری کے امتزاج نے متعین حدود اور اندرونی نظم دونوں کو خراب کر رکھا تھا۔ ناکمل ارتباط کی جانب میلان اس وجہ سے تھا کہ کوئی اتنی قوی مرکزی طاقت موجود نہیں تھی جو تمام مخل انداز افراد و جماعت پر قوم کے نام سے غالب آجائے اور انھیں پامال کر ڈالے اور اس کے ناکمل تعین کے میلان کی وجہ وہ طرز تھا جس سے ایک ملک کے اجزا یعنی جاگیری علاقے مناکحت و وراثت کے ذریعے سے غیر ممالک کے دوسرے اجزا سے متحد ہو جاتے تھے۔

مگر اس کے علاوہ، ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ قدیم شہری سلطنت کے بالمقابل جدید ملکی سلطنت کی بڑھی ہوئی پیچیدگیوں کی وجہ سے ہمیں تا حد شیوع جاگیریت صرف واقعی جاگیری تنظیم اور کسانوں کے ساتھ فوجی زمیندار طبقے کے تعلقات ہی پر غور نہیں کرنا ہے بلکہ ہمیں اس جاگیری تنظیم کے اندر ان غیر عناصر پر بھی لحاظ کرنا ہے جو اگرچہ جاگیریت کے قوی ترین وقت میں اسی میں مل گئے اور گونہ جاگیری رنگ میں رنگ گئے تھے پھر بھی حقیقتاً اس سے علیحدہ و ممیز تھے۔ یہ عناصر تین تھے (۱) اول بادشاہ تھا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس پر ہمیشہ دو حیثیتوں سے نظر ڈالنا ہے۔ ایک تو اس حیثیت سے کہ وہ جاگیری عمارت کا سنگ وسطی تھا یعنی جاگیری فرمانروا تھا، اور دوسرے اس حیثیت سے کہ اپنے جاگیری تابعین کے علاوہ اس کے کچھ حقوق و فرائض قوم کے ان بقیہ اشخاص کے ساتھ بھی تھے جو جاگیریت سے بے تعلق تھے، اور جن کی ترقی نے انجام کار جاگیریت کو تباہ کر دیا۔ وہ جس طرح جاگیرداروں کا آقائے اعلیٰ تھا اسی طرح کل قوم کا بھی بادشاہ تھا اور جہاں جاگیریت سب سے زیادہ قوی تھی وہاں اگرچہ اس کی اس قومی حیثیت کا کچھ زیادہ اثر نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور رہتے تھے، (۲) دوسرے پادری تھے جو عہد اصلاح کے زمانے تک ایک خود مختار فرمانروا

یعنی پوپ کے تحت میں خود اپنی ایک تنظیم رکھتے تھے اور اس فرمانروا کی مدد کے لئے ان پر محصول لگایا جاتا تھا اور وہ کم وبیش کامیابی کے ساتھ دعویٰ کرتا رہا کہ کلیسائی معاملات میں تک آخری عدالت مرافعہ وہی ہے۔ یہ تنظیم جو تمام مغربی یورپ پر حاوی تھی، ایک طرف تو اس کا میلان یہ تھا کہ وہ مغربی یورپ کو ایک متمدن نظم میں متحد کرنے پر آمادہ تھی اور دوسری طرف انجام کار میں وہ فرداً فرداً ہر ایک سلطنت کی ارتباطی تنظیم میں سد راہ بھی ہوگئی تھی۔ میں انجام کار کا لفظ اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ (مثلاً) انگلستان کی نسبت میرا خیال ہے کہ نارمن فتح کے قبل کلیسا کے اتحاد نے ان متعدد جماعتوں کے ایک قوم بننے میں مدد دی تھی جو مختلف آبادکاریوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں (۳) تیسرے شہر تھے، یہ شہر اگرچہ جاگیریت کے اندر[ل] دونوں قسم کے تعلقات رکھتے تھے یعنی ان کے جاگیری بالادست بھی تھے اور زیردست بھی تھے تاہم جب انھوں نے پوری ترقی کرلی تو اپنی خصوصیت وتنظیم میں جاگیریت سے بیگانہ محض ہوگئے۔ انھیں شہروں کی نیم آزاد حکومت خود اختیاری کی وجہ سے یہ ہوا کہ اس سے مدتوں قبل کہ عمومیت کو ازمنۂ وسطیٰ کی قومی حکومتوں میں جزدی وسریع الزوال حصہ مل سکے، وہ اس زمانے کے یورپ کے شہروں کے اندر دوبارہ زندہ ہوگئی تھی۔

اب اگر نظم معاشرت کی جاگیری تنظیم میں یہ تینوں مغائر یا نیم مغائر عناصر ہمیشہ اس امر کا احساس وادراک رکھتے کہ جاگیری تنظیم کے غیر مکمل انتظام وارتباط کے مقابلہ میں وہ تہذیب وتمدن کے حق کی نمائندگی کر رہے ہیں (اور بعض اعتبار سے وہ واقعی ایسا کرتے بھی تھے) اور پھر اس احساس وادراک کے نتیجے کے طور پر اگر وہ ہمیشہ جاگیریت کے خلاف ایک دوسرے کے حلیف بنتے رہتے تو ازمنۂ وسطیٰ کے تنظم کی رفتار ترقی نسبتاً بہت زیادہ سہل ہوجاتی اور اس کا عام تصور قائم کرنا بہت زیادہ آسان ہوجاتا، مگر واقعاً یہ صورت نہیں ہوئی بادشاہ اور کلیسا کے درمیان ہمیشہ بساط جنگ بچھی رہی، خاص کر ہلڈے برانڈ کے بعد سے،

[ل] اعلیٰ وادنیٰ۔

اور جب ان دونوں میں معرکہ آرائی ہونے لگی تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقع سے جاگیری عنصر کو اپنا حلیف بنانے لگا۔ علیٰ ہذا بادشاہ اگرچہ بالعموم شہروں کی ترقی کا جانبدار تھا مگر کبھی کبھی شہروں کو زیر کرنے کے لئے وہ اپنے بڑے بڑے باجگزاروں کے ساتھ متحد بھی ہو جاتا تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں انجام کار شاہی اصول کو ہی فروغ ہوا وہ اکمل نظم و اتحاد جس نے ازمنۂ جدیدہ کی سلطنت کو ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت سے ممیز کر دیا۔ وہ اسی شاہی بنیاد پر قائم ہوا اور وہ مرکزی اقتدار جسے انجام کار میں اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ جاگیریت کے بدنظمی و انتشار پیدا کرنے والے میلان کو پامال کر دیا وہ یہی شاہی اقتدار تھا لیکن اس کے وقوع میں آنے سے قبل یورپی نظم سلطنت میں زیادہ مربوط انتظام پیدا کرنے کی ایک تحریک مذہبی حکومت کی بنا پر ہو چکی تھی جس نے نشو و نما پایا اوج کمال کو پہنچی اور پھر فنا ہو گئی۔ میں اس موجودہ خطبے میں اسی کو مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔

۲۔ زمانۂ جدید کے مصنفان سیاسیات میں یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ حکومت کی شکلوں کے اختصاص و انقسام میں وہ ایک شکل حکومت مذہبی کی بھی قائم کیا کرتے ہیں مگر اس وقت تک مجھے اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں ملا ہے کیونکہ جس مفہوم میں اس لفظ کا استعمال مجھے سب سے زیادہ موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے اس مفہوم میں کامل ترقی یافتہ حکومت مذہبی نہ تو یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ ہی میں صاف طور پر نظر آتی ہے اور نہ رومانی تاریخ کے اس حصہ میں جس کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی ہے اس کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے اور اس لئے یونانی و رومانی اصحاب فکر کے سیاسی تخیلات میں اسے کوئی جگہ نہیں ملی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یونان کے سیاسی فلاسفہ نے قوم و ملت کی زندگی کے اندر بلکہ اس کی سیاسی تنظیم تک میں مذہب کی منزلت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ ارسطو نے پجاریوں کو عہدہ داروں میں شامل کیا ہے مگر یہ ایسا مذہب تھا جو قطعی طور پر سلطنت کے اغراض کے تابع اور دنیاوی حکومت کے زیر اقتدار تھا لیکن ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کے سیاسی ادارات کا پتا چلاتے

وقت ہمیں ایک ایسا درجہ بھی ملتا ہے جس کی نسبت مناسب طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اطالیہ کے ایک حصے میں بشمول رومتہ الکبریٰ مذہبی حکومت قائم ہوگئی تھی اور اس سے کسی قدر گھٹ کر جرمنی میں شہنشاہی کی کلیسائی ریاستوں کا بھی یہی حال تھا اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس مذہبی حکومت کو علاً مغربی یورپ پر حاوی کر دینے کی بزور و مستقل کوشش کی جا رہی تھی اس کوشش کو اگرچہ کسی وقت بھی جزوی کامیابی سے زیادہ کچھ نصیب نہیں ہوا مگر بعض اوقات و مقامات میں اس کی کامیابی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

مذہبی حکومت کی اس تحریک کے حالات و مدارج کے پرکھنے اور جانچنے سے قبل بہتر یہ ہوگا کہ اس لفظ کی تعریف سے آغاز کیا جائے۔ اول یہ کہ اس کے استعمال میں کسی قسم کا الہیاتی اصول مضمر نہیں ہے مذہبی سلطنت سے مراد وہ سلطنت نہیں ہے جس میں خدا حکمرانی کرتا ہو بلکہ اس سے مراد وہ سلطنت ہے جس میں عادتاً ان لوگوں کی اطاعت کیجاتی ہو جنھیں ربانی مرضی کے اظہار و اعلام کا کچھ خاص اقتدار حاصل ہو اور یہ اطاعت محض مذہبی عبادت کی نظم و ترتیب ہی تک محدود نہ ہو، بلکہ دنیاوی نظم و نسق سے بھی تعلق رکھتی ہو۔ مزید براں مذہبی حکومت کی بنا کرنے کے لئے میں صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتا کہ موروثی بادشاہ کی نسبت یہ خیال کر لیا گیا ہو کہ وہ خداداد حق کی رو سے حکومت کرتا ہے یا کم متمدن زمانے میں یہاں تک سمجھ لیا گیا ہو کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے حکومت کرتا ہے۔ الوہیت کے ساتھ اس قسم کے خاص تعلقات کی وجہ سے اس حکمراں کو جس کی نسبت اس طرح کے مورد عنایات الٰہی ہونے کا یقین ہو خاص امتیاز ضرور حاصل ہو جاتا ہے مگر حکومت کی شکل میں کسی قطعی تغیر کے لئے اس کا کافی ہونا دشوار ہے کیونکہ جس بادشاہ کے سر پر تقدس کا یہ ہالہ ہوتا ہے اس کے تقرر و فرائض کے متعلق لازماً اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہ صورت حال اس وقت کسی قدر بدل جاتی ہے جب بادشاہ یا امرا اہم قسیسی مذہبی فرائض کے اجارہ دار بن جاتے ہیں اور بالعموم ان کا یہ دعویٰ مسلم ہو جاتا ہے کہ وہ ان قوانین کو جانتے ہیں جن کی بجاآوری سے خدائی

قہر وغصہ معلق یا ساکن کیا جاتا ہے اور اس طرح رائے اور خیال پر جو اثر انھیں حاصل ہو جاتا ہے اسے اپنی حکمرانی کی مخالفت کو دبانے یا باطل کرنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس صورت میں ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ جس بادشاہی یا عدیدیت نے اس طرح تقویت واستحکام مزید حاصل کر لیا ہو، اگرچہ اس سے اس کے شاہی یا عدیدی ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا تاہم اسے ایک طرح پر مذہبی حکمرانی کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے؎ لیکن ہمیں اس میں سب سے زیادہ سہولت معلوم ہوتی ہے کہ قطعی معنی میں مذہبی حکومت کی اصطلاح سے مراد یہ لینا چاہیئے، کہ وہ ایک ایسی معاشری تنظیم ہے جس میں وہ لوگ جنھیں ملاء اعلیٰ سے خاص لگاؤ اور ربانی مرضی سے خاص مناسبت ہوتی ہے، وہ ایک ایسی پیشہ ور جماعت بن جاتے ہیں جو بالتخصیص مذہبی کام کے لئے وقف ہوتی اور معمولی دنیاوی حکومت سے زیادہ ممیز وجدا رہتی ہے، پھر یہ جداگانہ جماعت جس نسبت سے دنیاوی معاملات میں اقتدار حاصل کرتی جاتی ہے اسی نسبت سے حکومت صریحی ومادی طور پر مذہبی حکمرانی کے رنگ میں آتی جاتی ہے، اور جب اس مذہبی جماعت کو اعلیٰ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو حکومت مذہبی، کمل ہو جاتی ہے۔

یونانی شہری سلطنتوں کی تاریخ میں اگر پجاریوں کو کبھی اس قدر اثر حاصل ہوا ہو تو وہ لازماً اس زمانے میں ہوا ہوگا جو تاریخی علم سے قبل کا زمانہ ہے "کبھی اسقدر اثر حاصل ہوا ہو" یہ الفاظ میں اس وجہ سے کہتا ہوں کہ اس میں شک کی گنجایش بہت کم ہے کہ یونانیوں کی جو کیفیت ہمیں ہومر سے معلوم ہوتی ہے اس وقت ان میں جتنی مذہبیت نظر آتی ہے اس کے قبل ضرور ان میں اس سے زیادہ مذہبیت رہی ہوگی۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ مذہبیت کس حد تک پہنچی ہوئی تھی، لیکن یونانی شہری سلطنتوں کے جس دور کا ہمیں تاریخی علم ہے، اس دوران میں پجاریوں کی یہ حیثیت کہیں بھی نظر نہیں آتی کہ سیاسی فلسفے میں انھیں

؎ - مثلاً روما میں جب پیٹریشین عدیدیت طبقۂ پلیب کے ساتھ کشمکش میں مبتلا تھی اسوقت یہی حیثیت تھی۔

اس قسم کی خود مختاری و غلبہ حاصل ہوگیا ہو، مذہب سیاسی نظم معاشرت کا ایک جزو لاینفک تھا مگر سیاسی تغیرات کے تعین میں اس کی کوئی صریحی عام اہمیت نہیں معلوم ہوتی اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی خاص صورتوں میں اس کا عمل زوردار طور پر ہوتا تھا جیسا کہ اس وقت ہوا جبکہ خاندان پی سسٹراتوس ایتھنز سے نکالا گیا جس کی وجہ ایک حد تک یہ ہوی کہ اہل اسپارٹا کو ڈلفی کہانت کی جانب سے متواتر ہدایت یہ ہو رہی تھی کہ ایتھنز کو خلاص دلائیں (کہا یہ جاتا ہے کہ اس ہدایت کا باعث وہ فیاضی تھی جو ڈلفی کے اپالو کے مندر کے دوبارہ بنانے میں بعض دولتمند جلاوطن اہل ایتھنز کی طرف سے ظہور میں آئی تھی) بہر حال بہ حیثیت مجموعی یونان میں مذہب ایک مستحفظی قوت تھا، البتہ اہل فلسفہ اسے یہ اہمیت دیتے تھے کہ عمدہ سیاسی ادارات کے قائم رکھنے کے لئے یہ ایک ذریعہ ہے لیکن جب ہم یہ خیال کرتے ہیں، کہ انقلابی تحریکات کے روکنے میں واقعاً اس کا کتنا کم اثر پڑتا تھا تو ہمیں گونہ حیرت ہوتی ہے مگر فلاسفہ ہمیشہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ جس طرح کی اعلیٰ و عاقلانہ دنیاوی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، مذہب قطعی طور پر اس حکومت کے تحت میں رہیگا۔

جب ہم روما کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں مذہب نے زیادہ نمایاں حصہ لیا تھا۔ یوما کے متعلق، ہم جو کچھ سنتے ہیں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ روما کی تاریخ کے دور افسانہ میں کم از کم ایک موقع تو ایسا آیا تھا جب سلطنت کے اتحاد و ارتقاء میں مذہبی اثرات نے بہت اچھا کام کیا، اور تاریخی زمانے میں بھی طبقۂ پلیب کے ساتھ قدیم عدیدیت کی کشمکش میں، مذہب موخرالذکر کی جانب ایک قابل قدر قوت معلوم ہوتا تھا۔ اس سے انھیں کم از کم اتنا موقع تو ملگیا کہ جن سیاسی امتیازات کی وسعت کو وہ روک نہیں سکتے تھے ان میں تاخیر و تعویق ڈالدیں، مگر یونان کی طرح روما میں بھی یہ نہ ہوسکا کہ مذہب کی وجہ سے کوئی ایسی مذہبی ذات یا طبقہ پیدا ہوجاتا جو اپنی اس حیثیت سے اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ درحقیقت سلطنت کے متعلق یونانی واطالوی خیال اور ازمنۂ وسطیٰ و جدید کے خیال میں منجملہ اور فرقوں کے ایک نہایت ہی اہم فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر میں

سلطنت کے کچھ ایسے فرائض سمجھے جاتے تھے جنھیں ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت سے جدا کرکے کلیسا کے حوالہ کردیا گیا تھا اور جنھیں جدید نظریات نے ابھی اس وقت تک سلطنت کو واپس نہیں دیا ہے۔ چنانچہ اصحاب فکر کے تخیل کے بموجب یہ اساسی اہمیت رکھنے والا فرق سلطنت کو تفویض کیا گیا ہے کہ وہ اہل ملک کے اوصاف نیک کو اس طرح قائم رکھے کہ بچپن کے زمانے میں ان کی تعلیم کی نگرانی کرے اور سن رشد کے بعد ان کے عادات عیش پرستی و بدکاری کی اصلاح کرے۔

کلیسا و سلطنت کے جدا کردینے سے لامحالہ مذہبی حکومت کا پیدا ہوجانا لازم نہیں آتا بلکہ درحقیقت یہ کہنا چاہیئے کہ مذہبی حکومت جب اپنے کمال پر ہوتی ہے تو اس میں کلیسا و سلطنت دونوں مخلوط ہوجاتے ہیں۔ تاہم جہاں کہیں کہ پیشہ ور قسیسوں کی کوئی جداگانہ تنظیم ہوتی ہے، مذہبی خیالات وجذبات زبردست رہتے ہیں اور معاشرہ کی حالت ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کی سی ہوتی ہے جس میں قومی اتحاد ناکمل اور سیاسی نظم ہیجان اور ناپائدار ہوتا ہے جس سے نظم معاشرت کے ہر اس عنصر کو جس میں کچھ بھی لڑنے کی قوت ہوتی ہے مجبور ہوکر اس قوت کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیئے استعمال کرنا پڑتا ہے، یہ محل مذہبی حکومت کی کوشش کرنے کے لیئے موزوں و مناسب ہوتا ہے۔

۳۔ پس اب میری تجویز یہ ہے کہ اسی جداگانہ تنظیم کا درجہ بدرجہ پتا چلانے سے آغاز کیا جائے۔ جیسا کہ ہم سب کو عام طور پر معلوم ہے، اس کی بنائے اول عبرانی یعنی یہودی نظم حکومت پر ہے جو اپنی تاریخ کے اہم دور میں کامل حکومت مذہبی کی شکل رکھتی تھی، یونانی رومانی دستور میں جو جگہ قانون ملکی کو حاصل تھی وہ جگہ قوم یہود میں قانون الٰہی سے پر کیگئی تھی، جن محرکات مروجہ کی وجہ سے اس قانون کی اطاعت ہوتی تھی وہ اس شارع ربانی کے وعدے پر اعتماد اور اس کے وعید کا خوف تھا جس نے اس شرط پر قوم یہود کی حفاظت کا خاص عہد کیا تھا کہ وہ اس کا حق اطاعت ادا کرتی رہے اور جن وسائل سے واقعاً قانون کا علم حاصل ہوتا تھا ان میں ایسی پیچیدگیاں موجود تھیں جن کا اظہار اکثر ترقی یافتہ قوموں کے اصول فقہ سے ہوتا ہے مسیحیت کو تحریری مجموعۂ ضوابط کا خیال ورثے میں ملا جیسے سچے بنی اسرائیل نے

اسی حیثیت سے تسلیم کیا تھا اور بنی اسرائیل سے خدا نے جو وعدے کیے تھے اس میں عیسائیوں کو اپنا واجبی حصہ ملنے کا مدار اسی مجموعۂ ضوابط کو صدق دل سے قبول کرنے پر تھا (اور اب تو فی الاصل تمام بنی نوع انسان در نہ کم از کم اس کی تمام برگزیدہ تو میں عیسائیت ہی کے زمرے میں داخل ہیں) اگرچہ قدیم عبرانی مجموعۂ ضوابط کا محض رسمی حصہ بالکل مسترد کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وہ تمام ضمنی قوانین جن کا انحصار روایت اور عالموں کے شروح و حواشی پر تھا، خارج کر دئے گئے ہیں پھر بھی یہ یقینی کہا جاتا تھا کہ خدا کا قانون یہود کی کتب مقدس پر متضمن ہے جن کے ساتھ حضرت عیسٰیؑ کی تعلیم اور ان کے حواریوں کی تحریریں بھی ضم کر دیگئی تھیں۔ اس قانون کے تسلیم کرنے سے سلطنت سے قطعاً ممیز ہو کر کلیسا اب ایک منتظم ملت کی حیثیت سے ترکیب پا گیا تھا، اور دونوں کے درمیان یہ فرق اس وجہ سے بھی سخت ہو گیا کہ قدیم مسیحی اس خیال سے ملکی زندگی سے الگ ہو گئے تھے کہ وہ ان بت پرستانہ رسموں سے بچے رہیں جو وفاداری کے سرکاری اظہار کے طور پر عاید کی جاتی تھیں۔ اس تفریق میں اس دار و گیر کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی جو انھیں اس وقت برداشت کرنا پڑی جب ان کی اس جماعت کے شیوع نے جو قدیم نظم معاشرت کے قالب کی اس درجہ مخالف تھی، آخر میں شہنشاہی حکومت کے لئے خطرہ شدید پیدا کر دیا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس علیحدگی کی وجہ سے عیسوی نظم معاشرت کے اندر ابتدا ہی سے مذہبی حکومت کے تخم مخفی تھے لیکن جو لوگ کہ اس ربانی قانون کو تسلیم کرتے تھے جس کی حکمرانی تمام انسانی زندگی پر تھی، ان لوگوں کی جماعت اگرچہ نیم سیاسی سوسائٹی بنی رہی تاہم اس نے مدت تک اس وسیع متمدن سوسائٹی کے درمیان بسر کی جو رومانی قانون کے ماتحت تھی، اپنے آپ کو دنیاوی تنظیم سے الگ رکھا اور یہ سعی نہیں کی کہ اس سوسائٹی پر اقتدار حاصل کر کے جدید مجموعۂ ضوابط کے بموجب دنیاوی قانون کے نظم و نسق میں ترمیم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے زیادہ ابتدائی زمانے میں ملت عیسوی نے ہر قسم کی دنیاوی حکومت سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ قدیم عیسائیوں کے

خیال کے بموجب عام انسانی نظم معاشرت ایک ایسا عالم تھا جو عارضی طور پر شیطان کی حکومت میں دیدیا گیا تھا اور اس پر عاجل و ناگہانی بتاہی محیط تھی۔ ایسے عالم میں اس مختصر سی جماعت کا جو گرجا کی محراب کے نیچے جمع ہوتی تھی تعلیم دنیا میں کیا حصہ ہو سکتا تھا۔ غرض ابتدائی عیسویت کے زیر اثر حب وطن و خدمت ملکی کا احساس یا تو عالمگیر حُب انسانی کی صورت میں وسیع ہو گیا یا کلیسائی ملت تک محدود رہ گیا۔ ترتولیان کہتا ہے کہ "ہم (کل دنیا کی) ایک دولت عامہ کو تسلیم کرتے ہیں" اور یگن کہتا ہے کہ "ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا ایک وطن ہے، جو غدا کے حکم سے قائم ہوا ہے"۔ علہ

جب قسطنطین کے زیر سایہ مذہب عیسوی رومانی شہنشاہی کا مسلمہ مذہبی معیار بنگیا، اس وقت اس روش میں کس قدر تغیر ہوا مگر صرف کسی قدر مسیحی طبقۂ قسیس اب بھی اصولاً دنیا و معاملات دنیا سے الگ رہا اور عملاً اس مذہب کے اکابر کی ذات کے ساتھ کتنی ہی دنیاداریاں کیوں نہ لاحق ہو گئی ہوں مگر اس دنیاداری نے ہنوز اس کوشش کی صورت نہیں اختیار کی تھی کہ وہ دنیاوی امور میں دنیاوی حکومت پر اقتدار حاصل کر لے۔ شہنشاہ کے زیر اقتدار کلیسا کے خود اپنے حکمراں تھے، اور اگرچہ ضوابط جسٹی نیان کے بموجب اکابر کلیسا کو اخلاقی یا کرم گسترانہ حیثیت کے انتظامی فرائض تفویض کئے گئے، مثلاً یہ کہ خلاف قانون گرفتاریوں کے روکنے کے لئے قید خانوں کا معائنہ کرنا، قمار بازی کا انسداد، عورتوں کے جبراً اسٹیج پر لانے کا سد باب، وغیرہ یہ امور ان سے متعلق تھے اور چوتھی صدی میں شہروں کے زوال کے وقت شہری انتظامات میں بھی اکابر کلیسا نے اچھی اہمیت پیدا کر لی تھی، پھر بھی یہ لوگ فی الجملہ دنیاوی حکومت سے بے تعلق تھے نظم و نسق ملکی میں اہل کلیسا سے اس طرح کام لینا غالباً مذہبی حکومت کی جانب پہلا قدم سمجھا جائیگا مگر اسے صرف پہلا ہی قدم سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہبی و اخلاقی مسائل میں پادریوں کا دعویٰ یہ تھا کہ عام

علہ مصنف کی تاریخ اخلاقیات صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۲۰ کا مقابلہ کیجئے۔

دنیا دار کسی رتبے کے کیوں نہ ہوں ان کی اطاعت کریں۔ شہنشاہ اگر اپنے مذہبی و اخلاقی فرض میں کوتاہی کرے تو صدر کلیسا اگر صاحب جرأت و ایقان ہو تو وہ اسے بھی زجر و توبیخ کر سکتا، اس پر کفارہ عائد کر سکتا، اور اس کے گناہوں کی معافی سے انکار کر سکتا تھا لیکن جب تک کہ مغرب یا مشرق میں رومانی شہنشاہی باقی رہی بلند حوصلہ افراد کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے مگر پادریوں نے ایک منضبط جماعت کی حیثیت سے یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ اپنے اس اثر کے ذریعے سے شہنشاہوں کو تخت نشین کرنے ان کی میعاد حکومت معین کرنے یا ان کے معمولی نظم و نسق پر نگرانی قائم کرنے کا کام لیں۔

۴۔ پس شہنشاہی کے تحت میں، ہم شہنشاہی کے اندر تنظیم کی وہ تفریق دیکھتے ہیں جس میں آئندہ کی مذہبی حکومت کا تخم مخفی تھا، مگر اس تخم نے ابھی تک نشوونما نہیں پائی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ تخم کے نشوونما کی اولیں وجہ خود کلیسا کے اندر حکومت مذہبی کی کسی بلند حوصلگی کی تحریک نہیں تھی بلکہ خارجی حالات اس کا سبب ہوئے یعنی مغربی شہنشاہی کے زوال کے بعد دنیاوی اقتدار میں جو برہمی و ابتری پیدا ہوئی وہی اس کا باعث ہوئی۔ شہنشاہی شکست ہو گئی مگر کلیسا بدستور منضبط رہا۔ کلیسائی استعارے میں یہ ایک کشتی تھی جس کے ذریعے سے بربریوں کے حملوں کے بعد کی ابتدائی پانچ صدیوں کے تلاطم بحر سے گزار کر تہذیب و تمدن کو پار اتارا گیا تھا۔ اس پرآشوب زمانے میں مغربی یورپ کے نظم معاشرت میں اگر کچھ اتحاد قائم تھا تو اس کی اصل مغربی عالم عیسوی کا یہی اتحاد تھا۔ کلیسا کا تنظیمی ارتباط مضبوط تھا، اسے اس امر کا احساس تھا کہ ان وحشی حملہ آوروں پر اسے کامل ذہنی فوقیت حاصل ہے۔ کلیسا کی تعلیم و مراسم کے وسیلے سے ذہنی اثر کا وہ واحد ذریعہ جس سے ان کندۂ ناتراش بربریوں کے دلوں پر پرزور اثر ہو سکے وہ اسی کے قبضۂ قدرت میں تھا، اور بدنظمی کے بالمقابل کامیاب جدوجہد سے اسے نئی قوت حاصل ہوتی جاتی تھی، ان تمام امور نے وحشیوں کی ان فرمانرواییوں کے اندر جو رومانی شہنشاہی کی شکست اور اس سے باہر کی ٹیوٹنی قوموں کے اجزا سے بن گئی تھیں کلیسا کو اول درجے کی اہمیت دیدی اور بتدریج اس کا

تسلط وسیع ہوتا گیا۔ یہ امر واقعہ جیسا فرانس و جرمنی کی تاریخوں میں نمایاں ہے اس سے کم انگلستان کی تاریخوں میں نمایاں نہیں ہے اور اسپین میں بھی گاتھ اور عربوں کے فتوحات کے درمیانی زمانے میں نظر آرہا ہے مگر زیادہ خصوصیت کے ساتھ اس کا اظہار چارلس اعظم کی شہنشاہی میں ہوا جس کی متبرک حیثیت ایک نہایت حیرت انگیز خصوصیت ہے یہ چارلس ہی تھا جس نے زیادہ تر علیسوی عشر کا نظم قائم کیا اور کلیسائی اکابر کے وجود کا سلسلہ بھی اسی کی روش پر جاکر منتہی ہوتا ہے یہ کلیسائی اکابر وہ انتخاب کنندہ اساقفہ اعظم تھے جو جرمنی میں صدیوں تک شہنشاہ کے بعد بڑے بڑے دنیاوی حکمرانوں کی ہمسری کا دعوی کرتے رہے۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس نے مشرق کے بربری ملک کو بزور شمشیر زیر کرکے ازمنۂ وسطیٰ کے تمدن کا مطیع بنا دیا تو اس کے ساتھ ہی اس نے اس ملک پر قبضہ واقتدار عصائے اسقفی کے ذریعے سے قائم رکھا۔
نتیجہ عام یہ ہوا کہ اساقفہ نظم ونسق ملکی کے اور ان مجالس کے جو دنیاوی حکمرانی کو حکومت کے کام میں مدد دیتی تھیں اہم رکن بن گئے اور اس کے ساتھ ہی گرجے اور خانقاہیں اپنے ارضی اوقاف پر قابض ومتصرف رہے اور انہیں ترقی دیتے گئے۔ اور جب واقعات اپنی باری میں بالطبع خیالات پر اثر انداز ہوئے تو پادری اپنی خود مختاری اور دنیاوی معاملات کی نگرانی کے متعلق تبدریج لاطائل دعاوی پیش کرنے لگے۔ پادریوں کا دنیاوی عدالتوں کے اختیار سے آزاد ہونا، دنیاوی معاملات پر اسقفی دیا پاپائی اختیارات کا وسیع ہونا، بدکردار ستم شعار حکمرانوں کی مقاومت کرنے بلکہ انھیں معزول تک کر دینے کا استحقاق جتانا، یہ سب وہ دعاوی ہیں جو اوائل نویں صدی کے ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے لیکن ہنوز کلیسا کی اندرونی تنظیم اپنے پورے اتحاد وارتباط کو نہیں پہنچی تھی۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ پادری دنیاوی جاگیری نظم سے علٰحدہ ہو جائیں اور اس علٰحدگی میں دشواریاں جو اس وجہ سے لاحق ہو جاتی تھیں کہ دور تفرق وانتشار کے بعد نظم معاشرت کی تعمیر میں خود پادریوں ہی نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا (خاصکر فرانس وجرمنی میں)۔ اس کا ایک طبعی نتیجہ

جزوی جاگیریت اور اس لیئے کلیسائی عہدوں کے دنیاوی رنگ میں آجانے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

(جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) چارلس اعظم کی شہنشاہی کے اجزاء میں جب جاگیری طرز کی مدد سے نظم معاشرت کی تعمیر ثانی شروع ہوی تو اس وقت دنیاوی جاگیری طبقہ حکمراں میں کلیسا کے مقامی ارباب اقتدار کو بڑی ہی اہم حیثیت و منزلت حاصل ہوگئی تھی۔ اساقفہ بلکہ اہل صومعہ تک نے نیم خودمختاری حیثیت حاصل کر لی تھی اور بڑے بڑے وسیع علاقوں پر بالکل دنیاوی امراء کی طرح سے نیم حاکمانہ اختیارات عمل میں لانے لگے۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جاگیری نظم سلطنت کے اندر جابجا ایک طرح کی مذہبی حکمرانی قایم کر دی تھی مگر جو مذہبی حکمرانی اس طرح قایم ہوی وہ اس قسم کی تھی کہ مذہبی حکمراں کو زاید از ضرورت دنیاوی حکمراں کے مشابہ کر دینے سے خود اپنے ہی اصول کے برباد کرنے کی طرف مائل ہوگئی۔ ازمنۂ مابعد میں مقدس رومانی شہنشاہی کے اندر اس کا اظہار نہایت ہی حیرت انگیز شکل میں ہوا۔ چنانچہ جب مرکزی قوت کمزور ہوگئی تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس انتشار کے دور میں جو امارتیں بنیں انمیں کلیسائی امرا کو بہت ہی اہم حصہ مل گیا اور محکوموں کے ساتھ ان کا برتاؤ اور ان کے ساتھ محکوموں کا انداز طبیعت دونوں دنیاوی حکمرانوں کے برتاؤ کے بہت ہی مشابہ ہو گئے تھے۔ مگر سابق تر ازمنۂ وسطیٰ میں یہی واقعہ عجیبہ مغربی یورپ کی دوسری سلطنتوں میں بھی پیش آچکا تھا اگرچہ وہ اس حد تک نہیں پہنچا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرنگی شہنشاہی میں ملک کی معمولی عدالتوں سے برآت و مستثنیات (جنھوں نے حکومتی فرائض اور زمینداری کے امتزاج باہمی میں اس قدر اہم اثر دکھایا) پہلے پادریوں کو عطا ہوئیں اس کے بعد بڑے بڑے دنیاوی امرا کو ملیں۔ جو شخص کلیسائی تسلط کا دشمن بھی ہو اس کے لئے بھی یہ انکار کرنا دشوار ہے کہ جاگیری تنظیم میں پادریوں کو جو جگہیں دیگئیں وہ ان خدمات کی بناء پر بالکل بجا و درست تھیں جو بربری اقوام کے حملوں کے بعد کی ابتدائی پانچ صدیوں کے دور ابتری میں کلیسا نے اتحاد کے رشتے کو مضبوط کر کے

اور بحالی نظم و امن میں مدد دیکر تہذیب و تمدن کے حق میں انجام دی تھیں۔ اگر کلیسا ارضی انعامات کا خواہاں تھا تو اس نے مناسب طور پر یہ حق پیدا کر لیا تھا کہ جس جاگیری نظام میں زمین کا قبضہ اور حکومتی اختیار لئے ہوئے تھے اس نظم میں اسے وسیع ارضی دنیاوی اور حاکمانہ اختیار عطا کیا جائے۔ لیکن سوال یہ نہیں تھا کہ وہ ان دنیاوی انعامات کا اہل تھا یا نہیں بلکہ سوال یہ تھا کہ اپنی نمایاں خصوصیت کو زائل کئے بغیر ان انعامات کو قائم بھی رکھ سکتا تھا یا نہیں؟ کم از کم اس وقت تک تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا جب تک کہ کوئی پر زور مرکزی تنظیم اور کوئی سخت گیر جداگانہ انضباط دنیاوی رنگ اختیار کرنے کے اس میلان کا بدل نہ کر دیتا جو لازماً ان انعامات کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہو جاتا تھا اور میرا خیال ہے کہ مورخ بھی اس کا جواب اسی طرز پر دینا چاہے گا جس طرز پر ہلڈے برانڈ نے اس کا جواب دیا تھا ہلڈے برانڈ نے اس معاملے میں جیسا پر زور اثر ڈالا کسی ایسے ہی پر زور اثر کے بغیر اغلب یہی تھا کہ وسیع دولت و عظیم طاقت کے ترغیبات اور ان کے ساتھ ہی پدرانہ الفت اور نظم جاگیری کی موروثیت کا میلان، تمام مغربی یورپ میں مذہبی مناصب اعلیٰ کو موروثی جاگیر بنا دیتے اور ان مناصب کی مابہ الامتیاز مذہبی خصوصیت ہلڈے برانڈ اور اسکے جانشینوں کی سعی و کوشش کے باوجود بھی واقعاً جس حد تک گمنامی و خرابی میں پڑی رہی، اس سے زیادہ کامل طور پر غارت ہو گئی ہوتی۔

بہر حال، جب پوپ کے زیر سایہ پادریوں کا تجرد اور پر زور مرکزی انتظام کامیابی کے ساتھ قائم ہو گیا تو پھر یہ امر تقریباً لابدی تھا کہ اس قوت کی سعی یہ ہوگی کہ جس نظم معاشرت پر اس نے پہلے ہی سے اس قدر زبردست قابو حاصل کر رکھا تھا اس پر مکمل وہمہ گیر حکمرانی قائم کرلے۔ اور یہ اکابر دین روحانی و دنیاوی اقتدار کی تقسیم کو قطعاً یہ سمجھنے لگیں کہ (ان دونوں اقسام اقتدار میں) محکومین کے لحاظ و اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا بلکہ یہ فرق صرف طرز حکمرانی کے اعتبار سے تھا کیونکہ اخلاقیات کا تعلق بہ حیثیت مجموعی روحانی دائرے سے ہے اور سیاسیات کا وہ کونسا مسئلہ ہے جس کی نسبت اخلاقی مسئلہ ہونے کا

دعویٰ نہ کیا جاسکے؟ یہ صحیح ہے کہ پادری انہیں ذرائع سے حکومت کرتے تھے۔ جنھیں روحانیت کہا جاتا تھا یعنے اخراج از ملت تعطل فرائض مذہبی قہر خداوندی کے تہدیدات، اور عنایت خداوندی کے دعوے لیکن یہ طریقے اگر فی الجملہ کچھ موثر تھے تو وہ ایک دنیاوی غرض کے حصول کے لئے موثر ہوسکتے تھے، اور جیسا کہ کلیسائی اہل قلم کا دعویٰ تھا اگر اس امر کو ایک مرتبہ تسلیم کرلیا جاتا کہ ان طریقوں کے نفاذ کے حدود کا تعین کرنا صرف کلیسا کا کام تھا تو پھر اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدود اس قدر وسیع قرار دئے جاتے کہ ان میں حقیقتاً آزاد دنیاوی حکومت کے لئے کوئی جگہ ہی نہ باقی رہتی، اور چونکہ جاگیری نظریہ اور جاگیرانہ عمل کے درمیان قابل افسوس فرق موجود تھا جس کا ذکر پہلے ہی ہوچکا ہے اس لئے دنیاوی حکمرانوں کو ان کے فرض کا پابند رکھنے کے لئے ہر طرف سے مذہبی انقیاد کا شور مچا ہوا تھا (پھر بھی وہ کب کسی کو خاطر میں لاتے تھے) پس ہلڈےبرانڈ کا یہ خواب کہ ایک ایسا ذی اقتدار پوپ ہو جو تمام تنازعات کا عقدہ کشا ہو معاملات صلح وجنگ میں اسے اعلیٰ اختیار حاصل ہو سلطانوں کی متنازعہ فیہ وراثتوں کا تصفیہ ظالموں کی معزولی اس کے ہاتھ میں ہو، خلاصہ یہ کہ بادشاہ یا شہنشاہ کے بجائے جاگیری انتظام کا حقیقی مرکز پوپ ہوجائے، یہ ایک ایسا خواب تھا کہ صلیبی جنگہائے عظیم کے دور میں خیالات وحسیات کی جو کیفیت اور جاگیری نظم کی ناکمل ترتیب میں واقعات سیاسیہ کی جو حالت تھی وہ بہ شدت تمام کلیسا پر یہ زور دے رہی تھی کہ وہ اس خواب کو عملی صورت میں لے آئے۔

۵۔ کامل حکومت مذہبی کی اس کوشش کو اہم ترین عروج انوسنٹ سوم (۱۱۹۸ء سے ۱۲۱۶ء) کے دور پاپائیت میں حاصل ہوا، مگر اس تمام کوشش کے آغاز وانجام کو، ہم دو شہرۂ آفاق وافسانہ وار کشمکشوں کے ساتھ وابستہ کرسکتے ہیں، یعنی آغاز اس کا ہلڈےبرانڈ (یعنی پوپ گریگوری ہفتم ۱۰۷۳ء) اور شہنشاہ ہنری چہارم کی کشاکش سے ہوا اور انجام اس کا چودھویں صدی کے آغاز میں پوپ بانیفیس ہشتم اور فلپ (خوبرو) شاہ فرانس کی کشمکش پر ہوا، جبکہ بادشاہ اپنی تمام مملکت کو اپنی تائید میں لئے ہوئے پوپ کے اس تقدس مآب دعوے

کے ساتھ بہ تقابل پیش آیا کہ وہ جس طرح چاہے قوموں اور شاہیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے، تباہ و برباد کر دے اور (پھر اپنے حسب دلخواہ) انھیں صورت پذیر اور استوار کرے۔" اس کے فرمان کو عوام کے سامنے جلا ڈالا' اور خود پوپ کو گرفتار کر لیا اسے مذہبی حکومت کا خاتمہ قرار دینے سے میرا یہ منشا نہیں ہے کہ پاپائیت نے اپنے دعاوی کو ترک کر دیا میرا خیال تو یہ ہے کہ ان دعاوی سے باضابطہ طور پر کبھی (بلکہ اس وقت تک بھی) دست برداری نہیں کی گئی ہے مگر اس سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اس وقت بہ بہو نچکر اس کا اقتدار لوگوں کے دلوں سے اس قدر گھٹ گیا تھا کہ کامل حکومت مذہبی کی کوئی توقع باقی نہیں رہ گئی تھی' اگرچہ ہنوز اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً یورپ کے دنیاوی معاملات میں عام طور پر زبردست مداخلت کر سکے' اور اطالیہ کی سیاسی معرکہ آرائیوں میں باقاعدہ مقدم جگہ حاصل کر سکے۔

یورپ انوسنٹ سوم جس نوعیت اور جس حد کا مذہبی اقتدار عمل میں لایا اس پر زیادہ غایر نظر ڈالنا باعث دلچسپی ہوگا۔ جس عہد کا اس وقت ہم خیال کر رہے ہیں اس وقت عام طور پر دنیاوی طاقتوں کا جو حال تھا وہ حال اس کا نہیں تھا کہ جس قطعہ اراضی پر وہ حاوی ہو وہ اپنے مرکز پر تو زیادہ قوی ہو اور مرکز سے جتنا ہی بعد ہوتا جائے اسی نسبت سے اس میں کمزوری آتی جائے' بلکہ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے ساتھ ساتھ اس کا اثر امتیازی بڑھتا جاتا تھا یہ دیکھنا حیرت سے خالی نہیں ہے کہ انوسنٹ تک کے وقت میں اطالیہ کے اندر پاپائیت کی حکمت عملی کی خصوصیت یہ تھی کہ ہوشیاری و تدبیر سے کام نکالا جائے اور اس کے مقابلے میں دور کے حکمرانوں پر پوپ بڑی شان کے ساتھ احکام صادر کرتا تھا اور اس میں اسے کامیابی بھی ہوتی تھی' مثلاً انوسنٹ نے ہنگری کے ڈیوک اندریاس کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدس کی طرف کوچ کر جائے تاکہ اس کے بھائی بادشاہ ہنگری کو اطمینان نصیب ہو' اور اس کے بھائی کو یہ حکم دیا کہ وہ سزادہی کے لئے بوسینا کے بان' (صوبہ دار) پر حملہ آور ہو کیونکہ اس نے مرتدوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ شاہان ڈنمارک و سویڈن کو

یہ اشتعال دلایا کہ وہ شاہ نارڈوے کو اس کے تاج و تخت سے محروم کر دیں، اور ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ کو وہ اس حالت میں لے آیا کہ انھوں نے خود کو مسند مقدس کا باجگزار قرار دیدیا کلیسائی وقائع نگار کے دعوی کے بموجب سنہ ۱۱۹۵ء میں پرتگال کا بادشاہ اور اس کی بادشاہی پوپ کی باجگزار بنکر "مقدس پطرس" کی حفاظت میں آگئی۔ سنہ ۱۲۰۴ء میں شاہ اریگان نے اپنی بادشاہی انوسنٹ کے حضور میں پیش کی اور اسے ہمیشہ کے لئے اس کا اور اس کے جانشینوں کا باجگزار بنادیا۔ سنہ ۱۲۰۷ء میں شاہ پولستان نے اور (جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے) سنہ ۱۲۱۳ء میں جان شاہ انگلستان نے یہی حیثیت اختیار کی۔

یہ صحیح ہے کہ ان ملکوں میں سے کسی ملک میں بھی پوپ کی سیادت کے ان اعترافات کی قوم نے توثیق نہیں کی، درحقیقت (جیسا کہ ہمیں انگلستان کے متعلق معلوم ہے) ان اعترافات سے بادشاہ کی اس سعی کا اظہار ہوتا ہے کہ امرا کے ساتھ جد و جہد میں وہ اپنی تائید کے لئے کلیسا کی طرف جھکتا جاتا تھا، مگر یہ امر واقعہ کہ ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ نے اس قسم کا اعتراف کیا، بجائے خود بہت ہی حیرت افزا معلوم ہوتا ہے۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پوپ اس حیثیت کے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ازمنۂ وسطیٰ کے قدیم سیاسی تخیل کے بموجب (جسے انوسنٹ سوم کے ایک صدی بعد دانتی نے از سر نو زندہ کرنا چاہا) جہاگیری طبقۂ حکمراں کے سرتاج شہنشاہ کو حاصل ہونا چاہیئے تھی، پاپائیت نے مغربی یورپ کے دنیاوی معاملات میں فوقیت حاصل کرنے کی جو مسلسل و متصل کوشش کی اس پر غور کرتے ہوئے اس امر کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ اس نے اپنی کمان میں دو تیر جوڑ رکھے تھے، بقول اسٹبز ایک عام دعویٰ تو وہ تھا جسے گریگوری ہفتم اور اس کے جانشینوں نے پیش کر رکھا تھا، کہ پوپ کو دنیاوی بادشاہوں پر تفوق حاصل ہے یعنی روئے زمین پر جس روحانی طاقت کا مخزن اعلیٰ پوپ ہے وہ فی نفسہ دنیاوی طاقت سے فایق ہے[1] مگر جیسا کہ

۱۔ اسٹبز تاریخ دستوری جلد سوم باب نوزدہم صفحہ ۳۰۰۔

ہم دیکھ چکے ہیں اس کے سوا خاص خاص ملکوں پر سیادت کے خاص دعادی بھی تھے جنکی بنا خاص قانونی مفروضات اور خاص قوانین پر تھی۔ یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ فکر و تدبیر سے یہ آخر الذکر مخصوص قسم کی فوقیت کیونکر موقع محل پراز خود اس عام فوقیت سے پیدا ہوجاتی تھی اور پھر اپنی باری میں اس عام فوقیت کو تقویت دیتی تھی۔ اس دور میں اسی خاص قسم کی فوقیت انگلستان کی طرح اسکاٹلینڈ اور آئرستان پر بھی قائم ہوگئی تھی یا اس کا دعوی کیا جاتا تھا، اور مدت تک نیپلز پر بھی قائم رہی اور جیسا کہ ابھی ذکر ہوچکا ہے کچھ دیر کے لئے ارگان اور پرتگال پر بھی اپنا پرتو ڈال گئی۔

۶۔ جن قطعی نیم قانونی دلائل سے حکومت مذہبی کے ان دعادی کی تائید کیجاتی تھی، اب ایک بڑی حد تک ان کی دلچسپی زائل ہوگئی از منۂ وسطی کے طرز استدلال میں تعمق نظر، جولانی ذہن اور محنت پژوہی کے باوجود جس قسم کا امکان محال، ضعف بنا اور عدم ربط عام طور پر پایا جاتا ہے وہ ان دلائل میں ضرورت سے زیادہ موجود ہوتا تھا۔ اس دعوی کی بنیاد وضع تاریخ جعلی دستاویزات، انجیل کی خرافات تحریفوں اور تشبیہوں پر رکھی گئی تھی۔ نویں صدی کے "مجموعہ فرامین" میں سابق کے پاپاؤں کے بہت سے جعلی خطوط شامل ہیں، جن میں دنیاوی حکمرانوں کو اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ انھیں میں قسطنطین کا فرضی عطیہ بھی ہے جس کا ذکر پہلی مرتبہ ۷۹۱ء میں ہوا مگر گیارھویں صدی تک نمایاں طور پر اسے آگے نہیں بڑھایا گیا۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ دعوی کیا جاتا اور اس پر یقین بھی کیا جاتا تھا کہ شہنشاہ مذکور جب خود قسطنطنیہ کو چلا گیا تو اس عطیہ کے ذریعہ سے اس نے پاپائے مقدس سلوسٹر کو نہ صرف شہنشاہی نشان، قبا، عصا، اور محل دیدیا بلکہ تمام صوبے اور شہر یعنی اطالیہ و مغرب کا کل ملک اس کے حوالے کردیا۔ اوٹو اعظم نے جب دسویں صدی میں مقدس رومانی شہنشاہی کی تجدید کی اور جان دوازدہم سے "مسند مقدس" کی حفاظت اور روما کی آزادی کی وقعت کا وعدہ کیا تو اس وعدے کے متعلق بھی یہ تلبیس کی گئی کہ اس پر جاگیرانہ اطاعت کے حلف کا رنگ چڑھایا گیا۔ دنیاوی حدود کے اندر پوپ کی فوقیت کے نتائج اس قسم کے

خارج العقل دلائل سے نکالے گئے کہ بطرس کو کنجیاں عطا ہوئی تھیں یا یہ کہ شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب "چاند اور سورج" سے دی گئی ہے۔

اس قسم کے دلائل کے پڑھنے سے ہم یہ عاجلانہ نتیجہ اخذ کرنے کی طرف مائل ہو جاتے کہ مذہبی حکومت کی تمام بنائے قوت نیم مہذب زمانے کی وہم پرستانہ زود اعتقادی پر تھی، مگر یہ نتیجہ عاجلانہ و یکطرفہ ہوگا۔ ان مضحکہ انگیز و مغالطہ آمیز مفروضات و نتائج کی تہ میں یا ان کے ساتھ ایسے حقیقی وزن رکھنے والے مباحث بھی ہیں جن پر غور کرنا ضروری و اہم ہے۔ اول یہ کہ کلیسائی جداگانہ و نیم خودمختارانہ تنظیم کی بنا اس یقین پر تھی کہ مسیحی نظم معاشرت کے اتحاد کا دار و مدار کلیسا کے اتحاد پر تھا، اور کلیسا کے اتحاد کے لئے ایک ایسے داخلی ارتباط کی حاجت تھی جس کا قیام و دوام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا تھا کہ قسیسوں کی خودمختاری کو بالاستقلال قائم رکھا جائے۔ اس وجہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ قسیس دنیاوی عدالتوں اور دنیاوی محصولوں سے علٰحدہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک یقین صادق یہ تھا، کہ حق و انصاف کے مفاد کے لئے کلیسا کی مداخلت کی مسلسل ضرورت ہے اور یہ یقین بھی اسی نتیجہ پر پہنچاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم معاشرت کی خصوصیت خاص یہ تھی کہ سلطنت خداوندی civitas Dei کے اندر (جو اصلاً مغربی یورپ کے تمام مسیحی عالم پر چھا گئی تھی) تقدس و امن کا ایک اعلیٰ تخیل قائم رہنا چاہئے مگر اس کے ساتھ عملی واقعات یہ تھے کہ جور و زیادتی اور زبردستوں کے ہاتھوں زیردستوں کی حق تلفی کا بازار گرم تھا۔

پس جس طرح ارسطاطالیس کا اثر روایتی مسیحی عقیدہ مسلمہ سے ملکر ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفے کے وجود میں لانے کا باعث ہوا، اسی طرح زندگی کے مسیحی نقطۂ نظر پر ارسطاطالیسی خیال کا اطلاق سلطنت کے اوپر کلیسا کی فوقیت کا مؤید بن گیا۔ ارسطو نے بہبود انسانی کے عنصر کی حیثیت سے سیاسی افعال پر غور و فکر کی فوقیت کے متعلق جو کچھ کہا تھا اسے اس معنی میں پھیر لیا گیا کہ اس سے دنیاوی زندگی پر مذہبی زندگی کی فوقیت کی تائید ہوتی ہے اور اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ جس تنظیم کا مقصد روحانی بہبود ہے اسے اس تنظیم پر تفوق حاصل ہے

جو صرف دنیاوی بہبود کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مزید براں، صحیح بادشاہ جو تمام قوم کی بہتری کے لئے قانون کے بموجب حکمرانی کرتا ہے، اور وہ خودسر جو اپنے ذاتی مقصد کے لئے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، ان دونوں کے درمیان ارسطو نے جو فرق قائم کیا تھا اسے بھی ازمنۂ وسطیٰ کے اہل فکر نے پوری طرح سمجھ لیا تھا اور اس پر بحثیں کرنے لگے تھے۔ اس بے لگام، خود غرض شے کے لئے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضرور تھا، اور اس کا صریح و سہل علاج۔ بھی معلوم ہوتا تھا۔ ۔۔سوں کی طرف سے زجر و توبیخ ہوتی رہے، لیکن اگر ایسا ہوا تو اس تدارک کے عمل میں لانے کا فریضہ نائب عیسیٰؑ کے ہاتھ میں ہونا چاہئے کیونکہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا۔ اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران مقدس پطرس (حواری) کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کر دے، اور اس سے بالطبع یہ مزید ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کر سکتا ہے وہ نصب و تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے، اور اس تقدیس سے بھی انکار کر سکتا ہے جو عیسائیوں کے احساس عام کے بموجب بادشاہوں کے صحیح طور پر نصب ہونے کے لئے ضروری تھی جب اسے ایک مرتبہ تسلیم کر لیا گیا تو پھر ایک ایسی فوقیت تسلیم ہو گئی جسے اب اور کمال تک پہنچانے میں جاگیری اطاعت شعاری سے کچھ ایسی مدد نہیں مل سکتی تھی۔

یہ ملحوظ رہے کہ کلیسائی طبقہ و حکمراں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ دنیاوی حکومت کے فرائض اختیار کرنا چاہتا ہے، ازمنۂ وسطیٰ کے لوگوں اور خاصکر متکلمین کے طبائع میں بال کی کھال نکالنے کی جیسی عادت تھی مذہبی حکومت کی حمایت کرنے میں بھی اس سے کام لیا جاتا تھا اور وہ ہوشیاری کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ اگرچہ کلیسا کے پاس روحانی و دنیاوی دونوں تلواریں ہیں مگر وہ دنیاوی تلوار سے کام نہیں لیتا ہے، بلکہ دنیاوی اختیار کے واقعی نفاذ کو وہ دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے مگر وہ یہ دعویٰ رکھتا ہے کہ اسکا نفاذ مذہب کے اقتدار کے تحت میں اور اس کی منظوری سے ہونا چاہئے۔

بہر حال، (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) سترھویں صدی کے اختتام کے بعد دنیاوی حکومتوں کی خود مختاری کی راہ میں یہ دعویٰ زیادہ اہم طور پر سدراہ نہیں رہا، مگر پادریوں کی تنظیم و ترتیب ایک ایسے غیر ملکی حکمراں کے تحت میں باقی رہ گئی جسنے اصلاح کے زمانے تک اپنے اس حق یا عادت سے دست کشی نہیں کی کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں پادریوں پر محصول لگاتا رہے، نہ اپنے اس حق کو ترک کیا کہ مذہبی عدالتوں کا مرافعہ اس کے سامنے پیش ہو اور قانون مذہبی کے قواعد سے وہ معافیاں دیسکے، اور اس سے قومی اتحاد و ارتباط میں (مختلف جگہوں میں مختلف زور و قوت کے ساتھ رکاوٹ ہوتی رہی، لیکن چودھویں صدی میں ۱۳۰۹ء سے ۱۳۷۶ء تک اوی نیو کے قیام کی وجہ سے جو "قید بابل" کے نام سے مشہور ہے، اور جس کی وجہ سے پاپائیت ضرورت سے زیادہ فرانس کے اثر میں آگئی، پاپائیت میں ضعف آگیا، اس کے بعد ۱۳۷۸-۱۴۱۷ء کے "افتراق اعظم" اور اس کوشش کی وجہ سے کہ کلیسا کی شاہانہ مطلق العنانی کو موثر طور پر عام کونسلوں کے تحت میں لاکر دبا دیا جائے (اس میں مزید ضعف پیدا ہو گیا) جب پندرھویں صدی میں اس کوشش کی ناکامی سے پاپائیت کا امتیاز خاص از سر نو زندہ ہوا، تو اس وقت "نشاۂ جدیدہ" کا پورا زور شور تھا جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا، اور اس کے بعد پھر پاپائی بادشاہی نے اپنی کوشش کو اسی امر پر مرکوز رکھا کہ اطالیہ کے اندر اپنی مملکتی حیثیت کو مستحکم کرے۔

خطبۂ شانزدہم

بلاد ازمنۂ وسطیٰ ۔ طرز عام

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم حکومت کے وہ تین عناصر جن کی ترقی جاگیری دور میں بھی حاوی و غالب جاگیریت سے معائر و مباین تھی ان میں سے میں اب دوسرے عنصر کی طرف توجہ کرتا ہوں یہ دوسرا عنصر تجارتی و حرفتی عنصر تھا اور جس کے قائم مقام بلدیات سمجھے جاسکتے ہیں۔

عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں پر دو حیثیت سے غور ہوسکتا ہے۔ ایک طرف تو اس وسیع تر مجموعے کے اجزا تھے جسے ہم قوم کہتے ہیں اور قوم کے مقدر پر اس کے نشوونما کا اہم اثر پڑتا تھا اس حیثیت کے متعلق میں بعد کے (سلسلہ) بیان میں پھر کچھ کہوں گا۔ دوسری طرف یہ کہ جاگیری نظم کو جیسا ناکمل انضباط و انصرام حاصل ہوا خود اسی کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کو بہت معقول حد تک خود مختاری حاصل ہوگئی۔ یہ ضرور ہے کہ وسیع تر مجموعے کا انضباط جس قدر زیادہ تھا اُسی نسبت سے اس خود مختاری میں کمی تھی اور میں کچھ تو اس خطبے اور کچھ آئندہ کے چار خطبوں میں اسی نقطۂ نظر سے اس ارتقاء کا درجہ بدرجہ پتا چلانا چاہتا ہوں، میں پہلے بلاد ازمنۂ وسطیٰ کے عام طرز پہ بحث کروں گا۔

میں نے ایک سابق کے خطبے میں مغربی یورپ کی قوموں کے

سیاسی ارتقاء کی عام یکرنگی پر زور دیا ہے، میرا منشا یہ نہیں ہے کہ ان سب میں ایک ہی وقت میں ایک ہی طرز کی حکومت نظر آتی ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم بحیثیت مجموعی ان کا تصور اپنے ذہن میں قائم کریں۔ تو یونانی شہری سلطنتوں کیطرح یہاں بھی ہم یہ دیکھیں گے کہ بالاوسطہ ان کے ارتقا کے مبہم مدارج میں معاشری ترکیب اور حکومت دونوں اعتبارات سے ایک خاص طرز کی طرف میلان غالب موجود ہے۔ چنانچہ میں خطبۂ چہاردہم میں یہ تشریح کر چکا ہوں کہ قطعی معنی میں اگرچہ جاگیریت مغربی یورپ کے صرف ایک حصّے میں مستحکم طور پر قائم ہوئی تھی تاہم یہ حصّہ بہت بڑا حصّہ تھا اور اس جاگیریت صحیحہ کی حد سے باہر ہمیں وہ حالات نظر آتے ہیں جنھیں ہم نیم جاگیری کہہ سکتے ہیں اور پھر حکومت مذہبی کیجانب گامزن ہونے کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت مذہبی کی اس تحریک نے مغربی یورپ کے تمام ملکوں پر یکساں اثر ڈالا تھا (مثلاً یہ کہ پوپ کے ساتھ اطالیہ کا تعلق ہمیشہ نہایت ہی خاص قسم کا رہا ہے) تاہم مغربی یورپ پر اس کا اثر بہت ہی عجیب و غریب طور پر پھیلا ہوا تھا، جیساکہ ہمیں ان ملکوں کی فہرست سے معلوم ہو چکا ہے جن پر پوپ کو دعوائے سیادت تھا۔ علیٰ ہذا جیساکہ میں بعد کو ظاہر کرونگا، ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور یعنے تیرھویں یا چودھویں صدی سے سولھویں یا سترھویں صدی تک مغربی یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک ایک ایسے دور سے ہو کر گذرے تھے جس میں قومی معاملات کی نگرانی میں (اسٹیٹس، ڈائٹ، پارلیمنٹ وغیرہ کے نام کی) کسی نہ کسی قسم کی نیابتی جمعیتوں کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا تھا خواہ یہ اثر عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں مطلق العنان بادشاہی کے غلبے کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ طرز اگرچہ مستثنیات سے خالی نہیں تھا اور ان مستثنیات میں انگلستان سب سے زیادہ اہم تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ اسکو رائج الوقت واقعہ کہہ سکتے ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعتیں جس کی جانب میں اب خیال رجوع کرنا چاہتا ہوں، اس کی بابت بھی یہی کچھ کہا جاسکتا ہے اور یہاں اس پر

زور دینے کی اور بھی زیادہ ضرورت اس وجہ سے ہے کہ مختلف ممالک میں شہروں نے جیسی خود مختارانہ قوت اور شان و شکوہ حاصل کی ان کے عظیم الشان و حیرت افزا اختلافات کی وجہ سے ان کے طرز کی یہ عام یکسانی تاریخ کے عام مطالعہ کرنے والوں کی نظر سے مخفی رہجاتی ہے، مگر اسی طرز نے مختلف یورپی ممالک میں جس طرح ترقی کی اس میں مذکورۂ بالا اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی، ہم نمایاں مشابہت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئیڈن، اطالیہ جہاں کہیں بھی ازمنۂ وسطیٰ میں شہروں کو کافی اہمیت حاصل ہوئی اور اپنی سیاسی زندگی کو پوری طرح نشو و نما دینے کے لئے کافی آزادی میسر آئی، وہاں عام طور پر شہروں میں ایسی حرفتی تنظیم پیدا ہوئی جو زمانہ جدیدہ سے تو کچھ مشابہت ہی نہیں رکھتی تھی، اور قدیم شہری سلطنتوں کی زندگی میں جو عجائبات نظر آتے ہیں ان سے بھی نمایاں حد تک مغائر تھی، یہ مغائیرت مختلف اسباب کے اجتماع کا نتیجہ تھی ایک حد تک اس کا سراغ اس نہایت ہی اساسی فرق میں ملتا ہے جو قدیم و جدید یورپی تمدن میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اول الذکر کی بنا غلامی پر تھی اور اس لئے آزاد اشخاص کا محنت مزدوری کرنا فلسفیوں تک کی نظر میں بالطبع غلامانہ پیشہ معلوم ہوتا تھا، اسکے برخلاف ازمنہ وسطیٰ میں محنت مزدوری کرنے کا جس وقت سے ہمیں قطعی علم ہوتا ہے اس وقت سے ہم اسے آزاد دیکھتے ہیں اور اس دور کے موخر زمانے میں تو اس عمل بالید کو تاریخ یورپ میں پہلی مرتبہ تمام یورپ میں عروج حاصل ہوا۔ لیکن قدیم شہری سلطنتوں کے نظام حکومت اور زندگی کے بالمقابل ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے نظام حکومت اور زندگی کے پورے فرق کا پتا ایک حد تک اس سے چلتا ہے کہ جب ان کا مقابلہ یونان کی قدیم شہری سلطنتوں سے کیا جاتا ہے، تو جن ملکی سلطنتوں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ان کے عجائب کی پیچیدگی بہت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے اور اسپنسر اسے انکے اجزا کی تفریق مزید کہئے گا۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم شہری سلطنتوں کی تکوین محض ایک چھوٹی سی قومی جماعت کے اجتماع سے ہو جاتی تھی اور اس طرح بڑے

زمیندار جو قدیم خاندانوں اور ارباب دول پر مشتمل تھے شہر کے سر برآوردہ باشندے بن جاتے تھے اس کے برخلاف ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کی نشو و نما ایک ایسی قوم کے اندر ہوئی تھی جن کا حکمراں طبقہ عموماً ان شہروں سے باہر رہتا تھا۔ بڑے بڑے جاگیری زمیندار اپنے ٹیوٹنی عادات و اطوار کو برقرار رکھتے اور شدت کے ساتھ دہقانی بنے رہتے تھے یہ لوگ زیادہ تر حرفتی شہروں سے کبھی بہت ہی قریب میں اور کبھی بالکل ہی دیہات میں رہتے تھے، اور جب پختہ جاگیریت کی نیم انتظامی حالت نے ترقی کی تو ان لوگوں نے براعظم یورپ میں ہر جگہ دیہاتوں کے اندر دفاعی اور جارحانہ ضرورتوں سے قلعے تعمیر کر لئے۔ شہر زیادہ تر ان لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے گئے جنھیں اولاً نظم معاشرت کا نسبتاً وہ حقیر جزو سمجھا جاتا تھا جسے حرفت و تجارت پر گذر اوقات کرنا پڑتی تھی اور شہر جس قدر اہمیت و خود مختاری میں ترقی کرتے جاتے تھے۔ اسی قدر وہ اپنی سیاسی ہیئت اور زندگی کے اعتبار سے خود کو دیہاتوں سے (فی الجملہ) ممیز کرتے جاتے تھے۔ شہروں کے باشندے بلکہ شہروں کے ان سر برآوردہ لوگوں تک کی نسبت جو شہروں کے معاملات کا انتظام کرتے تھے، مسلّم طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ اپنے طرز زندگی اور اپنے غالب و حادی اغراض و مفاد کے لحاظ سے قوم کے ان سر برآوردہ ارکان سے حقیقتاً مغائر ہیں جو اردگرد کے دیہاتی اضلاع میں حکمرانی کرتے اور ابتک ملک کی مجموعی حکومت میں غلبہ رکھتے تھے، Citizen ("شہری") اب ایک نئے مفہوم میں استعمال ہونے لگا اب اس کے وہ معنی نہیں رہے جو یونانی لفظ πολιτης ("پولی تیس") اور لاطینی لفظ πολιτης ("سوِس") کے تھے یعنے سلطنتوں کے وہ رکن جنھیں سلطنتوں کے سیاسی اختیارات اور اقتدار حکومت میں کچھ حصّہ حاصل ہو اور مملکت جس قدر عمومیت کی طرف قدم بڑھاتی جائے اسی قدر اس حصے میں اضافہ ہوتا جائے، بلکہ اب اس کے معنے دیہات کے باشندوں سے ممیز شہر کے ان باشندوں Bourgeois کے تھے جو مخصوص طور پر شہری اغراض و مفاد

اور شہری طرز زندگی کے حامل ہوں اور یہ اختصاص سربرآوردہ شہریوں کو بھی بہ حیثیت ایک طبقے کے ان دیہاتی شرفا سے متغائر بنا دیتا تھا جن کے ساتھ اکثر صورتوں میں مدت دراز تک ان کے معاندانہ تعلقات قائم رہے۔

پس ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے مختلف مجموعوں کے درمیان بہت ہی اہم سیاسی فرق کی موجودگی کے باوجود بھی یہ حالت وسیع معنی میں صحیح وصادق رہی اور یہ سیاسی فرق نتیجہ تھا ان مختلف تعلقات کا جو شہر اور شہر کے حکمراں طبقے اور گرد و پیش کے ملک کی حکومت اور اس کے حکمراں طبقے کے درمیان قائم تھا۔ ان فرقوں میں سب سے زیادہ تعجب انگیز فرق کا آخری سراغ مقدس رومانی شاہی اور اس کے اس اثر میں ملتا ہے جس نے (اس تفریق پذیر قلمرو کے اندر جس پر اصولاً شہنشاہ فرمانروا تھا) مرکزی حکومت کو کمزور کر دیا تھا۔

اس پر ہم ایک سابق خطبے میں[1] غور کر چکے ہیں مگر اس وقت مجھے جس امر کو خاص طور پر زیر بحث لانا ہے وہ یہ ہے کہ ازمنۂ جدیدہ کی جرمنی اور شمالی اٹلی شاہی غلبے کے دور میں جس طرح برقرار رہ گئیں، وہ محض نیم خود مختار امارتوں سے مرکب نہیں تھیں شہنشاہی کے ضعف سے جس طرح والیان ملک کو موقع ہاتھ آگیا اسی طرح شہروں نے بھی نفع اٹھایا۔ اس ضعف سے جرمنی میں شہروں کی ایک تعداد کثیر کو یہ موقع مل گیا کہ انھوں نے اپنے قریب ترین کلیسائی دنیاوی امرا بلکہ ایک زمانے میں خود شہنشاہ کی مقاومت کے باوجود زور و زر یا غصب کے وسیلے سے اپنے کو شہنشاہی شہروں کے درجے پر پہنچا دیا جس سے معنوی طور پر ان کی نسبت یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ وہ مختلف امارتوں کے مانند خود مختار و نیم فرمانروا ہیں یعنی شہنشاہ اور شہنشاہی مجلس ملی کے سوا اور کسی کی وفاداری ان پر فرض نہیں رہی تھی، اور تیرھویں صدی کے آخر سے

[1] خطبۂ سیزدہم۔

مجلس ملّی میں ان کی جگہ مسلّم ہوگئی تھی، اور باضابطہ طور پر ان کی یہ حیثیت خود بقائے شہنشاہی تک قائم رہی، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں انھیں زیادہ نمایاں اہمیت نہیں حاصل تھی ان پر خاموشی طاری تھی اور، (اس لئے) عام مورخ ان پر نظر نہیں ڈالتے، مگر ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور میں حالت کچھ اور رہی تھی۔ یہ شہر اپنے قرب و جوار کے جاگیرداروں سے کشاکش رکھتے اور ان سے لڑتے تھے، پہلے تو فرداً فرداً ایسا کرتے رہے اور بعد میں لیگ اور عہدیت قائم کرکے نبرد آزما ہوئے جب شمالی جرمنی کے بڑے بڑے شہروں کی ہنسیائی لیگ خود اپنے طور پر اور مساویانہ شرائط کے ساتھ اسکینڈنیویا کی شاہیوں سے جنگ کرنے لگی ہے تو پھر بہت ہی معمولی مورخ کو بھی اس پر نظر ڈالنا پڑتی ہے۔

شمالی اطالیہ میں شہنشاہ کی شاہی طاقت جرمنی سے بھی کمتر درجہ پر تھی شہنشاہ کو لمبارڈی کا تاج پہننے کا مسلمہ حق حاصل تھا، اور اس نے بارہا یہ کوشش کی کہ اطالیہ میں اپنا موثر اقتدار اعلیٰ قائم رکھے، مگر اس میں اسے کبھی وقتی کامیابی سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس لئے اطالیہ میں شہروں نے جرمنی سے بھی زیادہ شاندار تفرد پیدا کرلیا مگر اکثر صورتوں میں یہ حالت جرمنی کے بہ نسبت کم زمانے تک قایم رہی اور ہنگامی طور پر تو یہاں تک ہوا کہ ان شہروں نے عملاً کامل خودمختاری حاصل کرلی، درحقیقت شمالی اطالیہ کے ایک معقول حصے میں شہروں نے دیہاتوں کو دبالیا اور ان مضافات کی زمین متصلہ شہری سلطنتوں کے اندر اس طرح تقسیم ہوگئی جس طرح قدیم زمانے میں یونان میں ہوتا تھا۔ بارھویں صدی کے وسط سے قبل ہی، لمبارڈی کے شہروں نے اتنی ترقی کرلی اور اس حد تک خودمختاری حاصل کرلی تھی، وہ آپس میں نہایت ہی شدید قسم کی لڑائیاں لڑنے لگے تھے۔ بعد کے زمانے میں فلورنس اور سینا، وینس، اور جینوا کی تاریخ پڑھنے والوں کی توجہ ایتھنز، اسپارٹا اور تھیبز کی طرح اپنی جانب منعطف کرلیتے ہیں، اور دوسرے کثیر التعداد شہر جو مدت تک

عملاً خود مختار رہے ان کی طرف بھی ان متذکرۂ بالا شہروں کے تعلقات کی وجہ سے مجبوراً توجہ کرنا پڑتی ہے۔ درحقیقت اطالیہ کے ازمنۂ وسطیٰ کے خود مختار بلدی زندگی کے اس عنادا ب نشو ونما کا اثر سترھویں صدی میں بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا مگر پھر بھی بعض بعض اجزا تو باقی ہی رہ گئے تھے اور انھیں میں ایک وینس بھی تھا جو ازمنۂ وسطیٰ وازمنۂ جدیدہ میں عدیدی استقامت کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

پس اب یہ امر آسانی سے ذہن میں آسکتا ہے کہ شہر جس قدر زیادہ خود مختاری حاصل کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ قدیم یونان کی خود مختار شہری سلطنتوں سے زیادہ کل طور پر مشابہ ہوتے جاتے تھے۔ پس اس تشابہ وتقابل کو پوری طرح ظاہر کرنے کے لیے میں آئندہ کے چار خطبات میں اپنی توجہ اس امر پر مرکوز رکھونگا کہ ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعتوں نے جرمنی واطالیہ میں اپنے سیاسی ارتقا کے دوران میں جو سیاسی ترکیب وہیئت اختیار کی وہ کیا تھی اور ان میں خاص کر اطالیہ کے بارے میں یہ ظاہر کرونگا کہ مغربی یورپ کے دوسرے ممالک کے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے بالمقابل اطالیہ میں خاص انھیں شہروں کے غلبے کی وجہ سے کیونکر ان کی سیاسی ہیئت ترکیبی، معاشری زندگی اور آخری انجام میں اہم تغیرات پیدا ہو گئے۔ مگر سردست میں اختلافات کی بہ نسبت زیادہ تر مشابہات یعنے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے عام خصوصیات پر بحث کرنا چاہتا ہوں اور اسے عیاں کرنے کے لیے میں اب اس ملک کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو مرکزی حکومت کے پرزور نفاذ اقتدار کے اعتبار سے جرمنی واطالیہ سے بعد المشرقین کا حکم رکھتا تھا، یعنے انگلستان۔

(۲)۔ ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں شہنشاہی کے شہروں کی تاریخ میں جن افسانہ وار دلچسپیوں کی بہتات ہے انگلستان کے شہروں کی تاریخ میں ان کی بہت کمی ہے جرمنی میں قلعہ بند اصحاب تصور کے ساتھ جس طرح "ناقابل مصالحت جنگ" کا بازار گرم رہتا تھا اور اطالیہ میں اکثر ایک شہر دوسرے شہر پر جیسے ہیبت ناک حملے کیا کرتا تھا، یہ سب باتیں انگلستان میں اس زبردست مرکزی حکومت کی وجہ سے خارج از بحث ہو گئی تھیں جو نارمن فتح کے بعد سے

انگلستان میں فی الجملہ برابر قائم رہی، صرف اندرونی بدنظمی کے بہت ہی قلیل زمانوں میں اس میں فرق پڑا۔ اس زبردست مرکزی حکومت نے شہروں کی ترقی کو تنگ حدود کے اندر مقید رکھا۔ اگرچہ کبھی کبھی ان کی بددلی سے کسی قدر فوری ابتری پیدا ہو جاتی تھی مگر آزادانہ جنگ کا اختیار ایک ایسا اختیار تھا کہ اس کے دعوی سے وہ بالکلیہ روک دئیے گئے تھے اور موثر طور پر روک دیئے گئے تھے۔ درحقیقت، جب اسٹیون کے عہد حکومت کی بیس برس کی طوائف الملوکی کے ختم ہونے کے بعد "غیر اجازت یافتہ گڑھیاں" ڈھادی گئیں تو جاگیری بیرنوں میں آپس کی لڑائیاں بھی اچھی طرح دب گئیں (جیسا کہ ہم دیکھیں گے) انگریزی قوم کے سیاسی ارتقا میں "ذی اختیار قصبات" کی ترقی بھی اہمیت رکھتی تھی مگر انگلستان کے شہروں اور قصبوں کی بلدی حکومت کیسی ہی تغیرات میں سے کیوں نہ گزرتی رہی ہو، اس نے اقتدار اعلےٰ کے اہم ترین فرائض کا نہ کبھی دعوی کیا نہ انھیں انجام دیا۔ اس بلدی حکومت کے ارتقا کو کسی حال میں بھی خود مختار مملکتوں کے ارتقا سے نسبت نہیں دیجا سکتی۔ اس ارتقا کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ ایک وسیع مجموعے کے ارتقا کا جزو تھا۔

لیکن باوجود اس اصولی فرق کے، ہم ازمنۂ وسطیٰ کے انگریزی، جرمانی اور اطالوی شہروں کی ہیئت ترکیبی میں ایک مشترک طرز کا بھی پتا چلا سکتے ہیں، اور یہ ایسا طرز تھا کہ جس قدر اس ہیئت ترکیبی کو کامل ترقی حاصل ہوتی جاتی تھی اسی قدر اس طرز کے اوصاف خصوصی زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے مثلاً یہ کہ جب انگلستان کے شہروں اور قصبوں نے کامل طور پر قومی حکومت کے زیر اقتدار رہتے ہوئے، خود کو مقامی انتظامی نظم سے آزاد کر لیا اور حکومت خود اختیاری کے معقول اختیارات حاصل کر لیئے (تو یہ طرز زیادہ نمایاں ہو گیا) نہ صرف یہ کہ (انگریزی و براعظمی) دونوں اصناف کے شہر اور قصبے حقیقۃً صنعتی جماعتوں پر مشتمل تھے جن کے حکمراں ارکان (یعنے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں بلدی حکومت کی باگ ہوتی تھی) تجارت صنعت وحرفت میں مشتغل رہتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی صنعتی ہیئت ترکیبی حیرت انگیز حد تک یکساں تھی یعنے کل مجموعے کے ترکیبی عناصر، اور ان عناصر کے باہمی تعلقات

ان کی معاشی ہیئت ترکیبی کا اثر جس صورت سے حکومت پر پڑتا تھا، اور جس طریقے سے ان کی حکومت ان اختیارات کو عمل میں لاتی تھی، جو تجارتی و صنعتی معاملات میں انھیں تفویض کیے گئے تھے، ان سب میں یکسانیت موجود تھی، وینس کو چھوڑ کر اطالوی جمہوریتوں میں سب سے زیادہ مشہور و طاقتور جمہوریہ یعنی فلورنس میں صحیح شہری اور کامل شہری وہی شخص ہوتا تھا جس کا شغل تجارت وصنعت ہو اور اس تخصیص میں انگلستان کے بازار والے پر امن قصبے کسی نہج سے کم نہ تھے۔ جب شہر کو پوری ترقی حاصل ہو گئی تو شہری حکمران جماعت کی ترکیب اس اصول پر قرار دی گئی کہ شہریت کا حق اور آزادانہ تجارتی و حرفتی مشاغل کا حق صحیح معنی میں ایک دوسرے سے ناقابل انفکاک ہو گئے۔ ان دونوں صورتوں (یعنی انگلستان و براعظم دونوں مقامات) میں جو شہری جماعت اس طرح پر ترتیب پاتی تھی اس نے کوشش یہ کی کہ بازار کے قواعد وضوابط اور باہمی بلدی مراسلات کے ذریعے سے اپنے رقیب شہروں کے بالمقابل ہر ایک ناممکن نفع اپنے لئے محفوظ کر لیں، اور یہ خیال قائم کیا کہ ہر ایک مقدم واہم پیشے کی خود اپنی تنظیم ہو اور اپنے ہی عہدہ دار ہوں جو اس پیشے کے ارکان پر حرفتی نگرانی کا متجسسانہ طریقہ قائم رکھیں اور اکثر صورتوں میں یہ خیال بھی مسلم ومقبول ہو گیا کہ شہری حکمراں جماعت میں ان حرفتی گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کا خود اپنا نمایندہ ہونا چاہیے ؎۱۔

میں تخصیص کے ساتھ اسی آخری خصوصیت پر نظر ڈالونگا جس کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعت ایک طرح پر صنعتی گروہوں کی شترکیت ہو گئی تھی، یہ گروہ "پیشہ" اسرار صنعت وحرفت یا فنون" تھے، اور ان کے آثار باقیات میں سے ہم اس وقت لندن کے بزازوں اور نوربافوں وغیرہ کی انجمنیں دیکھتے ہیں، ہر گروہ کو خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے کسی قدر آزادانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے جن کا اعلان کردہ عام مقصد زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ ہر ایک تجارت وحرفت پر ایسی نگرانی رکھی جائے جس سے سامان کی خوبی اور اچھے کام کا عام مقبولہ معیار

؎۱ ایشلی۔ انگلستان کی معاشی تاریخ جلد دوم صفحہ ۷

برقرار رہے، اور ہمیں یہ یقین کرنا چاہیئے کہ ابتدائی گروہ بندی کے اصلی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا۔ معاشی و سیاسی اغراض کے لئے شہری جماعت کی ہیئت ترکیبی کسی قدر کشمکش اور تصادم میں پڑنے کے بعد حاصل ہوئی تھی، اور اگرچہ اس کشمکش و تصادم کی شدت (مختلف مقامات میں) بہت کچھ مختلف تھی اور انگلستان میں تو نسبتاً بہت ہی خفیف تھی، پھر بھی مغربی یورپ کے مختلف ملکوں میں جب ہم اس کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں تو اس کے مدارج عمل کے اندر بہت کچھ یکسانیت پاتے ہیں۔

برّ اعظم کی طرح انگلستان میں بھی یہ ہوا کہ شہروں نے اپنے گرد و پیش کے حصص ملک کے معاشری و سیاسی نظم سے بتدریج ہی آزادی حاصل کی، اس لئے اولاً حق شہریت صرف شہر کے ان باشندوں تک محدود رہا جو حدود شہر کے اندر زمین کے مالک ہوتے تھے۔ صرف اسی قسم کے "قصباتی آراضی دار" شہری جمعیت کے کامل الحقوق رکن ہوتے تھے۔

پھر برّ اعظم ہی کی طرح انگلستان میں بھی یہ ہوا کہ جب شہروں کی صنعتی خصوصیت صاف طور پر نمایاں ہوگئی تو تاجروں کے عنصر نے دستکاروں کے عنصر سے بہتر ہو کر سرگروہی حاصل کر لی اور کچھ زمانے تک شہر کی حکومت پر عملاً انھیں کا اجارہ قائم ہو گیا۔ کم از کم انگلستان کے بعض شہروں میں تو تیرھویں صدی میں یہ ہوا کہ دستکار باضابطہ طور پر شہر کے آزاد (یعنی ذی اختیار) طبقے سے خارج کر دیئے گئے، اگر کسی دستکار کو آزاد بننے کی خواہش ہوتی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے وہ دستکاری کو ترک کرے اور اپنے گھر سے اوزار نکال باہر کرے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ دستکاروں کے اس استحقاق کی بھی مقاومت کی گئی کہ وہ اپنے اوپر حکومت کرنے کی غرض سے اپنی تنظیم قائم کر سکتے ہیں، لندن میں جان کے عہد میں شہریوں نے خزانے میں سالانہ ایک رقم اس شرط سے داخل کرنے کی پیشکش کی کہ انجمن نوربافاں منسوخ کر دی جائے، لیکن ایک وقت آیا کہ پانسہ بالکل ہی پلٹ گیا۔ نہ صرف اہل حرفہ کی گونہ خود مختار تنظیم کے ساتھ رواداری برتی گئی بلکہ اسکی ترقی و وسعت مرکزی حکومت کی تنظیم کا ایک جزو ہو گئی۔ ایڈورڈ سوم کے عہد کے ختم ہوتے ہوئے بجائے اس کے کہ دستکار شہریت کے ناقابل ہوتے لندن کے اندر شہریت کے لئے شرط یہ قرار پائی کہ کسی نہ کسی انجمن کا رکن ہونا ضروری ہے۔ ہر ایک "دستکاری یا انجمن" کے باضابطہ

اجلاس ہونے لگے، اور وہ جماعتیں اپنے افسر منتخب کرنے لگیں جو عام اغراض کے محصول کی ایک مقدار عاید کرتے تھے اور عدالتی اختیار اور تحبس کے بعض حقوق کو عمل میں لاتے تھے۔

دستکاروں کی انجمنوں کے ارکان کے اس طرح بتدریج سوداگروں کے ساتھ مساوی امتیاز کی حد کو پہنچ جانے کو ہم ازمنۂ وسطے کی شہری جماعت کی "تحریک بہ جانب عمومیت" کہہ سکتے ہیں، جو کسی حد تک یونانی رومانی شہری سلطنتوں کی "تحریک بہ جانب عمومیت" سے مشابہت رکھتی تھی گر ازمنۂ جدیدہ کے نقطۂ نظر سے دونوں صورتوں میں صریحاً نامکمل تھی لیکن دونوں تحریکوں کا فرق نہایت ہی حیرت افزا ہے؛ یونانی شہری سلطنت میں عمومیت کی جد و جہد کے تمام دوران میں عدیدی و عوام دونوں زیادہ تر زراعت پیشہ رہے اور جہاں عمومیت کو فتح حاصل ہوئی تھی وہاں اگرچہ آزاد اہل حرفہ انجام کار کامل شہری ہو جاتے تھے پھر بھی دستکارانہ محنت مزدوری زیادہ تر غلاموں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے برخلاف (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں عدیدی (اگر میں اس اصطلاح کا استعمال کر سکتا ہوں) حقیقتاً تاجر تھے اور عمومیت فی الحقیقت دستکاروں کی عمومیت تھی۔ یہ بھی خیال رکھئے کہ قدیم شہری سلطنتوں میں یہ کشمکش شخصی حقوق خاص کی وسعت کے لئے تھی، اور بعد میں زمانۂ جدیدہ کی ملکی سلطنتوں میں بھی جہاں تک عمومی تحریک کا تعلق ہے یہی حال تھا۔ اس کے برخلاف ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں دستکاروں کی منضبط جماعتیں تھیں جو اپنے مجموعی حقوق خاص کے لئے جد و جہد کر رہی تھیں۔ ایک حد تک اسی کا نتیجہ تھا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے ارتقا کے آخری درجے میں ہمیں ایک قسم کی عدیدیت کا میلان تسلیم کرنا پڑتا ہے جو خود دستکاروں کے اندر اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب انھوں نے اپنی امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی؛ یہ حالت اگرچہ جرمنی و اطالیہ کی بہ نسبت انگلستان میں کم تھی پھر بھی تھی ضرور۔ حرفت کے یہ حقوق خاص مالکانہ دستکاروں تک محدود تھے اور اس لئے ان میں اور عام مزدوروں کے روز افزوں طبقے میں تفریق پیدا ہو گئی، اور مزدوروں کے مالکانہ دستکار بن جانے کے راستے میں رکاوٹیں حائل کی جانے لگیں؛ مثلاً یہ کہ داخلے کا نذرانہ بہت گراں مقرر کیا گیا۔

اور پیشے کے ارکان کو پر تکلف ناشتہ یا کھانا کھلانا پڑتا تھا۔ مزید براں خود مالکانہ دستکاروں کے درمیان میں حکومت کا عدیدی طرز ترقی کرتا گیا یا یہ کہ زیادہ سخت ہوگیا۔ دستکاروں کی یہ سیاسی کامیابی ہی ان کی عمومی خصوصیت کی تباہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ جب یہ قاعدہ مستحکم ہوگیا کہ شہری حق رائے دہی کے حصول کے لئے کسی منضبط انجمن دستکاروں کا رکن ہونا شرط لازمی ہے تو پھر جو لوگ دولت و معاشری حیثیت میں معمولی دستکاروں سے بلند تھے وہ "حرفتوں" یا انجمنوں کے رکن بن گئے اور پھر بالطبع ان انجمنوں کے اندر سربرآوردہ حیثیت حاصل کرلی۔ اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اپنے آخری دور میں انجمنوں کی حکومت اور نیز وہ شہری جماعتیں جو انجمنوں پر مشتمل تھیں اکثر صورتوں میں بہت زیادہ عدیدی ہوگئی تھیں۔

میں نے ایسا بیان پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ارتقا کے اس طریق عمل کا نمونہ ہو جب اسے پوری طرح پھیلنے کا موقع ملگیا تھا' یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فروعات کے اعتبار سے تنوعات و مستثنیات بہت کثیر تھے' اور خاص کر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ملک کی حکومت سے شہری حکومت کی بے تعلقی' امیر جاگیرداروں کے ساتھ شہروں کے تعلقات اور تاجروں اور دستکاروں کے آپس کے تغیر پذیر روابط جملہ اعتبارات سے برّ اعظم کے سربرآوردہ شہروں میں بالعموم ایسی شدید و طولانی معرکہ آرائی جاری رہی جس کا انگلستان میں کہیں پتہ بھی نہیں چلتا' خاص کر اطالیہ میں شہروں اور امیروں کے باہمی تعلقات بدامنی کا مستقل منبع و مخزن بنے رہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے)

۳۔ شہروں نے جن اوقات میں کم و بیش زیادہ خود مختاری حاصل کی' اور نیز جس حد تک وہ خود مختاری کے درجے پر پہنچے یہ دونوں امور مغربی یورپ کے مختلف حصص میں ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف تھے' اسپین کے شہروں کو بہت پہلے خود مختاری حاصل ہوئی' اور یہ تقدم شہروں کی اس شرکت عمل کا مآل طبیعی معلوم ہوتا ہے جو ان سے مسلمانوں کے خلاف جد و جہد میں (جن سے آہستہ آہستہ اسپین واپس لیا جارہا تھا) ظہور میں آئی' چنانچہ اسپین میں گیارھویں صدی میں شہروں کو منشور عطا ہوگئے تھے اور وہ خود اپنے عاملوں اور عادلوں اور سپہ سالاروں کا انتخاب کرتے

اور اپنی زمین کے لئے صرف ایک مقررہ معتدل لگان ادا کرتے تھے[1] اطالیہ میں بارھویں صدی کے اوائل میں لمبارڈی کے اکثر اور ٹسکینی کے متعدد شہروں نے اسی قسم کے حقوق خاص حاصل کر لئے تھے (جیسا کہ ہم بعد کو دیکھیں گے)

جب ہم فرانس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو ہم نیم خود مختار شہروں اور مختلف درجوں کی خود مختاری کے متعدد نمونے دیکھتے ہیں، جو دور جاگیر میں مختلف حصص ملک کے مختلف حالات کے باعث ظہور میں آئے اور ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی واقعات عجیبہ کے کثیر التنوع کیفیات کی توضیح و تمثیل کے خیال سے ان اختلافات پر نظر ڈال لینے کے لئے ایک لمحہ ٹھہر جانا سودمند ہوگا۔ ملک کے وسطی حصے میں جہاں بادشاہ کو حقیقی قوت حاصل تھی وہاں اگرچہ دولت و آبادی کی فراوانی کے خیال سے شاہی حکمت عملی شہروں کے نشو و نما کو تربیت دینے کی طرف مائل تھی، مگر باشندوں کے صرف شہری حقوق کو وسعت دیجاتی تھی اور اقتدار اعلیٰ کا کوئی جزو انھیں عطا نہیں کیا جاتا تھا۔ اہل شہر اب غلامان وابستۂ اراضی پادشاہ کے "شہری" ہو جاتے تھے اور اس طرح آزادی و طمانیت میں جو زیادتی ہوئی بہت ہی قابل قدر تھی، لُوری کا "منشور" اس قسم کے شہروں کے لئے نمونہ تھا اور بارھویں صدی کے دوران میں اس کی استدعا و یافت بہت کثرت کے ساتھ ہوتی رہی، مگر اب بھی اس قسم کے شہروں کی فوج محافظ کی سپہ سالاری، ان کے محصولوں کی وصولی اور انجمن انصاف کا نفاذ یہ سب شاہی عہدہ دار انجام دیتے رہے لیکن انصاف کے نفاذ اور محاصل و مزدوری کے اجرا میں قدیم خود رایانہ رسم متروک ہوگئی بلکہ تمام ادائی و خدمات ایک معین مقدار میں مقرر کر دیگئی تھیں۔ فرانس کا مغربی حصہ جو بارھویں صدی میں انگریزی حکومت کے تحت میں تھا اس کی نسبت بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حالت بھی بہت کچھ ایسی ہی تھی، البتہ ہنری دوم اور رچرڈ کے عطا کردہ منشوروں میں سیاسی اختیارات کے متعلق

---

[1] اطالیہ کے بالمقابل یہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہیں ہو کہ ہسپانیہ کے متعدد قدیمی منشوروں میں صاف طور پر یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ کوئی امیر اراضی بلدیہ کے اندر جائداد غیر منقولہ نہ حاصل کرے گا نہ کوئی قلعہ تعمیر کرے گا۔

کسی قدر زیادہ فراخدلی سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف، شمالی مشرق اور جنوب مشرق میں بعض شہروں نے ایسی سیاسی خودمختاری حاصل کرلی تھی جو عملاً جاگیری امرائے عظام کی خودمختاری کے ہمپایہ تھی۔ یہ شہر اگرچہ ڈیوک، کاؤنٹ یا اسقف کے زیر اقتدار رہتے تھے مگر انھوں نے شہر میں انصاف کے علاوہ آمد پر پورا اقتدار حاصل کرلیا تھا، صلح و جنگ اور معاہدے خود اپنے طور پر کرتے تھے، خود اپنے حکام کا انتخاب عمل میں لاتے اور اپنے ہی قوانین کے مطابق اپنی حکومت چلاتے تھے۔ مگر ان نیم خودمختار شہروں کی حکومت خوداختیاری کی معاشرتی ہیئت ترکیبی اور ان کا طرز شمال و جنوب میں ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ جنوب خاصکر قدیم رومانی صوبے میں جہاں بربریوں کی فتح نے قدیم ایطالیہ اور رومانی معاشرتی تنظیم کو محض خفیف طور پر محو کیا تھا، وہاں شہروں کے اندر قدیم طبقۂ امرا کا عنصر موجود تھا اور اس لئے وہاں صنعتی عنصر کے غلبے کی تکمیل کم ہوئی۔ یہاں کے سیاسی ادارات اطالیہ کے ان سیاسی ادارات سے زیادہ مشابہ ہیں جن کا حال ہم اطالوی شہروں کے بیان پر پہنچکر دیکھیں گے۔ یہاں ہم "قنصل"، ان کی خاص و عام مجلس، پارلیمنٹ یا عام مجلس قوم اور ان میں غیرملکی "پودستا" قائم مقام یہ سب کچھ مشاہدہ کرتے ہیں اس کے برخلاف آمیاں، بووے، سواسوں اور شمال کے دوسرے شہروں میں ہمیں نہایت ہی نمایاں قسم کا ازمنۂ وسطی کا طرز نظر آتا ہے۔ یہیں ان تاجروں اور دستکاروں کی وہ آزاد انجمنیں تھیں جو حرفت و تجارت سے دولتمند ہوگئے تھے، جو کمیون کے لئے حلف اٹھاتے تھے" اور اپنے قرب و جوار کے جاگیری امرا سے معقول حد تک خودمختاری کے وسیع کرنے یا بزور حاصل کرلینے کے لئے باہم مرتبط ہوگئے تھے۔ خودمختاری کی اس معقول حد کے اندر اپنے شہروں پر کامل ابتدائی اختیار عدالتی (جس میں سزائے موت تک شامل تھی) اور صلح و جنگ کرنے کا حق سب داخل تھا۔ بعدازاں جب فرانس کی بادشاہی نے انضباط کی طرف قدم بڑھائے تو نیم خودمختار شہروں کی خودمختاری ہر جگہ گھٹ گئی اور آخرالامر گذرے ہوئے زمانے کی بات ہوگئی۔ پھر بھی (جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے) قومی حکومت کے نشوونما پر شہروں کے ارتقا کا نہایت اہم اثر پڑا۔

خطبۂ ہفتدہم

بلدیات ازمنۂ وسطٰی جرمانی

۱۔ ازمنۂ وسطٰی کی شہری جماعتوں سے متعلقہ خطبات میں مجھے فکر یہ ہے کہ مختلف یورپی ممالک کے اندر ازمنۂ وسطٰی کے شہروں کا جب ہم مقابلہ کریں تو انھیں جو نہایت اہم تشابہات پائے جائیں انھیں صاف طور پر عیاں کردیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف ممالک کے مختلف حالات کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہوئے اور وہ بھی اہمیت میں کسی طرح کم نہیں ہیں، انھیں بھی واضح کرسکیں لیکن اُن تشابہات پر زور دینے کے متعلق مجھے کسی قدر زیادہ خیال ہے (کیونکہ عام مورخ انھیں نظر انداز کرجائے گا) مثلاً یہ کہ فریمین کے گرانمایہ مضمون قدیم یونان و ازمنۂ وسطٰی کی اطالیہ میں قدیم یونان کی کامل خود مختار شہری مملکتوں اور ازمنۂ وسطٰی کے اطالیہ کی عملی حیثیت سے تقریباً خود مختار شہری جماعت کے درمیان بہت سے دلچسپ تشابہات و تخالفات دیئے گئے ہیں مگر ان اکاون صفحوں میں صرف چند ہی سطریں ایسی ہیں (اور ان پر بھی کچھ یوں ہی سی نظر پڑ جاتی ہے)، جس میں اس حقیقت کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہو جو شہرۂ آفاق فلورنس اور یورپ کے دوسرے کم شاندار شہروں میں مشترک تھی یعنی یہ کہ خاص شہری جماعت تجارتی یا حرفتی عناصر سے مرکب تھی جن کا انضباط مشخصہ تجارتوں اور حرفتوں کی صورت میں ہوا تھا۔

بہر حال، ان تشابہات و اختلافات کو صاف اور نیز مختصر طور پر آپ کی نظروں کے سامنے لانے کے لئے میں نے آپ کی توجہ انگلستان کی طرف منعطف کی تھی، جہاں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطٰی کے شہر مرکزی حکومت کے موثر اقتدار کے تحت میں

ترقی کرتے جاتے تھے۔ (مگر جیسا کہ میں نے کہا تھا) میری خواہش یہ تھی کہ جرمنی پر بھی ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے خالص طرز کے شہر خودمختاری کی جس انتہائی حد تک پہنچ گئے تھے اس کا خالص نمونہ ہمیں جرمنی ہی میں نظر آتا ہے اور شمالی اطالیہ میں بھی دکھائی دیتا ہے جہاں ہم ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کو غایت درجے کی خودمختاری اور غلبے پر پہونچا ہوا دیکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس غلبے نے ان کے طرز کی خالص کیفیت کو نقصان پہنچا دیا تھا کیونکہ جاگیری امرا کو جب شہروں میں قیام کرنے کے لئے مجبور کیا گیا یا انھیں ترغیب دیکر رکھا گیا تو وہ ایک مادی و غالب ترقی نظم حکومت کے اندر کم و بیش ایک خارجی عنصر ہو گئے اور (جیسا کہ ہم دیکھیں گے) اس خارجی عنصر کے امتزاج سے شدید نتائج پیدا ہوئے۔

پس اس وجہ سے اس خطبے کا موضوع جرمنی کے اندر شہری جماعت کا سیاسی ارتقا ہے۔ جرمنی سے مراد آلپس کے شمال کے وہ اقطاع ہیں جو مقدس رومانی شہنشاہی کے زیر تسلط تھے اور یہاں یہ مناسب ہے کہ مغربی یورپ کے دو حصوں کے درمیانی فرق پر نظر رکھی جائے کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے معاشری و سیاسی ارتقا کا قدم بقدم پتہ چلانے میں یہ فرق اہمیت رکھتا ہے۔ یہ فرق ان دو حصوں کا فرق ہے جس میں سے ایک حصہ متمدن و مہذب ہو گیا تھا اور اس میں تمدن (یعنی وہ قدیم رومانی تمدن جس نے مسیحیت کا جامہ پہن لیا تھا) بربریوں کے حملوں اور فتوحات سے دب گیا تھا، مگر بالکل تباہ نہیں ہو گیا تھا، اور دوسرا حصہ وہ ہے جو غیر متمدن ہی رہا تھا اور جس میں ٹیوٹنی، رومانی، اور مسیحی عناصر سے امتزاج یافتہ نئے تمدن کو ازمنۂ وسطیٰ کے ابتدائی حصے میں وسعت دیگئی تھی۔ وسیع معنوں میں یہ کہ مغرب کی طرف رائن اور ڈینیوب قدیم رومانی شہنشاہی کے حدود تھے۔ اگرچہ جدید زمانوں کے حدود سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رومانی تمدن ان حدود کے کناروں تک کمزور شکل میں وسعت پذیر ہوا تھا بہر حال جو کچھ بھی ہو ان حدود سے باہر ازمنۂ وسطےٰ کے ابتدائی حالات کے تحت میں جرمنی کو بالکل متمدن بنانا تھا اور تمدن کو مشرق کی طرف لیجانے کی اس کارروائی میں کلیسا اور شہر دونوں نے اہم کام انجام دئے اور بہت زمانے تک کلیسائی و حرفتی دونوں عناصر نے تمدن پیدا کرنے میں متحد ہو کر کام کیا۔ درحقیقت جب ہم بلدی ارتقا کی جانچ کرنا چاہیں،

تو ہمیں اس کا آغاز اسی طرح کرنا پڑتا ہے کہ جرمنی و اطالیہ دونوں ملکوں میں شہروں کے ارتقا کے پہلے ہی قدم میں کلیسا نے جس اہم اثر سے کام لیا اس پر نظر ڈالیں، اس کی وجہ کچھ تو کلیسا و شہنشاہی کا وہ اتحاد ہے جو چارلس اعظم کے قوی الضبط تسلط کی بنیاد تھا، کلیسا اس کی حکمت عملی کا ایک بڑا آلہ تھا، چنانچہ اس کا نہایت ہی نمایاں اظہار ملک سکسنی کی فتح اور جرمنی کی تبدیل مذہب سے ہوتا ہے جہاں اس نے آٹھ اسقفیاں اور خانقاہیں قائم کیں جن سے ہر طرف تمدن پھیلتا رہا، آٹو اعظم نے جب جرمنی و اطالیہ میں شہنشاہی کا احیاء کیا تو اس نے بھی اس اتحاد کو قائم رکھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اطالیہ میں کلیسا قدیم تمدن کے باقیات کا محافظ تھا، اور جرمنی میں وہ نئے تمدن کا منبع تھا۔

پس کچھ تو فرنیک بادشاہوں کی حکمت عملی کی وجہ سے اور کچھ ان بادشاہوں اور دوسرے دولتمند زمینداروں کے دلوں کے مذہبی اثر کی وجہ سے شاہی عطیات، نذر و وصیت اور کبھی کبھی کسی پر آشوب زمانے میں چھوٹے چھوٹے جو یائے امن زمینداروں کے اپنی زمینیں کلیسا کے حوالہ کر دینے کے باعث بہت ہی بڑے بڑے قطعات اراضی اساقفہ و روسائے خانقاہ کے قبضے میں آ گئے اور اس طرح یہ لوگ جاگیری نظم میں داخل اور دنیاوی باجگذار امرائے عظام کے ہم مرتبہ ہو گئے۔ ان کے جو فوجی مستاجر پٹہ دار (کاشتکار) بادشاہ کی فوجی خدمت کے لئے طلب کرنے پر بجا آوری حکم کے لئے اسی درجہ پابند تھے جس درجہ دنیاوی امرا کے تابعین پابند تھے لیکن کلیسا اگرچہ اس طرح نیم جاگیری حالت میں آ گیا تھا تاہم اس نے اپنی نمایاں خصوصیت کو برباد نہیں کیا تھا، اور اس کے مذہبی اثر نے اسے دوسروں کی حفاظت کی جو خاص قوت دیدی تھی اس کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ شہروں کے نشوونما میں تازہ روح پھونکنے کا بندوبست کر سکے، رائن اور آلپس کے ماورا کلیسا کے عام تمدن آفریں کاموں کا یہ بھی ایک جزو تھا۔

یہاں میں یہ خیال ظاہر کر سکتا ہوں کہ ایک اہم خصوصیت میں جرمانی شہروں کا طرز ہمیں ازمنہ وسطیٰ کے اطالوی شہروں کی بہ نسبت قدیم یونانی شہروں کی زیادہ یاد دلاتا ہے۔ ان شہروں نے بلدی تمدن کو خشکی کے راستے سے اسی طرح وسعت دی جس طرح یونانی شہروں نے اسے سمندر کے راستے سے پھیلایا۔ ان شہروں نے اس تمدن کو ہنگری پولستان اسکینڈینیویا اور روس تک میں پہونچایا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس ملک کو ہم اب جرمنی کہتے ہیں

اس کے مشرقی حصے پر ٹیوٹنی تمدن نے زیادہ تر اسی طرح فتح حاصل کی کہ اس میں جرمانی جماعتیں بلدی نظام حکومت کو لئے ہوئے زراعت پیشہ آبادی کے اندر (جو زیادہ تر ونڈیا سلافی نسل سے تھی) آباد کی گئیں۔

اطالیہ و اسپین سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے، تو جرمانی شہروں کا حیرت انگیز نشو و نما زمانے کے اعتبار سے مقدم نہیں ہے مگر دیرپائی میں نہایت ہی نمایاں رہا۔ ان جرمانی شہروں کی خارجی اہمیت چودھویں صدی تک بڑھتی رہی اور مزید دو صدیوں تک بغیر انحطاط کے قائم رہی اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اگرچہ ان شہروں کی نشو و نما کی پشت پناہی میں کلیسا نے سربراہی اختیار کی مگر انجام کار تیرھویں اور چودھویں صدی میں والیان ملک اور دوسرے امرائے ملک نے فیاضانہ ہمت افزائی سے کام لیا اور یہ ہمت افزائی زیادہ تر محض اس اقتصادی بنا پر تھی کہ یہ شہر ملکی امرا کو جو لگان و مطالبات ادا کرتے تھے وہ ان کی آمدنی کا ایک بیش قرار ذریعہ بن گیا تھا، اب یہ عام طور پر مسلم ہو گیا کہ بڑے بڑے علاقوں کے اندر زرخیز شہروں کا قیام اول درجے کی ترقی تھی لیکن ان شہری جماعتوں کے اوسط سیاسی ارتقا کے پتہ چلانے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا آغاز و انجام دونوں مختلف مدارج کے ساتھ ہوا، جن شہروں کی بنا بعد میں پڑی انھیں اکثر کشمکش اور آزادی کے ان ابتدائی مراحل میں سے گزرنا نہیں پڑا جن سے قدیم تر شہروں کو سابقہ پڑ چکا تھا، دوسری طرف ان آخری شہروں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے کہ انھوں نے لڑتے لڑتے شہنشاہی کے آزاد شہروں کی حیثیت نہیں حاصل کی بلکہ کسی قدر کشمکش کے بعد وہ اساقفہ یا دنیاوی حکمرانوں کی اطاعت پر رضامند ہو گئے۔ بارھویں صدی کے اواخر اور تیرھویں صدی کے اوائل میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پرانے شہر اس قسم کی آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے تھے جو اطالوی شہروں کی حاصل کردہ آزادی کے مساوی ہو، خاص کر اسقفی شہر اپنے اساقفہ کے ساتھ اس جد و جہد میں سرگرم پیکار تھے کہ انھیں اپنے اوپر محصول لگانے، سکہ بنانے، محصول رہگزر قائم کرنے اور عدالت گستری کی شیرازہ بندی کا حق کامل دیدیا جائے کیونکہ کلیسائی و حرفتی اغراض کے درمیان ہمنوائی اب گئی گزری ہوئی بات ہو چکی تھی۔ (تیرھویں صدی کے نصف اول میں) شہنشاہ فریڈرک دوم کی مخالفت کی وجہ سے شہروں کے ارتقا میں عارضی طور پر روک پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم شہروں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور آخر میں بوسیلۂ زر یا زور بہت سے شہر شہنشاہی شہر بن گئے

یعنی ان پر شہنشاہ اور مجلس ملی کے سوا اور کسی کی اطاعت واجب نہیں رہی تھی، البتہ خود مختاری میں یہ شہر اطالوی شہروں سے کم مرتبہ تھے کیونکہ مقدس رومانی شہنشاہی اگرچہ اتنی طاقت نہیں رکھتی تھی کہ جرمنی کو متحد کر دے پھر بھی آلپس کے جنوب کے بجائے شمال میں اسے زیادہ حقیقی حیثیت حاصل تھی۔

۲۔ اس سلسلۂ عمل کے مدارج پر ہمیں اب زیادہ نمایاں نظر ڈالنے کا موقع ملنا چاہئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں قدیم اسقفی شہروں نے اس معاملے میں اولیت و سبقت اختیار کی۔ کلیسا نے اگرچہ اپنے علاقوں کے مستاجروں اور کاشتکاروں پر آزادانہ اختیار (عدالتی) بہت ہی پہلے حاصل کر لیا تھا تاہم اوّل اوّل اسے آزاد زمینداروں، بادشاہ یا دوسرے دنیاوی امراء کے مستاجرین پر جو شہر میں رہتے تھے کسی قسم کا سیاسی اقتدار نہیں حاصل تھا، درحقیقت اولاً شہر کو کسی قسم کی سیاسی شیرازہ بندی حاصل نہیں تھی، مگر جب شہر ترقی کرنے لگے، اور ان کے باشندے اپنے اغراض، مفاد و طریق زندگانی میں خصوصیت سے شہری بن گئے تو اہل شہر کو اپنی ضرورت کے لئے خاص حقوق و امتیازات اور قانون و انصاف کے خاص انتظام (عملدرآمد) کا احساس ہونے لگا اور جب اکابر کلیسا کی اپنے امتیازات کو بڑھانے کی خواہش بھی اسکے ساتھ شامل ہو گئی تو یہ دو باتیں ملکر اس جانب منجر ہوئیں کہ اساقفہ کی سرگردگی میں شہروں کے اندر سیاسی توحد پیدا ہو جائے، اور اس پہلی ہی کارروائی میں شہروں کی حرفتی خصوصیت صاف نظر آنے لگی۔ جرمنی میں دسویں اور گیارھویں صدیوں میں (خاصکر جبکہ ۹۵۵ء میں آٹو اعظم نے اپنے فتحمند بازوؤں سے ہنگریوں کی غارتگرانہ یورشوں کو آخری طور پر روک دیا تو تجارت و سوداگری میں نمایاں ترقی ہو گئی۔ بڑے بڑے بازار (جس میں غیر ممالک کے لوگ آیا کرتے تھے) تمام حصص جرمنی میں قائم ہو گئے اور دولت و ثروت میں ترقی کرنے لگے اور جرمانی تاجروں نے اپنے اولوالعزمانہ کاروبار کو انگلستان، اسپین، اور مشرق بعید تک پہنچا دیا، اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب و تجارت کے پر امن مشاغل قدرتی طور پر شیر و شکر ہو گئے تھے اور یہ کہ بڑے بڑے کلیساؤں میں مقررہ طور پر آمد و رفت کی کثرت اور وہاں کی خاص خاص زیارتوں کی وجہ سے کلیسائی شہر بازاروں کے نشو و نما کے لئے طبعی مقامات بن گئے تھے۔ اس لئے جب تجارت کی سرپرستی کے لئے ان شہروں کو بادشاہوں کی طرف سے یہ خاص امتیاز اور یہ خاص "شاہی امن" کا حق عطا کیا گیا کہ بازار اور ان بازاروں کو جانے والے شر اور فساد سے محفوظ رہینگے تو اگر بالکلیہ نہیں تو زیادہ تر انھیں شہروں میں

بازار قائم ہو گئے جہاں اساقفہ کے مستقر واقع تھے۔
پس اب عظیم الشان شہروں کا نظم و نسق اساقفہ کی حکمرانی کے باعث مضبوط ہو گیا تھا، اور اولاً اس کا میلان کسی قدر یہ ہوا کہ اس نے شہر کے ان باشندوں کو جو ابتداءً آزاد تھے ان لوگوں کی معاشری سطح تک پست کر دیا جو اصلاً اساقفہ کے حشم و خدم میں داخل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اساقفہ اور شہروں کے مقاصد میں تصادم پیدا ہو گیا اور اس کا اظہار اس وقت ہوا جب گیارھویں صدی کے آخر حصے میں کلیسا اور شہنشاہی کے درمیان اول مرتبہ تنازعۂ عظیم برپا ہوا اور ہنری چہارم کے حریف اساقفہ کے مقابلے میں شہر یکے بعد دیگرے ہنری کی جانبداری اختیار کرنے لگے، اگر جب شہروں کی خوشحالی و دولت میں ترقی ہونے لگی تو انھوں نے ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری حاصل کر لی۔ اس ترقی دولت کی کیفیت یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کولون میں جہاں ہنوز گیارھویں صدی کے آخر میں اسقف اعظم کی حکمرانی قائم تھی "چھ سو نہایت ہی دولتمند تاجر موجود تھے"۔ قدیم شہروں میں شہریوں کے نام سے اس حکومت خود اختیاری کا ذریعۂ کار تدریجاً صورت پذیر ہوا تھا اس کا عنصر اصلیہ ججوں کی وہ جماعت تھی (جسے شکابینی یا شیوفن کہتے تھے اور) جسے عدالتی فرائض مدت مدید سے حاصل تھے بلکہ عہد کارولنجی سے چلے آرہے تھے مگر اس میں اسی جماعت نے (بالعموم دوسرے سربرآوردہ شہریوں سے مل کر) بتدریج انتظامی اور ادنےٰ درجے کے تشریعی فرائض تک حاصل کر لئے تھے یہاں تک کہ آخر میں ایک زاید "برگوماسٹر" (میر بلد) کی صدارت میں حکمران شہری مجلس قائم ہو گئی اور شہران "میران بلد" کے زیر حکومت قانون کے ہم مرتبہ مسلمہ رسم و رواج یا صریح معاہدے کے ذریعے سے خریداری یا جنگ وجدل کے ذریعے سے جس قدر وہ اختیارات حاصل کرنے لگے جنھیں اولاً اساقفہ یا والیان ملک کے عہدہ دار عمل میں لاتے تھے اسی قدر ان "میران بلد" کے انتظامی فرائض کی اہمیت بڑھتی گئی۔

یہ حکومت ابتداءً اور ایک طویل مدت تک "فطری حدیدیت" بنی رہی یعنی جو لوگ اسے عمل میں لاتے تھے ان کا انتخاب کسی طرح پر بھی ہوتا ہو مگر وہ سب کے سب زیادہ دولتمند باشندے ہوتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ارکان کونسل بالعموم ایک برس کے لئے ہوتے تھے اور نکلنے والے ارکان اپنے قائم مقاموں کا تعین کر کے جاتے تھے

اور اس طرح حکومت عملاً ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں رہتی تھی جسے "سیناتی خاندانوں" کا گروہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں بالخصوص زیادہ پرانے شہروں کے معاملے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جو گروہ اس طرح جد و جہد کر کے خود مختاری تک پہنچا وہ اولاً اس حادیانہ طریق پر حرفتی نوعیت نہیں رکھتا تھا جیسا کہ بعد میں ہو گیا اس میں اولاً مبارزا اور آزاد غیر فوجی شہری بھی داخل تھے اور ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جن میں ان مبارزوں کو بلدی حکومت کے اندر خاص نمائندگی حاصل ہو گئی، مگر اس میں شک نہیں کہ ایک دن وہ آیا کہ جاگیری عنصر نسبتہً اس قدر کمزور ہو گیا کہ اسے یا تو شہر کو چھوڑ دینا پڑا یا تجارتی عنصر میں جذب ہو جانا پڑا۔ پھر بھی اس طرح پر کامل الحقوق شہریوں کی جو جماعت پیدا ہو گئی اس کے لئے کچھ زمانے تک کامل شہریت کی شرط ضروری کے طور پر ایک خاص مالیت کی زمین پر قابض ہونا لازمی تھا، اور لیوبک وہامبرگ کے سے جو شہر بعد میں قائم ہوئے جنہیں جاگیری عنصر اول ہی سے نہیں تھا ان میں بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاجر زمینداران کی ایک اس قسم کی عدیدیت بن گئی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، ہر صورت میں شہروں کی حکومت بہت جلد اہل شہر میں سے ایک مادی تجارتی گروہ قلیل کے ہاتھوں میں آ گئی، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) حکومت ایک سال بسال مقرر کی ہوئی عدیدی مجلس کے ذریعہ سے عمل میں آنے لگی۔ اس مجلس نے اکثر پیچیدہ تشکیلیں اختیار کر لیں ابتدائی زمانے میں تو اس پیچیدگی کی وجہ وہ تصادم ہوا جو حکومت کا اجارہ لے لینے والے خاندانوں اور تجارتی طبقے کے دوسرے ارکان کے درمیان برپا ہو گیا تھا، اور بعض صورتوں میں یہ پیچیدگی کسی قدر اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ بعض فرائض حکومت کو تاجروں کی ایک رضاکارانہ انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، بعد میں اہل حرفہ کے ساتھ کشاکش کی وجہ سے پیچیدگی پڑی۔ مگر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ شہروں کی تمام تاریخ میں جرمانی شہروں کی حکومت زیادہ تر مجالس ہی رہی تھی یعنی انتظام کا خاص ذریعہ مجلس یا مجالس کا نظم تھا، قدیم یونانی شہروں کی طرح دستور سیاسی نے اس طرز روش کی طرف قدم نہیں بڑھائے کہ نظم و نسق شہریوں کی جمعیت عامہ کے ذریعہ سے انجام پاتا اور نہ قدیم یونانی یا ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی شہریوں کی طرح یہ شہر "مطلق العنان بادشاہوں" کے تحت میں آئے۔

یہ نہیں ہوا کہ آزاد شہریوں کی عام جماعت کی نسبت یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ

حکومت کی شرکت سے کلیتہً خارج کر دیگئی، لیکن مختلف مقامات میں ان کی شرکت کے مدارج میں بہت کچھ اختلاف تھا، جب نئے قوانین وضع ہوتے، یا معاہدات کئے جاتے، یا فوجی مہموں کے متعلق فیصلے ہوتے یا نئے محصول لگائے جاتے یا قرضے لئے جاتے یا اور اسی قسم کی ضرورتیں پیش آتیں تو ان وقتوں میں اکثر اسی جماعت کی طلبی ہوتی تھی مگر اس کے اجلاس کونسل کی صوابدید پر منحصر ہوتے تھے اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا یہ اجلاس کمتر ہوتے گئے۔ علی العموم نہیں مگر کبھی کبھی عام جماعت ارکان کونسل کا انتخاب بھی کرتی تھی۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک معین حد تک حکومت خود مختاری کے حاصل ہو جانے کے بعد اپنے اوپر آپ حکومت کرنے والے شہروں کے ارتقا کی پہلی منزل میں حکومت کا علی العموم میلان عدیدیت کی طرف زیادہ ہو جاتا تھا، یہ میلان کچھ اس قسم کا ہوتا تھا جس کا مشاہدہ ہم یونان کی شہری سلطنتوں میں زمیندارانہ عدم مساوات کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ صرف ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں یہ ہوا کہ عدیدیت حقیقتاً تجارتی عدیدیت ہو گئی اور ابھی اسے پوری طرح ترقی حاصل کئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے عام اہل حرفہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی تنظیم ازمنۂ وسطیٰ کی اس مخصوص قسم کی انجمنوں میں ہوئی تھی جن کا بیان پچھلے خطبے میں ہو چکا ہے۔ جرمنی میں ان کے مختلف نام تھے، مثلاً کولون میں انھیں "برادری" (Fraternity) وسطی اٹلی کے شہروں میں "انجمن" (Gild) اور بعض جگہ اتحاد (Union Innungen) کہتے تھے اور کہیں کہیں دوسرے نام بھی تھے۔ سہولت واستعارہ کے خیال سے میں ان سب کو "جماعت حرفہ" (Crafts) کہونگا۔ زمانۂ جدید کی انجمن مزدوراں سے ان کی مشابہت نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، مگر مشابہت جتنی نمایاں ہے اختلاف بھی ویسا ہی عیاں ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی "جماعات حرفہ" اجرت پر مزدوری کرنے والوں کی انجمنیں نہیں تھیں بلکہ وہ مالکانہ کام کرنے والو کی انجمنیں تھیں جو خود اپنے لئے کام کرتے تھے اور شاگردوں سے اور کہیں مزدوروں سے بھی کام لیتے تھے مگر یہ مزدور اس حیثیت سے اس کے رکن نہیں بنائے جاتے تھے۔

یہ موقع اس کے لئے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کی اس مخصوص اقتصادی ہیئت ترکیبی یعنی ان شہروں کے حرفتی عنصر کے انجمن اہل حرفہ اہل فن وغیرہ کی نمایاں تنظیم پر بحث کیجائے۔ یہ سب مشخصہ جماعتیں تھیں جنھیں اپنی حرفت کے

انضباط اور اپنے ارکان کی نگرانی پر کسی قدر اختیارات حاصل تھے۔ اس موقع پر میں مجبور ہوں کہ ایک مصنف (یعنی پروفیسر اشلی) کے نتائج سے اختلاف کروں گا جن کا میں بہت کچھ زیر بار احسان ہوں۔ وہ بظاہر اس نظریے کو مسترد کرتے ہیں کہ انجمنہائے اہل حرفہ یعنی بعض مشترک اغراض کے لئے کسی خاص شہر کے کسی خاص حرفت میں مشغول رہنے والے تمام دستکاروں کی انجمنیں اپنی اصل وابتدا میں رومانی ہیں[1] وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ دستکاروں کے کسی جداگانہ طبقے کی نشوونما سے یہ لازم آتا ہے کہ پہلے یہ فرض کرلیا جائے کہ حرفت کا ارتقا کسی قدر آخری منزل پر پہنچ چکا تھا اور یہ منزل انگلستان میں بارھویں صدی میں حاصل ہوئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ رومانی شہنشاہی کے آخری دور میں اہل حرفہ کی ایک تنظیم ایسی تھی جو بعد کے زمانے کی گلڈ (انجمن) سے کسی قدر مشابہ تھی، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ گال میں دو ایک جگہ بعض حرفتی جماعت (شخصیات) پانچویں صدی سے بارھویں صدی تک برابر قائم رہی ہوں مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جا بجا کے منفرد اہل حرفہ سے ممیز حرفتی طبقہ کا نشوونما بارھویں صدی تک ناممکن تھا، اور جو خیالات کہ حرفی انجمنوں پر حاوی تھے وہ انھیں تک مخصوص نہیں تھے بلکہ اس زمانے کی تمام نظم معاشرت میں مشترک تھے تو پھر تنظیم کے ان عناصر کی اہمیت بالکل ثانوی درجے کی ہو جاتی ہے جن کی نسبت رومانی حرفی جماعات (شخصیات) سے ماخوذ ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

ہم سب اس امر سے اتفاق کرینگے کہ مسٹر اشلی کے ذہن میں انگریزی شہروں کا خیال مقدم تھا اور ان شہروں میں رومانی زمانے سے اس وقت تک اہل حرفہ کے تنظیمات کا مسلسل وجود ہو نہیں سکتا تھا، اس میں قیل وقال کی گنجائش ہے مگر میرے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس بنا پر رومانی حرفی شخصیات سے اخذ وحصول کی اہمیت دوسرے درجہ کی ہے بے سوچے سمجھے ہوئے ایک نتیجہ نکالنا ہے میرا خیال ہے کہ سیاسی تنظیمات کے ارتقا میں نقل وتقلید کو جو وسیع جگہ ملنا چاہیے مسٹر اشلی اسے نظر انداز کر جاتے ہیں، بیشک انگلستان ہی کی طرح براعظم میں بھی

ملہ ۱۔ اشلی "انگلستان کی معاشی تاریخ"، کتاب اول، باب دوم فقرہ ۸ ۔

جن شہروں کا مبداء آغاز دورِ حال کے زمانے میں ہوا ہے ان میں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حرفی (شخصیات) دورِ موخر کی رومانی شہنشاہی سے براہ راست ماخوذ ہو سکیں مگر پھر بھی یہ ہو سکتا تھا کہ جن قدیم تر شہروں میں حرفت کی یہ مخصوص تنظیم برابر زندہ رہی ہو انھیں کی نقل و تقلید سے یہ حرفی جماعات بالواسطہ ماخوذ ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ اطالوی شہروں اور انگریزی یا جرمانی شہروں کی حرفتی ہیئت ترکیبی کی وسیع مشابہت اس نتیجے کو اغلب بنا دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ ہیئت ترکیبی وقائع نگار کی توجہ کو بہت بعد کے زمانے تک اپنی طرف منعطف نہیں کرتی لیکن وینس میں ہم نویں صدی ہی میں یہ دیکھتے ہیں کہ فن تعمیر کچہ کاری وغیرہ کے ایسی زیادہ موقر حرفتوں کے جنھیں واقعی فنون کہہ سکتے ہیں آزادانہ کام کرنے والے اور دستکاری کے پست درجے کے کام کرنے والے (جو بالکلیہ آزاد بھی نہ تھے کیونکہ انھیں بعض سرکاری خدمتیں بلا معاوضہ انجام دینا پڑتی تھیں) دونوں کی تنظیم موجود تھی، کم از کم یہاں تو یہ ضرور تھا کہ یہ تنظیم ٹیوٹنی ماخذ سے نہیں لی گئی تھی اور اس کا رومانی ماخذ صاف واضح ہے۔ بعدازاں جب ہمیں دوسرے اطالوی شہروں کا علم ہوتا ہے اور ہم ان کی ہیئت ترکیبی کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں ایسی یکسانیت پاتے ہیں جس سے ان کے ایک ہی ماخذ سے ہونے کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، یہ یقینی ہے کہ اس کا ماخذ اہل لمبارڈی نہیں ہو سکتے جن کی نسبت یہ مسلم ہے کہ تمام ٹیوٹنی حملہ آوروں میں وہ سب سے زیادہ بربری تھے۔ لیکن اگر ہمیں اطالیہ میں رومانی ماخذ کو قبول کرنا پڑا تو پھر اطالوی اور ٹیوٹنی شہروں کی ہیئت ترکیبی میں جو وسیع مشابہت پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے یہ بات ہی اغلب ہو جاتا ہے کہ آخر الذکر کا ماخذ بھی یہی ہو

یہاں چلتے چلتے یہ خیال بھی ظاہر کر دینا چاہیے کہ اس پر بحث کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اطالوی شہروں پر عام نظر ڈالتے وقت یہ ضروری ہے کہ قدیم رومانی تمدن کے بلدیات کے ساتھ ان کے تعلق کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ہمیں اپنے ذہن میں یہ خیال کر لینا چاہیے کہ قدیم تر تمدن کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے وہ زیادہ تر شہروں ہی میں باقی رہے تھے اور اطالوی شہروں نے جب قوت و ثروت میں ترقی کی تو جاگیریت کے ساتھ جس عناد کا اظہار کیا اور بارھویں صدی میں رومانی قانون کے تجدید شدہ مطالعے کو جس جوش و خروش کے ساتھ قبول کیا، اس کی توجیہ بھی ہم کسی

حد تک اسی اتحاد و ماخذ سے کر سکتے ہیں۔

۴۔ بہر حال کوئی بھی صورت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انجمنیں اس سے بہت قبل ہی قائم تھیں جب انھیں اپنی اپنی تجارتوں میں کام کرنے والے اشخاص پر مشخصہ (مجموعی) اختیار باضابطہ طور پر عطا کیا گیا اور اس کی قانونی حیثیت تسلیم کی گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں انجمنیں بہت وسعت کے ساتھ قائم ہو چکی تھیں البتہ ان کا حلقۂ اثر نئے عطیات کے ذریعے سے وسیع ہوتا رہتا تھا مگر ابھی اس وقت تک وہ بلدی حکام کے زیر نگرانی تھیں خود اپنے عہدہ داروں کے انتخاب کا پورا اختیار بھی ہر جگہ حاصل نہیں تھا، البتہ یہاں تک کہ قانوناً ان کا جواز تسلیم کر لیا گیا تھا انھیں اپنے جلسے کرنے اپنی اپنی دستکاریوں کے عملدر آمد کے لئے قواعد مقرر کرنے اور بہ سزائے تاوان ان کی پابندی کرانے کے اختیارات حاصل تھے۔

اس عمومیت اہل حرفہ کی نسبت ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا کچھ حصہ ان شہریوں پر مشتمل تھا جو نسلاً آزاد مگر بے زمین تھے، اور کچھ حصہ سرفوں یا کاشتکاران وابستہ اراضی پر مشتمل تھا جنھوں نے بتدریج اپنے کو غلامی کی حالت سے آزاد کر لیا تھا کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور میں مزدوروں (یعنی شہر کے مزدوروں) نے معاشری معیار میں جو منازل طے کئے اس میں انھیں دو مراحل سے گزرنا پڑا۔ اول تو انھیں سرفیت یا زرعی وابستہ آراضی غلامی کے باقیات کو دفع کرنا پڑا، اور اس سلسلۂ عمل کی شہادت ہمیں بارھویں صدی کے اوائل میں ملتی ہے اور اس کی انتہائی حد اس وقت پہونچی جب یہ اصول قائم ہو گیا کہ کوئی سرف یعنی غلام وابستہ آراضی جو ایک برس اور ایک دن شہر میں رہ جائے وہ از خود آزاد ہو جائیگا۔ بعد ازاں جب شہری آزادی حاصل ہو گئی تو پھر مجموعی آزادی اور سیاسی اقتدار میں شرکت کی کشاکش کا وقت آیا۔ اول الذکر کا حصول پہلے ہوا، اہل حرفہ نے اکثر اپنی تنظیم و انضباط کی کامل آزادی اور اپنے حرفی مقاصد کے لئے جن آزادانہ اختیارات کی ضرورت تھی انھیں حاصل کر لیا تھا، مگر سیاسی اختیار میں شرکت زیادہ زمانے تک ملتوی ہوتی رہی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں جس رکاوٹ کو رفع کرنا تھا وہ اگرچہ حسب و نسب کی طرح کوئی باضابطہ رکاوٹ نہیں تھی بلکہ پیشوں اور حیثیتوں کی حد بندیاں تھیں پھر بھی یہ کشمکش اپنی طوالت و استقامت کے اعتبار سے ہمیں روما کے پیٹریشین اور پلیب کی کشمکش کو یاد دلاتی ہے

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ یہ ایک تجارتی عدیدیت تھی جو عمومیت اہل حرفہ سے برسرپیکار تھی۔ اس کشمکش کا آغاز تیرھویں صدی بلکہ بعض وقت بارھویں ہی صدی میں ہو گیا تھا مگر اسے مکمل کامیابی عام طور پر چودھویں صدی تک نہیں حاصل ہوئی میرا خیال ہے کہ یہ مرحلہ تمام ہی قدیم شہروں میں طے کرنا پڑا تھا، صرف بعد کے قائم شدہ چند شہروں میں ایسا ہوا کہ اہل حرفہ اول ہی سے پورے شہری ہو گئے تھے۔

اہل حرفہ کو سیاسی حقوق میں جو حصہ دیا گیا تھا وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے بہت ہی مختلف و گوناگون تھا، مثلاً یہ کہ استراسبرگ میں ہم ۱۳۲۴ء اور ۱۴۸۲ء کے مابین سولہ مختلف دستور سیاسی کا شمار کر سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ جب اہل حرفہ فتح پاتے تو انھیں کسی نہ کسی صورت سے مجلس کے اختیار میں حصہ مل جاتا تھا، مگر یہ صورتیں مختلف ہوتی تھیں بعض وقت اہل حرفہ کی نسبت محض یہ اعلان ہو جاتا تھا کہ مجلس میں شریک ہونے کے مجاز ہیں۔ بعض وقت یہ ہوتا تھا کہ اہل حرفہ کے نمائندے ایک علٰحدہ طبقے کی صورت میں کبھی قدیم مجلس میں ہی بیٹھتے تھے اور کبھی قدیم مجلس سے باہر نگرانی و اتحاد عمل کے بعض اختیارات کے ساتھ وہ ایک جدید آلۂ حکومت بنجاتے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک یا زائد "برگو ماسٹر" (صدر بلد) کے انتخاب پر ان کو اختیار حاصل ہوتا تھا اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) آخری درجہ یہ تھا کہ بعض شہروں میں انکو اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہو جاتی تھی۔ شہر کا سیاسی دستور (مزدوروں کی) انجمنی اصول پر از سر نو مرتب ہو جاتا تھا، اور سوداگروں کی انجمنیں جہاں موجود ہوتی تھیں وہ جدید حرفتی انجمنوں کی سطح پر کر دی جاتی تھیں۔ حکومتی اعتبار سے یہ ایک طرح پر اتحاد مزدوراں کی عہدیت ہو جاتی تھی اور وہ اس طرح کہ ہر شہری انجمن تجارت کا ایک رکن ہو جاتا تھا اور پھر وہ انجمن شہری جماعت کی ایک سیاسی قسمت یا عنصر بن جاتی تھی۔ میں اس وقت جرمنی کا ذکر کر رہا ہوں مگر یہ یاد ہوگا کہ لندن میں بھی اڈورڈ دوم کے وقت سے ہر ایک شہری کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی منضبطہ تجارت کا، جسے رازِ پنہاں (Mystery) کہتے تھے رکن ہو جائے۔

فی الجملہ یہ کہ قدیم شہریوں نے اپنے خاص سیاسی حقوق جو کچھ بھی محفوظ رکھے ہوں (اور متعدد اہم شہروں میں عدیدیت ہی کا غلبہ باقی رہا) پھر بھی ہر جگہ عام قاعدے کے

طور پر یہ امر مسلم ہوگیا تھا کہ شہریت ملک آراضی سے آزاد ہے اور یہ کہ شہریوں کے طبقے میں تاجر کی طرح اہل حرفہ بھی داخل تھے (لیکن اہل حرفہ سے مراد صرف مالکانہ کام کرنے والے لوگ تھے جو باقاعدہ شاگردی کی مدت ختم کرنے کے بعد اپنے طور پر کام کرتے تھے) یہ قابل لحاظ ہے کہ اس تحریک میں عدیدیت کی پشت پناہی انھیں شہروں میں ہوتی تھی جہاں غیر ملکی تجارت کو بہت وسعت حاصل تھی۔ اس کی طبعی وجہ یہ تھی کہ شہر کے مقدم کاروبار میں شہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو غلبہ حاصل تھا، اور ان شہروں نے "ہنسیائی لیگ" قائم کر کے جو طاقت و امتیاز حاصل کر لیا تھا اس سے اس پشت پناہی کو تقویت پہنچ گئی تھی۔ اہل حرفہ نے جب جنوب و وسط جرمنی میں تقریباً ہر جگہ نشیبی رائن و سٹ فالیا اور شمال و مشرق کے بہت سے شہروں میں کامل سیاسی مساوات یا کم از کم یہ کہ حکومت میں شرکت حاصل کر لی تھی، اس وقت بھی وہ "ہنسیائی لیگ" کے سر برآوردہ شہروں کی مجالس سے خارج ہی رہے۔ البتہ (یہاں بھی) بہ حیثیت شہری کے ان کی رکنیت تسلیم کی جاتی تھی اور اہل حرفہ کے صدر عہدہ دار ایک طرح کے ایوان شہر کا کام دیتے تھے جسے شہر کی حکمراں مجلس وقتاً فوقتاً مشورے کے لئے طلب کرتی تھی، اور چودھویں صدی کے اختتام کے بعد ان شہروں میں مجالس کی شرکت کے لئے اہل حرفہ کی جدوجہد اکثر و بیشتر ناکام ہو گئی تھی۔

اس طرح دو مدارج ہمارے سامنے ہیں جو وسیع معنی میں یونان کے مدارج کے مماثل ہیں۔ اول یہ کہ جب شہروں نے مرفہ الحالی میں ترقی کی تو انھوں نے فطری عدیدیت کو چھوڑ کر شدید انتہائی عدیدیت کی طرف قدم بڑھائے جس کی وجہ عدم مساوات دولت تھی۔ اس کے بعد زیادہ عمومی دستور کی تحریک پیدا ہوئی۔ صرف ازمنۂ وسطی کے شہروں میں یہ ہوا کہ یہ عدیدیت سوداگروں کی عدیدیت رہی اور عامۃ الناس منضبط اہل حرفہ کی ایک جماعت بنے رہے مزید برآں جا بجا ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ اس تخصیص میں جرمانی شہروں کا ارتقا یونانی شہروں کے ارتقا کے مثل ہے کہ ان میں بھی کوئی ایسی شے نمایاں نظر آتی ہے جو قدیم زمانہ کے خودسر حکمرانوں کے مشابہ کہی جا سکتی ہے تا آنکہ جب اہل حرفہ میں سیاسی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ سیاسی حقوق کے لئے آزاد جنگجویوں کی حیثیت سے نمایاں نہیں ہوئے بلکہ زیادہ تر کلیسائی یا دنیاوی امرا کے

قدیم شہریوں کے ساتھ کشمکش میں ان لوگوں نے ان امرا کے معاون کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ تیرھویں صدی میں کولون میں ایک اسقف اعظم نے اہل حرفہ کو سرکاری عہدے اس خیال سے دیدئے کہ یہ لوگ اس کے لئے کارآمد آلے کا کام دیں گے لیکن پھر بھی جرمانی ارتقا میں ایک طرح کا جزوی ہنگامی اور عارضی واقعہ ہے جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دینا چاہئے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جرمانی شہروں کی یہ ایک قابل لحاظ خصوصیت ہے کہ جب انھوں نے خود کو نیچے درجے کے جاگیری امرا سے آزاد کر لیا اور شہنشاہی شہر بن گئے تو پھر وہ برضائے خود کسی وقت بھی کسی ایک شخص کی حکومت میں نہ آئے جیسا کہ ارض وسطیٰ کے اطالوی شہروں سے اکثر ظہور میں آتا رہا۔ نہ وہ کبھی مطلق العنان حکمرانوں کے پنجۂ تصرف میں پھنسے جیسا کہ ارض وسطیٰ کے اطالوی اور قدیم زمانے کے یونانی شہروں میں واقع ہوا میرا گمان یہ ہے کہ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ان کی خودمختاری کم مکمل تھی اور اس لئے ان کی ہستی میں خارجی جنگ کی حیثیت گھٹی ہوئی تھی اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ ان کی حرفتی خصوصیت زیادہ خالص تھی۔ اطالوی شہروں کی طرح ان پر قلعہ بند قصروں میں رہنے والے شورش پسند امرا کی بلا بھی نہیں مسلط تھی۔ شورش پسند امرا اپنے قزاقانہ قصروں میں شہر سے باہر رہتے تھے اور جو بہادر شہروں کے اندر رہتے تھے انھیں یہ امن تابعدار بنا لینے میں کامیابی ہوتی تھی۔

۸۔ ان شہروں میں سے ایک بہت بڑی تعداد نے (جو تعداد میں اسی کے قریب پہنچ گئی تھی) اٹھارھویں صدی کے اختتام تک جرمنی کے آزاد شہنشاہی بلاد کی حیثیت سے ان وسیع تر سلطنتوں کے اندر جو اپنے کمزور ارتباط سے "مقدس رومانی شہنشاہی" کا نام زندہ کئے ہوئے تھیں بہت بڑی حد تک اپنی خودمختاری کو برقرار رکھا مگر اب ان شہروں کی سیاسی زندگی کی نبض زور کے ساتھ نہیں چلتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ان شہروں میں اس قسم کے کسی میلان کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ وہ مطلق العنان حکمرانی کے تحت میں آجائیں گے" تاہم یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ پندرھویں صدی سے عمومی تحریک کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ صرف "اصلاح" کے دور میں تھوڑی دیر کے لئے اس کی تجدید ہو گئی مگر اس کے بعد ہی سخت رد عمل پیدا ہو گیا جہاں تک سیاسی تغیر کا پتہ چلتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان برابر قدیمیت کی جانب رہا ہے جنگ سی سالہ کی

تباہی کے بعد (جس نے جرمانی شہروں کی خوشحالی کو بری طرح پست کر دیا) حکمران مجلس کے عام باشندوں کے نمائندہ و جوابدہ ہونے کا خیال تقریباً مردہ ہو چکا تھا۔ شہریوں کی عام جمعیت کا طلب کیا جانا بالکل ہی بند ہو گیا اور ارکان مجلس کے تقرر پر معمولی شہریوں کا اثر قریب قریب زائل ہو گیا۔ میں ابھی یہ دکھا چکا ہوں کہ "ہسپانی لیگ" کے شہریوں نے عدیدیت کے لئے پیشتر تیار کر دیا تھا کیونکہ اس معاقدے نے پندرھویں صدی کے اوائل میں یہ روش اختیار کر لی تھی کہ معاقدے میں جو شہر شامل ہیں اگر ان میں سے کسی شہر میں انقلابی تحریکات رونما ہوں تو ان تحریکات کو اس ہیبتناک سزا سے روکا جائے کہ ان شہروں کو "معاقدے" کے بازاروں سے خارج کر دیا جائے۔ اس کے بعد زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ ردعمل ان دوسرے شہروں پر بھی مسلط ہو گیا جن میں اہل حرفہ نے اس سے پہلے حکومت کے اندر قدم جمائے تھے۔ انتخاب کے بجائے تقرر باہمی کا طریقہ اختیار کیا گیا، یا انتخاب محض ایک رسم رہ گیا۔ مجلس کی رکنیت عملاً دائمی ہو گئی۔ یا چند محدود خاندانوں کے ارکان کے اندر ہی اندر کبھی اِدھر کبھی اُدھر ہوتی رہی۔ اسکا سبب کچھ تو شاہی خیالات کا وہ مرض متعدی تھا جو قرب و جوار کی ملکی سلطنتوں میں پھیلا ہوا تھا، وہ خیال یہ تھا کہ عامۃ الناس خود اپنے اوپر حکومت کرنے والے شہری ہونے کے بجائے فطرتاً "رعایا" ہیں۔ اس خیال نے دیہات سے چلکر شہروں پر حملہ کر دیا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ شہروں میں یہ عامۃ الناس بادشاہ کی رعایا ہونے کے بجائے کسی مجلس کی رعایا ہو جاتے تھے لیکن اس عدیدی تغیر کا سبب کچھ تو یہ بھی تھا کہ جو انجمنیں عمومیت کی لڑائیاں سرکر رہی تھیں ان کے طبائع میں بتدریج فرق عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ انگلستان کے بلدی ارتقا کی خصوصیت کی حیثیت سے جس امر پر ہم نے نظر ڈالی ہے یہ تغیر اسی کے مثل تھا۔ ان انجمنوں نے جب اول اول اپنا انضباط قائم کیا تو یہ انضباط اس احساس و ادراک کے ساتھ ہوا کہ وہ اپنی مجتمعہ (شخصہ) حیثیت میں ایک عام فرض کو پورا کر رہی ہیں گی اور یہ قاعدہ کہ کسی خاص تجارت کے ہر ایک آزاد کام کرنے والے کو کسی گلڈ (انجمن تجار) سے تعلق رکھنا چاہیئے، اس کا قیام کسی قدر اسی وجہ سے ہوا کہ یہ فرض عامہ مناسب و موزوں طریقے سے انجام پائے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس قاعدے میں ایک خود غرضانہ مقصد یہ بھی تھا کہ تکلیف دہ مقابلہ کو روکا جائے،

یہ گلڈ (انجمن تجار) اگرچہ عموماً ان مالکانہ کام کرنے والوں کے لئے محدود تھی جنھوں نے ایک خاص مدت شاگردی میں گزاری ہو، مگر مالکوں کے مقابلے میں نوکروں کا تناسب کم تھا، عام طور پر صرف تھوڑے سے سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے کسی قابل وموزوں تربیت یافتہ کام کرنے والے کے راستے میں کوئی شدید رکاوٹ حائل نہیں تھی، مگر بازاروں کی کامیابی و وسعت کا میلان بتدریج یہ ہوا کہ اس نے گلڈ کو عملاً مزدوروں کی آزاد انجمن ہونے کے بجائے سرمایہ داروں کے لئے نفع رساں اور کم وبیش محدود اجارات کی صورت میں بدل دیا۔ ارکان کے بیٹے اور داماد آسانی سے داخل ہو جاتے تھے۔ باہر والوں کے لئے مختلف طریقوں سے داخلہ مشکل بنا دیا گیا تھا، انھیں روپیہ ادا کرنا پڑتا، کوئی گراں پایہ استادانہ کام بنانا پڑتا، اور اپنے ابتدائی داخلے کے وقت شاندار دعوتیں دینا پڑتی تھیں، اور یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ ان کے پاس سرمایہ یا مکان موجود ہے، وہ ناجائز اولاد یا کسانوں کے بیٹے نہیں ہیں اور بھی اسی قسم کی بہت سی باتیں تھیں۔ اس طرح گلڈ سے باہر مزدوروں کی تعداد مالکوں کی تعداد کے تناسب سے بہت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی۔ اور انھوں نے اپنی خاص برادریاں بنانا شروع کر دیں۔ طبقۂ چہارم نے اپنے کو منضبط کرنا شروع کر دیا۔ مگر ابھی اسے اتنی قوت نہیں حاصل ہوئی تھی کہ وہ عمومی تحریک کو اور آگے بڑھاتا۔

بس اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مجلس تجار جب اس طرح پر مزدوروں کی مخالفت میں سرمائے کی نمایندگی کرنے لگی تو ان کا اندرونی دستور عملاً زیادہ عدیدی ہو گیا اور ان کی حکومت روز بروز زیادہ دولتمند اقلیت کے ہاتھوں میں آ گئی اور اسطرح شہروں کی تمام سیاسی ہیئت ترکیبی پر ذی امتیاز حرفتی طبقوں کی ایک طرح کی متحد جماعت حکمراں بن گئی اور یہ جماعت جدید خیالات وضروریات کی اسی قدر مخالف تھی جس قدر گرد و نواح کا ذی امتیاز طبقۂ زمینداران خیالات وضروریات کا مخالف تھا، اور اس کے ساتھ ہی زمینداروں ہی کی طرح ان کی نسبت بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ جب قوم (یعنی جنزوا کسٹر) میں عمومی تحریک کی تجدید ہو گی تو زمینداروں کے ساتھ ساتھ یہ بھی غائب ہو جائیں گے۔

خطبۂ ہشر دہم

بلاد ازمنۂ وسطی ۔ بلاد اطالوی ۔ لمبارڈی

میں نے اپنے آخری خطبے میں مختصراً شہروں کے اس نشو و نما کا ذکر کیا ہے جسے میں اس ملک میں ازمنۂ وسطے کی شہری جماعت کا خالص نمونہ سمجھتا ہوں جس ملک میں یہ خالص نمونہ خود مختاری کے اس انتہائی درجے پر پہنچ گیا تھا جو اسے مغربی یورپ میں حاصل ہوئی وہ ملک جرمنی ہے یا زیادہ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا چاہیے کہ یہ شہنشاہی کے وہ اقطاع ملک تھے جو کوہستان ایلپس سے شمال میں واقع تھے ۔ جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، شمال ایلپس کے دوسرے ممالک میں مرکزی حکومت کی ترقی نے شہروں کی حکومت خود اختیاری اور انکی جزوی خود مختاری کو پست کر دیا تھا، دوسری طرف اطالیہ میں جس کی جانب ہم اب متوجہ ہوتے ہیں وہاں شہروں کی بین صنعتی خصوصیت نسبتاً کم واضح تھی اور (خوبی یہ ہے کہ) یہی وہ امر ہے جو ان کی نشو و نما کے متعلق مزید دلچسپی کا باعث ہے ۔ وہ امر یہ ہے کہ شمالی اطالیہ کے وسیع حصص میں انھیں جاگیریت پر غلبہ حاصل ہوگیا تھا، ہم دیکھ چکے ہیں کہ جن شہروں میں جاگیریت کو کامل نشو و نما حاصل ہوگیا تھا وہاں ہر شہر کی آزادی خود اسی ضلع کے جاگیری یا کلیسائی سردار سے حاصل ہوئی تھی ۔ اس اصول کا ذریعہ زور و جنگ یا خریداری یا تدریجی قبضۂ ناجائز یا آزادانہ عطیہ جو کچھ بھی رہا ہو ۔ آزادانہ عطیہ اس وقت میسر آتا تھا جب جاگیری سردار کو پوری طرح یہ یقین ہو جاتا تھا کہ اس کی اراضی کے اندر ترقی پذیر تجارت اور آبادی سے معاشی نفع ہوگا ۔ اکثر صورتوں میں جاگیری یا کلیسائی سردار شہر پر اپنی سیادت قائم رکھتا تھا، اور جرمنی کی طرح جہاں آزاد شہنشاہی شہر شہنشاہ کے

سوا اور کسی کی سیاسی فوقیت نہیں تسلیم کرتے تھے (اور تیرھویں صدی کے وسط کے بعد سے شہنشاہ کا یہ اقتدار محض ایک سایہ رہ گیا تھا) ان شہروں تک کے عین قرب وجوار میں زبردست وخطرناک جاگیری امرا بدستور موجود تھے مگر اطالیہ میں جہاں شہروں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا، وہاں ان شہروں نے نہ صرف قرب وجوار کے جاگیری امرا کو اپنے زیر اقتدار کرلیا تھا بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا تھا اور ان امرا کو شہر کے اندر لاکر شہری امرا کی حیثیت میں بدل دیا تھا تاہم بہ حیثیت مجموعی اور عام اعتبار سے ان حالات میں بھی اقتصادی ومعاشری نظام کے لحاظ سے اطالوی شہروں کی غالب حیثیت صنعتی حیثیت ہی سمجھنا چاہیئے یہاں بھی کامل شہری وہی شخص تھا جو صنعت وحرفت کے کام میں مشغول ہو، اور جب عمومیت کی تحریک شروع ہوئی اس وقت جو بلاد ارتقائے کامل سے لطف اندوز تھے ان شہروں میں جرمانی شہروں کی طرح وہاں کے جن عامۃ الناس نے حصول اختیار کے لئے کشاکش شروع کی وہ بھی منتظم اہل تجارت یا اہل حرفہ ہی پر مشتمل تھے یعنی یہ لوگ اہل حرفہ (asti) اور دستکار (mestieri) تھے۔ علاوہ ازیں (جیسا کہ فریمین نے کہا ہے) یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جاگیرداروں کو مجبور کرکے شہری زندگی میں شامل کرنے کی کارروائی (کبھی بھی) اس ملک کے تمام عرض وطول میں عمل میں نہیں آئی، شمال ومغربی حصے میں طاقتور جاگیری والیان ملک پیڈمنٹ، مونٹ فیراٹ اور سالوتزو بدستور حکمرانی کرتے رہے۔ ان کے علاوہ اور جگہوں میں بھی ان سے کم رتبے کے جاگیری سردار متعدد قلعوں میں اپنی وحشت انگیز خودمختاری کو قائم کئے ہوئے تھے مختصراً یہ کہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا گروہ جس نے برائے نام اپنا حق حکمرانی شہنشاہ سے حاصل کر رکھا تھا، اور جو نہ کسی شہر کے شہری تھے نہ اس کے خود سر حکمراں وہ زیادہ تر ناقابل گزر اکناف واطراف میں بھگا دئے گئے تھے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھیں بالکلیہ بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو[1]۔

ازمنۂ وسطی کے شہروں کو قدیم وجدید نظامائے سلطنت کے مشابہات کے جامع ہونے کی مختص خصوصیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ وہ اس معاشرے سے بالکل متضاد تھے

---

[1] مضامین تاریخی سلسلۂ دوم۔ یونان قدیم واطالیہ ازمنۂ متوسطہ۔

جن سے وہ گھرے ہوئے تھے، اور جن سے ان کی کم وبیش ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ وہ یونانی اطالوی تمدن کے قدیم شہری سلطنتوں سے اس اعتبار سے مشابہت رکھتے ہیں کہ وہ شہری جماعتوں پر مشتمل تھے، اور تمدن جدید کی ملکی سلطنتوں کے وہ اس وجہ سے شبیہ تھے کہ ان میں صنعت وحرفت کو غلبہ حاصل تھا۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ ازمنۂ وسطی کی بادشاہی کا وہ بیشتر حصہ جو آہستہ آہستہ قوم جدید کے مربوط نظم وترتیب کے طرف قدم بڑھانے میں کوشاں تھا اس میں قومی زمیندارانہ طبقہ اب بھی حاوی وغالب تھا مگر چونکہ ان کا طرز زندگی شہری نہیں بلکہ زیادہ تر دہقانی تھا اس لئے جب وہ شہروں کی رکنیت میں شامل کر لئے جاتے اور اس میں انھیں بلند درجہ حاصل ہو جاتا اس وقت بھی شہروں کی عادی خصوصیت انکے اثر سے صورت پذیر نہیں ہوتی تھی، مغربی یورپ میں جہاں کہیں بھی ہم ازمنۂ وسطی کے شہروں کی جانچ کرتے ہیں ہر جگہ شہر و دیہات کا یہ تضاد اور شہر کی عادی فرضی خصوصیت حقیقتاً ایک سی پائی جاتی ہے مثلاً اسکاٹ کی کتاب فیر میڈ آف پرتھ (Fair maid of perth) میں بمقام پرتھ ہم اس خصوصیت کو ایسے ہی نمایاں طور پر دیکھتے ہیں جیسے کسی جرمانی یا اطالوی قصبے میں دیکھتے۔

قبل اس کے کہ ہم اطالوی شہروں کی نشو ونما کی مختلف صورتوں پر غور کریں یہ بہتر ہوگا کہ چند لمحے اس وسیع تر تنظیم کی تاریخ پر نظر ڈالنے میں صرف کریں جس تنظیم میں یہ شہر بمنزلہ اجزائے ترکیبی کے تھے، کیونکہ اس تاریخ کی خصوصیت صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ان شہروں کو آزادانہ نشو ونما کے خاص مواقع حاصل ہو جاتے تھے بلکہ یہی خصوصیت باعث تھی ان متباین حالات کی جن کے تحت میں ہم مختلف شہر اور شہروں کے اجتماعات نظر آتے ہیں۔

میں ایک سابق خطبے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکا ہوں کہ یہ واقعہ ابتدائی ازمنۂ وسطی کی تاریخ کا ایک کلیۂ خاص ہے کہ جب قدیم شہنشاہی شکست ہو گئی تو کلیسا اپنی جگہ پر قائم رہا۔ بربریوں نے اپنی مفتوحہ متمدن دنیا میں جس کلیسائی جماعت کو پایا اس میں ایک طرح کا ارتباط اور حقیقی طاقت موجود تھی جس سے بالطبع اس جماعت کے حکمرانوں کو اس جدید دنیاوی نظم وترتیب میں (جو ابتری و پریشانی سے بتدریج رونما ہوئی تھی) اعلیٰ منزلت حاصل ہو گئی مشرق میں رومانی شہنشاہی کا جو حصہ ابتک

باقی رہگیا تھا، اس سے اور اطالیہ کے تعلق میں جو نکہ ایک خاص بعد ہوگیا تھا اس وجہ سے اس خصوصیت کا اظہار اطالیہ میں ایک خاص طریقہ سے ہوا۔ آلپس کی دوسری جانب رومانی شہنشاہی سے جو کچھ ایک مرتبہ لے لیا گیا اس کا کوئی جزو بھی پھر کبھی واپس نہ ہوا مگر اطالیہ میں صورت حال کچھ اور ہی تھی جسٹنین نے چھٹی صدی میں اطالیہ کو شہنشاہی اقتدار میں واپس لے لیا تھا اور اگرچہ کل سرزمین اطالیہ صرف (۵۵۳ء سے ۵۶۸ء تک) پندرہ برس تک شہنشاہی اقتدار کے ماتحت رہی اور پھر شمال میں بادشاہی اور مزید جنوب میں لمبارڈی کی ڈیوکیوں کے قائم ہو جانے سے اس کا بڑا حصہ دوبارہ نکل گیا تاہم ملک کے اہم حصص حقیقتاً یا برائے نام قسطنطنیہ کے شہنشاہ کے تابع رہے۔

اور یہاں میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اطالیہ کا وہ مرکزی حصہ جس سے ہم تاریخ جدیدہ میں ریاستہائے کلیسا کے نام سے مانوس ہیں اس کی اہم خصوصیت کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ ہم زیادہ تر اس امر کے عادی ہیں کہ اس سلطنت کی تکوین کو پاپاؤں کی دنیاوی آز و حرص سے منسوب کریں اور اس میں شک نہیں کہ اس معاملے میں دنیاوی آز و حرص کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور تھا لیکن تاریخی حیثیت سے اس کی نسبت یہ سمجھنا زیادہ سودمند ہے (اور واقعتاً تھا بھی ایسا ہی) کہ یہ ایک ایسی سلطنت تھی جس کا بیشتر حصہ کسی مدت مدید کے لئے کبھی بھی شہنشاہی سے جدا نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ پوپ اور چارلس اعظم کے مابین وفاق اکبر ہو جانے سے اس سلطنت نے پادریوں کی خواہش سے خود کو نئی شہنشاہی میں شامل کر لیا اپنی ابتدائی حالت میں یہ سلطنت دو حصوں پر مشتمل تھی ایک تو شمال مشرقی حصہ تھا جس پر قدیم شہنشاہی کا نائب السلطنت (Exarch) راوینا میں بیٹھکر حکومت کرتا تھا، دوسرا حصہ رومانی ڈچی تھا جو کہ لمبارڈون کے خلاف جد و جہد میں چھٹی صدی کے ختم ہونے کے قبل ہی پوپ کی سرکردگی میں عملاً آزاد ہوگیا تھا اور یہ قصہ زیادہ تر اس نہایت ہی قابل راہب کی مدبری و مستعدی سے ظہور میں آیا جو ۵۹۰ء میں گریگوری اول کے نام سے پوپ ہوا اگرچہ چھٹی صدی کے ختم ہونے کے بعد روما کا ایک ڈیوک بدستور ہوا کرتا تھا لیکن روما کے گرد اگرد جو علاقہ ہے کی قطعاً اور روم کی دستبرد سے آزاد ہو گیا اس کے مذہبی و دنیاوی دونوں اغراض کے لئے فی الواقع پوپ ہی باا ثر سرگروہ تھا، بلکہ جب آریوس کی پیروی کرنے والے اہل لمبارڈی قدیم مذہب میں داخل ہوگئے تو لمبارڈی کی

بادشاہی تک میں پوپ کے اثر کو اہمیت حاصل ہوگئی، لیکن روما کی ڈچی اگرچہ نیم خود مختار ہوگئی تھی تاہم اس نے قدیم نظم سے اپنا تعلق فوراً ہی منقطع نہیں کر لیا، بلکہ آٹھویں صدی کے نصف اول میں جب وثن پرستی (مورتی پوجا) کے مسئلہ پر مغربی و مشرقی کلیساؤں میں مذہبی مخاصمت برپا ہوئی اس وقت بھی اگر شہنشاہ قسطنطنیہ میں اس کے تحفظ کی قابلیت موجود ہوتی تو شاید یہ حصہ اس مخاصمت کے باوجود بھی شہنشاہی سے منقطع نہ ہوتا۔ بہر نوع جب تک لمبارڈوں نے سنہ ۷۵۱ء میں راوینا اور اس حصۂ ملک کو فتح نہ کر لیا جس پر راوینا سے حکمرانی ہوتی تھی اس وقت تک پوپ نے (۷۵۴ء میں) پپن کو شریف رومن پیٹریشین (Patricius romanorum) کا خطاب دیگر فرنگی بادشاہوں سے اتحاد نہیں کیا، پپن نے اس خطاب کے عوض میں راوینا کے صوبے کو جو چار برس تک لمبارڈوں کے قبضے میں رہ چکا تھا دوبارہ فتح کر کے پوپ کی نذر کر دیا چارلس اعظم نے جب لمبارڈی کی بادشاہی کو ۷۷۴ء میں فتح کیا تو اس نذر کی اس نے بھی تصدیق کی، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان نذروں کے بعد ہی پاپاؤں نے فوراً ہی شہنشاہی سے باضابطہ قطع تعلق نہیں کر لیا، چنانچہ ۷۸۱ء تک پوپ نے رومانی شہنشاہوں کے سنہائے جلوس کا تاریخ کے طور پر استعمال کرنا ترک نہیں کیا تھا، اس کے بعد ایک مختصر وقفہ تک روما نے کسی کو شہنشاہ نہیں تسلیم کیا مگر یہ صورت کلیسا کو ایک غیر طبعی حالت معلوم ہوئی۔ اسے تنہا رہنے کی کوئی خواہش نہیں تھی اور اسی لئے اس نے ۸۰۰ء میں فرنگی شاہ اعظم کے واقعی یا مصنوعی اکراہ کے باوجود اسے مغربی عالم عیسوی کے لئے دنیاوی سرگردہ کا باضابطہ لقب دیدیا اور اس کے تحت میں خود کلیسا، قدیم شہنشاہی ممالک پر ایک طرح کی نیم دنیاوی حکمرانی کرنے لگا اور راوینا کے قدیم صوبے اور روما کی ڈچی کو ایک تنگ قطعہ ارض سے ملا دیا اور اس طرح شمالی اطالیہ کو جنوبی اطالیہ سے الگ کر دیا۔

ٹیوٹن حملہ آوروں نے جب اطالیہ پر حملہ کیا اور ان کے خلاف متمدن اطالیہ کی جد و جہد کی سرگردہی اسقف روما نے اختیار کی اسی کا یہ طبعی نتیجہ اور اسی کا یہ اعتراف ہے کہ اس قطعۂ ارض پر پاپائی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تحقیقات کے مقاصد کے لئے اطالیہ دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ درحقیقت یہ تنصیف چھٹی صدی میں لمبارڈوں کے حملہ کے وقت واقعۃً عمل میں آگئی تھی کیونکہ اگرچہ لمبارڈوں کے حملہ کا سیلاب ان وسطی

ملکرڈوں کی کامیاب مدافعت کی رو سے گزرتا ہوا، انتہائی جنوب تک پہنچ گیا تھا تاہم اس رد کا اثر یہ ہوا کہ جنوب کی ڈچیاں یعنی اسپالتو اور بنیوٹنٹو کے لمبارڈ شمال کی بادشاہی کے لمبارڈوں سے جدا ہو گئیں بعد ازاں جب پاپائیت نے نئی شہنشاہی سے اتحاد و اتفاق کر لیا، اور قدیم رومانی ڈچی کے ساتھ ہی ساتھ راوینا کے دوبارہ فتح شدہ صوبہ کو بھی حاصل کر لیا تو اس طرح اس نے خود کو قدیم شہنشاہی کے ان دوسرے اجزا سے الگ کر لیا جو لمبارڈ مملکت میں شامل ہونے سے آزاد رہ گئے تھے اور یہ نکتہ ہمارے لئے اہم ہے یہی وجہ ہوئی کہ جنوب مغرب میں گیتا، نیپلز اور املفی کے بلدیات جنھوں نے حملہ آوروں کی کشاکش میں اپنی کامیابی سے ایک طرح کی نیم خود مختاری حاصل کر لی تھی، انھوں نے اس خود مختاری کو قدیم مشرقی شہنشاہی کے برائے نام اجزا کی حیثیت سے ترقی دی اور لمبارڈی کے بلدیات کی طرح سے جدید مغربی شہنشاہی کا جزو بنکر ترقی نہیں کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شمالی اطالیہ کے بلدیات کے بہ نسبت انھوں نے بہت جلد اپنی خود مختاری میں ترقی کر لی، اور قدیم شہنشاہی کے انتظامی نظم کے مطابق نشو و نما حاصل کرتے رہے، مغربی عالم عیسوی میں بربریوں کے فتوحات سے عام طور پر جو سیاسی حالات پیدا ہو گئے تھے، ان کا کوئی اثر ان بلدیات پر نہیں پڑا۔

ان بلدیات کی مثال سے بلا شک و شبہہ جو تحریک حاصل ہوئی اس کی وجہ سے ان بلدیات کی ابتدائی آزادی کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے مگر ان کی تاریخ کا علم ہمیں بہت کم ہے۔ لیکن قدیم رومانی سے کے اجزا میں ایک بہت زیادہ اہم شہر وینس بھی تھا جس نے قدیم مشرقی شہنشاہی سے اپنا برائے نام تعلق رکھا اور کسی وقت بھی فرنگی حکومت کے تحت میں نہیں آیا۔ اور وینس کی بے نظر تاریخ اور شمالی اطالیہ کی عام سیاسی تحریک سے کئی صدیوں تک اس کے کلیۃً جدا رہنے کو زیادہ تر اسی واقعہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ؏۱

؏۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں وینس ہی وہ شہر ہے جس نے جاگیریت کے حیطۂ اثر سے باہر کامل و غیر منقطع خود مختاری کے ساتھ ترقی حاصل کی اور بربری فاتحوں کا کسی طرح کا امتزاج اس میں نہیں ہوا شمال مشرق اطالیہ کے شہروں کے باشندے بے پناہ گیر جو حملوں کی وجہ سے وقتاً فوقتاً بھاگتے رہتے تھے وہ آباد

۳- یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اگر وینس لمبارڈوں کی حکمرانی کے تحت میں آ بھی جاتا تب بھی اس کی آزادانہ نشو و نما اور اس کی تجارتی حوصلہ مندی و طاقت اندرونی شہروں کی بہ نسبت غالباً جلد تر شروع ہو جاتی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وینس کے تجارتی رقیب جنوا اور پیزا کی حالت میں بھی یہی ہوا لمبارڈ قوم چونکہ سمندر سے نا آشنا تھی، اس لئے اسے ضرورت تھی کہ اس کی بحری تجارت کوئی دوسرا انجام دے جنوا جو شمال مغربی اطالیہ کے کونے میں پہاڑوں اور سمندروں کے درمیان واقع تھا اسے واقعی ایک مدت دراز تک لمبارڈ فتح نہ کر سکے اور فتح ہونے کے بعد بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک طرح کی نیم خود مختاری حاصل رہی۔ خارجی تعلقات کے معاملے میں پیزا کی خود مختاری کا آغاز کس وقت سے ہوا اس کی نسبت ہم کچھ کہہ نہیں سکتے مگر ہم یہ سنتے ہیں کہ دسویں صدی کے وسط سے وہ مسلمانوں سے بحری لڑائیاں لڑنے لگا تھا اور گیارھویں صدی کے اوائل میں جنوا کے ہمراہ ہو کر جزیرہ سارڈینیا کے فتح کرنے کا حوصلہ انہوں نے کر لیا تھا اور اس اولوالعزمی کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اس کی کامیابی کے ساتھ عمل میں آنے سے ہم معقول طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس سے قبل اس کی نیم خود مختاری کا ایک کافی وسیع دور گزر چکا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: ہونے کے لئے بتدریج انہیں جھیلوں میں پہنچتے رہے۔ اول اول تو وہاں محض عارضی قیام کرتے اور جب حملہ کا زور کم ہو جاتا تو واپس چلے جاتے تھے لیکن سنہ ۵۶۸ء و ۵۶۹ء کے درمیان میں آبادی قائم ہونے لگی۔ سنہ موخر الذکر کے لمبارڈ حملہ کے بعد یہ لوگ ٹھہرنے کی نیت سے وہاں آئے اور وینس آباد ہو گیا۔ اس تاریخ سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک یہ شہر غیر مفتوح رہا۔ وینس کی تاریخ نہایت حیرت انگیز ہے یہ طویل مدت قریب قریب مساوی حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ۱۲۹۷ء سے مجلس عظمیٰ کے بند ہونے کے زمانے یعنی ۱۲۹۷ء–۱۳۱۰ء تک یہ مملکت جدیدیت کی جانب ترقی کرتی گئی اور بعد کو یہی حالت مستقل قائم رہی اس دور اول کا آغاز امتزاج سے شروع ہوتا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول اول جھیل کے مختلف جزیروں پر جدا جدا ٹریبیون حکومت کرتے رہے ۵۸۴ء میں ٹریبیون عظام ایک طرح کی مرکزی مجلس کے اراکین کے طور پر منتخب ہوئے اور ۶۹۷ء میں مزید قوت کے لئے ایک ڈیوک یا دوجے Doge کا انتخاب ہوا اور ٹریبیون اس کے ماتحت ہو گئے۔ صلح جنگ معاہدات وغیرہ کا تصفیہ جمعیت عام میں ہونے لگا۔

جب ہم اندرون ملک کے شہروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں ٹسکنی کے شہروں اور لمبارڈی اور وادیٔ پو کے شہروں میں ایک مزید امتیاز قائم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کیونکہ ٹسکنی اگرچہ انتظامی حیثیت سے لمبارڈی بادشاہی سے بے تعلق تھا مگر اسی کا جزو تھا اور وادیٔ پو کے ضمن میں شمال مشرق کا وہ قطعۂ ارض بھی شامل تھا جنھیں سرحدات تریوینزا کہتے تھے اور جو بعد میں زیادہ تر وینس میں جذب ہو گیا۔ ٹسکنی کے اندرونی حصص کے ممتاز شہر فلورنس لوکا سی انیا اور ان میں بھی خاص کر فلورنس کا نشوونما لمبارڈی کے ہر ایک دوسرے شہر سے زیادہ طویل المدت اور زیادہ دلچسپ رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی محققانہ بحث دوسرے خطبے میں کروں کیونکہ یہیں خاص طور پر حرفتی عنصر کو قطعی سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا۔ لمبارڈی کے شہروں میں اس تجارتی عنصر کا سیاسی ارتقا اس وجہ سے منقطع ہو گیا کہ تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کے حصۂ اول میں تقریباً ہر جگہ خودسرانہ حکومت کا دور دورہ ہو گیا تھا مگر تاریخ کے ابتدائی دور میں یہی شہر پیش پیش تھے۔ لمبارڈی شاہی کے نقطۂ نظر سے اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ٹسکنی کا محل وقوع بادشاہی کے اطراف خارجی پر تھا آٹھویں صدی کے اختتام کے قریب جب چارلس اعظم نے اس بادشاہی پر قبضہ کرنا چاہا اس وقت اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ ماتحت حکمرانوں کو ضرورت سے زیادہ مضبوط نہ ہونے دے اس کی سلطنت کا بیشتر حصہ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا جن کی وسعت بہت زیادہ نہیں تھی اور ان کو کاؤنٹوں کے ماتحت بنا دیا گیا، مگر اطراف ملک یعنی سرحدی اضلاع میں پرزور مدافعت کے لئے کسی قدر زیادہ مضبوطی اور زیادہ حکومت کی ضرورت تھی پس یہ اضلاع "مارکوئیسون" یا مارک گرافوں یعنی سرحد داروں کے تحت میں رکھے گئے بعد ازاں جب دسویں صدی کے وسط میں آٹو اعظم کے وقت سے جرمانی بادشاہوں کو لمبارڈی کے تاج اور شہنشاہی خطاب کے حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور انھوں نے کلیسا سے اتفاق کو از سر نو تازہ کیا، اس وقت ٹسکنی کو ان کی عام حکمت عملی میں ایک مستثنیٰ حیثیت حاصل ہو گئی وہ عام حکمت عملی یہ تھی کہ سرحد داروں اور زیادہ طاقتور کاؤنٹوں کو کمزور کر دیا جائے جس کی صورت کچھ تو یہ ہو کہ کلیسا کو اوقاف عطا کئے جائیں اور کلیسا کی جاگیروں کو کاؤنٹوں اور مارکوئیسون کے حیطۂ اقتدار سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور کچھ یوں کہ چھوٹے درجے کے امرا کو بڑے درجے کے امرا کے مقابلے میں تقویت دی جائے،

مثلاً یہ کہ چھوٹے درجے کے امرا کی حیثیت کو موروثی کر دیا جائے اور اس طرح جاگیریت کی طرف قدم بڑھایا جائے (جیسا کہ فلورنس کے آخری مورخ[1] نے لکھا ہے) ٹسکنی میں معاملات دوسری ہی طرح چل رہے تھے ٹسکنی کے ڈیوک قوت وطاقت میں ترقی کر گئے اور انھوں نے اسافلہ اور چھوٹے درجے کے امرا کو دبائے رکھا، اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ وہاں جاگیریت کو وسعت پذیری کی طاقت نسبتاً کم حاصل تھی یا یہ وجہ ہو کہ وہ اپینین کی دوسری جانب حکومت کرنے میں دشواری زیادہ تھی، یا یہ کہ پاپاؤں کی ترقی پذیر طاقت کے مقابلہ میں کسی روک کی ضرورت تھی۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو، ان ڈیوکوں نے لمبارڈی کے برعکس اپنی طاقت بڑھاتے ہوئے شہروں کے حصول خود مختاری کی تحریک کو بھی روک دیا اور اس وجہ سے یہاں یہ تحریک بعد میں شروع ہوئی۔

۴۔ پس ہم اسوقت اپنی توجہ کو اپینین کے شمالی جانب کے ان شہروں پر مرکوز کر دیں جو خود مختاری کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ یہاں ہم پہلا مشاہدہ یہ کریں گے کہ دسویں صدی کے آخری حصے میں جب تجدید شدہ رومانی شہنشاہی کے تحت میں ان شہروں کا ارتقا شروع ہوا تو اس سے پہلے خاندان کارولنجی کے آخری پرزور بادشاہ لیوئس دوم اور آٹو کے عہد ہائے حکومت کے درمیان ۸۷۵ء سے ۹۵۰ء تک کا جو پرصعوبت ومصیبتناک زمانہ گزرا، اس زمانہ میں یہ شہر خود اپنی مدافعت کرنے اور اپنی آزادانہ اجتماعی کارروائی عمل میں لانے کے عادی ہو چکے تھے مغربی یورپ کے لئے بالعموم اور اطالیہ کے لئے بالخصوص یہ تاریک ترین زمانہ تھا اور اس زمانہ میں اپنے تکالیف کے گونہ معاوضے کے طور پر ان شہروں کو یہ اجازت ملگئی تھی کہ اہل ہنگری مسلمانوں کی یورشوں سے بچنے کے لئے اپنی قدیم شہر پناہوں کو دوبارہ بنالیں (اس طرح) یہ شہر قلعے بن گئے اور ان کے باشندوں میں فوجی تربیت وعادات پیدا ہو گئے شہر چار یا چھ محلوں میں منقسم ہوتے اور عام طور پر اپنے قریب ترین دروازے کے نام سے موسوم ہوتے تھے کیونکہ ہر محلے کے باشندوں سے بالتخصیص یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس قریب ترین دروازے اور اس کی ملحقہ دیوار کو قابل مدافعت بنائیں[2] ہر محلہ کا اپنا علم ہوا کرتا تھا اور اس میں

[1] - ولاری تاریخ فلورنس کی ابتدائی دو صدیاں، جلد ۱، صفحہ ۴۷۔

[2] سسمونڈی "تاریخ جمہوریات اطالوی از منۂ وسطیٰ" جلد اول صفحہ ۴۳،۳۔

اکثر متمول اہل شہر یا امرا کے) ایک یا دو رسالے (گران سلاح) سواروں کے ہوتے تھے، تو اس سے دو چند تعداد تیر اندازوں اور مسلح پیدلوں کی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ۱۸ سے ۶۰ تک کی عمر کے تمام شہریوں پر واجب تھا کہ جب خطرے کا گھنٹہ بجے تو وہ تلواریں لے لیکر اپنے محلہ کے میدان کارزار میں آجائیں شہنشاہ کونراڈ سالیانی (Salic) سلہ (سنہ ۱۰۲۵-۱۰۳۹ء میں) جو جنگ ہوئی اس میں ملان کے اسقف اعظم ہریبرٹ نے علمبردار گاڑی کا طریقہ جاری کر کے فوجی نظم کو مکمل کر دیا اور اس سے پیدل سپاہ کی اہمیت بڑھ گئی۔

اب ہر شخص کو نظر آسکتا ہے کہ اگر نئی شہنشاہی ان شہروں کے معاملات میں تکلیف دہ طور پر مداخلت کرتی تو اسے دشواری کا سامنا ہو جاتا مگر کچھ زمانے تک نئی شہنشاہی کی یہ حکمت عملی نہیں تھی۔ آٹو کی ذات سے جس طرح پر مقدس رومانی شہنشاہی کی تجدید ہوئی وہ فی الواقع ایک طرح کا مخالفہ تھا کہ جس کے ایک جانب کلیسا تھا جو اطالوی نظم معاشرت کے زیادہ متمدن عنصر کی نمایندگی کر رہا تھا اور دوسری جانب ایک جرمانی بادشاہ تھا جسے کلیسا نے ہمیشہ منزلت کا ایک خطاب عطا کر دیا تھا جس کے ساتھ اطالیہ کی قدیم بادشاہی کی فرمانروائی بھی شامل تھی۔ لامحالہ جرمانی بادشاہوں کی حکمت عملی یہ رہی کہ وہ لمبارڈی کی جاگیریت کے مقابلے میں اپنی تائید کے لئے کلیسا کی طرف جھکیں اس لئے آٹو نے خود اپنے اختیار کو وسیع کرنے کے لئے اساقفہ کے اختیارات میں وسعت دی ہر شہر میں اسقف کاؤنٹ کا رقیب بن گیا اور کاؤنٹ کے حدود اختیار کے بجائے زیادہ تر اسی اسقف کا اختیار قائم ہو گیا کلیساؤں نے بخوشی خاطر شہنشاہ کو اسقفوں کی نامزدگی کی اجازت دیدی کیونکہ وہ جاگیرداروں کے مقابلے میں شہنشاہ کو اپنا دوست و حلیف سمجھتے تھے کلیسا کے ساتھ ہی ساتھ شہروں کی قوت میں بھی ترقی ہوتی گئی اور ان میں بھی ان شہروں کو جو اساقفۂ عظمیٰ یا دیگر اساقفہ سے تعلق رکھتے تھے تقدم حاصل ہو گیا۔

غرضکہ جرمنی کی طرح یہاں بھی دور اول میں ارباب شہر کا حرفتی عنصر کلیسا کے زیر سایہ ترقی کرتا گیا۔ دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی کے اول حصے میں اس حرفتی عنصر نے خود کو ان جاگیرداروں کی گرفت سے آزاد کر لیا جو ملک پر حاوی ہو گئے تھے، اور ان

سلہ۔ فیراری "داستان انقلاب ہائے اطالیہ" جلد اول، ۲۱۷۔

شہروں میں جو قدیم سے اساقفہ یا اساقفہ اعظم سے تعلق رکھتے آئے تھے، اور جن میں ملان کو سب سے مقدم حیثیت حاصل تھی اس عنصر نے یہ آزادی اپنے ان اساقفہ کی جلو میں صف آرا ہو کر حاصل کی تھی جو شہنشاہ کے بعید و بے اثر تفوق عام کے تحت میں عملی طور پر قصبوں کے فرمانروا بن گئے تھے بعد ازاں جیسا کہ ہم جرمنی میں دیکھ چکے ہیں، ان حلفا یعنے کلیسائی سردار اور ترقی پذیر حرفتی عنصر کے اغراض و مقاصد بھی مغائر ہو گئے اور حرفتی عنصر نے حصول خودمختاری کے لئے جدوجہد شروع کر دی، اول اول تو انہوں نے خاموشانہ انتصاب سے کام لیا اور پھر علانیہ جنگ پر آمادہ ہو گئے، ۱۱۲۲ء تک اس کاروائی کو اس عظیم الشان کشمکش سے حسب دلخواہ مدد ملتی رہی جو اساقفہ کے انتخاب و لقب کے متعلق پاپائیت و شہنشاہی کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔

شہروں نے جب اسقفی اقتدار سے آزادی حاصل کر لی تو بارھویں صدی کے نصف اول میں ان کے نظام حکومت کا مروجہ انداز یہ تھا کہ حکومت کا کام مختلف تعداد کے قنصلوں کے ذریعہ سے انجام پاتا تھا یہی قنصل عمال ہوتے تھے، جنگ کے وقت وہ سپہ سالار ہوتے اور زمانۂ امن میں عدالت کا کام انجام دیتے تھے۔ شہر اب بھی عدیدی اقتدار کے تحت میں تھے مگر جو حکمراں خاندان ان شہروں پر حکومت کرتے تھے ان کا حلقہ زیادہ وسیع ہو گیا تھا، اس کے عقب میں ہم اہل حرفہ و اہل صنعت کی وہ جماعتیں (Corporazioni delle artie dei mastier) دیکھتے ہیں جو ہنوز مساوات کی دعویدار تو نہیں ہوئی تھیں تنظیمی قوت میں ترقی کرتی جاتی تھیں۔ ان جماعتوں کو فوجی تنظیم میں بلند جگہ حاصل ہو گئی تھی اور وہ وقت پر رسالے کمپنی بٹالین اور رجمنٹ میں مبدل ہو جاتی اور علمبردار گاڑی کے گرد جمع ہو جاتی تھیں بعلاوہ چونکہ قنصلوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور ان میں علی التواتر نئے لوگ داخل ہوتے رہتے تھے اس لئے یہ لوگ بہت زیادہ پرزور عاملانہ جماعت نہیں تھی، موثر حکومت کے لئے انھیں ضرورت ہوتی تھی کہ ایک معتمد یا خفیہ مجلس Credentia ان کی مدد کرے جس کا انتخاب شہر کے مختلف محلوں سے ہوتا تھا اور قناصل اسے طلب کرتے تھے، یہ مجلس رائج الوقت نظم و نسق کے جزئیات پر رائے دیتی تھی۔ اس کے علاوہ زیادہ اہم معاملات کے لئے ایک "مجلس عظمیٰ" ہوتی تھی جس کی ترکیب مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی تھی اور جس میں جمہوریت کا رنگ کہیں

ملاحظہ فیراری "حسب بالا" جلد اول صفحہ ۲۷۲۔

زیادہ ہوتا تھا اور کہیں کم جمعیت عامہ میں اہل حرفہ کے سر برآوردہ ارکان بھی بالضرور شامل ہوتے رہے ہوں گے اور اس کی مداخلت جنگ، معاہدے وغیرہ کے ایسے نازک معاملات کیلئے محدود تھی۔ ان مجالس کے ارکان کا انتخاب عام اہل شہر کی طرف سے یا کم از کم یہ کہ بلاواسطہ طرز پر نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا تقرر یا تو خود قنصل کرتے تھے یا خاص طور پر مقرر شدہ انتخاب کنندگان انھیں منتخب کرتے تھے اور اطالیہ میں اسی کا عام رواج تھا۔ عام اہل شہر کی طرف سے بلاواسطہ انتخاب شاذ و نادر ہوتا تھا۔ جب قنصلوں کے انتظامی فرائض بڑھنے لگے تو پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ عدالتی فرائض سے علیحدہ ہوگئے، چنانچہ ۱۱۳۴ء میں جنوا میں تین انتظامی قنصل اور آٹھ عدالتی قنصل تھے، اور انتظامی قنصلوں کی تعداد تین چار سے لیکر بیس سے زائد تک تھی، یہ تعداد یا تو شہر کے محلوں کے مساوی ہوتی تھی یا اسی کا کوئی مضروب ہوتی تھی۔

۶۔ بعد ازاں بارھویں صدی کے نصف اول میں شہروں کی ترقی یافتہ خودمختاری کا اظہار ان کی آپس کی لڑائیوں سے ہوتا ہے کیونکہ اول اول اسی زمانے میں پوری قوت و جوش کے ساتھ شہروں میں ایک دوسرے کے ساتھ ان پر غضب مسلسل لڑائیوں کو ترقی ہوئی جنھوں نے اطالوی تاریخ کو ازمنۂ وسطیٰ کے ہر ایک مغربی یورپی ملک کی تاریخ سے ممیز کر دیا ہے اور جن سے قدیم یونان کا خیال ہمارے دلوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔

ان جنگوں کے اسباب مختلف نظر آتے ہیں۔ کچھ سبب تو یہ تھا کہ رومانی شہروں میں جن کی فوقیت کلیسائی انتظام میں قائم رکھی گئی تھی اور ان شہروں میں جو لمبارڈی کی شاہی کے فوجی مرکز تھے، مدتہائے دراز سے رقابت قائم تھی۔ مثلاً ملان اور پاویا میں رقابت تھی۔ کچھ سبب یہ تھا کہ شہنشاہ اور پوپ کے مناقشے میں کسی نہ کسی طرف شریک ہونے کی وجہ سے شہروں کی رقابت باہمی بہت تیز ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی محض کلیسائی مناقشات کی وجہ سے جنگ کی وجہ پیدا ہو جاتی تھی مگر فی الجملہ جنگ کے اسباب زیادہ تر معاشی معلوم ہوتے ہیں۔ جب شہروں کی ثروت و آبادی بڑھ چلی تو پھر ان کی حرفت و تجارت کی ترقی پر دوسرے شہروں کی طرف سے جو روک ہوتی تھی اس سے خلش پیدا ہونے لگی۔ اول اول بڑے شہروں نے چھوٹے شہروں پر حملہ کیا چنانچہ پاویا نے تورتونا پر، کریمونا نے کریما پر اور ملان نے لودی پر حملے کر دیے یہی امر اس جانب منجر ہوا کہ شہروں کے باہمی معاہدے قائم ہوگئے۔ مثلاً

لودی نے خود کو پادیا کی حفاظت میں دیدیا۔ علی العموم یہ ہوتا تھا کہ زیادہ بڑے شہروں کی ملیشیا (فوج محافظ) باہر نکلکر دشمن کے کھیتوں کو تباہ کر دیتی (اور جو کچھ ہو سکتا) اٹھا لیجاتی۔ ملان اور لودی کے درمیان سنہ [illegible] سے سنہ ۱۱۱۱ تک کی، جنگ اسی طور سے شروع، مگر اس کا خاتمہ لودی ویخیو (قدیم لودی) کی بربادی پر ہوا جس کے باشندے ۶ دیہات میں تقسیم کر دئے گئے۔ سنہ ۱۱۱۸ سے سنہ ۱۱۲۷ تک کومو کے خلاف ملان کی جنگ کا آغاز اس فساد سے ہوا جو پاپائے مخالف دینو کے مقرر کردہ اسقف اور کومو کے جائز اسقف گوئیدو کے درمیان برپا ہوا کومو کے ایک شاعر نے اس جنگ کو جنگ ٹرائے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ لمبارڈی کے شہر زیادہ تر شہنشاہ کی جانب تھے مگر ان میں سے چند شہروں نے ملان کی بھی مدد کی تھی۔ اطالوی جھیلوں کے دیہات جو کومو کے ماتحت تھے ان میں سے کچھ دیہات نے بغاوت کر دی۔ انجام کار میں کومو نے اطاعت قبول کر لی، اس کے باشندوں نے یہ منظور کر لیا کہ وہ اپنے حصاروں کو منہدم کر دینگے ملان کو محصول ادا کر دیں گے اور اس کی جنگوں میں بطور حلیف کے کام کریں گے۔

بارھویں صدی کے وسط میں شمال اطالیہ کے شہروں کی آزادی کی تحریک میں اس شدید کشمکش کی وجہ سے جو ان شہروں اور شہنشاہی اقتدار کے درمیان برپا ہو گئی تھی نازک وقت آگیا۔ اقتدار شاہی اس وقت راسخ العزم فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) کے ہاتھ میں تھا جس کی کوشش یہ تھی کہ شہروں کو ان کے نیم خود مختار حقوق سے محروم کر دے (کیونکہ اس کے نقطۂ نظر سے یہ حقوق غصب میں داخل تھے) اور ان شہروں کی حکومتوں کو محض ایسی مقامی حکومتوں کی حیثیت میں بدل دے جیسی مربوط و منظم مملکتوں میں ہوتی ہیں۔ ابتداءً شہروں کی رقابت نے شہنشاہ کے مفید مطلب کام دیا، اس کی فوجیں ناقابل مدافعت معلوم ہوتی تھیں اور باغی شہروں میں سب سے مقدم شہر ملان پر قبضہ ہو گیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد ہی آزادی کی الفت قدیم بلدی مخاصمت کے جذبات پر غالب آگئی۔ لمبارڈی کے شہروں کی ایک لیگ قائم کی گئی، جس میں ملان کے قدیم دشمن اور اس کے قدیم دوست دونوں شامل تھے اور انھوں نے فریڈرک کے علی الرغم اس اسقف اعظم کے شہر کو از سر نو تعمیر کیا، جرمانی فوجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا، اور سنہ ۱۱۷۶ میں جنگ لی نیانو میں ان فوجوں کو قطعی شکست دیدی۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۸۳ میں کانسٹنس کے معاہدہ کے وقت انھیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے ہی قوانین کی اطاعت کریں گے،

انہیں کے حکام ان پر حکومت کریں گے (البتہ بعض صورتوں میں شہنشاہ کی باضابطہ منظوری لیں گے صلح و جنگ اور معالفہ خود کریں گے اور اپنے مالیات کا بھی خود ہی انتظام کریں گے) اس سے صرف وہ چند ادائیاں مستثنیٰ تھیں جو وہ وقتاً فوقتاً شہنشاہی خزانہ میں ادا کرتے رہیں، یہ اختیارات ایک ایسی قرارداد کی رو سے حاصل ہوئے تھے جن میں عملاً اس وقت تک خلل نہیں پڑا جب تک کہ لمبارڈی کے شہروں کی آزادی قائم رہی حقوق کا یہ قانونی تحفظ جو عملاً زمانہ دراز سے مسلم سمجھا جاتا رہا تھا ابتداءً اس مرحلے کو اس معاقدے کے شہروں نے سر کیا جو شہنشاہ سے بر سر جنگ تھا لیکن شہنشاہ اپنے دوستوں کے لئے اس شئے سے انکار نہیں کر سکتا تھا جو دشمنوں کے لئے روا رکھی گئی ہو، پس معاہدہ کانسٹنس کی رو سے بعض شہروں کو جو آزادی حاصل ہوئی وہ اطالیہ کے شہروں کے لئے عام ہو گئی۔

۶۔ اب میں اطالوی شہروں کی ایک دوسری سیاسی اہمیت رکھنے والی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور یہ خصوصیت شہر اور دیہات کی مخاصمت ہے شہروں کی باہمی رقابت کے مانند اس مخاصمت کے اسباب بھی زیادہ تر اقتصادی تھے جاگیری امرا آمد و رفت اور تجارت میں خلل انداز ہوتے تھے، وہ محاصل رہگذر کے ذریعے سے راستوں میں رکاوٹ ڈالتے اور سوداگروں کو لوٹتے تھے۔ اپنے راستے سے انہیں دقتوں کو بذریعۂ جنگ رفع کرنے کی ضرورت نے شہروں کی قوت کو پر امن حرفت کے کام سے ناقابل برداشت حد تک ہٹا دیا بارھویں صدی کی بلدی لڑائیوں کے دوران میں مضافات میں جاگیری امرا سے بھی جنگ جاری تھی مگر اس کا زیادہ اہم حصہ صلح کانسٹنس کے بعد واقع ہوا۔ میلان نے اپنی خاکستر سے سر اٹھا کر اردگرد کے تمام امرائے مضافات کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا۔ع۱ جنوا، فینا لے کی امارت مارگوئنس کو بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام زمانوں میں آہستہ آہستہ دباتا رہا اور نووارا اسٹی اور اس قسم کے اور بہت سے دوسرے مقامات پر تیرھویں صدی کے تمام دوران میں شدت کے ساتھ جنگ و پیکار جاری رہی جاگیری امرا اپنی مدافعت اس طرح کرتے تھے کہ ایک شہر کو دوسرے شہر سے ٹکرا دیتے تھے مگر اس سے وہ اپنی لابدی تباہی کو صرف ملتوی کرتے رہے۔

ع۱ فیرانی حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۰۵۔

اگر ہم یہ سوال کریں کہ صرف اطالیہ ہی میں کیوں ایسا ہوا کہ جاگیرداروں کے ساتھ کشاکش میں شہروں کو فتح حاصل ہوگئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شہنشاہی ملک اطالیہ میں شہروں نے زیادہ ترقی حاصل کر لی تھی اور وہاں ان کی تعداد بھی بہت کثیر تھی اور نیز یہ کہ شہنشاہوں کی حکمت گلی کی وجہ سے (جس کی توضیح پہلے ہو چکی ہے) اور جگھوں کے بہ نسبت اس ملک میں جاگیردار کمزور رہے تھے اس کے علاوہ شہروں کے حق میں ایک مزید قوت انکی آزادی کی اس خواہش سے پیدا ہوگئی تھی جو تمام ملک میں پھیل گئی تھی

بعد ازاں جبکہ شہروں نے زیادہ تر فتح حاصل کر لی تو پھر وہ آخری منزل آئی جو اطالوی بلدی زندگی کے لیئے سب سے زیادہ اہم اور بحیثیت مجموعی نہایت مہلک نتائج سے مملو تھی یعنی جاگیردار امرا کو مجبور کر کے شہروں کے اندر رکھا گیا۔ اس سے شہروں کا مقصود دلی تو یہ تھا کہ امرا کو جاگیری اختیارات سے نکال کر شہر کے حیطۂ اختیار میں شامل کر کے اس فتح کے ثمرات کو قانونی حدود کے اندر کر لیا جائے اور امرا کا مقصود یہ تھا کہ جس جنگ میں انھیں ہمیشہ سرنگوں ہونا پڑتا ہے اس کا خاتمہ ہو جائے پس امرا نے شرائط کو قبول کر لیا، انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ شہر کے اندر قصر بنائیں اور سال کے چند مقررہ مہینے وہاں رہا کریں اور جنگ کے اوقات میں یہ میعاد اکثر دو چند کر دیجاتی تھی اگر کوئی امیر اس شہر میں سکونت پسند نہ کرتا جس سے اس سے جنگ ہوئی تھی تو وہ کسی دوسرے شہر میں قیام کر لیتا جس سے اس کا مخالفہ رہا ہو۔ امرا فوراً اس حالت سے بہترین مفاد حاصل کرنے کے درپے ہو گئے۔ وہ شہریوں سے بہ تملق پیش آنے لگے اور اپنی دوربینی، وضعداری یا طمع سے محض تفریح طبع کے طور پر مجالس عظمی میں داخل ہو گئے [1] چونکہ نئے خاندان جنھوں نے حرفت و تجارت سے تمول حاصل کر لیا تھا وہ بھی "فضلی" خاندانوں میں شامل ہو گئے تھے۔ پس اس طرح شہروں کے اندر حکمراں عدیدیت میں وسعت ہو گئی اور یہ گویا ایک طبعی معاوضہ تھا۔

میدانہائے بو کے شہروں میں جہاں شہروں نے اپنے جاگیردار ہمسایوں پر قطعی فتح حاصل کر لی تھی بعینہ یہی صورت پیش آئی لیکن دوسرے مقامات مثلاً سرحد تریویز ا بلند پایہ شہر ویرونا و پیسرا، پادولا وغیرہ میں جاگیردار عنصر مضبوط تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ملک زیادہ

[1] فیراری، حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۲۶ -

پہاڑی تھا اور اگرچہ یہاں بھی مفصلات کے امرا بہت زیادہ شہروں میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن یہاں وہ بظاہر اپنے بلند مرتبے کو قائم رکھتے ہوئے ایسا کرتے تھے اور اسی بلند مرتبگی کا نتیجہ تھا کہ لبارڈی کے شہروں کی بہ نسبت یہاں مطلق العنانی جلد قائم ہو گئی (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ابنِ فتح کو اس طرح کام میں لانے سے شہروں کا مقصد یہ تھا کہ امرا کو موثر طور پر بلدی حکومت کے زیر اثر کر لیا جائے مگر شہروں نے امرا کو اس قدر طاقتور یا زیادہ وسیع معنی میں اس قدر جاگیردارانہ حالت میں چھوڑ دیا تھا کہ اس نتیجے کا امکان بہت بعید تھا شہروں نے امرا سے ان کے عدالتی اختیارات، ان کے برج، ان کے حصار، ان کی باقاعدہ فوج یہ سب چیزیں سلب کر لی تھیں مگر ان کی آراضی، ان کی دولت، ان کے خطابات، ان کے محلات اور اکثر و بیشتر صورتوں میں ان کے کاشتکار (جو اگرچہ اب ان کے غلامان وابستہ آراضی نہیں رہے تھے مگر ان کے توابع میں شامل تھے) انکی فوجی مشق و مہارت ان کا معاشرتی امتیاز اور ان کے خاندانی روابط یہ سب بدستور ان کے پاس چھوڑ دیئے تھے۔ پس جن تاجروں کو امرا اپنا ہم شہر سمجھنے پر مجبور کئے گئے تھے انھیں وہ پست نظر سے دیکھتے تھے۔ شہروں کے اندر انھوں نے جو محلات بنائے وہ بھی قلعے تھے۔ انھوں نے اپنے حشم و خدم کو مسلح کر دیا تھا اور آبادی کے ایک حصہ سے انھیں جنگجو خدام ملجاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اپنی قدیم روش پر چلے جاتے تھے اور حکمران حرفتی معاشرت کے اندر ایک پریشاں کن عنصر بن گئے تھے۔

ہمیں اپنے ذہن میں یہ خیال کر لینا چاہیئے[1] کہ اندرون شہر کے امرائے قدیم اور تجارت پیشہ عنصر کے درمیان ہمیشہ ایک گونہ مخالفت و مخاصمت قائم رہی البتہ جرمانی شہروں میں یہ ہوا کہ تجارت پیشہ عنصر نے جلد تر اس قدیم جاگیری عنصر کو ہضم کر لیا کیونکہ وہاں اسے اس جدید جاگیری عنصر سے تقویت نہیں ملتی تھی جو مفصلات سے بزور لا کر شہر میں داخل کیا گیا تھا، مگر اطالوی شہروں میں (اس داخلۂ جدید کی وجہ سے) اسے نئی تقویت حاصل ہو گئی تھی اور وہ پریشانی کا ایک مستقل سرچشمہ بن گیا تھا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ شہروں نے ان امن شکنوں کی جائدادیں ضبط کیوں نہ کر لیں، اس کا جواب یہ ہے کہ شہروں کی خود مختاری اگرچہ بظاہر تقریباً مکمل معلوم ہوتی تھی مگر اس مقصد کے لئے وہ جیسی ہونا چاہیئے ویسی مکمل نہیں تھی شہنشاہی نے ذاتی جنگ کو

[1] فیرابزی حسب بالا صفحہ ۱۳۰

روا رکھا تھا کیونکہ انسان ایک جنگجو حیوان ہے اور ہو سکتا تھا کہ زمین کی جبیرہ دستانہ قزاقی کو بھی وہ برداشت کر لیتی مگر وہ اس کے نتائج کو قانونی حیثیت دینے سے انکار کر دیتی۔ جو شہر جاگیر دار امرا کو برباد کر دینے کی کوشش کرتا وہ علی الاعلان شہنشاہی و پاپائی نظام اور عام اصول جاگیریت کا حریف سمجھا جانے لگتا۔ شہر اپنی جگہ پر یہ سمجھتے تھے کہ ان کی ہستی کا انحصار مقدم الذکر (شہنشاہی و پاپائی نظام) پر معلق ہے، اور (اس لیئے) موخرالذکر (اصول جاگیریت) کا بھی مقابلہ کرنے کی وہ جرات نہیں کر سکتے تھے۔

شہروں کے اندر جاگیری عنصر کی اس آمیزش کا نتیجہ انجام کار شہروں کی آزادانہ تجارتی حیثیت سے مرفہ الحالی کے ساتھ ترقی کرنے کے لیئے مہلک ثابت ہوا لیکن پہلا اثر اس کا ایک بہت عجیب وغریب ادارے یعنے سالانہ مقرر شدہ غیر ملکی حکمراں (پودستا Podesta) کی صورت میں ظاہر ہوا جب شہروں کی خودمختاری کے ساتھ فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) کی کشمکش ہوئی تو اس نے یہ کوشش کی کہ ہر ایک اہم مرکز میں ایک پودستا یا حکمراں کا تقرر کر کے شہنشاہی اقتدار کو قائم رکھے۔ شہروں نے ہر جگہ ان غیر ملکی آدردوں کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کے خلاف جدوجہد کی کہیں ان کے ساتھ بدسلوکی ہوئی کہیں انھیں خارج کر دیا گیا بلکہ بعض جگہ تو انھیں قتل بھی کر دیا گیا، بایں ہمہ جب صلح کانسٹنس نے ان کی فتح پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو اس کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے اس تنظیم کو قبول کر لیا جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے یعنے پودستا کے نام سے ایک اجنبی مبارز (نائٹ) کا کسی دوسرے شہر سے انتخاب ہوتا تھا اور اسے بلند ترین حاکمانہ اختیارات تفویض کر دیئے جاتے تھے۔

اس مختص اطالوی ادارے کا اولیں سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہری بدنظمی کے رفع کرنے کی شدید ضرورت تھی جسے شہر کے اندر جاگیر دار امرا کے جبریہ داخلے نے اس قدر بڑھا دیا اور تیز کر دیا تھا (اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ ضرورت اطالیہ ہی کے لیئے مخصوص تھی) لیکن یہ پودستا کم از کم لمبارڈی کے شہروں میں تو محض عدالتی عہدہ داری ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کے عدالتی فرائض پر خصوصیت سے زور دیا جاتا تھا مگر عدالتی فرائض کے ساتھ بعض وہ سیاسی فرائض بھی جو پہلے قنصل سے متعلق تھے پودستا کی جانب منتقل ہو گئے تھے اور یہ درجۂ اول بعض صورتوں میں یہ معلوم ہو گا کہ اس ادارے کے قبول کرنے میں یہ خیال بھی موید ہوا کہ ایک سرگروہ کے ہونے کا نفع بیرونی تعلقات کی بہ نسبت اندرونی

تعلقات میں بھی کم نہیں تھا۔ اس کا اولین فرض یہ تھا کہ قانونی نظم و امن کے سب سے طاقتور مفسدوں کے خلاف سختی و بے لوثی کے ساتھ نظم قانون کو قائم رکھ کر شہر کے اندر طوائف الملوکی کو فرو کرے۔ ایک اجنبی کا باقاعدہ انتخاب اسی بنا پر ہوا ہوگا گر اسے فوجی مہمات کی رہبری بھی کرنا پڑتی تھی۔ شہر کی مسلح قوت قانونی اغراض کے لئے اس کے تابع فرمان تھی۔

پودستا کے عہدے کی وجہ سے اطالوی شہروں کی نمونہ جی حکومت بہت زیادہ پیچیدہ ہوگئی تھی کیونکہ قنصل علٰحدہ نہیں کئے گئے تھے۔ البتہ نام اکثر بدل جاتا تھا۔ ان کی ایک مجلس بنادی جاتی تھی اور شہر کا عام نظم و نسق ان کے ہاتھ میں ہوتا اور اس کے ساتھ ہی نئے حکمراں کو مشورہ دینے کے لئے ایک دوسری مجلس یعنی پودستا کی مجلس خاص بھی مرتب کی گئی تھی یہ مجلس ملان ۱۱۹۹ء میں قائم کی گئی اور اس کے ارکان کو معتمد، مشیر یا عاقل کا لقب دیا گیا ارکان کمیون کے معتمد، "مشیر یا عاقل" کہلاتے تھے اس کے سوا مجلس عظمٰی بھی بالضرور موجود تھی اور کبھی کبھی "پارلامنتو" Parlamento بھی منعقد ہوا کرتی تھی پودستا شہر اور اس کے قوانین کی وفاداری کا حلف اٹھاتا تھا۔ اسے منصفوں، خادموں اور سپاہیوں وغیرہ کے ایک معینہ عملے کے ساتھ آنا پڑتا تھا اور اس کے لئے ایک مقررہ شاہراہ اور اسباب خانہ داری کا انتظام کیا جاتا تھا۔ خلاف ورزی فرائض کے لئے جو جرمانے متعین ہوتے تھے وہ اس کی تنخواہ میں سے وضع ہوتے تھے۔ اسے اپنے عہدے کے سال کے ختم ہونے کے بعد ایک معینہ وقت تک ٹھہرنا پڑتا تھا تاکہ شکایتوں کی تحقیق ہو سکے اور معاوضات عطا کئے جا سکیں، اسکے لئے لازم تھا کہ شہر میں کسی قسم کے تعلقات نہ رکھے اور نہ کسی قسم کی ضیافت وغیرہ قبول کرے۔

شہر اپنے وہاں اجنبی حکمراں لانے پر جس طرح آہستہ آہستہ راضی ہوے اس کی کیفیت کا پتہ کسی وقایع سے چل سکتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۹۰ء میں جنوا کو یہ محسوس ہوا کہ اسکے قنصل ناکافی ہیں، خانگیوں کے اختلافات اور تفرقے کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتے [1] اسلئے ایک پودستا کا تقرر کیا گیا جس نے ایک بہت ہی پرشور اہل فریق کا محل مسمار کر دیا اور اس طرح امن و انتظام کو بحال کیا دو برس بعد اہل شہر دوبارہ قنصلوں کی طرف پلٹے، مگر شہری مناقشات نے پھر سر اٹھایا اور لوگ مجبور ہوئے کہ بار دگر پودستا کا عہدہ قائم کریں آیندہ سال

[1] فیراری، حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۷۲۔

وہ پھر تذبذب میں پڑ گئے مگر آخرالامر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ سال بسال منتخب شدہ پودستا کا مستقل عہدہ قائم کر دیں۔

اسی طرح ٹاآن میں پہلا سالانہ پودستا ۱۱۸۶ء میں مقرر ہوا مگر اس کے بعد شہر پھر قنصلوں کی طرف پلٹ گیا اور ان کے اختیارات کو وسعت دیدی اور تین برس تک تواتر اسی کی تکرار ہوتی رہی بعدازاں ۱۱۹۱ء میں یہ تجربہ کیا گیا کہ دونوں فریقوں کو رضامند کرنے کے لئے دو پودستا مقرر ہوں مگر اس سے مطلب حاصل نہیں ہوا اور سال کے نصف آخر میں قنصل دوبارہ مقرر کر دئے گئے پھر ۱۱۹۳ء سے ۱۱۹۹ء تک قنصل ہوتے رہے اسکے بعد ایک پودستا کا تقرر ہوا اور یہ ردوبدل ۱۲۱۲ء کے بعد تک جاری رہا۔

بعض صورتوں میں یہ تنظیم ابتری و پریشانی کے بغیر قائم نہیں ہوئی اور اس عہدے کے ساتھ سخت خطرات لاحق ہو گئے چنانچہ ہم یہ سنتے ہیں کہ ۱۱۹۴ء میں ایک پودستا کو بولونیا سے بھاگنا پڑا اور غیظ آلود امرا نے جب تعاقب کر کے اسے گرفتار کیا تو انھوں نے اپنے جرمانوں کے انتقام میں اس کے دانت اکھیڑ ڈالے ۱۲۰۸ء میں لوگا کا ایک پودستا جان سے مارا گیا، اور ۱۲۱۳ء میں موڈینا کے پودستا کی زبان نکال لی گئی۔

پودستا اپنے کام اچھی یا بری طرح انجام دیتے رہے مگر فرقہ بندی کا بحر مواج انکی حد طاقت سے زیادہ جوش پر تھا اور تیرھویں صدی میں کوہ اپنین سے شمال کے شہروں میں شاہی حکومت کی طرف مغلوب کن حد کو پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے خودسری کے نام سے موسوم کیا ہے تاکہ اطالوی و یونانی تاریخ کا تشابہ ظاہر ہو سکے اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں اطالیہ کے مطلق العنان حکمرانوں نے جس صورت سے اختیار و قوت حاصل کی تھی اس کے اعتبار سے وہ خودسری کہلانے کے سزاوار تھے لیکن اگرچہ اس خودسری کا قیام ابتدائی اکثر جور و زیادتی ہی سے ہوتا تھا مگر وہ اکثر اس مقصد کو انتخاب کے وسیلے سے حاصل کرتا تھا۔

(جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) دور افتادہ مشرقی حصص کے بہ نسبت خاص لمبارڈی میں جاگیری عنصر کے اوپر بلدی عنصر کا غلبہ زیادہ تھا اور فی الحقیقت انھیں مشرقی اضلاع میں بادشاہی کا شیوع پہلے ہوا اور وہیں بادشاہی نے پہلے منظم صورت اختیار کی بادشاہی کی زیادہ منظم صورت کا آغاز ۱۲۰۹ء میں ہوا جبکہ ایستے کا مارکوئیس ازو ششم فیرارا

کا حکمراں مشہور کیا گیا۔ سسمونڈی[1] کہتا ہے کہ "یہ پہلا واقعہ تھا کہ اطالوی قوم کے افراد نے اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر ایک فرد واحد کی اطاعت قبول کرلی"۔ اس سے تقریباً بائیس برس بعد (۱۲۲۵ء میں) مشہور خود سر ایجیلینو دا رومانو نے ویرونا میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ یہ شہر دامنِ آلپس کے قریب واقع تھا اور اس لئے لمبارڈی کے میدانی شہروں کی بہ نسبت یہاں طریق جاگیریت کو زیادہ غلبہ حاصل تھا۔ رومانو کے اس خاص معاملے میں جزو اعظم فرقہ بندیوں کا اشتداد تھا اس سے کسی فوجی مہارت رکھنے والے جری سرگروہ کی ضرورت لاحق ہوئی لیکن اگرچہ مطلق العنانی کا قدم پہلے انھیں مشرقی شہروں میں آیا تاہم بقول ہیلم زیادہ سے زیادہ چودھویں صدی کے اختتام تک تمام ان شہروں نے جو شہنشاہوں کی اطاعت کے خفیف ترین نشان کو بھی ٹھکرا دیتے تھے، خود مختار حکومت کی یاد تک بھلا دی اور اب وہ اپنے نئے آقاؤں کی اولاد میں بے رد و کد ورثے کی طرح منتقل ہونے لگے[2]۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کی اطالوی طرز کے ارتقائے کامل تک سیاسی نشو و نما کا درجہ بدرجہ پتا چلانے کے لئے ہمیں فلورنس کی طرف متوجہ ہونا پڑیگا۔

[1] سسمونڈی حسب بالا جلد دوم صفحہ ۳۱۲۔

[2] ہیلم، "ازمنۂ وسطیٰ" جلد اول باب سوم حصۂ دوم صفحہ ۴۰۸۔ ملان میں (۱۴۴۷ء میں) جمہوریت کی ہنگامی تجدید پر اس بیان کے استثنا کی حیثیت سے سرسری نظر ڈالی جائے مگر سرسری ہی نظر ڈالنا کافی ہوگا۔

خطبۂ نوزدہم

بلادِ ازمنۂ وسطیٰ، اطالیہ کی شہری جماعتوں کا مقابلہ قدیم یونان سے

۱۔ میں نے کسی سابق خطبے میں یہ اشارہ کیا ہے کہ معمولی مورخ کی نظر میں یورپ کے دیگر حصص کی بہ نسبت اطالیہ کا مقابلہ قدیم یونان سے بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے عام معمولی مورخ سے میری مراد ایسے مورخ سے ہے جسے خصوصیت کے ساتھ اس بحث سے سروکار نہو جس کو مملکتوں کا علمِ التشکیل کہہ سکتے ہیں۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں صرف شمالی اطالیہ ہی وہ سرزمین تھی جہاں تک ایک مسلسل قطعۂ ارض کا کل حصہ تو نہیں مگر اسکا بیشتر حصہ متعدد شہری مملکتوں کی اراضی میں بالکل اس طرح منقسم تھا جس طرح کہ قدیم یونان کا زیادہ متمدن حصہ منقسم تھا (اس کے برخلاف) جرمنی کے اندر جن جگہوں میں شہروں کو بہت زیادہ خوش حالی حاصل تھی، وہاں بھی یہ شہری مملکتیں شاہانہ حکومت کے محض مستثنیات میں سے تھیں عله، نیز اس پر بھی لحاظ کیا جانا مناسب ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی اطالیہ اپنے علاً خودمختار شہری جماعتوں کے دورِ خوشحالی میں ذہنی و مادی تمدن و تہذیب میں تمام یورپ پر فائق تھی۔ یہ فوقیت ایسی نمایاں نہیں تھی جیسی قدیم یونان کو اپنے انتہائی سرسبزی کے زمانے میں حاصل تھی۔ تاہم بہت بڑے اختلافات کے باوجود یہ یقینی ہے کہ اطالوی جمہوریتوں کے اندر

عله۔ فریمین ۔ ۱۰ ۔ ۲۷

یونان قدیم کی تاریخ کے ساتھ نمایاں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر ان دونوں کو ساتھ ساتھ دکھاؤں۔

اولاً یہ کہ جس طرح یونانی شہروں نے قدیم بربریت سے نکل کر نشوونما پائی، اسی طرح اطالیہ کے شہروں نے اس زمانہ بربری بدنظمی سے جس میں خود معاشرہ ہی غرق ہو گیا تھا، نکلکر قوت و خوشحالی میں ترقی کی۔ (الف) فن جنگ کے اس دور میں ان کے فصیلی شہروں کو فوجی فوقیت حاصل تھی اور (ب) ان کی اقتصادی خوشحالی کا باعث یہ تھا کہ انھیں فصیلدار شہروں کے اندر ایک ایسے معاشرے میں جو یورپی تمدن، و حرفت کا پیشرو بنتا جا رہا تھا، متمدن حرفت و تجارت کا موقع مل گیا تھا۔

دوسرے یہ کہ ازمنۂ وسطی کے اطالیہ کی شہری جماعتوں کے اندر یونانی شہری مملکتوں کی سی مجتمعہ سیاسی زندگی اور انھیں کی سی گونہ عمیق حب الوطنی پائی جاتی تھی، اور دونوں صورتوں میں اس کا سبب بھی بہت کچھ ایک ہی تھا کہ ملکی سلطنتوں کی بہ نسبت یہاں افراد کے سود و بہبود کو اس کی جماعت کے سود و بہبود کے ساتھ زیادہ گہرا تعلق تھا۔ مزید براں دونوں صورتوں میں یہ حب الوطنی ان کی تاریخ کے اس ابتدائی حصے میں زیادہ تابناک نظر آتی ہے جب ان کے شہری سپاہی ان زبردست حملہ آور بادشاہوں کی مدافعت کے لئے ایک دوسرے کے دوش بدوش ہو جاتے تھے جو ان شہروں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اپنے قدیم تنازعات کے باوجود لمبارڈی کے کل شہر نہیں مگر شہروں کی ایک کافی تعداد جس طرح فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) (۱۱۶۷ء — ۱۱۸۳ء) کی مخالفت کے لیے متحد ہو گئی، اس کا مقابلہ اس صورت سے کیا جا سکتا ہے جس طرح یونانی مملکتیں اپنی موروثی رقابتوں اور اپنی سرحدی جنگوں کے باوجود کل نہیں مگر کافی تعداد میں ایرانی حملے کے روکنے کے لئے متحد ہو گئی تھیں۔

پھر جس قدر زمانہ گزرتا گیا، دونوں صورتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شہر نہ صرف ایک دوسرے سے بلکہ خود اپنے اندر بھی بہ اشتداد و طویل فرقہ بندیوں کی ناگواریوں کی وجہ سے مایوسانہ طور پر منقسم ہو گئے تھے۔ جس طرح اسپارٹا اور اس کے حلفا، ایتھنز اور اس کے حلیفوں سے لڑتے رہتے تھے، اسی طرح گوئلف (جانبداران پوپ کے شہروں کا معاقدہ) گبیلین (جانبداران شہنشاہ کے) شہروں کے معاقدہ سے برسرپیکار رہا کرتا تھا۔

مزید براں، قدیم تر زمانہ میں یونان قدیم اور اطالیہ ازمنۂ وسطی دونوں میں بلدی جنگوں میں ایک شہر دوسرے شہر سے آپس ہی میں ایک متحدہ جماعت کے طور پر لڑتا تھا، اگرچہ چوتھی صدی قبل مسیح کی یونانی جنگوں میں جس شہر پر حملہ ہوتا تھا اس کے خارج البلد اشخاص بھی حملہ آور قوت کا ایک قابل لحاظ عنصر ہوتے تھے اسی طرح اطالیہ کی باہمی بلدی لڑائیوں میں جن کا شمار تیرھویں صدی کے نصف آخر اور اس کے بعد کے زمانے سے ہوتا ہے، یہ صورت نہیں رہی تھی کہ پار ما پیاچنزا سے لڑتا تھا بلکہ پار ما مع فرو جین پیاچنزا سے لڑتا تھا عہ۱
پھر دونوں صورتوں میں، تمدن اور اس کے ساتھ ساتھ پر امن صنعت و حرفت اور عیش و عشرت نے بتدریج اہم شہروں کے باشندوں کو جنگ کرنے سے معذور بنا دیا تھا اور روز بروز اجیر سپاہیوں کے ذریعہ سے جنگ کرنے کا طریقہ اختیار کرتے جاتے تھے، پس کچھ تو پائدار اتحاد قائم کرنے کی عدم قابلیت اور کچھ جنگ میں بذات خود کام کرنے کی ناقابلیت کی وجہ سے انجام کار یہ لوگ اس جدال و قتال کے قابل نہ رہے جو ان کے قرب و جوار کی وسیع تر ملکی سلطنتوں کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی، یہ ملکی سلطنتیں یونان کے معاملے میں تو اسکندر کی شہنشاہی کے اجزا تھے، اور اطالیہ کے مقابلہ میں مغربی یورپ کی وسیع تر سلطنتیں تھیں؛ اور اس طرح ان شہروں کی آراضی غیر ملکی نبرد آزماؤں کے میدان کارزار بن گئی عہ۲ اطالیہ کے لئے یہ صورت حالات ۱۴۹۴ء میں چارلس ہشتم کے حملے سے شروع ہوئی بقول میکاولی جس ساعت سے کہ چارلس ہشتم کوہ الپس سے اترا، اسی ساعت سے اطالوی سیاسیات کی کل کیفیت بدل گئی۔ اس جزیرہ نما کی حکومتوں کا کوئی خود مختارانہ نظم باقی نہیں رہا۔ جو وسیع تر اجسام اب ان کے قریب آ گئے تھے انھوں نے اپنی کشش سے انھیں قدیم مرکز سے کھینچ لیا تھا۔ اور اب وہ فرانس و اسپین کے محض توابع رہ گئے تھے۔ ان کے تمام اندرونی و بیرونی مناقشات کا تصفیہ غیر ملکی اثر سے ہوتا تھا عہ۳

عہ۱ - فیراری، حسب بالا جلد دوم صفحہ ۲۵۷۔

عہ۲ - فریمین۔

عہ۳ مضمون بر میکیاویلی۔

ان شہروں کے اندرونی ارتقا کی طرف جب ہم توجہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں جس حد تک بھی حکومت خود اختیاری حاصل تھی ابتدا میں وہ نظم و نسق چند اشخاص کے ہاتھوں میں تھا اور بعض نہایت ہی اہم فیصلے قوم کی جمعیت عام کے سامنے محض منظوری یا نامنظوری کے لیئے پیش ہوا کرتے تھے۔ عام شہری جو قدیم یونان میں مجلس "اگورا" میں اور ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ میں مجلس "پارلامنتو" میں جمع ہوتے تھے وہ چند سربرآوردہ خاندانوں کی حکمرانی پر راضی رہتے تھے۔ اس کے بعد امرا اور قوم میں اختلافات برپا ہوئے اور پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عمومیت کی جانب میلان پیدا ہو چلا۔ ٹسکنی کے شہروں میں یہ صورت سب سے زیادہ دلچسپ ہے، کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے طرز کے شہروں کے نشو و نما کے متعلق ان شہروں کی اندرونی تاریخ سے شمال ایپے نین کے اکثر و بیشتر شہروں کی بہ نسبت زیادہ مکمل معلومات حاصل ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان شہروں میں جمہورانہ خود مختاری زیادہ مدت تک قائم رہی، لیکن لمبارڈی کے شہروں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ اس کی ترقی اس سے کم رہی۔ حدود شہریت میں وسعت دینے کے اس میلان کو خود مختارانہ جماعت کی حیثیت سے یونان کی شہری مملکتوں کی تاریخ کے موخر دور کے مثل قرار دے سکتے ہیں۔ مزید براں، جب زیادہ عمومی حکومت کی تحریک کو ترقی ہونے لگی تو تقرر عہدہ جات کے لیئے قرعے کا استعمال ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ میں بھی اسی طرح رائج ہو گیا جس طرح قدیم یونان میں رائج تھا اور آخر میں ان دونوں صورتوں میں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بد نظمی اور فرقہ بندی کے قانون میں حکمرانی کے ایک ہی شخص کے ہاتھ میں چلے جانے کا موقع پیدا ہو جاتا تھا، جمہوری زندگی کا کچھ زمانہ گزرنے کے بعد یہ میلان زیادہ قوی ہو جاتا تھا جس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لوگ جمہوری فرقہ بندیوں سے تھک جاتے تھے اور کچھ وجہ وہ تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ تمدن کے ترقی کے طور پر بذات خاص فوجی خدمت انجام دینے کی طرف سے بتدریج تنفر پیدا ہو جاتا تھا، اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اجیر سپاہیوں سے کام لیا جانے لگتا تھا۔

اس مواز نے کو اگر مخصوص شخصوں تک وسعت دی جائے تو ہم ایتھنز اور فلورنس کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں، یونانی شہری مملکتوں کے سرگروہ ایتھنز نے

قدیم یونان کے (علوم و فنون) کی عام ترقی میں جو درخشاں حیثیت حاصل کرلی تھی وہ اس تابناک منزلت کے بالکل مشابہ تھی جو ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ کے علوم و فنون کی ترقی میں فلورنس کو حاصل ہوئی ایتھنز کی طرح عمومیت کی تحریک میں بھی فلورنس نے مقدم حصہ لیا، یہ عمومیت ازمنۂ وسطیٰ کے منظم اہل حرفہ کی وہ تنظیم تھی جسے ہم تیرھویں صدی کے نصف آخر اور چودھویں صدی میں اطالوی جمہوریتوں میں دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی نتیجہ خیز طور پر ہم وینس کے ادارات کا مقابلہ اسپارٹا کے ادارات سے کرسکتے ہیں جس طرح وینس ازمنۂ وسطیٰ و جدید کی اطالیہ کی نہایت نمایاں و مستحکم عدیدیت تھی اسی طرح حال قدیم یونان میں اسپارٹا کا تھا (بلکہ ہم لفظ اسپارٹی کا انطباق صرف معدودے چند حکمراں افراد پر کریں[۱]) وینس کے دوج کے اختیارات کا مقابلہ جو تشدد آمیز اور حاسدانہ انداز سے روز بروز زیادہ محدود ہوتے جارہے تھے، اسپارٹی بادشاہوں کے روبتنزل اقتدارات سے کیا جاسکتا ہے۔ دوسری جانب اسپارٹا میں ایفوروں کے اختیار کی ترقی اور اس کے ساتھ ہی ان کے خفیہ طریق کار اور دہشت انگیز سزائے موت کا مقابلہ وینس کی "مجلس عشرہ" اور آخر الامر تین مفتشوں کے تقرر و قیام سے کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ بہرحال یہ تشابہات حیرت انگیز ہیں مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں خارجی تعلقات کے لحاظ سے خود مختاری کی یہ کیفیت تھی کہ خود شہر کے اندرونی اتحاد اور دوسرے شہروں کے ساتھ اس کے قلیل القیام باثر اتفاق کے وسیلے سے کامیاب طور پر اس خود مختاری کی حفاظت ہوتی رہتی تھی، اور جب نااتفاقی اور فرقہ بندی پھیل جاتی تھی (جس سے مختلف شہر باہم متفق ہو ہو کر علیحدہ ہو جاتے تھے) تو پھر خود مختاری پر زوال آجاتا تھا، اور ان دونوں صورتوں میں (اس خود مختاری کے زوال کے بعد) اندرونی سیاسی نشوونما کے لحاظ سے ابتدائی عدیدیت عمومیت کی طرف چل نکلتی، اور پھر بادشاہی یا خودسرانہ حکومت کی عام سرگشتگی میں مبتلا ہو جاتی تھی، مگر اس مشابہت کے ایک ایک نقطے میں بہت سے اہم غیر مماثلت کے قیود بھی لگے ہوئے ہیں۔ خود مختاری کے مدارج مختلف ہیں، فرقہ بندیوں کی نوعیت ایک جگہ کچھ، اور دوسری جگہ کچھ اور ہے اطالیہ

---

[۱] ملاحظہ ہو خطبۂ پنجم۔

میں عدیدیت نسبتاً زیادہ پیچیدہ تھی اور عام شہریوں کے ساتھ اس کا تعلق دوسری ہی طرح کا تھا، بادشاہی جس نے جمہوریانہ آئینی آزادی کو با دیادہ اطالیہ میں نسبتاً بہت بڑی حد تک باضابطہ انتخاب سے منضبط ہوتی تھی، اور عام خیال میں اسے جائز و درست سمجھا جاتا تھا، اور اگر ہم باشندوں کی تعداد کا نہیں بلکہ آزاد اشخاص کی تعداد کا لحاظ کریں تو اس صورت میں اطالوی عمومیت نسبتاً زیادہ جانبدارانہ تھی کیونکہ اس میں کبھی کبھی بااثر طور پر شہر کے تمام اصلی باشندے شامل نہیں کئے گئے بلکہ منتظم تجارتوں اور حرفتوں کی ایک خاص تعداد اس میں داخل تھی، اس کا نشوونما بھی نسبتاً زیادہ ناکمل رہا کیونکہ اطالوی عامۃ الناس نے کبھی بھی یونانیوں کے مانند واقعاً حکمرانی کی کوشش نہیں کی۔ بقول فریمین، بعد کے زمانے میں تو بارلاسنتوں کی طلبی بالعموم اس لئے ہوا کرتی تھی کہ "وہ خود اپنے اختیارات کے خلاف رائے دیا کریں"۔ آخری امر یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی عمومی تحریک ایک خاص نقطے پر پہنچکر رک گئی تھی، منتظم اہل حرفہ اپنے سرمائے کے وسیلے سے عدیدی بن گئے تھے، اور جہاں کہیں دستور مطلق العنانی کے تحت میں نہیں آگیا تھا وہاں آخری درجے میں کمل دستور سلطنت کا میلان قطعی طور پر عدیدیت کی طرف ہو جاتا تھا۔

ہم ان میں سے اب ہر ایک امر پر مختصراً بحث کرتے ہیں، پہلے دو امور سے چلے ہوئے ہیں، کیونکہ جن حالات کی وجہ سے اطالوی بلدیات کی خودمختاری یونانی شہروں کی بہ نسبت پست ہو گئی تھی انھیں وجوہ سے (جس زمانہ میں فرقہ بندیوں میں سب سے زیادہ شدت و مضرت پائی جاتی تھی) ان کی مروجہ فرقہ بندیاں بھی حقیقی طور پر مختلف النوع ہو گئی تھیں۔ درحقیقت اطالوی شہروں کی خودمختاری کی عدم تکمیل کا کوئی نمایاں اظہار اس امر واقعہ سے بڑھ کر ذہن میں نہیں آتا کہ گوئلف اور گبلین کے ان مناقشات میں جو تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں خود شہروں کے اندر اور مختلف شہروں کے درمیان برپا تھے، جن مقاصد کا نام لیکر یہ دونوں فرقے آپس میں لڑتے تھے، ان مقاصد کو ان جماعتوں کی انفرادی سیاسی زندگی سے اس قدر بعید ہونا، لیکن یونانی تاریخ میں اسی کے مشابہ دور ہیں جبکہ کچھ شہری اپنے مخالف شہریوں کو برابر قتل کرتے اور شہر سے نکالتے رہتے تھے اور یہ خارج البلد اشخاص اپنے وطن آبائی کے خلاف جنگ کرتے یہاں تک کہ اس کے موروثی دشمنوں کے ساتھ ہو کر اس سے لڑتے، اس وقت جن اغراض

و مقاصد پر بازی لگی ہوئی تھی وہ مسلّمہ طور پر سیاسی دستور کے اساسی اصول تھے یعنی یہ کہ عددیت کو غلبہ ہونا چاہیئے یا عمومیت کو۔ لیکن اطالیہ کی فریقانہ جنگوں میں جن ناموں کے تحت میں یہ فریق لڑتے تھے، وہ دو جرمانی ڈیوکوں کے خاندان کے نام تھے جو شہنشاہی تاج کے رقیبانہ دعویدار تھے، اور ان کے دعاوی کی وجہ سے جرمنی میں بارھویں صدی کے ربع ثانی ہی میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک تو ولف یا گوئلف کا خاندان تھا جس کی ایک شاخ خود انگریزوں کا شاہی خاندان ہے۔ اور دوسرا ہوہنشٹافن کا خاندان تھا جس کے وائب لنگن نامی قلعے کے نام سے گبلین کا نام بنا یا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تنازعے کی یہ خالص جرمانی خصوصیت حقیقی ہونے کے بجائے زیادہ تر مجازی تھی۔ اطالیوں کو جس امر سے دلچسپی تھی وہ یہ بات تھی کہ شہنشاہ تقریباً ہمیشہ خاندان ہوہنشٹاوفن سے ہوا کرتا تھا، (۱۱۳۸ء سے ۱۲۵۴ء تک تو ایسا ہی ہوتا آیا۔ اور اس کے بعد ایک مختصر وقفے کے سوا اطالیوں کے لئے شہنشاہی فی الواقع بالکل ناقابل لحاظ ہو گئی تھی)، دوسری طرف، پوپ تقریباً ہمیشہ گوئلف کے دعووں کی تائید کرتا رہتا تھا۔ پس یہ فرقہ بندیاں شہنشاہی و پاپائی بھی جاتی تھیں، لیکن پھر اس سے بجائے خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلاد اطالیہ کس کامل حد تک اپنی حیثیت کو ایک وسیع تر سیاسی مجموعے کا جزو سمجھتے تھے جو جرمانی بادشاہی اور رومانی کلیسا کے اس خاص اتحاد کی وجہ سے قائم ہو گیا تھا جس سے مقدس رومانی شہنشاہی ظہور پذیر ہوئی۔ یہ کہنا بھی پوری طرح صحیح نہ ہوگا کہ چونکہ شہروں کی آزادی کو پوپ کی طرف سے نہیں بلکہ شہنشاہوں کی طرف سے خطرہ پیش رہا کرتا تھا، اس لئے فریق گوئلف فی الحقیقت خود مختاری کے لئے لڑ رہا تھا۔ بیشک کشمکش کے آخری حصے میں ایک حد تک یہ صحیح تھا مگر صرف ایک حد ہی تک صحیح تھا۔ چنانچہ ہم ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ پاپائی ریاستوں کے اندر جب مسند نشینان پاپائیت نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے اقتدار اعلےٰ کو حقیقی اقتدار بنا دیں تو وہ جلدی آزادی کے دوست نہیں رہے بلکہ دشمن ہو گئے۔

دوسری طرف ان حدود سے خارج پیزا وغیرہ بعض ایسے شہر تھے جو اپنی جمہورانہ خود مختاری کی روایات پر بھی فخر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی شہنشاہی معاملے کے متعلق اپنی روایتی وفاداری پر بھی نازاں تھے۔

اس کے ساتھ ہی ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی فریقوں اور قدیم یونانی فریقوں کی

جنگ وجدل میں درحقیقت اس سے زیادہ مشابہت موجود ہے جتنی بادی النظر میں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگرچہ تمام طویل المدت فرقوں کی شعار اعلامی میں ایک مخلوط و تغیر پذیر مفہوم ہوا کرتا تھا، اور مذکورۂ بالا نام بھی اس سے مستثنےٰ نہیں تھے، تاہم ایک معقول حد تک یہ صحیح ہے کہ شہروں کے اندر گبلین جاگیری عنصر کے اور گوئلف حرفتی عنصر کے نمایندے تھے۔ کلیتہً ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ امرا کے متعدد خاندان گوئلف کے جانبدار تھے مگر ایک معقول حد تک ایسا تھا۔

۳- اس سے مجھے اپنے تیسرے نقطۂ تقابل کی طرف رہبری ہوتی ہے، یعنی قدیم یونانی عدیدیت اور ازمنۂ وسطیٰ کی اطالوی شہری عدیدیت کے درمیان جو فرق ہے وہ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے، اطالوی شہروں میں دو ممیز متخاصم و متصادم اجزا موجود تھے، جن میں ہر ایک کی نسبت "عدیدیت" و "عمومیت" کے مانوس تضاد کا استعمال ہو سکتا ہے اور درحقیقت اس وقت میں واقعاً اس کا استعمال ہوتا بھی تھا۔ اولاً تو جاگیری امرا (یعنی فوجی خصائل سے متصف زمیندار جو اپنی شہری زندگی میں بھی ان خصائل کو اپنے ساتھ لائے تھے) اور ان لوگوں میں مخاصمت تھی جو تجارت میں مشغول تھے اور خوش باش شہریوں میں بہت بڑی کثرت انھیں کی تھی۔ ثانیاً یہ کہ ایک طرف اہل تجارت و اہل پیشہ کا وہ عنصر تھا جس نے اس قسم کی گروہ بندیاں کر لی تھیں جنھیں فلورنس میں "فنون اعلےٰ" کہتے تھے اور دوسری جانب وہ حرفتی گروہ تھے جو معاشری معیار میں ان سے پست تر درجے میں تھے، ان دونوں کے درمیان بھی تفریق و کشمکش تھی۔

لیکن یونانی شہروں کی تاریخ میں یہ دُہرا تضاد صاف طور پر نمایاں نہیں ہوا تھا، اس میں شک نہیں کہ آزاد یونان کے دور آخر میں عدیدیت جہاں تک باقی رہی تھی، اس نے کسی حد تک اپنی خصوصیت کو بدل لیا تھا، اس دور آخر میں عدیدیت اُنھیں قدیم خاندانوں تک محدود نہیں رہی تھی، جنھیں نہ صرف دولت کا ورثہ ملتا تھا بلکہ وہ آبائی حقوق اور آبائی قابلیت کے بھی وارث ہوا کرتے تھے، اب عدیدیت کا میلان دولت کی عدیدیت یعنی خالص اغنیا نیت کی طرف ہو گیا تھا تاہم کہیں بھی یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ جو رشک و حسد اور منافسات قدیم خاندانوں اور نو دولتوں کے درمیان موجود تھے اس کا اظہار کسی پُرزور و نمایاں طریقے پر سیاسی ادارات

وقوانین میں ہوتا ہو، مثلاً جب ساتویں صدی قبل مسیح میں میگارا میں عمومیت کی جانب رجحان پیدا ہوا تو اگرچہ میگارا ایک تجارتی و استعماری سلطنت رہ چکا تھا، پھر بھی (جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس نے عدیدیت کے خلاف جس وجہ سے مقاومت کی وہ یہی وجہ تھی کہ دولت مند زمیندار کاشتکاروں پر ظلم وستم کرتے تھے عله۔

مگر اطالوی شہروں میں یہ دُہرا تضاد بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے، بہ حیثیت مجموعی جاگیری اور حرفتی عناصر میں کشمکش پہلے شروع ہوئی اور اس کے بعد مرفہ الحال آبادی Popalare grasse اور منظم اہل حرفہ وعمال میں کشاکش ہوئی۔ تاہم ایک حد تک دونوں ایک دوسرے میں شامل ہیں اس دوسری کشاکش نے شمال اسپین کے بیشتر شہروں میں (جن سے ہمیں آخری خطبے میں بالتخصیص تعلق رہا تھا) نسبتاً کم ترقی کی تھی کیونکہ یہ شہر عام طور پر خود سرانہ حکومت کے زیر اثر آ گئے تھے مگر شگی کے سربرآوردہ شہر فلورنس کی تاریخ میں اس کا اظہار پوری طرح سے ہوا، اور میں اب اسی کی طرف متوجہ ہوا چاہتا ہوں۔

آخر میں مجھے ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ کی مطلق العنانی اور قدیم یونان کی خودسری کے متعلق ایک بات کہنی ہے۔ ان دونوں کے اختیار یا اس اختیار کے طریق حصول بلکہ ان حالات تک میں جن سے اس کی تائید ہوتی تھی، اتنا زیادہ نمایاں فرق نہیں پایا جاتا جتنا ان دونوں کی شکلوں میں فرق پایا جاتا ہے تقریباً تمام صورتوں میں یونان کے خودسروں کا آغاز وانجام غیر آئینی طرز پر ہوا۔ جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، یونانی شہروں نے برضا ورغبت کسی امیر کی حین حیات حکمرانی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ چہ جائے کہ وہ موروثی حکمرانی کے مطیع ہو جاتے۔ تاریخی طور پر جن حالات کا علم ہے ان میں تو کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ اسکے برخلاف تیرھویں صدی کے آخر میں جب لمبارڈی کے شہر مطلق العناں حکمرانوں کے تحت میں آئے تو (جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) ان کا کم از کم رسمی انتخاب ضرور عمل میں آیا تھا، اطالوی شہروں میں بادشاہی کی اس بڑھی ہوئی آئینی نوعیت اور اس کے قبول کرنے اور اس پر رضامند ہونے کا مزید میلان کسی حد تک اردگرد کے اقطاع ملک کے حالات کے اثر سے ہوا۔ کیوں کہ اطالوی ان اقطاع ملک پر شہنشاہی کی باضابطہ فوقیت کو تسلیم

عله۔ خطبۂ ششم وضمیمۂ نوٹ سوم۔

کرتے تھے، اور وہ ان پر اس حقارت کے ساتھ نظر نہیں ڈال سکتے تھے جس حقارت کے ساتھ یونانی، ایران کی بر بری بادشاہی پر نظر ڈالتے تھے۔ وہ اپنے ہر طرف ایسے شہر دیکھتے تھے جن کی تہذیب انھیں کے مثل تھی۔ اور جو شہزادوں اور دوسرے امیروں کے تحت میں تھے، اور اگر انھیں بھی قسمت سے ایسی ہی حکمرانی سے سابقہ پڑ جاتا تو یہ انھیں اس قدر غیر طبعی و ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی جس قدر یونانیوں کے سیاسی احساس پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ درحقیقت اطالوی شہروں میں سب سے زیادہ آزاد شہروں (یہاں تک کہ فلورنس تک کو) غیر ملکی خطرات کے نازک اوقات میں اسی میں مصلحت نظر آئی تھی کہ اپنے شہر کی امارت کسی بادشاہ یا شہزادے کو دیدیں۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ فکر رکھتے تھے کہ اندرونی معاملات میں معتدبہ حد تک حکومت خود اختیاری قائم و برقرار رکھیں۔

ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ تیرھویں صدی کے بعد سے بارود کے رواج کے وقت تک سواروں کی مسلح فوج کی روزافزوں فوقیت اور جنگ میں اجیر سپاہیوں سے اس حد تک کام لینے کی ترقی جس کی کوئی نظیر یونان میں نہیں ملتی یہ دونوں امور اطالوی خودسری کے حق میں سودمند ثابت ہو رہے تھے۔ پس اطالوی جمہوری زندگی جس مطلق العنانی کی حالت میں جا پڑی تھی وہ یونان کے موخر زمانے کے خودسروں کی حالت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے، اس کا مخصوص فرق یہ ہے کہ اس کی ابتدا اور اس کی نوعیت اگر تمام حالات میں نہیں تو اکثر حالات میں زیادہ قانونی طرز پر ہوتی تھی، یہ خودسری اکثر اس اختیار سے ترقی کر کے پیدا ہو جاتی تھی جو غیر ملکی یا خانگی دشمنوں کے خلاف مزید طاقت کے حصول کی خواہش سے بظاہر شہر کی حقیقی رضامندی سے عطا کیا جاتا تھا، میرا خیال ہے کہ اطالوی شہروں کے نسبتاً زیادہ عمومی آغاز ہی کا یہ باعث تھا کہ ان کے نشوونما میں اس قدر کم امور ایسے ملتے ہیں جو یونان کے قدیم تر زمانے کے خودسروں سے مشابہت رکھتے ہوں شہر کا حرفتی عنصر جو اپنی تجارتی شرکتوں میں منتظم و مرتب ہو گیا تھا، وہ اس تحریک کی ابتدا ہی سے سیاسی حیثیت سے آزمودہ کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان عمومی سرگردہوں کے لئے جو اپنے کو خودسر بنا لینے کے درپے رہتے تھے، وہ موقع نہیں پیدا ہونے دیتا تھا جو ابتدائی عمومی تحریکات سے یونانی ملکتوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔

خطبۂ بستم

بلاد ازمنۂ وسطیٰ فلورنس

۱۔اب ہمیں فلورنس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، جسے ہم اطالوی شہروں میں عمومیت کی تحریک کا ایک نمونہ قرار دے سکتے ہیں، عمومیت سے مراد منظم تجارتوں اور حرفتوں کی وہ عمومیت ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں رائج تھی (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) فلورنس اور عام طور پر ٹسکنیی کے شہروں کی موثر خودمختاری کا آغاز شمال کوہ ایپےنین کے شہروں کے بعد ہوا ہے جس کی وجہ ٹسکنیی کی امارت مارکوئسی کی قوی تر حکومت تھی، مگر یہ خودمختاری زیادہ دیرپا رہی جب لمبارڈی کے قریب قریب تمام شہر مطلق العنانہ حکومت کے تحت میں آ گیئے تھے، اس کے مدتوں بعد تک فلورنس اپنے جمہورانہ دستور کو ترقی دیتا اور اپنے خصائص کا کامل تر اظہار کرتا رہا، اس ارتقا کے دوران میں بلدی دستور بے انتہا پیچیدہ ہو گیا تھا، تغیرات کے خاص اسباب حسب ذیل نظر آتے ہیں۔

(۱) حکومت کی نت نئے تنظیمات کے ذریعے سے امراء کی بے ضابطگیوں کو دبانے کی مسلسل تجدید، اور (۲) حکومت میں تجارتوں یا صنعتوں کی نمایندگی میں ازدیاد و توسیع جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اول الذکر خصوصیت اطالیہ کے شہروں کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے برخلاف موخر الذکر کا حقیقی رشتہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے عام طور سے ملا ہوا ہے۔

فلورنس کی خودمختاری کا آغاز اگر کسی خاص وقت سے ہوتا ہے تو اس وقت کو کوئی گگا ڈنسل مٹلڈا کے انتقال کے بعد یعنی ۱۱۱۵ء سے سمجھنا چاہیئے (مٹلڈا نے ۱۰۷۶ء سے

ٹسکنی کی امارت پر تنہا حکمرانی کی تھی اور) اسکے تحت حکومت میں شہر کو اصولی طور پر حکومت خود اختیاری حاصل نہیں تھی مگر عملی طور پر سربرآوردہ خاندانوں کے ارکان عدالتی کاموں میں حصّہ لیتے تھے۔ مٹلڈا جب موجود ہوتی تو وہ خود اجلاس عدالت کی صدارت کرتی تھی مگر اس کی عدم موجودگی میں فیصلے اکثر شہر کے ججوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے جاتے تھے، اور سیاسی و انتظامی مشاغل کی وجہ سے مٹلڈا کی عدم موجودگی کچھ کم نہ تھی۔ مزید براں، پوپ اور شہنشاہ کے درمیان جو کشمکش جاری تھی اس میں اگرچہ شہر فلورنس اپنے اعلیٰ جاگیردار یعنی کاونٹس کے ساتھ ہوکر پوپ کا جانبدار بن گیا تھا، مگر گردونواح کے جاگیردار امرا جو یہ سمجھتے تھے کہ انکے جاگیردار اعلےٰ نے انھیں ستا رکھا ہے، وہ زیادہ تر شہنشاہ کی جانب میں تھے بدیں وجہ امرائے دیہات کے ساتھ شہروں کی جس کشمکش کو ہم لمبارڈی کے شہروں کے حال میں دیکھ چکے ہیں، اس کا آغاز فلورنس میں کسی قسم کی بلدی خود مختاری کے آغاز کے قبل ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے خود مختاری کی یہ تقلیب بغیر کسی قسم کے سخت صدمہ کے واقع ہو گئی۔ سربرآوردہ خاندانوں کے ارکان جو پہلے عاملانہ حکومت کو مٹلڈا کے نام سے چلاتے رہتے تھے وہی اب اس حکومت کو شہر کے نام سے چلانے لگے۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ حکومت بارہ ارکان پر مشتمل ہو گئی جنھیں قنصل کہتے تھے اور شہر کے چھ محلوں میں سے ہر محلہ سے سالانہ دو دو قنصل منتخب ہوتے تھے۔ یہ لوگ سربرآوردہ شہریوں کے طبقے میں سے ہوتے تھے جن میں زیادہ تر جاگیردار امرا شامل تھے، مگر سوا اس سے زائد افراد کی ایک اور مجلس تھی جو ان کی مدد کرتی تھی، اس مجلس میں اہل صنعت و حرفت بھی داخل تھے، اور بلاشبہہ انھیں کو اس میں غلبہ حاصل تھا۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس مجلس میں ان منتظم تجارتوں کے نمایندے بھی شامل تھے جو بعد میں ''فنون اعلےٰ'' کے نام سے مشہور ہوئے یا یہ کہ ان میں سے بعض تجارتوں کے ارکان داخل تھے، کیونکہ بارھویں صدی کے ربع آخر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صناعوں کے سرگروہ اس قابل سمجھے گئے تھے کہ شہر نے جن معاہدات پر دستخط کئے تھے ان میں ان لوگوں کو بھی حسب ضابط کچھ تفویض ہوا تھا اور ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس سیاسی اعتراف کے قبل ان کی منظم ہستی کی مرفہ الحالی کا ایک طویل زمانہ گزر چکا ہوگا۔ درحقیقت یہ معلوم ہوتا ہے، کہ فلورنس کی خارجی حکمت عملی پر اول ہی سے تجارتی اغراض کا اثر قائم ہو گیا تھا۔ بڑے

مواقع کے لئے "پارلامنتو" بھی تھی، مگر اس کا اجلاس محض ضابطہ کے طور پر ہوتا تھا، اور چونکہ اس کا انعقاد اکثر کسی معمولی وسعت کے چوک یا کسی گرجا میں ہوتا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عام شہریوں کو حکومتی فیصلوں میں کوئی موثر شرکت حاصل نہیں تھی۔

۲۔ اس حد تک امرا اور حرفتی عناصر میں کسی قسم کا عناد نہیں پایا جاتا، مگر ۱۱۲۹ء کے بعد سے ہم یہ پڑھتے ہیں کہ قرب و جوار کے قصر منہدم کر دیئے گئے، اور ان قصروں کے امرا کو شہر کے اندر رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس طرح شہر میں جاگیری عنصر کا اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے بعد بارھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) سے کشمکش واقع ہوئی، جس نے فلورنس اور دوسرے شہروں میں پودستا کا تقرر کیا تھا، مگر یہ شہنشاہی نظم جو کبھی بھی زیادہ زوردار نہیں ہوا تھا، اس صدی کے آخر میں درہم برہم ہو گیا، بایں ہمہ، کسی غیر ملکی امیر کے پودستا یا حکومت کے سرگروہ کے طور پر سالانہ مقرر کئے جانے کی مخصوص تنظیم لمبارڈی کی طرح یہاں بھی رائج ہو گئی" اور اس کے بعد ہی بہت جلد (۱۲۱۳ء میں) اس تنظیم نے قنصلوں کو پست کر دیا، اور ان کی حیثیت پودستا کی مجلس خاص کی سی ہو گئی۔ یہاں اس تغیر کی وجہ ایک حد تک یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں فلورنس نے (امرا کے) قصروں اور ارد گرد کے شہروں کے ساتھ جو جنگ جاری کر رکھی تھی اس کے لئے ایک واحد حکمراں کی اعلیٰ قابلیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ غیر ملکی شخص کے انتخاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ضرورت لمبارڈی میں محسوس ہوئی تھی وہی یہاں بھی موجود تھی یعنی امرا کی بے ضابطگیوں کے دبانے کے لئے کسی بے لوث اجنبی کی حاجت تھی۔ بہر نوع تیرھویں صدی کے نصف اول میں امرا کے درمیان مشاجرات برپا ہو گئے۔ اور یہ مشاجرات بہت جلد گوئلف اور گبلین کے عام مناقشے میں محو ہو گئے۔ امرا میں گوئلف بھی تھے۔ اور گبلین بھی تھے، مگر قدیم خاندان تقریباً سب کے سب گبلین تھے، اور حرفتی عنصر اور منظم اہل حرفہ زیادہ تر پوپ کی حمایت کرتے تھے۔

اب امرا اور اہل حرفہ کا عناد بڑھ چلا، اور ۱۲۵۰ء میں عامۃ الناس نے اپنے ایک قائد عوام Capitans popolo کے تحت میں اپنی جداگانہ فوجی و سیاسی تنظیم قائم کر لی۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ امرا کی بے ضابطہ زیادتیوں کو موثر طور پر دبایا جا سکے۔ چھ محلے کمپنیوں میں منقسم کر دیئے گئے جن کی کل تعداد بیس تھی، اور ہر ایک کمپنی کا ایک علم تھا۔

تاکہ جب قائد عوام "برج اسد" پر بڑا گھنٹہ بجائے تو کل قوم فوجی ترتیب میں مرتب ہو کر یکجا ہو سکے۔

گبلین فریق کے عارضی غلبے کے دوران میں یہ انتظام معطل کر دیا گیا، مگر ۱۲۶۷ء میں کچھ ترمیمات کے ساتھ اس کی پھر تجدید کی گئی۔ اس کا نتیجہ ایک نہایت ہی پیچیدہ دستور بلدی کی صورت میں ظاہر ہوا، کیونکہ حکومت عمومی کی جانب فلورنس کی تحریک کا اصل الاصول یہ تھا کہ اہم فرائض کا بیشتر حصہ موجود الوقت حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ اور عام اغراض کے بہتر تحفظ کے لئے ایک نئی تنظیم کا اس پر اور اضافہ کر دیا جائے پس اس طرح ۱۲۶۷ء کے بعد سے حسب ذیل بلدی دستور قائم ہوا۔ اولاً یہ کہ حسب سابق ایک پودستا تھا (جس کا انتخاب سال بسال غیر ملکی امرا میں سے ہوا کرتا تھا) اور اس کے ساتھ نوے اشخاص کی ایک مجلس خاص اور ایک اس سے بڑی مجلس تین سو شخصوں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ مجلسیں امرا اور عوام دونوں سے مرکب ہوتی تھیں، مگر انتظامی کاموں کے معمولی انجام دہی کے لئے بارہ شخصوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جنھیں اشخاص نیک (Buoni Uomini) کا لقب دیا جاتا تھا، اس میں ہر محلہ سے دو شخص ہوا کرتے تھے۔ ان کا انتخاب عام قوم میں سے ہوتا تھا، اور سو شخصوں کی ایک مجلس انھیں مشورہ دیتی تھی، اور اس کا انتخاب بھی عام قوم ہی میں سے ہوتا تھا، اس کے بعد قائد عوام ہوتا تھا۔ اور وہ بھی پودستا کی طرح کوئی غیر ملکی امیر ہوتا تھا جس کا انتخاب کسی گوئلف قصبے سے ہوتا تھا، اس کی بھی خاص و عام مجلسیں ہوتی تھیں وہ شہر کی فوج محافظ کی سرداری کرتا تھا، یہ پیدل فوج عام اشخاص کی کمپنیوں سے مرتب ہوتی تھی پودستا خارجی معاملات میں جمہوریت کا خاص نمایندہ ہوتا تھا، اور اکثر کل فوج کا سپہ سالار اعظم بھی وہی ہوتا تھا، مگر زیادہ تر دہ سواروں کا سپہ سالار ہوتا تھا، جو تقریباً تمام تر امرا اور دوسرے پیشہ ور سپاہیوں سے مرکب ہوتی تھی[عہ] پودستا دیوانی و فوجداری کی عام عدالت کا

عہ۔ ایک طرف ۱۲۵۰ء کے بعد سے شہر کی زندگی میں حرفتی عنصر کا غلبہ قوی ہوتا جاتا تھا، اور سیاسی تنظیم میں اس کا اظہار یوماً فیوماً زیادہ ہوتا تھا، دوسری طرف سوارہ فوج کی ترقی یافتہ گراں سلاحی کی وجہ سے جاگیری عنصر کا فوجی غلبہ بڑھتا جاتا تھا، جیساکہ ۱۲۶۰ء کی جنگ مونتاپرتی سے ثابت ہوا۔ اس سے جنگ میں اجیر سپاہیوں سے کام لینے کی ترقی ہوئی، امرا کے خاندانوں تک کے لڑکے چندروں کے سردار بنے اور جنگ کے نئے

صدر ہوتا تھا، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ قائد عوام کا خاص فرض یہ ہوتا تھا کہ جو امرا عوام کے خلاف زیادتیوں کا ارتکاب کریں انھیں روکے۔

نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جس کارروائی کے لئے تمام مباحثی جماعات کے اتفاق رائے کی ضرورت تھی اس میں عجیب پیچیدگی پڑ جاتی تھی یا وہ جو کارروائی تجویز کرتے تھے اس پر (۱) مجلس صدر (۲) قائد کی مجلس خاص (۳) قائد کی مجلس عام (بالعموم ایک دن میں) (اور دوسرے دن) (۴) پودستا کی مجلس خاص اور (۵) اس کی مجلس عام کی رائے لی جاتی تھی۔ نامناسب تاخیرات کے روکنے کے لئے تقریریں نہایت سختی کے ساتھ محدود کر دی گئی تھیں، اور یہ بھی ایک وجہ ہے، کہ فلورنس اور درحقیقت تمام ہی اطالیہ میں خطابت کو شاندار ترقی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

۳۔ مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ فلورنس کی حکومت جو اس طرح پر قائم ہوئی تھی اس کا تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم حاوی و غالب گوئلف فریق اور تجارتوں یا صنعتوں کے انتظام کا بھی اندازہ نہ کریں۔

ان میں سے اول الذکر کی کیفیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں چھ سرداران فریق گوئلف مقرر کئے گئے تھے اور ان کے ساتھ بھی خاص و عام مجلسیں تھیں اور ان کا کام یہ تھا کہ حامیان شہنشاہ کی جائدادوں کی ضبطی سے حامی پوپ فریق کو جو سرمایہ حاصل ہو گیا تھا اس کا انتظام کریں۔ یہ لوگ بتدریج بعض امرا کے لئے باقاعدہ حکومت کے عضو ہو گئے، اور یہ تو فرض کر لیا گیا تھا کہ حامی پوپ فریق ہمیشہ برسر اقتدار رہے گا۔ باقاعدہ حکومت کے اندر فریقانہ تنظیم کا اس طرح داخل کیا جانا آخری دور ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی دستور کا ایک ایسا قابل لحاظ وصف ہے جس کی تقلید زمانۂ جدید کی کسی مملکت نے ابتک نہیں کی ہے، مثلاً انگلستان میں ۱۷۱۵ء سے ۱۷۶۱ء تک یہ ایک مسلمہ عقیدہ تھا کہ وھگ فریق ہمیشہ برسر اقتدار رہے گا، مگر دستور مملکت نے کسی نوعیت سے وھگ فریق کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ فلورنس کے فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے ابھی ابھی یہ بیان کر چکا ہوں کہ گوئلف اور گبلین جماعت کی کشمکش امرا اور عوام کی کشمکش سے کلیۃً مماثل نہیں تھی، اگرچہ دونوں کی بعض کارروائیوں میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ امرا کے قدیم خاندان تقریباً سب گبلین تھے اور گوئلف فریق کی قوت اہل صنعت کی تائید پر منحصر تھی مگر امرا میں جس طرح گبلین تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ فن میں شہرت حاصل کرنے لگے۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، خود سری حکومت کے لئے یہ ایک بار وسیع بن گیا۔

ویسے ہی گوئلف بھی تھے اور درحقیقت فریق گوئلف کے چھ قائدوں میں سے تین قائم امرائیں سے اور تین عوام میں سے ہوتے تھے۔ بعد میں ان کا خود ایک محل بن گیا، اور جیساکہ میں کہہ چکا ہوں انھیں بعض سرکاری فرائض بھی تفویض ہو گئے جن میں سے خاص فرض گبلین گروہ کی دار و گیر کا تھا، اور جیساکہ ہم دیکھیں گے بعد میں اس فرض کو حکومت کی نوعیت کے تعین میں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو گئی۔

۴۔ مگر تجارتوں اور صنعتوں کی تنظیم اور بھی زیادہ اہم ہے درحقیقت یہی وہ محور تھا جس پر ۱۲۶۷ء کا دستور چکر لگاتا تھا، اور چونکہ یہی تنظیم اور شہر کی حکومت میں اس کی نمایندگی وہ شے ہے جس سے شہروں کی ازمنۂ وسطی کی ساخت و کیفیت اول اول صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے اس لئے میں اس پر ذرا زیادہ وسعت کے ساتھ بحث کرونگا۔

حرفتی انجمنیں جنھیں اطالیہ میں آرتی Arti کہتے تھے ان کی ابتدا جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، رومانی زمانہ تک پہنچتی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ فلورنس میں ان کی کارگر تنظیم ابتدائی زمانے میں ہو چکی تھی۔ ۱۲۶۶-۶۷ء میں جو کچھ ہوا وہ غالباً اتنا ہی تھا کہ جو نظام مدت دراز سے قائم اور موثر طور پر زیر عمل تھا اسے قانوناً تسلیم کر لیا جائے، اور شاید یہ کہ اس میں نسبتاً زیادہ استقامت و نظم پیدا کر دیا جائے، اور جدید حکومتی ہیئت میں ان مرکزی تنظیمات کو باضابطہ طور پر کوئی اہم جگہ دیدی جائے، خواہ وہ جگہ تحتانی ہی جگہ کیوں نہو۔ ان تجارتی انجمنوں کے نمائندے خاص حکمران اعضا اپنے عہدے کے اعتبار سے قائد عوام کی مجلس خاص و مجلس عام دونوں میں نشست کرتے تھے۔

جو فنون اس طرح تسلیم کئے جاتے تھے، ان کی تعداد سات تھی، اور انھیں "فنون اعلیٰ" کہتے تھے۔ ان میں ایک فن کے اشخاص یعنی "جج اور مختار" دوسروں سے علیحدہ تھے، کیونکہ نظر اول میں ان لوگوں کا کام تجارتی کام نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اچھے ججوں اور مختاروں کے تقرر کو اطالیہ میں بہت اہم معاملہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ تجارتی خوش حالی، تجارتی تنازعات کے فیصلے شخصیہ کے قوانین کی ترتیب، نظر ثانی و نفاذ اور معاہدات کی تحریر وغیرہ سب انھیں لوگوں پر منحصر تھی۔ دوسرے چند فنون وہ تھے جو فلورنس کی غیر ملکی تجارت کی ممتاز شاخوں کی نمایندگی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سب سے اول جگہ غیر ملکی کپڑوں کو نفیس بنانے اور رنگنے Arti Di calimala

اور خانہ ساز کپڑوں کے لین دین Arti della Lana کو حاصل تھی چونکہ اطالیہ کی اُون اول اول ناقص تھی، اور اطالیوں کا ذوق طبیعت بلند تھا اس لئے کپڑوں کو نفیس بنانے اور رنگسازی کے فن کو سب سے پہلے خوشحالی حاصل ہو گئی تھی۔ بعد میں جب خود اطالیہ میں خام مال کو ترقی دینے کی کوششیں کامیاب ہو گئیں تو خانہ ساز اُون کے مصنوعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، ان دونوں کے ساتھ ہی ساتھ ساہوکاروں اور صرافوں Arti del cambio کو بھی اول درجہ حاصل تھا اس کے بعد ریشم کے کاروبار کرنے والوں Arti della seta کا درجہ تھا جسے بعد میں زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد طبیبوں Medici کا درجہ تھا، جو پہلی نظر میں تجارتی طبقہ کی بہ نسبت زیادہ تر پیشہ ور طبقہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طبیب طبی مشورہ دینے کے ساتھ ہی ساتھ ادویات وغیرہ کا کاروبار بھی کرتے تھے، اور گرم مصالحہ بیچنے والوں Speziali کے ساتھ مل کر یہ مشرقی تجارت کی ایک ایسی شاخ کی نمائندگی کرتے تھے جسے غیر اہم نہیں کہہ سکتے اس فہرست کا خاتمہ سمور کے کاروبار کرنے والوں پر ختم ہوتا ہے۔

ان میں سے متعدد انجمنیں ایسی تھیں جن میں اس وقت کئی کئی متعلقہ شاخیں داخل تھیں، اور یہی انجمنیں یکجا طور پر شہر کی حرفتی آبادی کے طبعی سرگروہ کی حیثیت سے پیش پیش تھیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت میں ادنےٰ درجہ کی حرفتیں انھیں کو اپنا سرگروہ سمجھتی تھیں مگر ان ادنےٰ درجہ کی حرفتوں نے دوسری نسل کے دوران میں اپنے لئے قانونی تنظیم پیدا کرلی، اور اس کے بعد سیاسی اعتراف حاصل کرلیا، ان اہل حرفہ کے قانون سے یہ فرق صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے، ان کے نام حسب ذیل تھے بزاز، موچی، بقال، قصاب، کلال، سرادار، زین ساز، دباغ، زرہ و قفل ساز، معمار، نجار، طباخ وغیرہ وغیرہ یہ پست تر فنون تقریباً سب کے سب اندرون ملک ہی میں اشیا و خدمات کے تبادلہ سے متعلق تھے، اور اس لئے فنون اعلیٰ کے مقابلے میں ان کے کاروباری اغراض کا حلقہ زیادہ محدود تھا، فنون اعلیٰ کے لوگ ان تجارتوں میں مشغول تھے، جن کی وسعت مغرب سے مشرق تک پھیلی ہوئی تھی، اور اس لئے وہ بالطبع شہر کے خارجی سیاسی تعلقات سے واقف ہو گئے تھے، اور ان تعلقات سے انھیں گہرا تعلق ہو گیا تھا، اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایک بڑی حد تک وہ ان تعلقات کو تجارتی اصول کے مطابق چلاتے تھے

ان فنون کی تنظیم کا تصور قائم کرنے کے لئے میں ان میں سے اسی فن کو لیتا ہوں جسے اس زمانے میں مقدم حیثیت حاصل تھی یعنی کپڑوں کو نفیس بنانے اور انھیں رنگنے کا فن Arti della calimela ہر چھٹے مہینے انبار خانوں اور دکانوں کے سرگروہ یکجا ہو کر اپنی پسند سے انتخاب کنندگان کا تقرر کرتے تھے۔ یہ انتخاب کنندے چار قنصل منتخب کرتے تھے جو اس حرفت پر حکمراں ہوتے تھے، اور ان کی مدد کے لئے ایک چانسلر، ایک مختار بارہ شخصوں کی ایک خاص مجلس اور ایک اس سے کسی قدر بڑی عام مجلس ہوا کرتی تھی (مختار کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ قوانین کے لفظ بلفظ عملدرآمد پر نظر رکھتا تھا۔ اور اکثر جلسوں میں قنصلوں کی جانب سے تقریریں بھی کیا کرتا تھا) قنصل دکانوں اور انبار خانوں کا معائنہ کرتے۔ اور آمیزش مال کی خرابی، وزن کی کمی، حساب کتاب کی لاپروائی کے لئے جرمانہ کی سزا دیتے تھے اور آخری چارہ کار کے طور پر ایسے اشخاص کو اہل حرفہ کے زمرے سے خارج کر دیتے تھے[1]۔ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ۱۲۶۷ء میں سات اعلےٰ فنون کے قناصل باضابطہ طور پر قائد عوام کی مجلس خاص میں شامل کر لئے گئے تھے جسے سرگروہان اہل حرفہ Capetudim delle کہتے تھے۔

۵۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ جس عجیب و پیچیدہ دستور کی تفصیل ابھی ابھی بیان کی گئی ہے اس میں امرا کا حصّہ کم ہی کم تھا، اور اس کی مجلسوں میں اہل حرفہ کے سرگروہوں کی اہمیت بلاشک وشبہہ بہت بڑھی ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے بھی چھوٹے اور بڑے اہل حرفہ بمنزلہ قوم کے تھے لیکن پندرہ برس بعد جب ۱۲۸۲ء میں خاص عاملانہ حکومت چھ اکابر Priori کے ہاتھ میں دیدی گئی جن کا انتخاب دو دو مہینے کے لئے ہوتا تھا، اور چھ اعلےٰ فنون کے ہر فن میں سے ایک شخص لیا جانے لگا تو ان کا غلبہ نمایاں طور پر بڑھ گیا۔ ساتویں حرفہ کے لوگ (یعنی جج اور مختار) اس وجہ سے ساقط کر دئے گئے تھے کہ ان کو اپنے پیشہ کی نوعیت ہی کی وجہ سے کافی سیاسی اثر حاصل تھا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) مختار ہر حرفہ میں ایک اہم عہدہ دار ہوتا تھا۔ پس اس طرح سب سے

---

[1] بیرون ملک میں بھی ان کے قناصل ہوتے تھے جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اس حرفہ کے ارکان کے مقاصد پر نظر رکھیں۔ زمانۂ جدید میں قنصلوں کے تقرر کا انتظام سلسلہ بسلسلہ یہیں سے آیا ہے۔

بڑے عاملانہ عہدے پر پہونچنا ان منظم تجارتوں میں سے کسی ایک نہ ایک تجارت کے رکن ہونے پر منحصر ہو گیا، جن امرا کو انتخاب کی خواہش ہوتی تھی وہ ان چھ حرفوں میں سے کسی ایک نہ ایک حرفے میں اپنا نام درج کرا لیتے تھے۔

پس اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حرفتی عدیدیت باضابطہ قائم ہو گئی تھی مگر اسوقت تک یہ ایک فطری عدیدیت تھی۔ اس وقت تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اعلےٰ حرفتوں کے ارکان کے متعلق کسی قسم کی تخلیت کی شکایت پائی جاتی ہو۔ وہ قوم کے طبعی سرگردہ تھے، اور تیرھویں صدی میں تمام چھوٹی بڑی حرفتیں بظاہر امرا کے خلاف بدستور متحد معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی حالت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی انگلستان میں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں قوانین غلہ کے خلاف جد و جہد میں شہری سرمایہ دار اور اہل حرفہ ذی املاک امرا کی مخالفت میں متحد ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار گیارہ برس سے تیرہ برس بعد تک ۱۲۹۳ء سے ۱۲۹۵ء تک میں ہوا، جبکہ امرا کا تختہ اور بھی الٹ گیا، اور فلورنس کے نہایت معزز خاندان اکابر کے عہدے کے ناقابل قرار دیدئے گئے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہ اکابر بارہ حرفتوں کے صدروں اور دیگر عقلمند اور نیک چلن اہل حرفہ" کے ذریعہ سے منتخب ہوتے تھے۔ درحقیقت اس وقت کی عموما نہ تحریک میں بعض چھوٹے درجے کی حرفتوں نے بھی بظاہر نہایت اہم دخل حاصل کر لیا تھا، اور چھوٹے بڑے اکیسوں حرفتوں نے ملکر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس زمانے کی نہایت ہی نمایاں جدت "احکام انصاف" کو جن سے بالتخصیص امرا کے خلاف کام لینا مقصود تھا، برقرار رکھیں گی۔ میں اس پر ایک لمحہ کے لئے توقف کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے نہایت ہی نمایاں طور پر ان اطالوی شہروں کے مشکلات کا اظہار ہوتا ہے جو امرا کو حفظ قانون و نظم ملک کا پابند بنانے کے ابتدائی مرحلہ کی تکمیل میں سرگرداں تھے، اور ادھر ان امرا کی حالت یہ تھی کہ یورپی تہذیب کے میدان کے عین وسط میں تیرھویں صدی کے آخر تک اتنی کچھ تہذیب و شائستگی پھیل جانے پر بھی ہنوز ویسی ہی کندۂ ناتراش تھے۔

فلورنس میں حرفتی عنصر نے خصوصیت کے ساتھ حقیقی کامل و مرفہ الحال نشو و نما حاصل کر لیا تھا، تقریباً تیس برس تک اسے سیاسی فوقیت بھی میسر رہی تھی، جس کی طمانیت ۱۲۶۷ء میں ہوئی، اور ۱۲۸۲ء میں اس میں اور اضافہ ہوا۔ پودستا اور قائد عوام وہاں موجود تھے،

اپنی ذات کی حفاظت کے لئے حرفتی عنصر کو منظم کرنے کی ہر طرح کی کوششیں عمل میں آچکی تھیں، مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہاں بھی یہ صاف نظر آرہا ہے کہ امرا اپنی دولت اپنے امتیاز خاص اپنے خاندانی روابط اور اپنے حشم خدم کی وجہ سے اس قابل بنے ہوئے تھے کہ قانون کے علی الرغم ایسی کارروائیاں کرتے رہیں جو پرامن شہریوں کے لئے ناقابل برداشت ہوجائیں، وہ گواہوں کو ڈراتے دھمکاتے اگرفتار شدہ مجرموں کو چھوڑا لیجاتے اور اسطرح اپنی عادتی زیادتیوں کے لئے فی الواقع سزا سے بالکل مامون تھے، اس کا خاتمہ کرنے کے لئے یہ نئے احکام بنائے گئے تھے اور ان کو عمل میں لانے کے لئے ایک نئی کل بھی تیار کی گئی تھی۔

ان احکام کی اہم خصوصیات حسب ذیل تھے، (۱) خاندانی رشتہ جو بے ضابطگیوں کی پشتی بانی کر رہا تھا، اسی کو قانون شکنی کے دبانے کا ایک ذریعہ بنایا گیا۔ اگر کسی امیر خاندان کے کسی رکن سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو اس کے رشتہ دار اس کے ذمہ دار بنائے جاتے، (امیر خاندان سے مراد وہ خاندان تھے جن کے ارکان میں مبارز شامل ہوں) یہ بھی حکم دیا گیا کہ پندرہ برس سے ستر برس تک کی عمر کے تمام امرا سالانہ پودستا کے سامنے حاضر ہوا کریں، اور اپنی نیک چلنی کی ضمانت دیا کریں۔ چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کے لئے ضامن کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ اس کی تلافی مجرم کے مال و اسباب سے کر لیتا تھا، اگر کسی عام آدمی کو کوئی امیر مار ڈالتا یا مہلک طور پر زخمی کر دیتا تو پودستا کا یہ فرض تھا کہ مجرم کا سر اڑا دے، اس کے مکانات ڈھا دے، اور اس کا مال و اسباب ضبط کر لے،

(۲) مگر سب سے زیادہ تعجب خیز کارروائی ان زیادتیوں کے گواہ فراہم کرنے کی دشواری کو رفع کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھی یہ حکم دیدیا گیا تھا کہ کسی امیر کے خلاف جرم کے ثابت کرنے کے لئے عام افواہ (جس کی تصدیق دو[1] ثقہ گواہ کر دیں) کافی ہے۔ اس قاعدے کی تائید کرنا دشوار ہے مگر تدارک کی اس سختی سے بدنظمی کی شدت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس قاعدے کا نفاذ اس شرط کے ساتھ محدود تھا کہ اگر عوام امرا کے مناقشات میں شرکت کریں گے تو پھر یہ غیر معمولی احکام قابل نفاذ نہ ہوں گے۔

---

[1] بعد میں اس کی تعداد تین کر دی گئی۔

نئی کل یہ تھی کہ ایک عملدار انصاف مقرر کیا گیا، ایک ہزار مسلح عوام اس کے تابع حکم ہوتے تھے، اور بعد میں ان کی تعداد چار ہزار تک بڑھادی گئی تھی، ان عوام کا فرض یہ تھا کہ بوقت طلب یا ہنگامے کے موقع پر سینیوریا کے محل (ایوان حکومت) کے گرد جمع ہوجائیں۔ عملدار کا کام یہ تھا کہ وہ پودستا کے احکام کی تعمیل میں اس کی تائید کرے یا اگر پودستا اور "قائد عوام" اپنے ادائے فرض میں کوتاہی کریں تو وہ خود ان کے عوض کام کرے۔ عملدار اور چھ اکابر سے مل کر سینوریا یعنی "حکومت عاملانہ" بنی تھی۔ اور آخر میں یہی عملدار اس حکومت کا خاص رکن ہوگیا اس کا انتخاب بھی اکابر کی طرح سالانہ ہوتا تھا، اور یہ انتخاب بارہ فنون اور دوسرے اہل حرفہ کے صدر کیا کرتے تھے جو شہر کے مختلف حصوں سے لئے جاتے تھے صرف حرفتوں کے ارکان اس عہدے کے قابل تھے، اور امرا اس سے خارج رکھے گئے تھے خواہ وہ کمپنی میں اپنا نام ہی کیوں نہ درج کرالیں۔

ان درشت احکام سے بھی مقصد فوراً ہی حاصل نہ ہوا، نصف صدی تک امرا ان احکام کے خلاف جد وجہد کرتے رہے، اور چودھویں صدی کے آغاز میں "ابیض" و "اسود" کے درمیان جو تنازعہ ہوا اس میں امرا بالکل قدیم طرز پر لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر قوم ان احکام پر ثابت قدم رہی اور ضرور ہے کہ ان سے کوئی معتد بہ نتیجہ نکلا ہوگا۔ یہ احکام اس قدر اہم ثابت ہوئے کہ ۱۳۳۸ء میں روما نے بھی فلورنس سے اس قانون کی ایک نقل کی خواہش کی۔

۴- اسی دوران میں ۱۳۲۳ء میں عمال کے انتخاب کے طریقے میں ایک ایسا اہم تغیر واقع ہوا جو ان طلبہ کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے جو ازمنہ وسطیٰ کے اطالوی نظم دستوری کا قدیم یونانی نظم دستوری سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، یعنی کسی حد تک قرعہ اندازی کا رواج ہوگیا تھا۔ اس وقت تک اکابر (Priori) اگرچہ ہر دوسرے مہینے بدل جاتے تھے لیکن ان کا انتخاب چھ مہینے کے لئے ہوا کرتا تھا، مگر اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ انتخابات کی بہت کثرت ہوجاتی تھی اور پھر اس پر سازشیں مستزاد، اس لئے یہ قرار پایا کہ یکدم سے تمام اکابر کا انتخاب بیالیس مہینہ قبل سے کر دیا جایا کرے یعنی اکیس تغیرات کے لئے ایک ہی مرتبہ انتخاب ہوجایا کرے اور اس کے بعد دو ماہہ میعادوں کے لئے تقدم و تاخر کا تعین قرعہ کے ذریعہ سے ہوا کرے اور جب تک یہ کل تعداد ختم نہ ہوجائے اس وقت تک کوئی شخص دوبارہ منتخب نہ ہوسکے عموی نقطۂ نظر سے اس میں

یہ بھی فائدہ تھا کہ اس طرح اس عہدے کا دروازہ زیادہ تعداد کے لئے کھل جاتا تھا ساڑھے تین برس کے اندر اکابر کے عہدے پر فی الواقع ۲۶ مختلف اشخاص لازماً فائز ہو چکیں گے، اور ہر شخص یہ خیال کرسکتا ہے کہ یہ تعداد بہر نوع ان اشخاص کی تعداد کا ایک معتد بہ جزو تھی جنہیں ان کے عمال اس عہدے کے قابل سمجھ سکتے تھے؛ اور چونکہ اس طریقہ کو تمام ناظموں (مجسٹریٹوں) کے عہدے پر بھی حاوی کردیا گیا تھا (جن کی تعداد سسمونڈی کے اندازے کے مطابق ۱۳۶ تھی) اس لئے یہ امر تقریباً متیقن معلوم ہوتا ہے کہ فلورنس کے ہر ایک موقر شہری کو کوئی نہ کوئی عہدہ ملجاتا رہا ہوگا، بشرطیکہ وہ سرکاری کاموں میں وقت صرف کرسکتا ہو، کیونکہ کسی عہدے کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا بجز ان عہدوں کے جو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھے۔ سسمونڈی اس بیان پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ اطالیہ کے تقریباً تمام آزاد شہروں نے فلورنس والوں کی اس جدت کے اختیار کرنے کی طرف سبقت کی علہ، اور وہ کہتا ہے، کہ یہ عملدرآمد انیسویں صدی کے اوائل میں لوکا اور ٹسکنی کی ریاستہائے کلیسا کے بلدیات میں بدستور جاری تھا۔

حکام کی تعداد کا تصور کرتے ہوئے ہمیں دل میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ چودھویں صدی کے نصف اول میں فلورنس ایک بہت بڑا شہر ہوگیا تھا؛ سسمونڈی کا اندازہ یہ ہے کہ سنہ ۱۳۴۰ء میں اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ نفوس کی تھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگرچہ طریق انتخاب کا مذکورۂ بالا تغیر اس اعتبار سے عمومی ہے کہ نسبتاً زیادہ آدمیوں کے لئے حصول عہدہ کے مواقع پیدا ہوگئے تھے مگر جن لوگوں کو ان کے انتخاب کا حق حاصل تھا وہ اب بھی معدودے چند افراد رہتے تھے؛ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو نام قرعے کے ذریعہ سے نکالے جاتے ہیں ان کا انتخاب عام شہریوں کی جانب سے نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی بہت تفصیلی تجویزیں اس امر کی اختیار کی گئی تھیں کہ کوئی شہری جو واقعی قابل انتخاب ہو وہ انتخاب سے رہ نہ جائے۔ سنہ ۱۳۲۸ء میں جب ڈیوک کالابریا کے انتقال کے بعد (جو تین برس تک فلورنس کی امارت پر فائز رہا تھا، علہ) سخت کوشش اس امر کی کی گئی کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت کو وسیع

علہ۔ "تاریخ جمہوریات اطالیہ" جلد پنجم باب سی ام۔

علہ۔ یہاں برسبیل تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کرسکتا ہوں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ میں جمہوری خود مختاری کے قائم رکھنے میں جیسی تعجب خیز دشواریاں درپیش تھیں ان کا اظہار اس سے بہتر کسی امر سے نہیں ہوسکتا

بنیاد پر قائم کیا جائے بشرطیکہ اختیار گوئلف فریق ہی کے ہاتھ میں رہے، اس وقت اکابر اور علمداروں کے انتخاب میں جو کارروائی اختیار کی گئی اگر میں اسے بیان کرنے میں، اس وقائع نگار کے نقش قدم پر چلوں تو فلورنس کی چودھویں صدی کے دستور کی خصوصیت سودمند طور پر واضح ہو جائے گی۔ یہ طریقہ حسب ذیل تھا (۱) اکابر جن کے ساتھ شہر کے ہر محلے سے دو عوام بھی شامل کئے جاتے تھے۔ گوئلف فریق میں سے تیس برس سے زائد عمر کے غیر امرا شہریوں میں سے چند ایسے شخصوں کا انتخاب کرتے تھے جن میں اکابر بننے کے شرائط پائے جاتے تھے (۲) کمپنیوں کے سردار بھی جن کے ساتھ ہر کمپنی سے دو عام شخص شامل کئے جاتے تھے ایسا ہی کرتے تھے مگر اتنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ فریقانہ تنظیم اور حرفتی تنظیم کو بھی اس انتخاب میں مدد دینا پڑتی تھی، اس لئے (۳) گلف (حامی پوپ) فریق کے سرگردہ بھی بشمول مجلس ایک فہرست تیار کرتے تھے، اور (۴) علیٰ ہذا پانچ عہدہ داران تجارت بھی اعلےٰ صنعتوں کے دو قنصلوں کے ساتھ ملکر فہرست مرتب کرتے تھے، یہ صورت بالکل ایسی ہی ہوتی اگر انگلستان میں یہ روش اختیار کی جائے کہ لبرل فریق ہمیشہ برسر اقتدار رہے جسطرح جارج اوّل اور جارج دوم کے وقت وہگوں کو ہمیشہ اقتدار حاصل رہا تھا) اور وزارت کا انتخاب اس طرح پر ہو کہ کابینہ نیشنل لبرل فڈریشن (قومی وفاقیہ احرار) اور سربرآوردہ اتحادات مزدوراں کے وکلا کی مدد سے وزارت کا انتخاب کیا کرے۔

جب فہرستیں تیار ہو جاتیں تو آئندہ دو برس کے لئے اکابر کے عہدے کے قابل اشخاص کا آخری تعین کسی قدر مختلف الترتیب اشخاص کی جماعت کی خفیہ رائے دہی سے عمل میں آتا، اس جماعت میں حسب ذیل افراد شامل تھے "اکابر اور بارہ اشخاص نیک" جن سے اکابر اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے" انیس علمداران (سرداران) کمپنی بارہ اعلیٰ فنون میں سے ہر ایک کے دو دو قنصل ، اور چھتیس وہ اشخاص جنہیں اکابر اور "اشخاص نیک" نے شہر کے چھ محلوں میں سے چھ شخص فی محلہ کے حساب سے مقرر کیا ہو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کہ جمہوریت کے سربرآوردہ حامی فلورنس کو بھی مجبور ہو کر گاہ بگاہ عارضی طور پر غیر ملکی امرا کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اس قسم کے امرا بلدی حکومت خود اختیاری کے حقوق کو بخوبی محفوظ رکھ کر قبول کئے جاتے تھے، پھر بھی ان کا قبول کیا جانا فی نفسہ ایک تعجب انگیز امر ہے۔

پسندیدگی کے لیئے اڑسٹھ رایوں کی ضرورت تھی، اس کے بعد ان پسند شدہ اشخاص کے نام تھیلیوں میں رکھے جاتے تھے، شہر کے ہر محلہ کے لیئے ایک تھیلی ہوتی تھی، اور ہر دوسرے مہینے ہر تھیلی میں سے ایک ایک نام قرعہ کے ذریعہ سے نکالا جاتا تھا، ان میں سے جن جن اشخاص کا نام نکل آتا تھا وہ آئندہ دو مہینے کے لیئے اکابر کا عہدہ پر کرتے تھے مگر اسمیں شرط یہ تھی کہ ایک ہی شخص دو برس کے اندر (دوبارہ) اکابر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ایک ہی خاندان کے دو رکن چھ مہینے کے اندر یہ عہدہ حاصل کر سکتے تھے نہ دو بھائی یا باپ اور بیٹا ایک سال کے اندر اس پر فائز ہو سکتے تھے علمدار اور بارہ "اشخاص نیک" بھی اسی قسم کی فہرستوں سے منتخب ہوتے تھے اور ہر ایک حرفت اپنے قنفسل بھی اسی طریق پر منتخب کرتی تھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اسی (۱۳۲۲ء کے) زمانہ میں مذکورۂ بالا پیچیدہ نظم مجالس دو مجلسوں تک محدود کر دیا گیا تھا، "ایک مجلس عمومی" تھی جو کو ٹلف فریق کے عوام میں سے تین سو اشخاص پر مشتمل تھی اور دوسری "مجلس کمیون" تھی جس میں امرا اور عوام کے ڈھائی سو پسند شدہ اشخاص شامل تھے مقصد یہ تھا کہ مملکت کے تمام اعلےٰ اغراض و مقاصد کی کسی نہ کسی طرح پر نمایندگی ہو جائے، تا آنکہ "مجلس کمیون" میں امرا کو بھی نمایندگی عطا کی گئی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ فریقانہ ظلم و تعدی کے خلاف انھیں قرار واقعی تحفظ حاصل ہو سکے۔

۷۔ مگر ان پر شور و شر زمانوں میں سیاسی دستوروں کی مدت قیام بہت تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ اعلےٰ فنون جو تجارتی عنصر کی نمایندگی کرتے تھے اور ادنیٰ فنون جن میں اہل حرفہ کا عنصر شامل تھا، ان دونوں کے درمیان اتحاد خیال کم ہوتا جاتا تھا، اور ایک طرف امرا اور سر برآوردہ عوام اور دوسری طرف زیادہ متمول عوام اور معمولی اہل حرفہ کے دہرے دہرے مناقشے سے مطلق العنانی کو غلبہ کا موقع میسر آتا جاتا تھا، اور شمالی اٹلی کے شہر تو پہلے ہی عام طور پر اس مطلق العنانی کے قدموں کے نیچے آ چکے تھے ستمبر ۱۳۴۲ء میں جب والٹر ڈی برین (ڈیوک ایتھنز) عارضی طور پر شہر کا مالک بن گیا تو یہ قدیم امرا اور ادنیٰ طبقہ کے اہل حرفہ ہی کا اتحاد باہمی تھا جس نے ایک بے ترتیب پارلیمنٹ کے اندر اس کے لیئے شہر کا آقائے مادام الحیات ہونے کا آوازہ بلند کر دیا۔ مگر آئندہ جولائی میں فلورنس کو اس مطلق العنانی سے آزادی دلانے کے لیئے تمام طبقات متفق ہو گئے۔ اس اتحاد کو قائم رکھنے کے لیئے تھوڑی دیر کے لیئے یہ کوشش کی گئی، کہ امرا کو بھی

عہدوں میں شریک کرلیا جائے، اور ان کے خلاف احکام عارضی طور پر معلق کردئے گئے، مگر بقول وقائع نگار[1] مذکور بنی نوع انسان کے دشمن نے امرا کے غرور و تمرد کو متحرک کردیا۔ عوام ان کی زیادتیوں سے برافروختہ ہو گئے، اور ان کو اعلیٰ عہدے سے خارج کردیا۔ ایک مختصر سی مسلح کشمکش ہوئی اور (۱۳۴۳ء میں) امرا ہمیشہ کے لئے دب گئے۔ اسکے بعد قدیم امرا نے بہ حیثیت ایک طبقے کے پھر کبھی مقابلے کے لئے سر نہیں اٹھایا، احکام متذکرۂ بالا دائمی طور پر جاری کردئے گئے، اگرچہ اب کے زیادہ منصفانہ صورت میں جاری ہوئے کسی امیر مجرم کے لئے رشتہ داروں کی ذمہ داری اس کے قریب ترین اقربا تک محدود کردی گئی۔ نیز امرا کا مفہوم بھی بدل گیا، بعض جرائم کے لئے عوام بھی امرا کے مفہوم میں قرار دیدیئے گئے یعنی ان کے اہل خاندان و رشتہ دار بھی اس وقت تک شریک جرم سمجھے جاتے تھے جبتک کہ وہ اس مجرم کو انصاف کے لئے حوالہ نہ کردیں۔ دوسری طرف امرا کے چند قدیم خاندان اور کچھ افراد مراعات کے طور پر عام فیصلے سے عوام میں داخل کردیئے گئے۔

مختلف ناموں کے ساتھ اسی قسم کی کارروائی امرا شکنی کی دوسری آزاد جمہوریت سی ریناپستوریا، لوکا نے بھی اختیار کی اور جو شہر آزاد رہے ان میں بھی عام طور پر یہ ہوا کہ طبقۂ امرا تمام حاکمانہ عہدے سے خارج کردیا گیا، اور ایک سے زاید شہروں میں فلورنس کے مانند امرا کی ایک فہرست اندراج کھول دی گئی، جس میں بطور سزا کے ان لوگوں کے نام درج کئے جاتے تھے جو امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے جن ادارات کا ہمیں علم ہے ان میں سے یہ ایک نہایت ہی عجیب ادارہ ہے۔

اب پھر فلورنس کی طرف پلٹ کر دیکھئے۔ جب انجام کار ہیں قدیم امرا کی طاقت زائل ہوگئی تو سوال یہ باقی رہ گیا کہ ایک خاص حرفتی حکومت کے اندر ذیلیبی عدیدیوں اور ان اہل حرفہ کے درمیان جو چھوٹے چھوٹے پیشوں میں منضبط ہو گئے تھے، اختیارات کی تقسیم کیونکر عمل میں آئے ۱۳۴۲ء کے بعد پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا موخرالذکر غالب آجائیں گے۔ ۱۳۲۸ء اور ۱۳۴۳ء کے مابین خاصکر ۱۳۴۲ء و ۱۳۴۳ء کے پرآشوب زمانے میں عمومیت کی جانب بہت زیادہ توجہ مبذول کی گئی،

[1] جیووانی ویلانی، جلد ۱۲ باب ۱۹۔

چنانچہ وقائع نگار نے لکھا ہے کہ امرا پر فتح حاصل کر کے عوام (اور خاصکر طبقۂ متوسط اور چھوٹے درجہ کے اہل حرفہ) بہت بلند منزلت اور جرأت و اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے تھے[1]۔ فی الجملہ شہر کی حکومت اکیس فنون کے ارباب عاملانہ کے ہاتھوں جا رہی۔ چھ ضلعوں، (حلقوں) کی قدیم تقسیم از کار رفتہ ہو چکی تھی۔ لہٰذا شہر اب چار محلوں میں تقسیم کیا گیا اور اکابر کی تعداد چھ سے بڑھا کر آٹھ کر دی گئی یعنی ہر محلہ سے دو شخص اور انھیں لوگوں سے بشمول علمدار انصاف (جو اب حکومت کا صدر سمجھا جاتا تھا) نو شخصوں کی حکومت عاملانہ بنتی تھی۔ یہ انتظام کر دیا گیا کہ ان نو اشخاص میں سے تین شخص نیچے درجہ کی حرفتوں میں سے لئے جائیں گے۔ وقائع نگار نے آگے چلکر لکھا ہے کہ بہ حیثیت ایک امر واقعہ کے اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ان نیچے درجہ والوں کو اس نسبت سے زائد جگہیں ملگئیں خاصکر اس وجہ سے کہ ایک ہی خاندان کے دو شخصوں کے چھ ماہ کے اندر اکابر منتخب ہونے کی ممانعت کا اثر قدیم خاندانوں پر زیادہ سخت پڑتا تھا کیونکہ ان کا سلسلۂ قرابت دور تک معلوم تھا، نئے لوگوں پر اتنا اثر نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ اپنے یکجدی لوگوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔

۸۔ مگر جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ عدیدیت بالعموم بڑی مشکل سے زائل ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ جب یہ معلوم ہوا کہ ذلیل و جاہل اشخاص نے اکابر کے عہدے حاصل کر لئے ہیں[2] تو عملاً عدیدیت کی جانب رجعت شروع ہو گئی اور اس کا نفاذ ذرا خاص طریقے سے ہوا۔ میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ کیوں کر عادی و غالب گوئلف فریق ایک گوئلف سوسائٹی (انجمن) کے طور پر منظم کیا گیا تھا جس میں مجلس و قائدین ہوتے تھے۔ اور کس طرح بعد کے زمانہ میں اس فریق کے قائدین ان قابل انتخاب شہریوں کی فہرست کے مرتب کرنے میں حصہ لینے لگے جن میں سے بذریعۂ قرعہ اندازی کے حکام کا انتخاب ہوتا تھا مشتبہ شہنشاہی پسندوں پر مقدمہ چلانے کے لئے بھی ان میں ایک عہدہ دار ہوتا تھا، اور ان کے اثر کی وجہ سے گبلین تین ربع صدی تک (یعنی ۱۲۶۶ء سے ۱۳۴۳ء تک) عملاً عہدوں سے خارج رکھے گئے تھے لیکن ۱۲۴۳ء کے تغیر کے بعد یہ یقین کیا جاتا تھا یا بہ تصنع ایسا ظاہر

[1] ۔ ویلانی جلد ۱۲، باب ۲۲۔

[2] ۔ ہیلم (از منۂ وسطی)، باب سوم حصۂ دوم صفحہ ۴۲۹۔

کیا جاتا تھا کہ قابل انتخاب اشخاص کی پسندیدگی میں ڈھیل دینے سے گبلین عہدوں پر فائز ہوگئے ہیں اور اس مردود عام جماعت کے مخالف جوش کے پردہ میں گوئلف سوسائٹی نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ بیس برس تک اختیارات اس کے ہاتھ میں رہے، اس سوسائٹی میں ایسے قدیم امرا کا معقول اثر تھا، جو گوئلف تھے اور جس طرح قدیم روما میں ہوا کم وبیش اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ سربرآوردہ دولتمند عوام سے ملکر انھوں نے ایک نیا گروہ بنالیا جس کا میلان عدیدیت کی طرف تھا، انھوں نے ایک قانون یہ منظور کرالیا کہ جو گبلین کسی عہدہ پر قابض ہوگا وہ جان ومال کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی گلف سوسائٹی کے سرگروہوں کو یہ حق بھی دیدیا گیا کہ مشکوک گبلین کو "متنبہ" کرسکیں گبلین مسلک کی اس غلط تعبیر سے ان لوگوں نے ۱۳۵۵ء سے ۱۳۷۸ء تک یہ انتظام قائم رکھا کہ نہ صرف گبلین فریق کو عہدوں سے خارج کردیں بلکہ ہر اس شخص کا عہدہ چھین لیں جو حکمراں گروہ کا مخالف ہو۔

اس سے بددلی پیدا ہوئی اور وہ منجر ہوئی اس انقلاب کی طرف جو غالباً فلورنس کا سب سے زیادہ مشہور انقلاب ہے یعنی ۱۳۷۸ء کا چیومپی فریق کا انقلاب جس میں دہری تاریخی دلچسپی ہے۔ کیونکہ (۱) فلورنس میں عمومی تحریک کی یہ انتہائی حد تھی اور (۲) یہی پہلا موقع تھا کہ یہ تحریک باقاعدہ منضبط شدہ تجارتوں اور حرفتوں کی حد سے گزر کر عارضی طور پر حکومت میں عوام کے ایک اور زیادہ پست طبقہ کی شرکت کا باعث ہوگئی۔ اس طبقہ میں کسی قدر کام کرنے والوں کا وہ گروہ شامل تھا جنھوں نے ابھی آزادانہ شخصیت نہیں حاصل کی تھی بلکہ وہ کسی نہ کسی اعلیٰ فن کے ساتھ تابع ومتبوع کا تعلق رکھتے تھے، مثلاً ایک حرفت Arte di Lana تھی جسے میں عام محاورے میں "بزازوں کی شرکت" کے نام سے ترجمہ کرسکتا ہوں، اس کے ساتھ اون کے صاف کرنے والے، رنگنے والے اور بننے والے سب ضمنی حیثیت سے اس کے تابع تھے بلکہ غیر ماہر مزدور بھی شامل تھے۔

انقلاب کی مختلف صورتوں کو سلسلہ وار بیان کرنے کے لئے بہت وقت چاہیئے۔ اس کا نفاذ اس طرح سے ہوا کہ وہ واقعی یا مشتبہ حامیان شہنشاہی جن کی دار وگیر ہورہی تھی، چھوٹے درجے کے اہل حرفہ اور پست تر طبقے کے لوگ سب

متحد ہو گئے۔ ایک خاص موقع پر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس پست تر طبقہ نے اس پورے لقمہ کو دانتوں میں دبا لیا ہے اور ایک عام جوش کی رو میں (جس سے ۱۷۸۹ء کے بعد کے زمانہ کے انقلابوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے) سب کو بہا لے جائے گا۔ اسے عارضی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا کہ نو حکام عاملانہ (یعنی آٹھ اکابر ایک علمدار انصاف) میں سے تین حکام وہ مہیا کرے۔ اس کے بعد ایک رد عمل واقع ہوا جس کا نتیجہ ایک نظام سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں پست تر فنون کو غلبہ حاصل ہو گیا، مگر یہ حالت صرف تین برس تک قائم رہی۔ ۱۳۸۲ء میں "امیرانہ عوام" کو پھر اقتدار حاصل ہو گیا اور پر زور عمومیت کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ پست تر حرفتوں نے عہدہائے نظامت کا ربع حصہ اپنے قبضہ میں رکھا مگر وہ حقیقتاً "انجمن ہائے حرفتی" نہیں رہیں، دولتمند نوجوان ان میں داخل ہو گئے۔ اور عام اہل حرفہ سرمایہ داروں کی حکمران عدیدیت کے بیجان آلۂ کار ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچاس برس بعد جس ارتقا نے اس جمہوریت کو رفتہ رفتہ عملاً خاندان میدیچی کی شاہی میں بدل دیا اسے بالکل اسی طرح عوام کی تائید حاصل تھی جیسی رومانی جمہوریت کے وقت میں حاصل ہو چکی تھی۔

ف۔ میں نے صرف فلورنس سے بحث کی ہے تاکہ حتی الوسع ایک مختصر بیان کو صفائی کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ لیکن قریب قریب اسی زمانہ میں مشابہ گر پست درجہ حرفتوں کی عمومیت کو اسی طرح ناتمام طور پر ہسپانیہ، گنٹ، اپیناد غیرہ کے دوسرے شہروں میں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔

خطبہ بست وکیم

ازمنۂ وسطیٰ کے نیابتی ادارات

۱۔ اب میں اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں کہ ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کے جن جاگیری یا نیم جاگیری حالات کے جزوی اختلافات کو نظر انداز کر کے ہم یہ قرار دے سکتے ہیں کہ وہ دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک قائم رہے ان حالات اور سولھویں اور سترھویں صدیوں کی خالص شاہی کو غلبہ حاصل ہو جانے کے درمیانی زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر جو نظم سلطنت ازمنۂ وسطیٰ کے دورِ آخر میں قائم تھا اس نظم سلطنت کے آغاز و زوال کو مختصراً بیان کروں۔ اس نظم کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جمعیتہائے طبقات کے زیرِ نگرانی شاہی نظم سلطنت تھا لیکن ذہن میں یہ ملحوظ رہے کہ ان جمعیتوں میں امیروں اور پادریوں کے علاوہ شہروں کے نمایندے بھی شامل تھے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس بیان کو شروع کروں میں چاہتا ہوں کہ قدیم و جدید سیاسی خیالات کے ایک اہم فرق کی طرف توجہ دلا دوں جس سے ان خیالات پر روشنی پڑے گی جن کا اظہار میں اس باب میں کرنے والا ہوں۔ ارسطو کی جس عبارت کا اقتباس پہلے پیش کیا گیا ہے[ل] اس میں اس نے مباحثی جماعت کے فرائض بیان کرتے وقت محصولوں کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ اس کے نزدیک مقاصد عامہ کی ضرورت

[ل] خطبہ دوازدہم۔ صفحہ ۱۶۴۔

کے لئے محاصل عائد کرنے کا مسئلہ اس قدر صریحی طور پر ثانوی اور زیریں حیثیت رکھتا تھا کہ اس کی نسبت اس نے کچھ نہیں کہا، اس کے برخلاف لاک کی مشہور کتاب "ملکی حکومت" (مصنفہ ۱۶۹۰ء) میں اس سوال کو کہ اجرائے محصول کا تعین کون کرے اس سے بھی زیادہ اساسی سوال قرار دیا ہے کہ وضع قوانین کا تعین کون کرے۔ لاک اس امر کے تسلیم کرنے پر آمادہ ہے کہ کوئی قوم یہ کر سکتی ہے کہ وضع قوانین کے فرض کو کسی مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں دیدے اور اس کے ساتھ صرف یہ مبہم سی شرط لگا دے کہ قوانین کا مقصود قوم کی بہبود ہونا چاہیئے، مگر لاک اس کو قبول نہیں کرتا کہ قوم نے کسی وقت بھی اس طرح پر کسی حکومت کو یہ حق دیدیا ہو کہ وہ قوم کی رضامندی کے بغیر (خواہ یہ رضامندی اسنے خود دی ہو یا اس کے نائبوں نے دی ہو) قوم کی جائداد پر محصول عائد کر سکتی ہے[۱]، یہ رائے قدیم سیاسی نظریہ کی رو سے جس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے جدید نظریے کے لحاظ سے بھی اس کی غرابت اس سے کم نہیں ہے مگر سترھویں صدی کی آئینی کشاکش میں تاریخی طور پر مسئلہ مالیات کو جو فوقیت حاصل تھی، اس کے یہ عین مطابق ہے۔

قدیم و جدید سیاسی تخیلات کے درمیان یہ فرق میری دانست میں اس طرز پر مبنی ہے جس طرز سے جدید نظم سلطنت جاگیری حالات سے گزر کر بتدریج نمودار ہوا۔ جاگیری نظم سلطنت میں محصول خالص کو کوئی حیثیت نہیں حاصل تھی۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا، کہ بادشاہ اپنی بادشاہی کے اخراجات اپنے صرف خاص کی آمدنی اور ان جاگیری خدمات، حقوق اور گاہ بگاہ کی "امداد" سے چلاتا تھا جو اس کے تابعین سے حاصل ہوتی تھیں، بعد ازاں جب خاصکر جنگ میں تنخواہدار پیشہ ور سپاہیوں کے غالب مفاد کی وجہ سے تاج کے اخراجات بڑھے تو پھر بادشاہ کے نقدی ضروریات کا تصادم اس کے تابعین کی اس مستحکم عادت سے ہوا کہ وہ صرف معینہ لگان، حقوق اور معاوضۂ خدمات کے ایک مسلمہ حق و فرض کے ادا کرنے کے پابند تھے۔ چنانچہ جب فرانس میں مجلسوں کے دور کا آغاز ہوا تو ہیلم (اس وقت کے) شاہ فرانس کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ ایک واقعی امتیاز خاص ایسا تھا جسے بادشاہ باوجود اپنی ازدیاد طاقت کے بزور پلٹ دینے کی

---

[۱] "رسالہ ملکی حکومت" باب یازدہم فقرہ ۱۴۲۔

توقع نہیں کرسکتا تھا یعنی اس کے بیرنوں کو محصول سے جو بریت حاصل تھی اسے وہ ساقط نہیں کرسکتا تھا[1] اور اس پر ہم یہ بھی اضافہ کرسکتے ہیں کہ حقوق یافتہ شہروں کو منشوروں کے ذریعے سے ان کی سالانہ ادائی رقوم کے متعلق اپنی رائے سے اضافہ کرنے کے خلاف جو طمانیت دی گئی تھی اسے بھی معمولی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، پس بادشاہ کے مالیات کے راستے میں جو رکاوٹیں اسطرح حائل ہوگئی تھیں ان پر غالب آنے کے لئے بادشاہ کے نقطۂ نظر سے عام مجلسوں کا اجرا و قیام ایک اہم ذریعہ تھا۔

۲۔ اس امر کو اصولی اہمیت حاصل ہے کہ ازمنۂ وسطی کے سیاسی ارتقا کا وہ دور جس میں گو نہ نیابتی جمعیتیں حکومتی اقتدار کے اہم اعضا بن گئی تھیں، وہ دور اس ارتقا سے مقدم تھا اور ایک حد تک اسی سے پیدا ہوا تھا جس سے ملکی سلطنتوں کے اندر شہری جماعتوں کو جاگیری امرا کے ہم پایہ خود مختاری حاصل ہوگئی، اگرچہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اندرونی حیثیت سے اس کا انتظام ان اصولوں پر تھا جو جاگیریت سے بالکل غیر مشابہ (بلکہ حقیقتاً حرفتی) تھے اور جن میں کچھ زمانے کے لئے کم و بیش نیم عمومی نظام سلطنت کا میلان پایا جاتا تھا۔ اسی ارتقا کی وجہ سے یہ ہوا کہ جب یہ جمعیتیں بنیں تو یہ صرف جنگجو اور مذہبی امرا کی جمعیتیں نہ تھیں بلکہ ان میں نظم معاشرت کے ترقی یافتہ حرفتی عنصر کے نمایندے بھی شامل تھے اور حرفتی عنصر کی بھی شمولیت تھی جس سے نہایت ہی قطعی طور پر یہ ظاہر ہوتا تھا، کہ ان جمعیتوں سے قوم کے ارتقا کے ایک نئے دور کا اظہار ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ان جمعیتوں کا جاگیری عنصر کوئی نئی شے نہیں تھا، بادشاہ کے براہ راست تابعین کی جمعیت کی یہ صرف بعد کی شکل تھی، یہ جمعیت "شاہی عدالت" یا شاہی مجلس کے نام سے جاگیری دور میں حکومت کا مشہور و مانوس عنصر تھی، البتہ جس پابندی کے ساتھ وہ اپنے فرائض اس زمانہ میں ادا کرتی تھی اس میں اور اس زمانے میں بہت فرق تھا قدیمی نظم سلطنت میں یہ جمعیت سرداروں کی مجلس کی صورت میں موجود تھی، اس کا اجتماع اس لئے ہوتا تھا کہ وہ صلح و جنگ کے معاملے میں بادشاہ کو مشورہ دے، اہم عدالتی فیصلے صادر کرے اور اتفاقی جنگی محصولوں "امداد" کا انضباط کرے اور ازمنۂ جاگیری میں معمول کی صرف یہی ایک ممیز و عام شکل تھی، اگر تنہا یہی جمعیت بادشاہ کو صلاح و مشورہ دیتی اور قوانین و محاصل سے اتفاق کرتی رہتی، تو یہ لوگ صرف اس کشمکش کو جاری رکھتے

---

[1] ازمنۂ وسطی صفحہ ۲۲۳ باب دوم حصۂ دوم۔

جو ملوکیت و عدیدیت کے درمیان برپا تھی جس کی نسبت میں ابھی ابھی یہ کہہ چکا ہوں کہ ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کی مخصوص خصوصیت یہی تھی، اگر شہروں کے شیوع سے طبقات کے جلسوں" میں ایک زیادہ عمومی عنصر داخل ہو گیا۔ جسنے تیرھویں صدی کے بعد سے شاہی کو کسی قدر مدد بھی دی، اور کسی قدر اقتدار بھی اس پر قائم رکھا۔

ان جمعیتوں کی تکوین قوم کی ترقی پذیر ارتباط کا نشان و اظہار ہے یہ ایسا بیان ہے جو ان سب پر عاید ہو سکتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جن اسباب سے یہ صورت زیادہ تر پیش آئی ان کی نسبت کوئی ایسا بیان مشکل ہے جو صاف طور پر تمام حالات پر عائد ہو سکے، بعض وقت ان جمعیتوں کی تکوین کا تحرک کلیۃً یا بیشتر اوپر سے شروع ہوتا معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ بادشاہ کی حکمت عملی کے اسباب، اور خاصکر مالیاتی حالت ہوتی تھی، لیکن بعض وقت اس کا شیوع نیچے سے ہوتا تھا، اور یہ ایک وسیع تر و موثر نتیجہ تھا، رضاکارانہ اتفاق کی اس غوری تحریک کا جو ایک ہی معاشری طبقے کے اشخاص کی جماعتوں میں پیدا ہو جاتی تھی اور ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور کی یہ ایک خاص خصوصیت ہے، لیکن اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ دونوں اسباب مخلوط ہو جاتے تھے۔

لیکن غالباً ہر شخص کو یہ توقع ہو گی جس تحریک کے بموجب تیسرے طبقہ کے قائم مقاموں کو بیرنوں اور مذہب کے پیشواؤں کے پہلو بہ پہلو نشست ملی ہو، وہ تحریک جہاں اوپر سے چلنے کے بجائے نیچے سے شروع ہوئی ہو وہاں نہایت درجہ اغلب یہ ہے، کہ یہ تحریک ترقی کر کے ایک پائدار و مستقل آئینی حکومت کی صورت اختیار کریگی۔ مگر واقعہ اسکے برعکس تھا، جرمنی وہ ملک ہے جہاں ہم اتفاق کی قوت کو نہایت ہی واضح اور نہایت ہی پر زور طور پر عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جرمنی ہی میں یہ ہوا کہ شہروں کی مشہور رضاکارانہ لیگیں قائم ہوئیں جن میں سے ہنسائی لیگ بالتخصیص ایک نہایت ہی نمایاں مثال اس قوت و عملی خود مختاری کی ہے جو ان عناصر کے خود ساختہ اشتراک و اختلاط سے ظہور پذیر ہوئی جو خود انفرادی حیثیت سے باضابطہ سیاسی ماتحتی کی حالت میں رہے۔ انگلستان، فلینڈرز، اسکینڈینویا، روس وغیرہ کے ایسے غیر ممالک کے جرمانی تاجروں نے اپنے اغراض مشترک کے تحفظ کے لئے اتحادات قائم کئے، اور شمال جرمنی کے تجارتی شہروں میں مختلف مقاصد کے لئے چھوٹے چھوٹے اتحادات قائم ہو گئے

آخرالامر انھیں سے ترقی کرکے چودھویں صدی کے وسط میں "ہنسا" کے نام سے شمال جرمانی شہروں کا ایک بہت بڑا اتحاد قائم ہوگیا، اس کی حکومت ان قراردادوں کے مطابق ہوتی تھی جو مختلف شہروں کے قائم مقاموں کے اجلاسوں میں منظور ہوتی تھیں، بری و بحری راستوں کو مامون رکھنا، جو شہر اتحاد کے رکن ہوں ان کے مناقشات کا تحکیم سے طے کرنا اور غیر ممالک میں تجارتی حقوق کا حاصل کرنا اور ان پر نگاہ رکھنا یہ امور ان کے اولین مقاصد میں داخل تھے، سنہ ۱۳۶۷ء میں اس اتحاد نے کامیابی اور شان کے ساتھ سکینڈینوی سلطنتوں کے خلاف جنگ کی، اور اس کے بعد ہی مدت دراز تک اس کی پرجوش زندگی قائم رہی، جو شہر اس میں داخل تھے، ان کا اندرونی نظم سلطنت اسی اتحاد کی نگرانی میں رہا اور "اصلاح" کا دور آیا تو اس اتحاد نے مذہبی معاملات تک میں دخل دیا۔ شہنشاہی طاقت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد ازمنۂ وسطیٰ کے آخری زمانے کے جرمانی شہروں کی عہدیت کی مختلف مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے جرمنی کے اندر صرف شہروں ہی میں ایسا نہیں ہوا کہ مشترکہ اغراض کے لئے متحد ہونے کا یہ بے ساختہ میلان ظاہر ہوا ہو، بلکہ امرا اور خاصکر نیچے درجہ کے امرا بھی اپنے حقوق و امتیازات کی حفاظت کے لئے برادریوں میں متحد ہو گئے تھے، یہ تحریک کسانوں تک میں پہنچ گئی اگرچہ سوئیزرستان کے کسانوں کے مشہور واقعے کے سوا اور جگہ یہ تحریک ناکمل اور عارضی سی رہی۔ آخری امر یہ ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں (جو ازمنۂ وسطیٰ کی پارلیمنٹوں کا دور تھا) رضاکارانہ اتحاد کی قوت کا اظہار خصوصیت کے ساتھ جرمنی ہی میں اس طرح ہوا کہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف امرا و قسیس مبارزا اور شہری اپنی محافظت کے لئے زیادہ وسیع اتحادات میں متحد ہو گئے۔ بایں ہمہ جرمنی میں طبقات کے اجلاسوں کا یہ ازمنۂ وسطیٰ والا نظم کمزور پڑ گیا اور سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں باقی بھی رہا تو حاوی و غالب مطلق العنانی کے مقابلے میں کسی قسم کی پرزور مقاومت پیش نہ کرسکا۔ؑ

اس کے برخلاف انگلستان میں جہاں کہ ازمنۂ وسطیٰ کی پارلیمنٹ سے زمانۂ جدید کی پارلیمنٹ تک کا تغیر بتدریج و غیر منفک طور پر عمل میں آیا، وہاں شہروں کی

ؑ ملاحظہ ہو خطبۂ بست سوم صفحہ ۳۳۶-

جانب سے باہمی اتحاد کا یہ خود ساختہ دور نمایاں نہیں ہوا۔ شہروں کو اوّل اوّل بے ترتیب طور پر بیرنوں کی طرف سے طلب کیا گیا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس سے ان کا خاص مقصود اخلاقی تائید حاصل کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ بادشاہ کے مقابلہ میں بیرنوں کے معاملہ کو قومی جدو جہد سمجھنے کی زیادہ موثر وجہ موجود ہے۔ بعد میں شہروں کی طلبی باترتیب طور پر ہونے لگی خاصکر اس وجہ سے کہ بادشاہ کی مالیاتی ضروریات کے لئے روپیہ حاصل کرنے میں شہروں سے علٰحدہ علٰحدہ گفت و شنید کرنے کی بہ نسبت قائم مقاموں کے توسط سے مجموعی طور پر گفت و شنید میں زیادہ سہولت تھی۔ اسپین میں ان مجلسوں کا ظہور زیادہ پہلے ہوا۔ چنانچہ پرسکاٹ کہتا ہے کہ اب یہ دریافت کرنا بعد از وقت ہے کہ (اسپین میں) قومی مجالس میں طبقۂ سوم کا شمول بادشاہوں کی مدبرانہ فکر کا نتیجہ تھا یا شہروں کی ترقی پذیر قوت و اہمیت کی وجہ سے انھیں مجبور ہو کر ایسا کرنا پڑا تھا[1]۔ انگلستان کی طرح فرانس میں بھی یہ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا اجرا اولاً اوپر سے ہوا، مگر فرانس میں جب بادشاہ کی حکمرانی کمزور و ناکام نظر آنے لگی تو جو مجلس اس طرح سے طلب ہوتی تھی اس نے جلد تر اس میلان کا اظہار کر دیا کہ وہ زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتی ہے۔

۳۔ قبل اس کے کہ میں ان غیر معمولی حالات کا تجزیہ کروں جو انگلستان میں ازمنۂ وسطیٰ کے ان نیابتی ادارات میں زیادہ مکمل اور زیادہ کامیاب نشو و نما کا باعث ہوئے، ہمیں مقابلے کے طور پر فرانس کی صورت حال کی تحقیقات کرنی چاہئے جس کی وجہ کسی قدر یہ ہے کہ نیابتی ادارات کے اس عارضی دور کے بعد جب شاہی کا زمانہ آیا تو فرانس ہی میں شاہی شان و شوکت اور اس کے اثر کو سب سے زیادہ نمود حاصل ہوئی۔

ہم اس کا آغاز اس بیان سے کر سکتے ہیں کہ جیسا گیزو نے اشارہ کیا ہے[2]، جب فرانس کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں طبقۂ سوم نے اہم حصہ لینا شروع کیا اس وقت شہروں کی خود مختاری کی حالت وہ نہ تھی جو اس سے قبل رہ چکی تھی۔ قانون پیشہ اشخاص کی مدد سے بادشاہ کی طاقت ظاہراً و باطناً جس قدر بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ

(حاشیۂ تمہید)

[1] ۔ تاریخ فرڈیننڈ و ازابیلا۔

[2] ۔ تاریخ تمدن فرانس خطبۂ نوزدہم۔

ملک کے اندرونی نظم و ارتباط میں جس قدر ترقی ہوتی جاتی تھی اسی قدر شہروں کی انتظامی خود مختاری اور خاصکر بعض شہروں کے نیم فرمانروایانہ اختیارات بتدریج گھٹتے جاتے یا منسوخ ہوتے جاتے تھے، کیونکہ وہ اس ارتباطی نظم سے موافقت نہیں رکھتے تھے جو اہل قانون کا منتہائے خیال تھا اور جہاں تک کہ بادشاہ کی فوقیت کے قیام کو اس سے استحکام حاصل ہوتا تھا بادشاہ کی ہوس بھی بالطبع یہی تھی۔ یہ کارروائی تیرھویں صدی کے بیشتر حصص میں جاری رہی اور اس کے بعد سے بھی دو صدیوں تک اس کا سلسلہ چلتا رہا، اگرچہ چودھویں صدی کے آغاز تک شہروں کے نمائندے طبقات عامہ کی جمعیت میں تیسرا طبقہ قائم کرنے کی غرض سے طلب نہیں کئے گئے اور نہ اس صدی کی وسط تک اس طبقے نے اپنے مطالبات پیش کرنے اور دشمن کے قلعے پر گویا حملہ کرنے کی روش اختیار نہیں کی۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ آتی ہے کہ بادشاہ اگرچہ برابر یہ کوشش کرتے رہتے تھے کہ شہروں کو ان کے نیم فرمانروایانہ اختیار سے محروم کر دیں تاہم شہروں کی طرف سے انھیں نہ وہ اندیشہ تھا اور نہ وہ انھیں اپنا ویسا حریف سمجھتے تھے جیسا جاگیری امیروں اور پادریوں کو سمجھتے تھے اور بادشاہوں نے جاگیری طرز و روش کی جو عام مخالفت اختیار کی تھی، اس میں ان کے لئے یہ بہت اہم منفعت کا باعث تھا کہ وہ صرف شاہی املاک کے شہروں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ عام طور پر ملک کے تمام شہروں کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا کریں۔

طبقات عامہ کا پہلا اجلاس جو ۱۳۰۲ء میں منعقد ہوا اس سے بادشاہ کا اولین مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ پوپ کی مخالفت میں اسے اپنی ساری بادشاہی کی تائید حاصل ہے لیکن (جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) اس کے سوا ایک دوسرا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ زیادہ آسانی سے روپیہ حاصل ہو سکے، اور میرا خیال ہے کہ انگلستان کی طرح فرانس میں بھی بہ حیثیت مجموعی اس مقصد کو نسبتہً زیادہ اہمیت حاصل تھی، اگرچہ اس کی اہمیت دقت پر سمجھی نہیں گئی۔ عام جمعیت نے ان مالیاتی انتظامات میں آسانی پیدا کر دی جو بصورت دگر بادشاہ کو اپنے تابعین سے فرداً فرداً کرنا پڑتی۔ بادشاہ نے غالباً یہ توقع کی (اور حقیقتاً ویسا ہی ہوا بھی) کہ شہروں کے نائبین مالی مدد دینے کے لئے زیادہ آسانی سے راضی ہو جائیں گے، اور اس طرح جاگیری امرا کے ساتھ ان کی موجودگی کی وجہ سے روپیہ کے حصول کے مشکلات کم ہو جائیں گے، لیکن یہ تدبیر کیسی ہی دلفریب

کیوں نہ ہو اس کا تجربہ بغیر اس کے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شاہی کو یہ خاص خطرہ لاحق ہو جائے کہ قائم مقاموں کو اتحاد باہمی کا جو مزید موقع حاصل ہوگا وہ انھیں اس جانب لے جائیگا کہ جب کبھی شاہی میں ضعف آئے تو وہ حکومتی اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور وضع قوانین اور نظم و نسق میں مداخلت کرنے لگیں، اور ۱۳۵۳ء میں جنگ پواتی ایر کی مصیبت ناک تباہی کے بعد فرانس میں واقعۃً یہی صورت پیش آئی۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت اصلاح (یا انقلاب) کی تحریک کو شہروں نے خاصکر ابھارا تھا، اور ان کی سرپرستی تاجران پیرس کے نمایندے کر رہے تھے۔ اسی قسم کی ایک تحریک (جس کی سرگروہی یہی شہری عنصر کرتا تھا) اس وقت بھی ہوئی جب ۱۴۱۳ء میں ملک متخاصم فریقوں کے ظلم و تعدی سے پاش پاش ہو گیا تھا۔

مگر مختلف طبقات اور خاصکر شہریوں اور اعیانیوں کے درمیان اتحاد کی کمی اس امر کے لئے کافی تھی کہ عموعی نگرانی ان اضطراری کوششوں کو قیام و دوام حاصل کرنے سے باز رکھے۔ اس اتحاد کے نقص کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ امرا اور پادری مالگزاری سے بری تھے اور غیر امرا کو زمین کا محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اصول یہ اختیار کیا گیا تھا کہ پادری اپنی دعاؤں سے، امرا اپنی تلواروں سے، اور عوام اپنے روپیہ سے گویا محصول ادا کرتے ہیں، جہاں تک محصول کے عام بار کا تعلق تھا وہاں تک تو بہر نوع یہی اصول رائج تھا۔ پس چونکہ اس طرح ممتاز طبقات کو ان مالیاتی مسائل سے دلچسپی نہیں رہی تھی جن کی بحث مجالس طبقات عام میں ہوتی تھی، اس لئے اہل شہر بجر و رو خود اتنے کمزور ہو گئے کہ وہ تن تنہا بادشاہ سے کشمکش نہیں کر سکتے تھے۔ مالیات کی اصولی اہمیت پر خیال کرتے ہوئے اس کا انقلابی لمحہ اور کشمکش کے نقطۂ بازگشت کا وقت ۱۴۳۹ء میں آیا۔ اب طبقات نے مستقل محصول پر رضامندی ظاہر کی یا یہ سمجھ لینے میں کامیابی ہوگئی کہ انھوں نے ایسی رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ یہ اصول کہ اجرائے محصول کے جائز ہونے کے لئے طبقات کی منظوری ضروری تھی صریحی طور پر ترک نہیں کیا گیا تھا۔ نصف صدی بعد ۱۴۸۴ء میں اس کا دعوےٰ کیا گیا اور زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ہر دوسرے برس جمعیت کے انتخاب اجلاس کا مطالبہ کیا گیا۔ بادشاہ سے جو کچھ چاہا گیا اس نے اس کا وعدہ کر لیا مگر اس نے اس کے بعد سے جمعیت کو طلب نہیں کیا۔ اور محصول حسب دستور سابق وصول کرتا رہا۔

فرانس کے طبقات عامہ اور طبقات صوبجاتی کی جمعیتوں کی تاریخ کے مسلسل بیان کرنے میں بہت طوالت درکار ہے۔ عام خواہشوں کے اظہار کے لئے وہ ایک اہم و موثر آلہ تھیں۔ اور حکومت جب دانشمند ہوتی تھی تو وہ ان اظہارات سے قابل قدر صلاح و اشارہ حاصل کرتی تھی۔ لیکن عام طور پر ہر شخص یہی کہتا چاہے گا کہ جن طبقات کی نمائندگی ہوتی تھی ان میں اتحاد کا نہ ہونا ہی زیادہ تر وہ سبب تھا جس کی وجہ سے یہ مرکب جمعیت حکومتی اختیار میں کوئی اہم و مستقل حصہ پانے سے محروم رہتی تھی۔ امرا و عوام کے مابین اس مہلک عدم اتحاد کا اظہار بہت ہی نمایاں طور پر ۱۶۱۴ء کے طبقات عامہ کے اجلاس میں ہوا جبکہ امرا نے باضابطہ بادشاہ کے حضور میں یہ شکایت کی کہ طبقۂ سوم کے ایک مقرر نے امرا، قسیس و عوام کے تین طبقوں کو ایک ہی خاندان کے تین بھائیوں سے تشبیہ دی ہے طبقۂ سوم نے صرف برادر خرد ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مگر امرا اتنی اخوت کے بھی روادار نہیں تھے۔ جب یہ تینوں طبقات پونے دو صدی بعد ۱۷۸۹ء میں پھر جمع ہوئے تو جیسا کہ کبھی کبھی خاندانوں میں بھی یہی ہو جاتا ہے، سب سے چھوٹا بھائی سب سے زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اور اس نے اپنی طاقت کا لوہا منوا دیا۔

اسی قسم کے ایک سبب نے ایسا ہی نتیجہ اسپین میں بھی پیدا کیا، جہاں قومی جمعیتوں میں شہروں کی نمایندگی کا رواج بارھویں ہی صدی میں ہو گیا تھا، اور جہاں کاسٹیل اور اراگان دونوں حصوں میں ایک مدت تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ کے اوپر ان جمعیتوں کا اقتدار زیادہ مضبوطی و باقاعدگی کے ساتھ قائم ہو گیا ہے اور پندرھویں صدی تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان جمعیتوں کی باقاعدہ آئینی حکومت میں ترقی کر جانے کی امیدیں زیادہ قوی ہیں، لیکن یہاں بھی بادشاہی کی طاقت اسی میں مضمر تھی کہ اس کے حریفوں میں اتحاد مفقود تھا، اور حریف اس امر پر رضامند رہتے تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچا کر خود خاص خاص حقوق حاصل کر لیں۔ چنانچہ کاسٹیل کے شہروں کی نمایندگی کی قوت میں اس طرح ضعف آیا کہ جب چودھویں صدی میں بادشاہ نے جرأت کر کے ان شہروں کی تعداد جنھیں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق تھا، اٹھارہ تک گھٹا دی تو ارکان کی تعداد بھی کم ہو گئی، خفیف تغیرات کے ساتھ یہ تعداد اسی حالت پر قائم رہی، جن شہروں کو حقوق خاص حاصل تھے وہ (دوسروں کے لئے) ان حقوق کی توسیع میں

سدراہ ہوتے تھے۔ طبقۂ امرا کو یہاں بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنی ذاتی فوجی خدمت کی وجہ سے محصولوں سے بری ہیں۔ اس طرح امرا اور شہریوں کے درمیان جو تفریق قائم ہوگئی تھی اسی نے سولھویں صدی میں مطلق العنانی کی طرف منقلب ہونے کو نہایت آسان کردیا۔ اسکینڈنیوی بادشاہوں کی پارلیمنٹوں میں عمومی ہیئت زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم تھی۔ ان پارلیمنٹوں میں امیروں اور شہریوں کے نمایندوں کے ساتھ کسانوں کے نمایندے بھی شامل تھے درحقیقت سویڈن نے موثر پارلیمنٹی قوت کی مثال اٹھارھویں صدی جیسے بعید زمانے تک میں پیش کی ہے۔ تاہم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جس ناگہانی کارروائی نے ۱۶۶۰ء میں ڈنمارک کی حکومت کو مطلق العنان شاہی میں بدل دیا وہ اسی مالیاتی غرض کی تفریق کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ شہروں کے رہنے والے امرا کے اس انکار سے غضبناک تھے کہ جب وہ امرا اپنی جاگیروں میں رہیں تو ان پر محصول نہ لگایا جائے۔ بادشاہ نے ہوشیاری کے ساتھ ان کے غیظ و غضب کو اور بھڑکادیا جس نے ایک عمومی انقلاب کی صورت اختیار کرلی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطلق العنان بادشاہی قائم ہوگئی۔

۴۔ پس اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ مغربی یورپ کی بڑی سلطنتوں میں سے صرف انگلستان ہی میں کیوں ایسا ہوا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقوں کی جمعیتیں اپنے عملی تسلسل سے موجودہ پارلیمنٹی حکومت کی صورت میں آگئیں، تو میرے خیال میں اس کا خاص جواب یہی ہوسکتا ہے کہ جو سبب (یعنی مختلف اجزا و درجات میں فقدان اتحاد) دوسری جگہوں میں ناکامی کا موجب ہوا اس کا اثر انگلستان میں بہت کم ہوا میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پندرھویں صدی کا انگلستان صوبہ جاتی رقابت یا درجاتی رقابت سے بالکل مبرا تھا مگر ان رقابتوں کا اثر دوسری جگہوں کی بہ نسبت انگلستان میں بہت کم تھا میرے خیال میں اس کے دو خاص اسباب تھے ایک انگلستان کی جزائری حالت، اور دوسری نارمن بادشاہوں کی طاقتور حکومت۔

میرا دل کہتا ہے کہ میں اس بات پر یقین کروں کہ جزائری حالت اور اس کے معینہ حدود نے قومی احساس کے اتحاد کے خیالات پر براہ راست اثر انداز ہونے میں زیادہ سہولت پیدا کردی۔ جزیرے سے باہر کے لوگ صاف طور پر غیر ملکی نظر آتے تھے۔ اسی لئے نارمن فاتحوں اور انگریز مفتوحوں کے درمیان بہت ہی مکمل امتزاج ہوگیا اور صورت حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امتزاج بہت عجلت کے ساتھ ہوا۔

اگر ہم (Dialogue de scacceario) ("مکالمۂ خزانہ") پر اعتماد کریں تو (ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ) یہ اتحاد ڈیڑھ صدی کے اندر اندر عملاً مکمل ہوگیا تھا۔ غالباً جزایری حالت کا دوسرا زیادہ اہم اثر یہ تھا کہ مدتوں تک کسی شدید حملے کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ باامن حالت کی طرف سے طمانینت ہوگئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ (بہ الفاظ مسٹر ہربرٹ اسپنسر) برِ اعظم کی بہ نسبت عسکریت کا غلبہ یہاں کم رہا۔ انگلستان میں ہمیشہ ان زمینوں کے ساتھ ہی ساتھ جو فوجی خدمت کی بناپر عطا کی گئی تھیں بہت وسعت کے ساتھ غیر فوجی خدمت کی بناپر بھی زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ اور جزیرہ کے باعث نسبتاً زیادہ باامن صورت کے پیدا ہو جانے سے زمیندارانہ املاک رکھنے والوں کا زیادہ باامن عنصر دوسرے عنصر کو جذب کرنے لگا تھا۔ بادشاہ کو برِ اعظم میں اپنے مقبوضات کے حفاظت کی ضرورت رہا کرتی تھی مگر سمندر کے پار کی ان لڑائیوں میں خدمت کرنے کا فرض رفتہ رفتہ ایک طرح کا بار معلوم ہونے لگا۔ مبارز معاوضہ نقد دیکر اس خدمت سے بچ نکلنے پر خوش تھے مگر جب یہ ذمہ داری نقدی میں بدل گئی تو پھر مبارزوں کو یہ نقدی ذمہ داری بھی تکلیف دہ معلوم ہونے لگی۔ اور تیرھویں صدی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اجرا جبراً کیا جاتا تھا۔ پس اس طرح چھوٹے درجہ کے زمینداروں میں فوجی وغیر فوجی عنصر کا فرق مٹ چلا اور دیہات کے شرفا اور شہر کے تجار کے لئے عوام کے نام سے ایک پرزور و پرحوصلہ جماعت میں متحد ہو جانے میں زیادہ سہولت پیدا ہوگئی۔

انگریزی نظم معاشرت کے مزید اندرونی ارتباط کا ایک دوسرا اہم سبب ولیم فاتح کی قائم کردہ بادشاہی کا غلبہ وزور ہے۔ ایک معنی کر کے ولیم نے جاگیریت کو رائج کیا، مگر جاگیریت کے خاص سیاسی اثرات یعنی حکومتی اختیار کے تجزیے کو بہت ہوشیاری کے ساتھ خارج رکھا گیا تھا۔ اس کے پرزور ہاتھ اور شاطرانہ حکمت عملی نے اپنے ان ماتحتوں کو جن کے ساتھ اس نے غنیمت کا حصہ بخرہ کیا تھا فرانسیسی یا جرمانی جاگیری مستاجروں کے مانند کسی قسم کی خود مختاری حاصل نہ ہونے دی۔ چنانچہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ انگلستان میں یہ اصول قائم رکھا گیا تھا (اور کم از کم اصول وضابطہ کی رو سے تو ضرور یہی یہ تھا) کہ بادشاہ کی ذات کے ساتھ وفاشعاری نہ صرف بادشاہ کے بلاواسطہ تابعین مستاجرین اعلےٰ پر واجب تھی بلکہ ان تابعین کے تابعین پر بھی لازم تھی، انگلستان کی زمین کی

غنیمت کو فیاضی کے ساتھ تقسیم کرنے میں ولیم نے یہ خیال رکھا تھا کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرے تاکہ جہاں تک ہو سکے کسی زبردست امیر کو کسی ایک ہی حصۂ ملک میں زائد از ضرورت غلبہ نہ حاصل ہو جائے۔ اس نے چیسٹر اور ڈرہم کے سرحدی صوبوں کے سوا (جن پر ارل ویلز و ارل اسکاٹلینڈ کے خلاف فوجی مدافعت کا فرض عائد تھا) اور جگہوں میں انتظامی نظم کے وسیع اختیارات کو بڑے بڑے امرا کے ہاتھوں میں جانے سے روک لیا تھا۔

علاوہ ازیں، انگلستان میں بارھویں صدی سے دورہ کرنے والے عادلوں کے ذریعہ سے عدالت مقامی کے نظم ونسق پر نگرانی قائم رکھی گئی تھی، اور اس شاہی انصاف نے مقامی رسم ورواج کو دبا کر قوم کی یکرنگی وہمنوائی میں اضافہ کر دیا تھا، (یہ یاد رہے کہ نارمنوں سے قبل بھی براعظم کے مقابلہ میں انگلستان میں قومی یکرنگی بڑھی ہوئی تھی) ہنری دوم کے بعد سے ناقابل لحاظ مستثنیات کو چھوڑ کر انگلستان کا صرف ایک عام قانون رہا ہے۔ مزید براں جب نیابتی ادارات کا آغاز ہوا تو انگلستان میں "صوبہ جاتی طبقات" کے مثل کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ اسکے بجائے صرف ایک پارلیمنٹ تھی

علاوہ ازیں، انگلستان میں مختلف طبقات کے ارتباط میں انگریزدن کے ایک خاص خیال سے بھی مدد مل گئی کہ اعیانیت کو وہ ایک ایسا وصف سمجھتے تھے جو چھوٹے بیٹوں کی طرف منتقل نہیں ہوتا تھا، ایک حد تک اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دارالامرا (یعنی ملک کی مجلس اعظم[1]) ہماری مضبوط اور مرکزی نارمن حکومت کا ایک ایسا قائم عنصر تھا کہ براعظمی سلطنتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ نارمن بادشاہ اپنی

---

[1] ولیم کے جاری کردہ جاگیریت کے اثر کے تحت میں قومی مجلس نے (جس کا عمومی عنصر نارمنی فتح کے بہت ہی قبل ناپدید ہو چکا تھا) تقریباً غیر محسوس طور پر عقلا کی جمعیت سے شاہی دربار کی صورت اختیار کر لی جسمیں منشورات منتخبہ (Select charters) صفحہ ۱۵) جس میں (بادشاہ کے) جاگیری مستاجرین اعلیٰ مگر عملاً بڑے بڑے بیرن شامل ہوتے تھے۔ (اگرچہ دستور کی رو سے تمام فوجی اعلیٰ مستاجرین کو شرکت کا حق حاصل تھا) پس جہاں تک کہ پارلیمنٹی ارتقا کے تسلسل کا تعلق ہے دارالامرا ہی وہ ایوان ہے جو قدیم قومی مجلس کا گویا قائم مقام ہے۔

کارروائیوں کے متعلق اپنے امراکی مجلس کی مخالفت سے خائف نہیں رہتا تھا، بلکہ اسے خوف تھا تو مقامی مقاومت کا خوف تھا، اور مجلس کی رضامندی اس مقاومت کو روک دینے کا باعث ہوسکتی تھی، اس لئے جو امرا فرداً فرداً مجلس میں بلائے جاتے تھے ان میں اور جو نہیں بلائے جاتے تھے، ان کا فرق انگلستان میں بہ نسبت اور ممالک کے زیادہ نمایاں ہو گیا، جو نہیں بلائے جاتے تھے، وہ بادشاہ کے چھوٹے درجہ کے ستاجرین میں ملکر آخر میں اعیان سلطنت کا ایک طبقہ بن گئے۔

پس اس طرح ہم ایک زبردست بادشاہی، ایک کمزور تر طبقۂ امرا اور ایک ہم رنگ و متحدہ قوم کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لہذا طبقۂ امرا کو مجبور ہوکر بادشاہ کی مطلق العنانی کی مقاومت کرنا پڑی تو بالطبع وہ اس طرف مائل ہوا کہ ان دوسرے طبقات کے ساتھ ملکر اس ظلم و ستم کو محسوس کرتے تھے خود کو تقویت دے۔ اس اتحاد میں اس سے بھی سہولت پیدا ہوئی کہ انگلستان کے شہروں کے ارتقا میں اس قسم کی کشمکش نہیں پائی جاتی جو اکثر براعظمی تاریخ میں شہریوں اور امیروں کے درمیان نظر آتی ہے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں انگلستان زیادہ تر ایک زرعی اور مرغزاری ملک تھا لیکن جو بڑے شہر وہاں تھے (اور جو زیادہ تر براہ راست بادشاہ کے تابع تھے) ان کی تاریخ امرا کے ساتھ اس قسم کے طولانی، تلخ و ظالمانہ مناقشات سے پر نہیں رہی جو دوسرے مقامات میں اتحاد کے لئے سنگ راہ ہو گئے تھے، اور چونکہ پر زور مرکزی نظم و نسق نے چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندوں کو مختلف اغراض کے لئے صوبے کے حکام کے تابع کر دیا تھا اسلئے دہقانی و شہری عناصر مشترکہ کاموں کے عادی ہو گئے تھے۔

پس اس طرح نارمنی فتح کے ڈیڑھ صدی بعد بادشاہ کی غیر معمولی قوت ان دوسرے

ع۱ - چنانچہ یہ بیرن ہی تھے جنھوں نے ۱۲۱۵ء میں جان سے بزور "منشور اعظم" لکھوایا یہ بیرن قوم کی جانب مائل تھے اور "منشور اعظم" کسی بڑے مفہوم کے عدیدی گروہ کے اغراض کے لئے مرتب نہیں ہوا تھا اس کا مقصود یہ تھا کہ کم از کم تمام آزاد زمینداروں کے لئے خود رایانہ محصول سے اور تمام آزاد اشخاص کے لئے خود رایانہ قید و سزا سے آزادی حاصل کرے۔

اسباب کے ساتھ ملکر انہوں نے انگریزی معاشرے کے عناصر میں اتفاق باہمی کی غیر معمولی قابلیت پیدا کر دی تھی، پارلیمنٹ کی قوت کا ایک خاص سبب بن گئی، اور پارلیمنٹ پندرھویں صدی کے آغاز میں حکومت کا ایک باقاعدہ جزو ہو گئی۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی پارلیمنٹ کا موقع بادشاہ کی مالیاتی ضروریات ہی کے اندر مضمر تھا۔ مگر پارلیمنٹ[1] کے اندر نمایندہ عنصر کے زیادہ مستحکم ارتباط کی وجہ سے دوسرے ممالک کی بہ نسبت یہاں پر اس موقع سے زیادہ مستعدانہ عزم کے ساتھ کام لیا گیا، اور چودھویں صدی کے قبل ہی یہ گرانقدر اصول قائم ہو گئے تھے کہ بغیر منظوری پارلیمنٹ کے نیا محصول[2]

---

[1] نمایندگی کا اصول "منشور اعظم" میں نہیں پایا جاتا، مگر جہاں تک کہ آزاد زمینداروں کا تعلق ہے اس کا رواج بتدریج ہوتا گیا، اور ولیم و فریمین کے ساتھ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسکا باعث زیادہ تر یہی تھا کہ اس سے روپیہ حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ سائمن ڈی منٹفرٹ نے جب ۱۲۶۵ء میں پہلی مرتبہ شہروں کے نمایندوں کو پارلیمنٹ میں طلب کیا تو درحقیقت یہ طلبی مالیاتی وجوہ پر نہیں تھی، تاہم مالیاتی وجوہ کا اثر یہ ہوا کہ اس طریقہ کو اس نے باقاعدہ دستور کا ایک فرد بنا دیا۔ اور اسی کی وجہ سے عہد اڈورڈ اول ۱۲۹۵ء میں تینوں طبقوں کی پہلی مکمل نمایندگی ہوئی۔ اس کے بعد بہت ہی جلد (۱۲۹۷ء میں) نئے محصولوں کے اجرا کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت باضابطہ تسلیم کر لی گئی۔ پہلے پارلیمنٹ میں تین طبقے تھے۔ اور مبارز شہریوں سے علحدہ رائے دیتے تھے، اور اپنے اوپر محصول عائد کرتے تھے۔ مگر چودھویں صدی میں پادریوں نے پارلیمنٹ میں شریک ہونا ترک کر دیا۔ اور خود اپنے مذہبی جلسوں میں علحدہ طور پر جمع ہونے کو ترجیح دی، اور نائٹ شہریوں میں مل گئے، مگر ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ پندرھویں صدی میں انتخاب کنندگان کی عام کثرت میں کمی آگئی۔ ۱۴۲۹ء میں "چالیس شلنگ" والے آزاد اراضی داروں کی شرط نے ایک معقول تعداد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا، نیز بہت سے قصبوں میں بلدی حکمراں جماعت اپنا انتخاب کرنے والی ہو گئی۔ اور نمایندوں کے انتخاب کرنیکے حق کو غصب کر لیا۔ یہ واقعہ بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم جرمنی و اطالیہ کی نسبتاً زیادہ خودمختار شہری جماعتوں کے حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

[2] رسم و رواج کے متعلق کچھ شکوک کے ساتھ، اور یہ شکوک بعد کو بہت اہم ہو گئے یہاں تک کہ طویل العہد پارلیمنٹ نے آخری طور پر ان کا تصفیہ کر دیا۔

لگانا ناجائز اور وضع قوانین کے لئے دونوں ایوانوں کا اتفاق رائے ضروری ہے[عہ] اور یہ کہ دارالعوام نظم ونسق کی خرابیوں کی تحقیقات اور اس کی ترمیم کا مطالبہ کرسکتا ہے اگرچہ اس وضاحت وتکمیل کے ساتھ نہیں پھر بھی یہ مسلم ہوگیا تھا کہ انگریزوں کے حقوق وآزادی میں محض بادشاہ کے فرمان یا حکم کی بنا پر جائز طور پر کوئی مداخلت یا ترمیم نہیں کی جاسکتی ان اصول نے انگلستان کے شعور سیاسی میں بہت گہری جڑ پکڑ لی تھی یہاں تک کہ جب گلابوں والی لڑائیوں کے بعد پارلیمنٹ کا جوش عارضی طور پر پست ہوگیا اور بادشاہ کو عملاً غلبہ حاصل ہوگیا تب بھی وہ علانیہ پارلیمنٹ کے روایتی حقوق کو زیر بحث نہیں لایا اور نہ انہیں پامال کیا۔ ٹیوڈر بادشاہ اپنے منشا دلی کے موافق چلے، اور بعض جہات میں انگریزوں کے روایتی حقوق میں سختی کے ساتھ دست اندازی بھی کی، مگر انہوں نے بالعموم اپنی یہ من مانی کارروائیاں پارلیمنٹ کی رضاجوئی سے انجام دیں، اس کے آئینی حقوق کو زیر وزبر کرکے انجام نہیں دیں۔

عہ۔ پہلے دستور یہ تھا کہ نئے قوانین عوام کی درخواست اور امرا کی منظوری سے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بعد بتدریج درخواستوں نے مسودات قانون کے نام سے مکمل قوانین کی صورت اختیار کرلی کیونکہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اکثر جو کچھ درخواست میں ہوتا تھا بادشاہ حقیقتاً وہ سب کچھ عطا نہیں کرتا تھا۔

خطبۂ بست و دوم

مطلق العنان شاہی کی جانب میلان

اس سلسلۂ کلام میں اس سے پہلے جہاں ہم نے مغربی یورپ کی ملکی سلطنت کا مقابلہ قدیم یونان کی شہری سلطنت سے کیا ہے وہاں میں نے اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ جب ہم اپنی توجہ کو حکومت اور اس کی شکل کے ادیر مرکوز کر کے خالص سیاسی حیثیت سے اس پر نظر کریں تو دور آخر کے ارتقامیں (قدیم یونان سے) ایک بہت ہی نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ یہ فرق بادشاہی کا دوام ہے۔ ارتقا کے مختلف مدارج میں موروثی بادشاہی بدستور قائم رہی لیکن شہری مملکت کے ارتقامیں حکومت کی جو مختلف شکلیں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں، ان سے مشابہات کا پتہ چل سکتا ہے، یہ بادشاہی اس دور میں بھی قائم رہی جو شہری سلطنتوں کے عہد میں، قدیمی عدیدیات یعنی، قدیم خاندانوں کی عدیدیات کے ہم شکل ہے۔ جس زمانہ میں بالفاظ مورخین نشۂ زیدہ سرامرا نے بادشاہی کی شان و شکوہ کو ماند کر دیا اور اس کے اختیار کو گھٹا دیا تھا جس زمانہ کی نسبت ہم یہ سنتے ہیں کہ ڈیوک کاونٹ یا ارل جس بادشاہ کی رسمی اطاعت کا دم بھرتے تھے اختیارات میں اس کی ہمسری کا دعوای رکھتے تھے، اس زمانے میں بھی ان لوگوں کو اس امر میں کبھی کامیابی نہیں ہوی کہ وہ موروثی بادشاہی کی تنظیم کو تباہ کر دیتے، وہ اس کا خیال کبھی دل میں نہیں لاتے تھے، اور اب جس عمودی دور میں سے ہم گزر رہے ہیں، اس دور میں بھی یورپ کے اکثر ممالک میں بادشاہی بدستور موجود ہے حالانکہ اس زمانہ میں تقریباً ہر ایک متمدن ملک میں تشریعی اختیارات کا

بہت بڑا حصہ بالضرور قوم کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہے اور اس قسم کے اکثر ممالک میں ان نمایندوں نے رائج الوقت نظم ونسق پر بھی بڑی حد تک اقتدار حاصل کرلیا ہے، اور اس طرح جیساکہ میں ظاہر کرچکا ہوں وہ دور جو کم وبیش مطلق العنان بادشاہی کا دور تھا اور جو ان دونوں عہدوں کے درمیان واقع تھا، اور جس کا غلبہ وزور یورپ کے سب سے زیادہ اہم ممالک میں سترھویں صدی کے آخری حصہ اور اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب تک قائم رہا۔ یہ دور اگرچہ یونانی تاریخ کے خودسر حکمرانوں کے قدیم تر دور سے کچھ مشابہت رکھتا ہے، مگر یہ ایک شخص کی حکومت کی جانب بیقاعدہ وخلاف قانون بازگشت کا دور نہیں ہے، بلکہ قدیم قائم شدہ حکومت میں ایک عنصر کا تدریجاً یا دفعۃً دوسرے عناصر پر غالب آجانا ہے۔

جیساکہ میں کہہ چکا ہوں، میرے خیال میں اس واقعۂ عجیبہ کا خاص سبب یہ ہے کہ ایک ملک کے اتنے وسیع قطعہ پر جو لوگ بسے ہوئے تھے ان میں قومی اتحاد اور سیاسی نظم کا قائم رکھنا زیادہ دشوار طلب تھا اور اسی دشواری کی وجہ سے ملکی سلطنت میں مادام الحیات سرگروہی کے ذریعہ سے اتحاد واجتماع اختیار پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ ہم فرانس وجرمنی کی تاریخ میں یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کے مقابلہ میں سربرآوردہ امرا کے اختیارات کے اضافہ کا آخری میلان زیادہ تر اس طرف ہوتا تھا کہ سلطنت مختلف حصوں میں تقسیم ہوجائے۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ ایک مجتمعہ عدیدی نظام سلطنت قائم ہوجائے اور (دوسرا اثر یہ ہوتا تھا کہ) امرا خلاف قانون ظلم وستم کرنے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے تھے، برخلاف ازیں یونان وروما کی قدیمی عدیدیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف منضبط صورت سے اور قانون کا رنگ لئے ہوئے ظلم وزیادتی کرتا تھا۔ اس لئے جب ملک میں جہاں تک قومی احساس وامداد ملک کو ترقی ہوجاتی تھی، اسی حد تک وہ بادشاہی کو اس ابتری وپریشانی کے مقابلہ میں ایک ضروری روک سمجھکر قائم رکھتا تھا، اور تمدن کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی تھی اسی قدر ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جو اپنے ہمسایوں کے ساتھ پرامن قانونی تعلقات کے ساتھ رہنا چاہتے تھے اور (اس لئے) وہ بادشاہ کی

مدد کے خواہاں ہوتے، اور بدنظمی و بے ضابطگی کے خلاف بادشاہ کی تائید کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

لیکن خاص سبب اگرچہ یہی ہے تاہم ہمیں ان خیالات کے اثر کو بھی حساب میں لانا چاہئے جو رومانی شہنشاہی سے حاصل ہوئے تھے، ان خیالات کی نقل و سرایت مختلف ذرائع سے ہوئی تھی، اول ذریعۂ ٹیوتوقوموں میں حکم برداری کی عادت تھی، دوسرے سنہ ۸۰۰ء میں چارلس اعظم نے جب قدیم لقب شہنشاہی کی تجدید کی تو اس لقب کی منزلت و امتیاز کا اثر پڑا، اور اس کے بعد کلیسا اس کا وسیلہ بنا اگرچہ یہ وسیلہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) غیر مسلسل رہا، آخر الامر میں قانون پیشہ اشخاص اسکا ذریعہ ہوئے۔

ان تمام اسباب کے مجموعی اثر کی وجہ سے بادشاہی ان مختلف صدمات و خطرات کے درمیان جو ازمنۂ وسطیٰ کے طولانی دورعمل میں اور اس کے بعد کی مذہبی جنگ و جدل میں، اسے پیش آئے، بحال خود قائم رہی اور آخر الامر اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سب پر غالب آگئی اگرچہ بلا استثنا ہر جگہ ایسا نہیں ہوا۔ وینس کی قدیم عدیدیت اور ہالینڈ و سوئزرلینڈ کی جدید متفقیت میں حکومت کی جمہوری شکل قائم رکھی گئی۔ انگلستان میں سنہ ۱۶۸۹ء کے بعد سے بادشاہ کو پارلیمنٹ سے بالمقابل ہوکر حکومت کرنا پڑی جسکی فوقیت کو قانون سازی و مالیات کے باب میں بادشاہ نے بالآخر تسلیم کرلیا۔ (یہ پارلیمنٹ فی الاصل ایک وسعت یافتہ عدیدیت کی نمایندگی کرتی تھی)۔ اور نظم ونسق پر بادشاہ کا اثر صرف اس طریقے سے قائم رہا جسے متین اشخاص اثر اور بدتہذیب لوگ عہدوں اور وظیفوں کی رشوت دہی کہتے تھے۔ شمال میں سویڈن میں سنہ ۱۶۹۳ء سے سنہ ۱۷۱۸ء تک کی علی مطلق العنان بادشاہی کے مختصر دور کے بعد چارلس دوازدہم کی فوجی مہمات کی وجہ سے قوم کے وسائل پر جو سرفانہ بار پڑگیا تھا اس نے یہ رجعت قہقری پیدا کردی کہ ایک جمعیت کی نگرانی قائم ہوگئی جس میں انگلستان ہی کی طرح سے عدیدیت کا غلبہ تھا اور یہ صورت پچاس برس سے زائد تک قائم رہی (۱۷۲۰-۱۷۷۲) دوسری طرف مشرق میں پولینڈ کے امرا نے بادشاہ سے اور ہر طرح کے نظم و انتظام سے عملاً خود مختاری حاصل کرلی، اور اپنے ہمعصر ہمسروں کے سامنے ایک دلچسپ مثال اس بدترین عدیدیت کی پیش کی جس کا علم تاریخ کو ہوا۔ تاہم یہ سب مستثنیات میں تھے

دوسری جگہوں میں رومانی وجرمانی قوموں میں یکساں طور پر حکومت کی شاہی شکل متمکن رہی، چنانچہ فرانس، اسپین، پرتگال، ہرد وسسلی، ڈنمارک بشمول ناروے، آسٹریا اور جرمنی وشمال اطالیہ کی اکثر وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن میں مقدس رومانی شہنشاہی منقسم تھی، ان سب میں یہی شکل رائج تھی۔

پس جس نقطۂ نظر سے میں نے ان خطبات میں یورپ کی تاریخ کے خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے اگر اسی نقطۂ نظر سے براعظم (یورپ) کا کوئی بے لوث مبصر اٹھارھویں صدی کے وسط میں بالاختصار اس تاریخ کی رفتار کا پتہ چلاتا تو غالباً وہ یہی خیال کرتا کہ منظم ملکی سلطنتوں کی تکوین کا جو عمل مدت سے جاری ہے وہ اس طرف منجر ہوا ہے کہ حکومت کی آخری شکل اس طرز کی بادشاہی ہے جسے مطلق العنان[1] کہتے ہیں اور یہ حکومت کی وہ شکل ہے جس نے سیاسی ہیئت کی دوسری شکلوں کے ناکام ہو جانے کے بعد ایک متمدن سیاسی نظم کے قیام ودوام کو بہ حیثیت مجموعی کمال کو پہنچایا ہے۔

اس کے بعد عین اس وقت جب کہ یہ بادشاہی نہایت مستحکم طور پر قائم شدہ معلوم ہوتی تھی، اور خاص اس ملک (فرانس) میں جہاں اسے سب سے زیادہ شان وشکوہ حاصل ہو گئی تھی، خیال ورائے کی ایک ایسی تحریک شروع ہوئی جسنے بتدریج آزادی، مساوات اور عمومی حکومت کے لئے پرجوش مطالبہ پیدا کر دیا اور اس مطالبہ نے سب سے پہلے پر زور طور پر شمال امریکہ کی عظیم الشان متفقی جمہوریت کی قسمت کی تکوین وتعیین میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد اس کامیابی سے قوت حاصل کر کے اس نے فرانس کی بادشاہی کا تختہ الٹ دیا۔ بعد ازاں اس سے جو خطرناک تباہی برپا ہوئی اور پھر نپولین نے اسے اپنی فوجی مطلق العنانی سے بدل دیا۔ اس سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے باوجود کہ دوسرے ملکوں میں حب الوطنی کی پرزور تائید کے ساتھ نپولین کی اس چیرہ دست مطلق العنانی اور اس کے انقلابی سوابق کے خلاف رجعت قہقری پیدا ہو گئی، پھر بھی عمومی حکومت کی تحریک کو ان تمام

[1]۔ میں نے بنظر اختصار اس اصطلاح کا استعمال روا رکھا ہے، اگرچہ اس میں بعض شرائط کی ضرورت ہے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ممالک میں جو مغربی یورپی تمدن میں شریک تھے، از سر نو زندگی حاصل ہو گئی، اس نے ترقی کی اور ایک بڑی حد تک اپنے مقصد کو حاصل کر لیا، تا آنکہ ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد اس کے بجائے کہ مطلق العنان بادشاہی متمدن ملکی سلطنت میں حکومت کی معمولی شکل ہوتی، وہ عام طور پر صرف اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ وہ نیم متمدن روس کے لئے موزون ہے اور مغربی یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس خطبۂ زیر بحث اور بعد کے خطبات میں میں یہ چاہتا ہوں کہ انھیں دونوں تحریکوں پر بحث کروں، جو اس مطلق العنانی کے پیدا کرنے کا باعث ہوئیں، اور اسکے بعد آئینی بادشاہی یا جمہوریت کی طرف رہبری کی۔ ایک نقطۂ نظر سے یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے قطعی مخالف ہیں۔ عام الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ایک تحریک آزادی سے مطلق العنانی کی طرف جاتی تھی اور دوسری مطلق العنانی سے آزادی کی طرف۔ لیکن یہ خیال صرف ایک نقطۂ نظر سے ہے دوسرے نقطۂ نظر سے وہ دونوں ایک ہی مسلسل عمل کے جو ایک ہی منزل کو جا رہا ہو، دو مدارج ہیں۔ وہ منزل سیاسی معاشرت کے متعلق ازمنۂ وسطیٰ کے تصور کے بالمقابل اس کا جدید تصور ہے۔ اس تمام مراتب عمل کے ایک مکمل و متوازن خیال کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پر دونوں نقطہائے نظر سے بحث کیجائے۔

۲۔ لیکن اگر اس موقع پر میں قطع کلام کر کے اس آسان سے سوال کا جواب دوں جو میرے مذکورۂ بالا بیان سے پیدا ہو گا تو غالباً میرا یہ فعل منفعت سے خالی نہ ہو گا مگر اس آسان سوال کا جواب ایسا آسان نہیں ہے میں نے سیاسی نظم معاشرت کے متعلق ازمنۂ وسطیٰ و ازمنۂ جدیدہ کے تصورات کا ذکر کیا ہے مگر سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جدید تاریخ کا آغاز کس وقت سے ہوتا ہے؟ اس سوال کا قطعی طور پر جواب دینا مشکل ہے کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات و واقعات سے جدید خیالات و واقعات کی طرف جو تغیر ہوا ہے وہ تدریجی و مسلسل ہوا ہے اور اس امر میں بہت اختلاف رائے ہے کہ اس تاریخ کا تعین کہاں ہونا چاہئے۔ مثلاً یہ کہتا ہوں کہ بلنتشلی[1] اس تاریخ کے تعین میں سنہ ۱۷۴۰ء تک کی تاخیر کرتا ہے

[1] نظریۂ سلطنت (Theory of the state) کتاب اول باب پنجم۔

وہ کہتا ہے کہ "اصلاح" کے زمانہ سے تقریباً ۱۷۴۰ء تک ہم یورپ میں عام طور پر جدید دور کے نوجوانانہ خصائص کے بجائے وہی پرانا زمانہ اور ازمنۂ وسطےٰ کے خصوصیات کا انحطاط دیکھتے ہیں اور ۱۷۴۰ء تک ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی نیا زمانہ آرہا ہے۔ میرا خیال بھی یہ ہے کہ اس بیان میں کسی حد تک صداقت موجود ہے اور اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب ہی یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے بادشاہوں نے اس تغیر کو تکمیل تک پہنچایا کہ وہ ایک حد سے بڑھے ہوئے جاگیری آقا ہونے کے بجائے زمانۂ جدید کے مطلق العناں بادشاہ بن گئے۔

ایک طرف تو یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جاگیری و نیم جاگیری دور میں (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) بادشاہی محض نیم جاگیرانہ تھی۔ دوسری طرف بادشاہی کے ساتھ جاگیری خیالات کے اثرات باقیات اس زمانے کے بعد تک نمایاں رہے جب بادشاہی نے جاگیریت کو دبادیا۔ ایک طرف جاگیری دور میں جہاں بادشاہ سب سے اعلیٰ جاگیری آقا ہوتا تھا وہیں اس کے تعلقات بہ حیثیت مجموعی تمام قوم اور قوم کے تمام ارکان کے ساتھ جاگیرانہ حیثیت سے کچھ مختلف بھی ہوتے تھے، یہ تعلقات قدیم جرمانی و رومانی شہنشاہی خیالات کے امتزاج سے پیدا ہوے تھے، اور شاید اس میں کچھ رنگ ایشیائی بادشاہی کا بھی تھا جو "عہد نامۂ قدیم" سے ماخوذ تھا۔ دوسری طرف جب جاگیری و نیم جاگیری ادارات سلطنت جدیدہ کی ترقی کے سامنے ساقط ہوگئے تب بھی حقوق عامّہ و حقوق خانگی کے جاگیرانہ طرز کا خلط مبحث بادشاہ کی ذات کے ساتھ وابستہ رہگیا۔ بادشاہوں کے ذہن میں یہ جما ہوا تھا کہ وہ ایک طرح پر (اپنے ملک کی) سرزمین اور اس کے باشندوں پر مالکانہ حق رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت محض ایسے عہدہ دار سے کچھ زیادہ ہے جو ملک و قوم کی بہبود کو ترقی دینے کے لیئے مقرر کیا گیا ہو۔ لوئی چہاردہم کے لیئے فرانس کل کا کل بادشاہ کی ملک ہوگیا تھا، ۱۷۱۰ء میں جب اسے اپنی رعایا پر محصول لگانے کا عارضی تردد پیش آیا تو اسے اس خیال سے پھر تیقن ہوگیا کہ وہ اپنی رعایا کی تمام جائداد کا اصلی مالک ہے۔ علیٰ ہذا، اگرچہ سلطنت مثل دیگر املاک کے حکمران کے لڑکوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی تھی تاہم اس وقت تک یہ صحیح سمجھا جاتا تھا کہ شاہی عقد کے ذریعہ سے مثل دوسری املاک کے سلطنتوں

کا بھی اتحاد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہنوور کی بلا انگلستان کے سر اسی وجہ سے آئی۔ یہ خیال ان آثار باقیات سے تھا کہ بادشاہ اگر اپنی رعایا کو ایسے مناقشات کے متعلق جنگ کرنے کو بھیجتا ہو جن سے اس کی رعایا کا کوئی تعلق نہ ہو تو اس میں بادشاہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ تغیر بتدریج ہوا مگر وسیع معنی میں بلنٹشلی کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب سمجھنا چاہیئے۔ اسی زمانہ کے قریب یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے سربرآوردہ بادشاہوں کی نسبت عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا اور وہ خود بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگے کہ وہ ایسے عام عہدہ دار ہیں جنکے ہاتھوں میں سلطنت کے اختیارات کے ہونے کی بابت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عام اغراض کے لیئے مجتمع کر دئے گئے ہیں۔

تاہم میں تخیلات و سیاست میں اس تغیر کو اتنا اہم نہیں قرار دیتا جتنا کہ بلنٹشلی نے خیال کیا ہے۔ سیاسی اختیار کی تقسیم میں اس سے فرق نہیں آتا، نہ اختیارات کے معمولی عملدرآمد پر اس کا کوئی قوی اثر پڑتا ہے، پس بلنٹشلی کی تاریخ میرے خیال میں تاخیر کی جانب منحرف ہو گئی ہے۔

دوسری طرف، عام خیال یہ ہے کہ جدید تاریخ کا آغاز ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے زوال سے سمجھا جائے، اور اس میں شک نہیں کہ جس سال میں مشرق کی قدیم رومانی شہنشاہی کے بجائے ترکوں نے ایک اول درجہ کی یورپی شہنشاہی کی حیثیت سے اپنے قدم جما لیئے اور اس کے ساتھ ہی قسطنطنیہ سے یونانیوں کے نقل وطن کی وجہ سے مغربی یورپ میں علوم کی تجدید میں پر زور حرکت پیدا ہو گئی، یہ سال ایک سے زائد اعتبارات سے پر از نزاکت سال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے جدید تاریخ کا آغاز مناسب طور پر مختلف اوقات میں مقرر کیا جا سکتا ہے۔

مگر، اس موجودہ سلسلۂ بحث کی غرض کے لیئے مجھے بلنٹشلی کی تاریخ جس طرح بہت بعد از وقت معلوم ہوئی ہے اسی طرح یہ تاریخ بہت قبل از وقت معلوم ہوتی ہے اس زمانے میں بادشاہی بدستور جاگیریت سے کشمکش میں مبتلا تھی، اور ازمنۂ وسطے کے پارلیمنٹی ادارات یعنی جمعیتہائے طبقات کی طرف سے دقتیں حائل ہو رہی تھیں البتہ فرانس میں شاہی کو صاف طور پر تقویت حاصل ہوتی جا رہی تھی اور پندرھویں صدی کے

ختم ہونے کے قبل شاہی کا غلبہ عارضی طور پر مکمل ہوگیا تھا، اور پندرھویں صدی کے اختتام پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرانس، انگلستان اور اسپین سب جگہ یکساں طور پر زوردار بادشاہ پیدا ہوگئے تھے اور شاہی کے غلبہ کی جانب نمایاں قدم اٹھ رہے ہیں، مگر یہ سلسلۂ عمل ہنوز نامکمل تھا، فرانس میں بادشاہی کی طاقت "اصلاح" کی کشمکش سے پھر کم ہوگئی سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے اوائل میں جو ملکی مناقشات پے درپے برپا ہوئے وہ صرف مذہب پروٹسٹنٹ اور مذہب کیتھولک کی جنگ وجدل تک محدود نہ تھے، بلکہ امرا بھی بادشاہ کے خلاف جد وجہد کر رہے تھے! انگلستان میں شاہان ٹیوڈر نے اپنی حکمرانی میں مطلق العنانی کے اظہار کو بہت ہوشیاری سے بچایا اور وضع قوانین پر پارلیمنٹ کی ظاہری نگرانی کو قائم رکھا۔ اسپین میں بھی اس وقت تک پارلیمنٹی روایات بدستور قوی تھے اور فرڈیننڈ قوت کے بجائے زیادہ تر تدبیر و ہوشیاری سے اپنی بات چلاتا رہا۔ اسپین میں مطلق العنانی کا استحکام فلپ دوم (۱۵۵۶-۱۵۹۵) کے وقت میں ہوا، اور فرانس میں مطلق العنانی کے قیام واستحکام کا آخری و قطعی کام سترھویں صدی میں جلیل القدر رشلیو اور اس کے بعد مازارین کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ کامل فتحمندی کے ساتھ بادشاہی کا قرار "فروند" کی کشمکش کے بعد ہوا۔ اسی طرح یہ دور سترھویں صدی کے وسط تک آجاتا ہے اور یورپ میں بہ حیثیت مجموعی یہی وہ زمانہ ہے جب اس جانب نہایت ہی قطعی رجحان محسوس ہونے لگا ہے۔

چنانچہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یورپ کی تاریخ میں مطلق العنانی کی جانب سب سے زیادہ حیرت ناک تغیر ۱۶۶۰ء میں ڈنمارک میں وقوع میں آیا جہاں بادشاہ نے شہریوں اور پادریوں کی مدد سے امرا کو مغلوب کر لیا۔ یہ شہری اور پادری امرا سے اس وجہ سے غضبناک تھے کہ وہ محصول میں اپنا موزوں حصہ برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے ۱۶۶۵ء میں بادشاہ نے ایک اساسی قانون کا نفاذ کیا جس کے بموجب خود اسے اور اس کے ورثا کو غیر محدود اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگیا۔ پرتگال میں ازمنۂ وسطیٰ کی نیابتی جمعیت کورٹس کا آخری اجلاس ۱۶۹۷ء میں ہوا، اور اسی صدی کے ربع ثالث (یعنی ۱۶۵۰ء سے ۱۶۷۵ء تک) میں برانڈن برگ، کلیوز اور پروشیا میں (جو بعد کو پرشیا کے اجزا بن گئے) وہ کارروائی جاری رہی جس کے ذریعہ سے

"ولی اعظم" نے طبقات کی جمعیتوں کے اختیارات کو توڑنا شروع کر دیا اور باوجود شدید مقاومت کے اپنے شاہی اختیار کو ان جمعیات کے مالی اقتدار سے آزاد کرنے لگا کم از کم پروشیا میں تو ایسا ضرور ہوا۔

پس اپنے موجودہ مطالعے کے نقطۂ نظر سے اس معرکۃ الآرا سوال کا کہ "جدید تاریخ کس وقت سے شروع ہوتی ہے" اس طرح جواب دینا چاہتا ہوں کہ اس کے آغاز کو سترھویں صدی کے وسط میں قرار دوں اور "نشاۃ جدید" اور "اصلاح" اور اس کے بعد کے مذہبی مناقشے کے دور کو یہ قرار دوں کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ و ازمنۂ جدید کے خیالات کے درمیان ایک طولانی اور انقلابی دور کا کام دیتے ہیں۔ سترھویں صدی کے وسط میں (۱۶۴۸ء کے) معاہدۂ وسٹ فیلیا نے مذہبی جنگوں کا دور ختم کر دیا تھا اور اس وقت اس کے کچھ بعد یہ صاف عیاں ہو گیا کہ مغربی یورپ کی بیشتر سلطنتوں میں بادشاہ اپنی سلطنت کے اندر کے ان عناصر پر غالب آگیا تھا جو اس کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے اور جو امرائے عظام ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہ کی سطوت و شوکت کے حریف بنے ہوئے تھے ان کے جانشینوں پر بادشاہ کو قطعی غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ منقسم عالم عیسوی کی کمزور شدہ مذہبی طاقت پر بھی بادشاہوں کو آخر الامر فوقیت حاصل ہو گئی حالانکہ جب مغربی عالم عیسوی متحد تھا تو اس مذہبی طاقت کے دعاوی بہت دور تک پہنچے ہوئے تھے اور تیرھویں صدی میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جانشین عیسیٰ کو دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں پر ایسا اقتدار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے انھیں معزول کر سکتا ہے۔ بادشاہوں نے ایک بڑی حد تک ان شہروں کو اپنی حکومت میں جذب کر لیا تھا جنھوں نے مغربی یورپ کے مختلف حصص میں بہت کچھ خود مختاری حاصل کر لی تھی، اور انجام کار میں یہ بادشاہ اکثر صورتوں میں ان نیابتی جمعیتوں پر بالکلیہ حاوی ہو گئے تھے جنھوں نے دور تقلیب کی صدیوں میں (جبکہ مغربی یورپ کی سلطنتیں جاگیریت کے تحلیل و انتشار کے باعث ترقی کر رہی اور مملکت جدیدہ کے کامل تر اتحاد و تنظم کی طرف جلد جلد قدم بڑھاتی جا رہی تھیں) بادشاہوں کی قوت کو روکا اور اس میں توازن پیدا کیا تھا۔ اس طرح بادشاہوں کے غلبے کی وجہ سے آخر الامر تمام مغربی یورپ میں ایسی سلطنتیں قائم ہو گئیں جن کا اندرونی ارتباط، اتحاد و نظم،

اس منقسم اقتدار (مشکوک) ارتباطا اور ناکمل نظم سے نمایاں طور پر مغایر معلوم ہوتا ہے جو ازمنۂ وسطے کے ادارات کے خصوصیات میں داخل تھے۔

۳۔ ہم اس تقلیب پر اب زیادہ گہری نظر ڈالیں، جب ہم ازمنۂ وسطے میں انسان کے سیاسی و معاشری تعلقات کا مقابلہ ان تعلقات سے کرتے ہیں جو یونانی ور ومانی تاریخ سے ظاہر ہوتے ہیں یا اس دور کے تعلقات سے کرتے ہیں جسے میں "جدید" کے لفظ سے ممیز کرتا ہوں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان میں (جواز قانونی و عدم جواز قانونی) کا عجیب و غریب اجتماع پایا جاتا ہے۔ ان میں باضابطہ جواز قانونی کی خصوصیت اس وجہ سے موجود ہے کہ ہر شخص کو حقوق حاصل ہیں۔ یہ قدیم جمہوریات کی تہذیب و تمدن کے مقابلہ میں بہت بڑی ترقی ہے جن میں ایک بہت بڑا طبقہ غلاموں کا ہوتا تھا جو ازروئے قانون اپنے آقاؤں کی ملک ہوتے تھے تخت نشین بادشاہ سے لیکر کدال چلانے والے نیم غلام تک ازمنۂ وسطے کے ہر طبقے کے اہم حقوق تھے جو قانون ورواج کے ذریعے سے محفوظ تھے، لیکن اس کے بعد ازمنۂ وسطے کی سلطنتوں میں عملاً خلاف قانون حالات کی صورتیں بھی موجود تھیں کیونکہ کسی شخص کو کافی طور پر یہ طمانیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کر سکتا تھا جب حقوق کی نسبت کوئی مناقشہ برپا ہوتا تھا اور حیران کن تنوع، پیچیدگی اور تغیر کی وجہ سے ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے، یا جب جبرو دستی کے ساتھ ان حقوق کی علانیہ خلاف ورزی کیجاتی تھی تو سلطنت کے اندر کوئی مرکزی اعلیٰ قوت ایسی نہیں تھی جو اس ہنگامے کا تصفیہ قطعی طور پر کر سکے اور اگر کوئی شخص یا گروہ اس فیصلے سے علانیہ سرتابی کرے تو قوم کی منضبط مادی قوت اپنے ناقابل اندفاع زور سے اسے پامال کردے۔

لیکن جدید سلطنت کے مسلمہ عام نظریے میں اس قسم کی قوت کا ہونا لازمی فرض کر لیا گیا ہے۔ درحقیقت سیاسی قوم کی جو تعریف عام طور پر کی جاتی ہے یہ مفہوم خود اس تعریف میں داخل ہے حکومت کے تشریعی عاملی و عدالتی اعضا کے تقرر، فرائض اور باہمی تعلقات کے بہترین طور پر طے کرنے کی بابت زمانۂ جدید کے تمام مباحث میں حکومت کی مختلف شکلوں کے درمیان جو کچھ بھی اختلاف ہو

لیکن کہیں نہ کہیں کوئی طاقت ایسی ہوگی جو آخری طور پر یہ قرار دے سکے کہ قانون کیا ہے اور جو خاص مناقشات پیدا ہوں ان کے طے کرنے میں وہ اس قانون کا قطعی نفاذ کر سکے اور کارگر طور پر اسے عمل میں لا سکے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مغربی یورپ کی ہر ایک سلطنت میں اس قسم کی طاقت اپنی مکمل حالت میں موجود ہے لیکن اگر مکمل حالت میں نہیں تو کم از کم اس کے غیر مکمل وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فسانہ وار دلچسپی کا وہ عنصر جو از منۂ وسطے کے معاشرے میں اس امر سے پیدا ہو گیا تھا کہ افراد و طبقات اگر چاہیں تو اپنے حقوق کے لئے خود جنگ کرنے کے لئے آمادہ رہیں، یہ دلچسپی فی الجملہ (وسیع معنی میں) جدید سیاسی معاشرے سے معمولی حالات کے اعتبار سے مفقود ہو چکی ہے۔

یہی وہ نقطۂ نظر ہے کہ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو مطلق العنان بادشاہی کی تغلیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس راستہ کی ایک منزل ہے جس کی ایک آگے کی منزل انیسویں صدی کی آئینی بادشاہی ہے۔ بادشاہی کی فتحمندی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت کے اندر تمام دوسرے اقتدارات کو موثر طور پر بادشاہ کے اقتدار کے تحت میں لا کر پہلی مرتبہ تقریباً مکمل اتحاد و نظم کا شیوع عمل میں آیا ہے، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایسا ہونا ہی اس سوال کی توجیہ کا ایک اہم جزو ہے کہ کیوں تغیر واقع ہوا۔ تمدن کی آہستہ رو ترقی جس قدر بڑھتی رہی اسی قدر مکمل انتظام کی ضرورت بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوتی گئی اور اس لئے پرزور افراد یا جماعات کی طوائف الملوکی کی مقاومت کے زیادہ کامل طور پر دبانے میں رائے عامہ کی تائید روز بروز زیادہ حاصل ہوتی گئی۔ قومی اتحاد کے جذبے نے ترقی کی اور اس کے ساتھ اس احساس نے بھی کہ نہ صرف اندرونی نظم و امن کے لحاظ سے بلکہ غیر اقوام کی کشاکش میں تقویت حاصل کرنے کے لئے بھی اس اتحاد کو اور زیادہ مکمل بنانا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کوئی شے جو قوم کے اندر "شاہی در شاہی" قائم رکھنے کی طرف مائل ہو اسے یہ جذبۂ حب الوطنی نفرت و بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتا تھا اور اس لئے اس قسم کے تمام طوائف الملوکانہ قومی میلانات کے ساتھ بادشاہ کی جنگ و جدل میں یہ جذبہ بادشاہ کی پرزور تائید کرتا تھا۔

یہ قوتیں تغیر پذیر اور مختلف حیثیت و حالت کی تھیں اور اس لیئے بادشاہی کی بنا پر زیادہ مکمل نظم و امن کے حصول کی جد و جہد میں طوالت واقع ہوئی اور اکثر صورتوں میں اس میں نمایاں مد و جزر بھی ہوتا رہا۔ پر زور بادشاہ کے تحت میں بادشاہی کو قوت حاصل ہو جاتی تھی مگر زیادہ تر باہمتگی اور پھر کمزور بادشاہ کے تحت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قوت زائل ہوگئی اور کبھی کبھی یہ ابتری دفعۃً واقع ہوتی تھی۔ یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کشاکش میں ہمیشہ بادشاہ کو ہی فتح حاصل ہو جیسا کہ رومانی جرمانی شہنشاہی میں ہوا لیکن اگرچہ جرمنی میں خود بادشاہ مظفر و منصور نہ ہوتا ہو مگر شاہی شکل حکومت یہاں بھی زیادہ فیروزمند رہی کیونکہ ماتحت حکمران عملاً بادشاہ ہو گئے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بادشاہ کو قوم کے ہر ایک عنصر کے ساتھ باری باری سے کشمکش کرنا پڑی۔ کبھی امرا کے ساتھ، کبھی شہروں اور کبھی مذہبی جماعتوں کے ساتھ، اور مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے لحاظ سے اس کشمکش نے ہر ایک واقعۂ خاص میں مختلف صورتیں اختیار کیں کبھی کبھی پر زور امرا ان دوسرے خاندانوں کی بھی نمائندگی کرتے تھے جنھیں قدیمی اختیارات اور بڑی جاگیریں حاصل تھیں جن سے وہ بادشاہ کے حریف بنے ہوئے تھے جب یہ لوگ زیر ہو جاتے تھے تو کبھی کبھی یہ کشمکش خود شاہی خاندان کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کے ساتھ شروع ہو جاتی تھی جنھیں موروثی بادشاہوں نے متمول و قوی بنا دیا تھا جیسا کہ فرانس میں واقع ہوا۔ سابق جاگیری زمانوں میں یہ کشمکش بالعموم طاقتور باجگزاروں کے ساتھ فرداً فرداً ہوتی تھی پھر اس کے بعد جب اتحاد و اتفاق کا میلان بڑھا تو یہ کشمکش امرائی لیگوں یا انجمنوں سے یا جیسا کہ شاید جرمنی میں ہوا شہروں کی لیگوں کے ساتھ ہونے لگی۔ علیٰ ہذا کلیسائی ادارات کے ساتھ جو تصادم ہوا اس نے بھی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں یہ کشمکش مغربی عالم عیسوی کے ایک کلیسا کے ساتھ ہوئی جو روما کے اس غیر ملکی حکمراں کے تحت میں متحد تھا جس کا مقصد اپنی مذہبی حکومت کی فوقیت کا قائم کرنا تھا۔ اس کے برخلاف اس کی بادشاہی کے آخری غلبے کے عین قبل جو دور گزرا ہے جسے مراعات پر لوتھر کے اعتراض کرنے کے وقت سے صلح وسٹ فیلیا تک کا زمانہ کہنا چاہیئے اس دور میں کلیسا جن اجزا میں منقسم ہو گیا تھا وہ مغربی یورپ کے سیاسی نظم و ترتیب کو

ابتر کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے کیونکہ ان اجزا کے حدود تقسیم مختلف قوموں کے حدود تقسیم کو منقطع کرتے تھے۔ لیکن ان تمام حادثات و تغیرات کے درمیان ان عام میلانات کا غلبہ جو بادشاہی کو فتحمندی کی جانب لئے جا رہے تھے، اور بھی زیادہ نمایاں طور پر ظاہر تھا، تمدن و تہذیب کی ہوا اسی کے موافق چل رہی تھی کیونکہ شاہی قوت کی ترقی کے ساتھ ساتھ عملاً یہ لازمی تھا کہ سیاسی نظم و امن کو بھی ترقی ہو۔

۴۔ جب ہم اس سوال کی منفی حیثیت سے اس پر غور کرتے ہیں اس وقت بھی اس امر سے کہ بادشاہی قوم کے اتحاد کی نمائندگی کرتی تھی ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ ازمنۂ جدیدہ کی سلطنت کے لئے جس مزید نظم و امن کی ضرورت تھی وہ اول ہی سے اس آئینی بنیاد پر کیوں نہیں قائم ہو سکتا تھا جو اسے واقعاً انیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا جواب مجملاً یہ ہے کہ ازمنۂ وسطے کے آخری حصہ میں بادشاہ کو جن طبقات سے سابقہ پڑتا تھا اور حکومت کے کام چلانے کے لئے کسی نہ کسی طرح ان کی رضامندی حاصل کرنا تھی، ان طبقات کی حالت یہ تھی کہ جب یہ لوگ جمعیتہائے طبقات میں مجتمع ہوتے تھے اس وقت یہ بالعموم اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ایسا کامل دپائندار اتحاد پیدا کریں جو بتدریج طبقوں کی نمایندگی کو قوم کی نمایندگی میں بدل دے۔ انگلستان اس میں ایک استثنا ہے اور میں اس کی لم کی تشریح کر چکا ہوں لیکن اکثر صورتوں میں ازمنۂ وسطے کی جمعیتوں میں مختلف طبقوں کے نمائندے (جن کے متعلق سابق خطبہ میں بحث ہو چکی ہے) خالصاً و ظاہراً اپنے مخصوص فوائد کے نمائندے و حامی رہتے تھے، جس کی وجہ سے بادشاہ کے بالمقابل جد و جہد میں وہ دہری کمزوری میں مبتلا ہو جاتے تھے ایک تو باہمی عدم اتحاد کی کمزوری تھی، دوسری کمزوری اس وجہ سے لاحق ہو جاتی تھی کہ نمائندوں کا ہر ایک گروہ کل کے اغراض کے مقابلہ میں ایک جزو کے اغراض کی حفاظت کرتا یا اس کا اظہار کرتا تھا، وہ ایک حصہ کے امتیازات خاص کو قوم کے مشترک اغراض کے مقابلہ میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اور جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں انھیں حکومت میں حصہ حاصل کرنے کا موقع انھیں مالیات کی وجہ سے مل سکتا تھا اور یہی وہ موقع تھا جہاں مختلف اغراض کی علحدگی زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی۔

لیکن جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو علاوہ اس کمزوری کے جوان جمعیتوں میں پائی جاتی تھی جو ازمنۂ وسطےٰ کے آخری حصہ میں اقتدار اعلیٰ کے لئے بادشاہ کی حقیقی یا غلبی حریف معلوم ہوتی تھیں، یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کیوں خالص بادشاہی کو وہ پہلی شکل ہونا چاہیئے تھا جس میں واقعتاً اقتدار اعلیٰ کا وہ تصور مجسم ہو کر نمودار ہوا جو نظم و امن کے قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ درحقیقت ہمیں اس خاص صورت پر صرف اس دلیل کے عاید کرنے کی حاجت ہے جو میں اپنے پہلے خطبے میں اس امر کے متعلق بیان کر چکا ہوں کہ حکومت کی دوسری شکلوں کے مقابلے میں متمدن نظمہائے معاشرت کے اندر بادشاہی کو عام طور پر کیوں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کسی طرح کی حکومت کیوں نہ ہو اس میں استقامت عزم و عمل کے حاصل کرنے کے متعلق ہمارے ذہن میں جو تصور قائم ہے اس کے حصول کے لئے سب سے زیادہ سادہ و کارگر صورت یہی بادشاہی کی ہے۔ اگر ہم اس مقصد کو ازمنۂ وسطےٰ کے آخری دور کے اصحاب فکر کے عالمانہ انداز میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ وہ "اتحاد" جو ایک منتظم سلطنت کی خصوصیت خاص ہونا چاہیئے اس کا حصول سب سے زیادہ آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ اسے اس فرد کی حکمرانی کے تحت میں رکھا جائے جو حقیقتاً و اصلاً ایک ہے۔

میرا خیال ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا جدید اصول مسلمہ جب پہلی مرتبہ یورپ کے سیاسی خیال کی تاریخ میں نمودار ہوا اگر ہم اس کی جانچ کریں تو خیال کا یہ میلان بہت ہی نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ژان بودین (بودینوس) وہ مصنف ہے جس نے سب سے پہلے اس مسلمہ کو صفائی اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور اس نے اپنی جلیل القدر تصنیف ڈی ریپبلیکا (۱۵۷۶ء) میں [1] جس طرح اس کی توضیح و تشریح کی ہے، جب ہم اس کی جانچ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اصولاً یہ مسلمہ جس طرح بادشاہی پر عاید ہوتا ہے اعیانیت و عمومیت پر اس سے کم عاید نہیں

---

[1] بودین کی کتاب کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ علم سیاست کے متعلق زمانۂ جدیدہ کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے مگر اسے ایک عارضی تصنیف سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔

ہوتا لیکن جیسا کہ سر فریڈرک پولک نے کہا ہے بودین فوراً اس طرف مائل ہوگیا ہے کہ جن سلطنتوں میں بادشاہ کا وجود ہے وہاں نظریاتی فرمانروا کو حقیقی بادشاہ کے مرادف قرار دے[عله] آسٹن کی طرح اس کی بھی یہ رائے ہے کہ ہر ایک خود مختار قوم میں جس پر قانون کی حکومت ہوتی ہو ایک ایسی طاقت ہونا چاہئے جس سے قوانین جاری ہوں اور جو قانون کو قائم رکھے کیونکہ یہ ایک فضول و مہمل خیال ہے کہ قوانین کو بطور خود ہی ٹکسال اور ناقابل تنسیخ سمجھ لیا جائے" اس سے بحث نہیں کہ یہ طاقت ایک شخص واحد میں مرکوز ہو یا مختلف شخصوں کو حاصل ہو اور چونکہ یہ طاقت قانون کا منبع ہوگی اس لئے وہ خود قانون سے بالاتر ہوگی اور اس لئے قانوناً اس کی تحدید نہیں ہوگی[عله٢] میں کہتا ہوں کہ اصولاً وہ اس غیر محدود طاقت کو ان تمام حکومتوں میں موجود پاتا ہے جو حکومت کے نام کی اہل ہیں وہ اسے خود مختار سلطنت کی ہستی کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔ درحقیقت اس کی کتاب میں ازمنۂ وسطےٰ کے تصورات کے مقابلہ میں جدید سلطنت کا عام اساسی تصور نظر آتا ہے اور واقعی حکومتوں کی ترتیب ورہی میں وہ اصولاً یہ چاہتا ہے کہ وہ بالکلیہ واقعات کے زیر ہدایت چلیں۔ لیکن عملاً جب وہ اس اصول کا اطلاق موجودۃ الخارج سیاسی امور پر کرنا چاہتا ہے تو اس کا میلان شدت کے ساتھ اس طرف ہو جاتا ہے کہ اگر اس سے ممکن ہو تو وہ نظریاتی صاحب اقتدار اعلےٰ کو حکمراں بادشاہ کے مرادف بنا دے۔ اس کے وقت کی جرمانی شہنشاہی کی صورت میں ایسا کرنا درحقیقت واقعات سے جنگ کرنا تھا اس لئے وہ شہنشاہی کی حکومت کو اعیانیت کے تحت میں شمار کرتا ہے مگر اسے اس میں شک نہیں ہے کہ نظریاتی صاحب اقتدار اعلیٰ کو وہ جس غیر محدود اختیار سے متصف کرتا ہے فرانس کے بادشاہ کو وہ اختیار حاصل تھا

عله۔ تاریخ سیاسیات صفحہ ۲۰۹۔

عله٢۔ یعنی قطعی قوانین کے ذریعہ سے اس کی تحدید نہیں ہوگی کیونکہ بودین کے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے انکار کرے کہ صاحب اقتدار اعلیٰ قانون قدرت کے حصر سے بھی باہر ہیں۔

جیساکہ میں بعد کے ایک خطبے میں ظاہر کروں گا اس کے بعد کی صدی میں ہابس کے متعلق بھی کم وبیش یہی کہا جا سکتا ہے۔ مطلق العنانی کے متعلق اس کا اصول مسلمہ بادشاہی اعیانیت و عمومیت کے درمیان قطعاً غیر جانبدارانہ حیثیت رکھتا ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا میلان بادشاہ کی جانب تھا۔ اس کے عام نظریے کا مطالبہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں مطلق العنان طاقت موجود ہونا چاہئے مگر بادشاہ کے اندر اس طاقت کے مرکوز ہونے کو وہ مرجح سمجھتا ہے۔

خطبۂ بست و سوّم

مطلق العنان بادشاہی کی جانب میلان (بسلسلۂ سابق)

ا۔میں نے سابق خطبے میں واقعات وخیالات کی یکساں تحریک کی جس مختصر خصوصیت کے دکھانے کی کوشش ہے اس سے میرے خیال میں اس تسبب کی خاص روش معلوم ہو جاتی ہے جس نے بتدریج وبہ تغیر حالات مگرفی الجملہ قطعی طور پر سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کی خالص بادشاہی کی جانب رہبری کی ہے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہمیں مسیحی دینیات اور رومانی قانون کے خاص اثرات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے میں اس کے قبل یہ بھی ظاہر کرچکا ہوں کہ ایک حد تک ان دونوں صورتوں میں اور خاص کر رومانی اصول قانونی کے معاملہ میں محوشدہ رومانی شہنشاہی کا بالواسطہ اثر بھی پڑا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک کی جانچ کریں اور پہلے دینیات کے اثر کو لیں جس پر بہت فکر کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ درحقیقت یہ اثر پیچیدہ ہے اور اس کے مختلف عناصر مختلف طریق پر عمل کرتے ہیں۔

بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ پادری "بادشاہوں کے حقوق ربانی" کے جس اصول کا وعظ (مثلاً سترھویں صدی میں) بادشاہ کی طرفداری میں کہا کرتے تھے وہ ازمنۂ وسطیٰ کا اصول تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر صرف ایک حد تک۔ اس میں شک نہیں کہ سترھویں صدی کی راسخ الاعتقاد مسیحیت کا یہ اصول نظام عالم

اور انسانی معاشرے کے متعلق ازمنۂ وسطیٰ کی رائے وخیال کا بقیہ یادر نہ تھا مگر یہ ایسا بقیہ تھا کہ حالات متغیر ہو گئے اور یہ اصول بدستور باقی رہا، اس لئے اس کا سیاسی اثر بالکل ہی بدل گیا تھا۔ لاریب کہ ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر یہ دعویٰ کرتے تھے، کہ جائز بادشاہ ربانی حقوق کی رو سے حکومت کرتا ہے لیکن اس مسلمہ سے بادشاہوں کے شاہی اختیارات کا تعین اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ زمانۂ جدید کے کسی قدیم الخیال عیسائی کی رائے میں انجیل کے اس مسلمہ اصول سے کہ "جو اختیارات الحال موجود ہوں وہ خدا کی مرضی سے ہیں"، برطانی دستور سیاسی میں حکومتی فرائض کی تقسیم کا تعین ہو سکتا ہے۔ ازمنۂ وسطے کے خیال کے مطابق تمام قدرت اور تمام سیادت خدا کے حکم سے اور خدا کی جانب سے تھی۔ بر سبیل تقریر، یہ مقولہ شاہ فرانس پر اس سے زیادہ صادق نہیں آتا تھا جتنا ان امرائے عظام پر صادق آتا تھا جو اپنے ایسے موروثی حقوق کے بموجب جن میں بادشاہ نہ کمی کر سکتا تھا اور نہ انہیں واپس لے سکتا تھا، اسی بادشاہ کے تحت میں جاگیروں پر قابض تھے

اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ارباب فکر اپنے مخصوص اصول دینیات کی وجہ سے بادشاہی کو سب پر ترجیح دیتے چلے جاتے تھے۔ ان کے خیال میں حکومت کی بہترین شکل وہ تھی جو تمام کائنات پر ایک خدائے عزوجل کی حکومت سے قریب ترین مشابہت رکھتی ہو۔ چنانچہ "حکمرانی والیان ملک" نامی کتاب میں (جو ٹامس آکوئی ناس کی جانب منسوب کی جاتی ہے) یہی دلیل پیش کی گئی ہے چونکہ مذہب عیسوی کا نشوونما بادشاہی کے تحت ہوا تھا اس لئے سیاسی نظم کے متعلق کلیسا کا فطری تصور بادشاہی کا تھا۔ نیز اعلیٰ دنیاوی حکمران کی تقدیس کے ذریعہ سے کلیسا کے اقتدار حاصل کرنے کا دعویٰ بھی بالطبع بادشاہی سے مطابقت رکھتا تھا، یہ خیال کرنا مشکل تھا کہ کسی مجلس یا جمعیت عامہ کی تقدیس موثر اسم کے ذریعہ سے عمل میں آ سکتی تھی۔ اس لئے عیسائیت کا خیال اولاً وابتدائً شاہی کا تھا لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ یہ تخیل ارباب فکر کو اس طرف نہیں لیجاتا کہ جب وہ عالم عیسوی کا اتم واکمل خیال اپنے ذہن میں قائم کریں تو مغربی عالم عیسوی میں جو جداگانہ قومیں قطعی طور پر منضبط ہو گئی تھیں، ان کے بادشاہوں کے قطعی خود مختارانہ اقتدار اعلیٰ کو اصولاً تسلیم کریں۔ کم از کم یہ ان کی اولین حالت میں اور ازمنۂ وسطے کے نہایت ہی قطعی تصور کے موافق

یہی کیفیت تھی) اس خیال نے زیادہ تر ارباب فکر کے دلوں میں یہ امنگ پیدا کی کہ ایک ایسی بادشاہی تنظیم ہو جس میں ایک ہی سرگروہ کے تحت میں تمام عیسوی دنیا متحد ہو جائے۔ ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر کے خیال کے بموجب بنی نوع انسان کا تمام نظم معاشرت اپنی منتہائی حالت میں نہ صرف ایک عالمگیر کلیسا میں منضبط ہونا چاہئے بلکہ اسے ایک عالمگیر دنیاوی ملت بھی بننا چاہئے کلیسا کو شاہانہ طور پر ایک پوپ کے تحت میں اور دنیاوی نظم سلطنت کو ایک شہنشاہ کے تحت میں منضبط ہونا چاہئے جن میں سے ہر ایک انجیلی قصص کی ان "دو تلواروں" میں سے ایک تلوار سے کام لے جو مذہبی اور دنیاوی حکومت کی علامت قرار دی گئی تھیں۔

ان دینی و دنیاوی دو تلواروں اور دو حکومتوں کی اس حقیقی دوگونہ نوعیت کے اعتبار سے جس طریق پر عیسوی نظم سلطنت کے حقیقی اتحاد کا قائم رکھنا منظور تھا اس کے سوال کے متعلق جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ازمنۂ وسطے کے خیالات کے تمام دوران میں اصولی بحثیں برپا رہیں، کم از کم ہلڈے برانڈ کے وقت سے تو ایسا ہی رہا۔ اس مذہبی فریق کی رائے کے مطابق جو انوسنٹ سوم اور بونی فیس ہشتم کے دعادی کی تائید کرتا تھا یہ اتحاد اس طور سے حاصل ہو سکتا تھا کہ دنیاوی تلوار کو سیدھی طرح پر مذہبی تلوار کے تابع کر دیا جائے (ان کی دلیل یہ تھی کہ) پوپ خدا کی جانب سے اخلاقی مسائل کا اعلیٰ فیصلہ کن مقرر کیا گیا تھا اور چونکہ سیاسیات کے تمام مسائل دراصل اخلاقیات کے ہی مسائل ہیں اس لئے جیسا کہ بونی فیس کا دعوی تھا پوپ خدا کی جانب سے تمام بادشاہوں اور بادشاہیوں سے بلند تر تخت عدالت پر بٹھایا گیا ہے" یہ دعادی اگر پورے ہو جاتے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام مغربی عالم عیسوی کلیۃً ایک مذہبی نظم سلطنت میں بدل جاتا حالانکہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی عملاً ایسا نہیں ہوا، لیکن ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر کا ایک ذی اثر گروہ ان دعادی پر رد و قدح کر رہا تھا اور وہ مذہبی حکومت کی اعلیٰ منزلت کی تعبیر یہ کرتا تھا کہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ بنی نوع انسان کی اس اخلاقی بہبود کو اصلی اہمیت حاصل ہے جس سے مذہب کا تعلق ہے، اس کا یہ مقصود ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا حق شامل ہے جو دنیاوی حکمرانوں پر ان کے حد اقتدار کے اندر ان پر غالب آجائے، اور اسلئے

یہ ارباب فکر عالم عیسوی کے منتہائے اتحاد کو ربانی سر گروہ میں مرکوز بتاتے تھے جس کی نمائندگی مذہبی و دنیاوی حدود کے اندر بالترتیب پوپ اور دنیاوی بادشاہ کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

بعد ازاں جبکہ شہنشاہی کی روز افزوں کمزوری نے شہنشاہ کے تحت میں دنیاوی اتحاد کے عدم امکان کو روز بروز زیادہ واضح کر دیا تو سیاسیات پر لکھنے والے کلیسائی گروہ نے معاً علٰحدہ علٰحدہ قوموں کی بادشاہی کی بے لیت و لعل تائید نہیں شروع کر دی کیونکہ دنیاوی طاقت کے ساتھ ان کے تصادم نے انھیں یہ راستہ دکھایا کہ وہ بلاواسطہ ربانی مبداء حکمرانی مذہبی کے بالمقابل سلطنت کے فطری مبداء پر زور دیں کہ یہ طریق بھی راہ دور و دراز سے اسی منزل مذہبی کو پہنچ جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ از منۂ وسطیٰ کے موخر زمانہ میں یعنی تیرھویں صدی کے بعد سے یہ نہایت ہی مسلمہ اصول ہو گیا تھا کہ دنیاوی حکومت کی بنا قوم کی رضامندی پر ہے کیونکہ قوم کو یہ خلقی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے حکومت کی جس شکل کو چاہے اختیار کرے۔ پس اس طرح اگرچہ یہ مسلمہ کہ "حکمراں خدا کا نائب ہے" باقاعدہ ترک نہیں کر دیا گیا تھا مگر عملاً یہ مسلمہ بے حقیقت سا ہو گیا اور اب بادشاہی کو اس سے کسی قسم کی تائید و تقویت نہیں حاصل ہوتی تھی۔ اس کے بعد مذہبی مناقشات کے تمام زمانے میں مذہب عیسوی کا اثر مخلوط و متنوع رہا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جب (اپنی ضد یعنی) بالترتیب پروٹسٹنٹ اور کیتھولک حکومتوں کے تحت میں ہوتے تھے تو دونوں میں یہ قوی میلان پایا جاتا تھا کہ بادشاہی کو دوسری طاقتوں کے تحت میں لانے کے سیاسی اصول کی جنبہ داری کریں، لیکن ۱۶۴۸ء کے بعد جب یہ دور ختم ہو گیا اور عالم عیسوی کے مسلمہ حصوں نے ہمیشہ کے لئے ان مذہبی کوششوں کا خاتمہ کر دیا کہ مذہبی حکومت کی کوئی تنظیم پوپ کے تحت میں قائم کی جائے، تو پھر اصلاح شدہ اور کیتھولک دونوں فرقوں کا حاوی اثر قطعی طور پر بادشاہی کی طرف ہو گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم و امن اور خاصکر مذہب میں نظم بادشاہی کی تائید کا جو فطری میلان موجود تھا اب اسے پورے طور سے پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا، چنانچہ اس نص کی کہ "موجود الوقت اختیارات خدا کی مرضی سے ہیں" سترھویں صدی میں راسخ الاعتقاد مصنفوں نے

یہ تفسیر کی کہ کوئی عیسائی جائز بادشاہ کی مقاومت کرنے کا قانوناً مجاز نہیں ہے [۱]

پس بہ حیثیت مجموعی "اصلاح" اور اس کے نتائج بادشاہی کی طرفداری میں اہم اثر رکھتے تھے، مناقشہ کی صدی ختم ہو جانے کے بعد ان ملکوں میں بھی جو نہایت ہی خالص طور پر کیتھولک تھے، دنیاوی فرمانروائی کے متعلق پوپ و بادشاہ کی رقابت اس طرح ختم ہو گئی کہ پھر کبھی واپس نہیں آئی۔ کلیسا کو اپنا بہترین مفاد اسی میں نظر آتا تھا کہ وہ بادشاہ کی جانب مائل رہے، اس سے مادی تائید حاصل کرے اور خود اسے اخلاقی تائید پہنچائے، اور ان ممالک میں جہاں اینگلیکی یا لوتھری عقیدہ رائج تھا کلیسا کی جانب سے تاج کی اطاعت اور بھی نمایاں تھی۔

اصلاح کی وجہ سے عالم عیسوی میں جو تفرقہ پڑ گیا تھا اس کا وسیع میلان دنیاوی طاقت کو تقویت دینے کا تھا اور اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال اسپین کی حالت میں ملتی ہے۔ اصلاح کے بعد کے دور میں اسپین راسخ الاعتقاد مذہب کیتھولک کے عظیم الشان پشت پناہ کی حیثیت سے نمایاں ہوا، یہ وہ ملک تھا جہاں مذہب کیتھولک اس طرح حاوی تھا کہ اس کا مقابلہ دشوار تھا اور نہایت درجہ سخت غلو اس میں موجود تھا، یہ اگنا ٹیوس لو یو لا کا ملک تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی ملک عدالت (استیصال ارتداد) انکوئی زیشن کا وطن تھا، اور اگرچہ اس زمانہ میں اسپین کے اندر مذہب پروٹسٹنٹ یا کسی اور زندیقانہ وافتراقانہ اصول کی تحریک کا کچھ اثر

---

[۱] یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ ابتدائی مصلحین لوتھر، ملانکتھون بلکہ کالون نے بھی موجود الوقت طاقت کی اطاعت اور حکومت کی انقلابی تجاویز سے علٰحدہ رہنے پر زور دیا ہے، اور ان کا ایسا کرنا کچھ تو اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے فہم وادراک کے موافق اناجیل اور قدیم عیسویت کی طرف پلٹنا چاہتے تھے اور کچھ اصطباغین وغیرہ کی رجعت قہقری کی وجہ سے تھا، مزید براں، عام طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا کے اندر پاپائی اختیار کی مخالف تحریک نے بالطبع صدیوں کی پرانی کشاکش کا ساتھ دیا جو ملکی و مذہبی اختیار کے درمیان برپا تھی مگر یہ اتفاق باوقار مستقل یا ہمہ گیر نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کی جو دوسری رد جلی جس کا تعلق لوتھر سے نہیں بلکہ کالون سے ہے ہم ملکی طاقت کے اوپر مذہبی طاقت کی فوقیت کے ایسے دعاوی دیکھتے ہیں جو بالکل پاپائی دعاوی کے مثل ہیں مگر ان میں سیاسی قوت کی کمی ہے کیونکہ مصلحین کو بہت سخت ضرورت دنیاوی طاقت سے مدد لینے کی تھی۔

نہیں معلوم ہوتا اس پر بھی عدالت مذکور نے فلپ دوم کے عہد میں اپنے متواتر "فیصلہ جات مذہبی" سے چھ ہزار کالبد انسانی کو جلاکر نیست ونابود کردیا۔ پس خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر دنیوی قوت پر پاپائیت کی مذہبی قوت کی فوقیت کا دعویٰ کہیں بھی کامیابی کے ساتھ قائم ہو سکتا تھا تو اسی ملک میں ہونا چاہئے تھا مگر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے درحقیقت اس کہنے میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہے کہ عملی اغراض کے لئے اسپین میں فلپ دوم ایسا ہی مطلق العنان تھا جیسا انگلستان میں ہنری ہشتم۔ اسپین کے تمام اسقفی گرجوں کی سرپرستی انہی کے قبضۂ قدرت میں تھی وہی اسافقۂ اعظم اساقفہ اور رؤساے صوامع کا انتخاب کرتا، کلیسائی انضباط کی جزئیات کو ترتیب دیتا، اور پوپ کے فرامین ومراسلات جب اس کی حکمت عملی کے منافی ہوتے تھے تو ان کے ملک میں داخل ہونے سے انکار کردیتا تھا۔ عدالت استیصال ارتداد اس کے اشارے پر چلتی تھی نہ کہ پوپ کے۔ وہی اس عدالت کے نام احکام صادر کرتا، اور عدالت کے ارکان کو مقرر وبرطرف کرتا اور ان پر نگرانی رکھتا تھا۔ درحقیقت فلپ کے مذہبی جوش جنوں کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب اس کے معمولی نظم ونسق کے آلات کام نہیں دیتے تھے تو وہ اپنے اس مذہبی غلو کو خالص دنیاوی مقاصد کے لئے کام میں لانے لگتا تھا۔ مثلاً جب اس کے پرمٹ کے عہدہ دار فرانس کی جانب گھوڑوں کی برآمد روک نہ سکے تو اس نے ایک حیلہ یہ تراش لیا کہ اسے یقین ہے کہ گھوڑے پروٹسٹنٹ فوجوں کے لئے درکار ہیں اور اس لئے عدالت استیصال ارتداد کے ذریعہ سے ان کی برآمد کی ممانعت کردی۔ پوپ نے اس کی شکایت کی مگر آخر پوپ ہی کو دبنا پڑا اور اس کے مذہبی آلات کارگر ثابت ہوئے بادشاہ کا مذہبی جوش بہت سخت تھا مگر اس سے بھی زیادہ سخت تر اعتقاد اسے خود اپنی ذات اور اپنے شاہانہ حقوق کے متعلق تھا اور اس مذہبی جوش کو اس اعتقاد کی حد کے اندر ہی رہنا پڑتا تھا۔

یہی حال لوئی چہاردہم کی فرانسیسی بادشاہی کا تھا، کلیسا کو اگرچہ اہم امتیازات (جو ملک کے مختلف حصص کے اعتبار سے مختلف تھے) بدستور حاصل رہے مگر کلیسا موثر طور پر تاج کے تابع ہوگیا تھا اور وہ اس کی وفادارانہ تائید کرتا تھا جس طرح انگلستان میں انگلیکی پادریوں کے بعض سربرآوردہ نمایندوں نے سترھویں صدی میں

کیا ویسا ہی یہاں بھی کلیسا کے نہایت ممتاز سفیروں نے شاہی مطلق العنانی کی انتہائی صورت کی ہے چوں وچرا تائید کی بوسوئے کہتا ہے کہ حکمراں یعنی خدا کا برگزیدہ (بادشاہ) اپنے احکام کے لئے کسی انسان کو جوابدہ نہیں ہے کوئی شخص اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں "اے شاہان ارض آپ دیوتا ہیں" مقرر اس فقرے کو بت پرستی کی حد تک پہنچا سمجھکر اس پر یہ ایزاد کرتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "آپ کے اقتدار کو ربانی نوعیت حاصل ہے آپ کی پیشانیوں پر الوہیت کے نشانات ہویدا ہیں"۔ علہ

۲- اب میں قانون پیشہ اشخاص کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یہاں رومانی، اصول قانون کا اثر اور بھی زیادہ استقامت کے ساتھ اس جانب یعنی بادشاہی کی طرفداری کی طرف مائل تھا۔ جب بارھویں صدی میں رومانی اصول قانون کے مطالعہ کی بنیش بہا تجدید سب سے پہلے بولوینا کے دار العلوم میں وقوع میں آئی اس کے بعد ہی اول مرتبہ اس اثر کو اہمیت حاصل ہوی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قدیم رومانی اصول قانون کے جس موخر شاندار زمانہ کی کتابیں از منۂ وسطے کے طلبہ کے مطالعہ میں آئی تھیں وہ بہر نوع شہنشاہی دور تھا اور جن مقننوں کی عقل ودانش سے یہ طلبہ فیضیاب ہوتے تھے ان کا اساسی اصول یہ تھا کہ تمام حکومتی اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں مرکوز ہے۔ لہذا فرانس میں جہاں ملک بے شمار جاگیروں میں منقسم ہوگیا تھا خصوصیت کے ساتھ ایسا ہوا کہ اہل قانون کی یہ فوج جسنے رومانی مقننوں کے علوم کی تربیت حاصل کی تھی اس خدمت پر متعین ہوی کہ غیر محدود شاہی کے لئے بادشاہ کو اپنے پیشے کی جانبداری کا نفع پہنچائے۔ وہ اس امر پر مستحکم ہوتے تھے کہ فرانس کے بادشاہ کو یہ سمجھیں کہ وہ رومانی شہنشاہ کے اختیار کا وارث ہوا ہے۔ یہ اعتقاد انھیں تمام متخاصم دعاوی کا مقابلہ کرنے پر برانگیختہ کردیتا تھا اور اس طرح امرائے عظام کی خودمختاری کے کم کرنے اور بادشاہ کے اختیار کو تمام ملک میں موثر وبرتر قرار دینے کے لئے یہ قانون پیشہ اشخاص نہایت ہی اہم ولازمی آلۂ کار بن گئے۔

علہ "بوسوے سیاسیات ماخوذ از اناجیل مقدسہ" کتاب ۳، ۴، ۵۔

جرمنی میں پارلیمنٹی حکومت کے لئے ازمنۂ وسطے میں جو کوششیں ہوئیں ان کے ناکام رہنے کے وجود میں ایک وجہ رومانی قانون کا یہ اثر بھی تھا۔ جیسا کہ میں ایک سابق خطبے میں کہہ چکا ہوں تیرھویں صدی کے بعد سے جرمنی کی معاشری و سیاسی تاریخ میں (نہ صرف اپنے طبقاتی امتیازات کی حفاظت کے لئے باخود ایک ہی طبقہ کے لوگوں کا بلکہ مختلف جماعتوں کا) ارتباط و اتفاق کی جانب میلان اس قدر نمایاں (اور انگلستان سے تو بدرجہا بڑھا ہوا) نظر آتا ہے کہ مجھے قطعاً یہ توقع ہونا چاہیے تھی کہ جب یہ صاف عیاں ہوگیا تھا کہ شہنشاہی ایک مجموعۂ مربوط کے طور پر قائم نہیں رہ سکتی اور اس کے مختلف اجزا سے ملکی سلطنتیں بن گئی تھیں تو ان سلطنتوں میں نیابتی جمعیات کے قائم و برقرار رہنے میں یہ ارتباط و اتفاق اس سے بہت زیادہ کارگر ثابت ہوتا جتنا کہ واقعاً ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ جن طبقات میں مقاومت کی قوت تھی ان میں عدم اتحاد کا عام سبب موجود تھا اور شاید کہ یہ سبب بالتخصیص شہنشاہی میں اس وجہ سے زیادہ نمایاں تھا کہ ازمنۂ وسطی کے آخری زمانہ میں شہنشاہی قوت ناقابل تلافی طور پر درہم و برہم ہو گئی تھی یہ طبقے متحد تو ہو گئے، مگر ان میں امتزاج نہیں پیدا ہوا۔ مذہبی مناقشہ کے دور میں جو اندرونی افتراق پیدا ہوا اور اسمیں جس قسم کی زیادتیاں ہوئیں وہ بے شک و شبہ اس کا دوسرا سبب ہیں یہ دور کچھ کچھ وقفے کے ساتھ لوتھر کی سرتابی کے وقت سے جنگ سی سالہ کے اختتام تک رہا۔ بادشاہی سے جو نظم و امن قائم ہوتا ہے اس کی آرزو قوم کے درماندہ عناصر میں خصوصیت کے ساتھ بہت قوی تھی مگر رومانی قانون کے حسن قبول کو فی الاہمیت تھی، جرمانی بادشاہ کے رومانی شہنشاہ ہونے کی وجہ سے جرمنی میں رومانی قانون کا جو اثر تھا وہ اس کا ایک ہی سبب ہے۔

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ رومانی مقننین کے ان تخیلات نے کہ "سب انسان فطرتاً آزاد و مساوی الدرجہ ہیں" زمانۂ مابعد میں انقلاب فرانس کے قبل کے اس خیال کو جس نے انجام کار میں مغربی یورپ کی مطلق العنانی بادشاہی کو تباہ کر دیا نہایت اہم مدد دی تو پھر یہ تمام امور اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ مغربی یورپ کے نظم سلطنت کے مدارج ارتقا میں، اس مطلق العنان

بادشاہی کے اس تصور کا ایک درجہ قرار دینے میں ہمیں جن قیود و مستثنیات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے ان کی نسبت میں اب کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں قیود سے ابتدا کرتا ہوں، سب سے پہلا امر یہ ہے کہ جن مختلف ملکوں میں تاج کو غلبہ حاصل تھا، وہاں مختلف حد تک وہ اثرات باقیات موجود تھے جنھیں میں ازمنۂ وسطیٰ کی لاحاصل پارلیمنٹ کے اثرات کہہ سکتا ہوں۔ ان اثرات سے اگرچہ تاج کے خلاف کسی شدید مقابلے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا پھر بھی وہ کسی حد تک تاج کے لئے روک کا کام دیتے تھے یا کم از کم اتنا ہوتا تھا کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹ پیدا کر دیتے تھے اور اس خیال کو زندہ کئے رہتے تھے کہ اجرائے محصول کے لئے قوم کی رضامندی ضروری ہے۔

چنانچہ فرانس میں مجلس طبقات کے اجلاس ۱۶۱۴ء کے بعد سے بند ہو گئے تھے مگر بعض حصص میں صوبجاتی طبقات کے اجلاس بدستور ہوتے رہتے تھے لانگ ودک، پرووانس، برگنڈی، برٹینی اور بعض اور چھوٹے حصوں میں خاصکر ان حصص میں، جو ملک کی حدود کے قریب واقع تھے یہ اجلاس جاری تھے۔ رسماً ان مجلسوں کا کام یہ تھا وہ ان اضلاع کے محصولوں کی نسبت رائے دیں۔ یہ مجلسیں کبھی موثر طور پر بادشاہ کی مخالفت نہیں کرتی تھیں مگر بسا اوقات بادشاہ کسی قدر تدبیر و انتظام، قدرے رشوت دہی یا خفیف سی تہدید کے بغیر ان سے امداد نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

اسپین میں بھی اسی قسم کے اثرات موجود تھے، اور وہاں بادشاہی کے مختلف حصص میں ان اثرات کی حالت میں نمایاں فرق تھا کاسٹیل کی کورٹیز (پارلیمنٹ) چارلس پنجم کے عہد میں بالکل بیکار ہو گئی تھی مگر اراگان کی کورٹیز نے (جہاں ازمنۂ وسطیٰ میں کاسٹیل کی بہ نسبت شاہی طاقت زیادہ رقیبانہ طور پر محدود ہو گئی تھی) تقریباً فلپ کے عہد کے آخر تک بادشاہ کی مرضی پر موثر روک قائم رکھی تھی اور محصول کے معاملات پر تو اور بھی زمانہ دراز تک اس کا اثر قائم رہا۔ درحقیقت اراگان کی صوبجاتی کورٹیز سے شاہ اسپین کو اٹھارھویں صدی کے ابتدائی زمانے تک دشواریاں پیش آتی رہیں یہاں تک کہ ۱۷۰۷ء کی ایک شورش کے دبانے کے حیلے سے بادشاہ نے اس صوبے کے خاص حقوق و امتیازات کو منسوخ کر دیا۔ کیٹلانن کے دستور سیاسی کو اس قسم کی

مصیبت سے ۱۷۱۴ء تک سابقہ نہیں پڑا اور اس وقت بھی اہل کیٹیلانین نے بڑی شدت و ہمت سے مقاومت کی۔

علیٰ ہذا جرمنی کے اندر شہنشاہی کے مقبوضات جن مختلف وسعت کی امارتوں میں تقریباً شکست و منتشر ہو گئے تھے، ان امارتوں میں بھی مختلف مقامات میں مختلف حد تک حکمرانوں کے اختیار میں طبقات کی صوبجاتی جمعیتوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ دقت حائل ہوتی رہی، ان جمعیتوں کا اقتدار کہیں بھی زیادہ موثر نہیں تھا اور زمانے کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہی گیا۔ اکثر صورتوں میں جو حصہ ان سے پہلے نکلا وہ وضع قوانین کا حصہ تھا، جمعیت کا کام صرف مشورہ دینا سمجھا گیا تھا اور جہاں ظاہراً دستور سیاسی کی رو سے قوانین کے لئے طبقات کی منظوری ہنوز تسلیم کی جاتی تھی، وہاں بھی ہر طرح کوشش یہ کی جاتی تھی کہ اسے محض ضابطہ پیمائی کی حد تک سمجھا جائے اجرائے محصول کی نگرانی پر بھی اگرچہ شدت کے ساتھ حملے ہوئے مگر یہ کچھ زیادہ سخت جان ثابت ہوئی لیکن یہاں بھی عام محصول پر مضبوط نگرانی حاصل کرنے کی بہ نسبت طبقات کو زیادہ تعلق اس امر سے تھا کہ خاص خاص طبقات کے لئے امتیازات و مستثنیات حاصل کریں، لیکن دوسرا امر یہ ہے کہ جب اصولاً بادشاہ کی مرضی ناقابل مدافعت قرار پاگئی اس وقت بھی مغربی یورپ کی بادشاہیاں عملاً محدود تھیں اور یہ تحدید نہ صرف روایتی قانون، رسم و رواج اور مذہب وغیرہ کی وجہ سے تھی بلکہ جن آدمیوں کے وسیلے سے اسے کام کرنا پڑتا ہے ان کی مدافعانہ قوت بھی اس کا باعث تھی خاصکر امرا میں اپنی شخصی منزلت کا احساس، اہل قانون میں ذہنی عادات اور دونوں میں اپنے جماعتی اعزاز کا خیال اس کا موجب تھا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب اس زمانے کے نظریۂ سیاسی کے مصنفوں میں ایک نہایت ہی باا ثر مصنف یعنی مونٹسکیو نے اسی زمانے میں اس کا اظہار کر دیا تھا، اور درحقیقت اس امتیاز کے نمایاں کرنے کے لئے وہ "ملوکیت" کی اصطلاح اس معنی میں استعمال کرتا ہے جو مطلق العنانی سے صریحاً ممیز ہے (خیالات میں انقلاب رونما ہونے سے بیشتر) ایک فرد کی حیثیت سے میں مونٹسکیو کے تفکرات کی عام رفتار کی جانچ کے بعد کے ایک خطبے میں

کروں گا مگر اس بحث پر اس نے جو کچھ کہا ہے اسے میں اپنے ہی اٹھارھویں صدی کے مورخوں میں سے ایک نہایت ہی عادل مورخ رابرٹسن کے الفاظ میں بیان کروں گا (اس نے یہ خیال اس موقع پر ظاہر کیا ہے، جہاں اس نے یورپ کی حالت کے متعلق اپنی رائے کو ختم کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ جب بادشاہی کا کامل غلبہ مستحکم ہوگیا اس وقت دو چیزیں ایسی باقی رہ گئیں جنھوں نے فرانس کی حکومت کو مطلق العنانی کی پستی تک پہنچ جانے سے باز رکھا۔ اول یہ کہ فرانس کے امراء نے اگرچہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپنا سیاسی اقتدار کھو دیا تھا پھر بھی انھوں نے اپنے ذاتی امتیازات اور اپنے منصب کے تقدم کو قائم رکھا تھا۔ ان میں یہ احساس و ادراک موجود تھا کہ دوسرے طبقات سے وہ مرتبے میں بلند ہیں اور محصول کی زیر باریوں سے مستثنیٰ ہیں۔ انھیں ایسے نشانوں کے اختیار کرنے کا حق خاص حاصل تھا جن سے ان کی منزلت کا اظہار ہوتا ہو، زمانہ صلح میں انھیں یہ حق حاصل تھا کہ ان کے ساتھ ایک حد تک تعظیمی برتاؤ کیا جائے اور جب وہ میدان جنگ میں ہوں تو (وہ اپنے لئے مختلف قسم کے تعظیمی امتیازات کے متقاضی تھے) ان میں سے اکثر دعاوی ایجابی قوانین سے ماخوذ نہیں تھے مگر چونکہ مقولات اعزاز کے بموجب وہ متعین و مشخص تھے اور شخصی اعزاز کے زبردست احساس کی پوری قوت سے ان کی تائید ہو رہی تھی اس لئے انھوں نے عملاً بادشاہ کے اختیار پر حدبندیاں قائم کر رکھی تھیں پس اس طرح بادشاہ اور اس کی رعایا کے مابین ایک درمیانی طبقہ قائم ہوگیا تھا جس کے اپنے روایتی امتیازات تھے اور بہ حیثیت مجموعی بادشاہ کو بڑا زور خیال اس امر کا تھا کہ وہ ان امتیازات کے خلاف نہ کرے۔

فرانس سے مخصوص، بادشاہ کی حرص و ہوس میں ایک اور اہم روک پارلیمان کے عدالتی اختیارات کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی بالتخصیص پیرس کی پارلیمان کی وجہ سے جسے عدالت کے نظم و نسق کا اعلیٰ اختیار تفویض تھا۔ فرانس کے بادشاہوں نے جب اول اول تشریعی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کیا تو وہ اپنے فرامین و احکام پیرس کی پارلیمان میں بھیجتے تھے جہاں وہ درج ہوتے تھے

اور اندراج کے اس رسمی فرض کی وجہ سے پارلیمان کو یہ موقع ملگیا کہ جس حکم کو وہ ناپسند کرے ہو اس کے خلاف تعرض کرے اور وقتاً فوقتاً اس نے اس تعرض سے بہت کارگر طور پر کام لیا[1]۔ ان دونوں صورتوں میں بادشاہ اپنی مرضی کے بزور نفاذ سے مقاومت کو دبا سکتا تھا مگر امرا اور اہل قانون میں جماعتی اعزاز کا احساس اس قدر قوی تھا کہ اس کے دبانے میں بادشاہ کو بہت کچھ دشواری پیش آتی۔

۴- ان خطبات کے سلسلے میں ہم جس مطالعہ میں مشغول رہے ہیں اس کے بیشتر حصہ کے ہر درجہ میں ہمیں اس امر سے تعلق رہا ہے کہ ان خود مختار یا قریب بہ خود مختار جماعتوں کے ممتاز سیاسی خصوصیات کا مقابلہ کرتے رہیں جو کم و بیش ایک ہی سے حالات زندگی کے تابع ہوں اور کسی عام تمدن میں شریک ہوں، چنانچہ یونانی شہری سلطنتیں، ازمنۂ وسطے کی شہری جماعتیں، ازمنۂ وسطے اور زمانۂ جدید کی کشوری سلطنتیں اسی قبیل سے ہیں، اس مبحث میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ مملکتوں کے گروہ کے مختلف ارکان میں حکومت کی شکلوں کے درمیان جو عام مشابہتیں ہوں، اور محکوم کو حکومت کے ساتھ جو تعلقات ہوں اور ان میں جو تغیرات واقع ہوں اور ان تغیرات کے جو اسباب ہوں، وہ سب صاف واضح و عیاں ہو جائیں، مگر اس قسم کے تمام مقابلوں میں میری سعی یہ رہی ہے کہ جس طرح تشابہات پر نظر کی جائے اسی طرح تخالفات پر بھی نظر کی جائے، اور میں نے جب کسی مروج طرز حکومت کا ذکر کیا ہے تو یہ خیال رکھا ہے کہ اس بیان میں ایسا حصر اور ایسی حد بندی کر دوں جن سے وہ خاص مواقع صاف واضح ہو جائیں جہاں یہ مروج طرز کارگر نہ ہو۔ اتفاقی مواقع میں کسی طرز خاص کے رائج ہونے کے حالات

---

[1] انگلستان کی پارلیمنٹ کی طرح سے فرانس کی پارلمان بھی ابتدائً ایک قومی جمعیت تھی جو اور فرائض کے ساتھ عدالتی فرض بھی انجام دیتی تھی مگر فلپ نے ۱۳۰۲ء میں پارلمان کو صرف عدالتی فرائض تک مخصوص کر دیا اور اہل قانون کو اس میں نمود حاصل ہو گیا (چنانچہ چودھویں صدی میں اس میں ۸۸- اہل قانون اور ۱۲- امرا تھے) (چارلس نہم کے عہد میں) لوپیتال نے ۱۵۶۶ء میں عمر و قابلیت کے شدید شرائط کا اجرا کیا۔ رکنیت اکثر وروثی اور ہمیشہ بادام الحیات ہوتی تھی اس سے فی الواقع خود مختاری حاصل ہو گئی اور پارلمان ایک ایسی جماعت ہو گئی جس میں نیک و بہ ہر حالت میں اعزاز جماعتی بہت شدت کے ساتھ برقرار رکھا جاتا تھا۔

و اسباب پر غور کرنے کے لئے یہ مثنیٰ مواقع عام طور پر نہایت ہی اہمیت رکھتے ہیں لہذا اپنے آخری خطبے میں جہاں میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں مغربی یورپ میں خالص بادشاہی کس طرح غالب آگئی' وہاں میں نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ اس عام نتیجے میں مستثنیات کے موجود ہونے کو بھی ظاہر کروں۔

اب ہمیں ان ممتاز مستثنیات اور ان کے اسباب کو کسی قدر زیادہ قریب سے دیکھنا چاہیئے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی جمہوری زندگی کے باقیات' یعنی وینس اور جرمانی شہروں کو نظر انداز کر دینے اور چارلس دوازدہم کے بعد سویڈن کے عارضی طور پر عدیدی اقتدار میں چلے جانے کو ساقط کرنے کے بعد یہ مستثنیات انگلستان' ندرلینڈز' سویزرلینڈ' اور پولینڈ تک محدود رہ جاتے ہیں۔ پہلے مجھے یہ ظاہر کر دینا چاہیئے کہ ان چار مثالوں میں سے تین میں' مادی حالات کا اثر نمایاں نظر آرہا ہے۔ یہ میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ انگریزوں کی زندگی کے جن مخصوص حالات نے ازمنۂ وسطے کے پارلیمنٹی ادارات کو خصوصیت کے ساتھ نفع پہنچایا وہ کس طرح زیادہ تر انگلستان کی جزائری کیفیت کے تابع تھے۔ اپنے آقاؤں سے آزادی حاصل کرنے میں سویزرلینڈ کے کسانوں کی جد وجہد کو کوہستان آلپس نے کیسے مخصوص طور پر محفوظ رکھا اور ندرلینڈز کے اہم حصص کی (سیاسی مفہوم میں) بری وبحری دورنگی نے جسے جوش مذہبی کی قوت سے مدد مل گئی تھی کیونکر اسے اس قابل بنا دیا کہ "اصلاح" کے بعد کے مذہبی مناقشے والی صدی میں اسپین کے بظاہر حد سے بڑھے ہوئے فوجی غلبے کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہ سب ایسے تاریخی تبصرات ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے۔ ان دونوں جمہوری متفقیوں پر میں دوبارہ اپنے آخر کے خطبہ میں جو فاقیت سے متعلق ہے بحث کروں گا' سردست میں صرف ان دونوں کے قیام ودوام کے متعلق کچھ تشریح و توضیح کروں گا۔ سوئزرلینڈ کے باب میں یہ ہوا کہ اس کے مادی حالات اور اس کی خود مختاری کے آغاز کار کی وجہ سے حکومت کی جس متفقی وجمہوری شکل نے طبعی کیفیت پیدا کر لی تھی وہ اٹھارھویں صدی کے دوران میں کامیابی کے ساتھ قائم رہی جس ملک کو ہم ہالینڈ کہتے ہیں اس کے باب میں حکومت کی اس شکل کی توضیح اس کے آغاز کار کے حالات سے ہوتی ہے وہ بھی اس دور میں

برائے نام قائم رہی مگر یہاں اس کی کامیابی نامکمل رہی اور اس میں رخنہ پڑتا رہا اور فی الواقع وہ بادشاہی کے رنگ میں آگئی میرے خیال میں اس کی صاف وجہ وہ خطرات عظیم ہیں جو ہمیشہ نیدرلینڈ کے سر پر منڈلاتے رہتے تھے فرانس کے حملہ کی وجہ سے جو خطرناک نازک حالت پیدا ہوئی وہی اس کا باعث تھی کہ ۱۶۷۲ء میں ولیم سوم غیر محدود اختیارات کے ساتھ ہالینڈ کا اسٹاٹ ہولڈر مشتہر کر دیا گیا، اور اسنے اپنے غلبہ کو اپنے انتقال (۱۷۰۲ء) تک قائم رکھا، اور اسی قسم کے ایک خطرے کے باعث یہ ہوا کہ ۱۷۴۷ء میں سات متحدہ صوبوں کا ایک موروثی "اسٹاٹ ہولڈر" مقرر ہوگیا۔

جب ہم پولینڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہی کے ساتھ کشمکش کرنے میں آخرالامر شورش انگیز امرا کو کامیابی حاصل ہوگئی لیکن یہاں ایک دلچسپ مثال یہ ملتی ہے کہ مغربی یورپ کی سلطنتوں میں تجارتی عنصر کو جو نشو و نما حاصل ہوگیا تھا اس کی یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی یعنی جاگیری و نیم جاگیری امرا کی کشمکش میں نہ تو بادشاہ کے نزدیک اس کی کوئی پرسش تھی اور نہ معاشری زندگی اور سیاسی نظم میں اس کی کوئی قدر و منزلت تھی۔ وجہ یہ ہے کہ علی العموم زیادہ مغرب کی جانب کی سلطنتوں کے مقابلے میں پولینڈ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں قوم میں کسی زوردار حرفتی طبقہ کا نشو و نما نہیں ہوا۔ شہروں کے اندر تجارت غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عدیدیت کو بادشاہی پر فتحمندی حاصل ہوگئی اور اس نے ازمنۂ وسطے کی عدیدیت کے انتشارانہ و طوائف الملوکانہ میلانات کا بہت نمایاں اظہار کیا۔ وہ "آزادانہ حق امتناع" (جس کے بموجب ۱۶۵۲ء کے بعد سے پولینڈ کی ڈائٹ کا ایک واحد رکن پوری جمعیت کی قرارداد کی منظوری سے انکار کر سکتا تھا) پولینڈ کی اس منزلت کا ایک مخصوص اظہار و نشان ہے جو اسے پوری عدیدیت کے نشو و نما میں حاصل ہوا۔

۵۔ انگریزوں کے سیاسی ارتقا کی غیر معمولی رفتار کا ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ معائنہ کرنا ہے، نہ صرف انگریزوں کے نقطۂ نظر سے بلکہ سیاسیات کے مطالعہ کرنے والے کی حیثیت سے ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ مغربی یورپی سیاسیات کی

یا اُمتہا ریخ میں اس ارتقا کو نہایت اہم حصے کی حیثیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب وہ وقت آیا کہ خالص بادشاہی سے گزر کر عام طور پر انیسویں صدی کے ان دساتیر کی طرف قدم بڑھایا جائے جن میں ان نمایندہ مجلسوں کو جن کے انتخابات زیادہ وسعت دادہ حق انتخاب کے رو سے عمل میں آنے تھے، اختیار میں بہت بڑا حصہ دیا گیا تھا تو یہ سب کچھ ارتقا کی اسی مخصوص رفتار کا نتیجہ تھا جو انگلستان میں وقوع پذیر ہوئی اور جس نے ایک بڑی حد تک اس تکوین دساتیر میں نمونہ کا کام دیا۔ انگلستان کے دستور سیاسی کا بغور مطالعہ کرنا اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ تکوین دستور سازی کے تخیلات اور وہ احساسات جنھوں نے اسے پرزور حرکت دی ان کی شعاعیں انگلستان سے زیادہ فرانس کے مرکز تک ضیاگستر ہوئیں۔

انگلستان میں وہ دور جس میں ہم بادشاہی اختیار کی ترقی کا میلان دیکھتے ہیں یا کم از کم یہ کہ اپنے غلبے کے قائم رکھنے کے لئے بادشاہی کی کشمکش نظر آتی ہے وہ دور ہنری ہفتم کی تخت نشینی سے ۱۶۸۸ء کے انقلاب یعنی تقریباً دو صدی تک رہا۔ اس دور کے خصوصیات پر میں سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جاؤں گا کیونکہ اس کے عام کیفیات اچھی طرح معلوم ہیں اور اس کے جزئیات مغربی یورپ کے ارتقا کے عام مطالعے میں کچھ ایسے دلچسپ نہیں ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، گلابوں والی لڑائی کے بعد قدیم طبقۂ امرا کی طاقت بظاہر برباد ہوگئی تھی اور پارلیمنٹ بادشاہ کی اس سے زیادہ مطیع و منقاد ہوگئی جتنی اس سے قبل کی دو صدیوں میں تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ شاہان ٹیوڈر کو اگرچہ غلبہ حاصل ہوگیا مگر ان کی حکمت عملی یہ رہی کہ پارلیمنٹ کی تشریعی نوعیت کو ظاہری لحاظ سے مسلم رہنے دیں اور ایوانہائے پارلیمنٹ اپنے روایتی امتیازات کے جس رقابت کا اظہار کرتے تھے اس کی وقعت کریں۔ انھوں نے اپنی جانب سے دستور سلطنت کے اصول پر کوئی حملہ نہیں کیا، ناکس نے "عورتوں کی عفریتانہ جمعیت" کے خلاف جو لعنت کی ہے اس کا جواب انگریزوں کی طرف سے یہ ہے کہ انگلستان کی حکومت ایک مرکب و محدود شاہی ہے۔[۱]

[۱] ہیلم تاریخ دستوری (Constitutional History) جلد اول باب پنجم۔

غیر ملکی خطرے کے گزر جانے کے بعد الزبتھ کے آخری زمانے میں جا کر یہ ہوا کہ تاج کے افعال پر نکتہ چینی کرنے میں دار العوام نے کسی حد تک خود مختاری کا وہ انداز اختیار کیا جو گلابوں والی لڑائی کے قبل پارلیمنٹ میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف بر اعظم میں یہ ہو رہا تھا کہ بالتخصیص قانون دان اشخاص میں یہ نظریہ شایع ہو رہا تھا کہ "خود شاہی عہدے کی نوعیت ہی میں مطلق العنان و اعلیٰ طاقت خلقتاً موجود ہے"۔ اور انگلیکی کلیسا بھی اس کی تائید کر رہا اور بادشاہوں کے حق خداداد کے اس مسلمہ کو دوبارہ زندہ کر رہا تھا جو نیم مربیانہ ہونے کے لحاظ سے قانون فطرت کے ہمنوا بنایا گیا تھا۔

اس کے بعد شاہان اسٹوارٹ کے تخت نشین ہونے کے ساتھ فوقیت کے متعلق شاہی و پارلیمنٹی دعاوی کے درمیان تصادم برپا ہو گیا اور اس میں واقعی قرار و سکون اس وقت تک نہیں پیدا ہوا جب تک کہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب نے اس کا تصفیہ پارلیمنٹ کے حق میں نہ کر دیا۔ اس تصادم میں دو ممتاز عناصر تھے ایک سیاسی اور ایک مذہبی۔ نئی مطلق العنانی پرانی پارلیمنٹی روک ٹوک کے ساتھ کشاکش میں مبتلا تھی اور مذہب انگلیکی، مذہب پیوریٹنی اور مذہب کیتھولک کے ساتھ جد و جہد کر رہا تھا۔ مذہب انگلیکی ہمیشہ بادشاہ کی جانب رہتا تھا، اور علاوہ جیمز دوم کے زمانہ تک مطلق العنانی کے مفاد کے دعاوی کی تائید کرتا رہا تھا، ۱۶۸۸ء کے انقلاب میں فیصلہ کن قوت یہی تھی کہ مذہب انگلیکی نے جیمز سے کنارہ کشی کی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اس میں شک کی گنجایش ہے کہ وضع قوانین و اجرائے محاصل میں پارلیمنٹی فوقیت کی غیر منفصل روایات اس امر کو روک دیتے کہ بر اعظم کی طرح انگلستان میں بھی بادشاہی کو غلبہ حاصل ہو جائے۔

اس اعتبار سے شاہان ٹیوڈر کے بجائے شاہان اسٹوارٹ کا حکمراں ہونا ان کی شخصیات کے لحاظ سے ایک امداد غیبی تھی۔ شاہان ٹیوڈر اپنی سعی کرنا چاہتے تھے اور بالعموم اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے، مگر وہ اتنے دانشمند تھے کہ وہ ایسے دعاوی نہیں پیش کرتے تھے جو انگریزی پارلیمنٹی روایات کے مخالف ہوں اور اس طرح وہ خوفناک مخالفت سے پہلو بچا لیجاتے تھے۔ جیمز اول

ایک علم نما اور شیدائے اصول مخصص تھا، اور اس لئے وہ ایسے دعاوی کے پیش کرنے کی طرف مائل تھا جن سے اصولاً شاہی امتیاز خاص کو وسعت ہوتی ہو مگر واقعی اسے اپنے اختیارات کا قائم رکھنا منظور نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دارالعوام بھی قطعی حیثیت سے بالمقابل دعاوی پیش کرتا تھا۔ چارلس اول اور جیمز دوم کی غلطیاں اس سے مختلف تھیں مگر ایسی قابلیت اور جفاکشی کے باوجود، غالباً چند ہی بادشاہ ہوئے ہوں گے جنھوں نے حکمرانی کے اصول کو اس قدر کم سمجھا ہو، عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ پارلیمنٹ کی کامیابی کا انحصار چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے نظائر کی مستحکم تائید پر مبنی تھا، (ورنہ تاریخ کے پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی کا مطلق یقین نہیں تھا) لیکن مذہبی عنصر کے بغیر تنہا اس سے کام نہیں چل سکتا تھا، اور اس میں شک ہے کہ اگر مذہبی عنصر مفقود ہوتا تو آیا صورت معاملات وہی ہوتی جو ہوئی۔

۱۶۸۸ء میں قطعی نتیجہ حاصل ہوا اور اس کے بعد انگریزی دستور سیاسی کو جو نشو و نما ہوا اس کی نسبت میں کچھ گفتگو کروں گا۔ آئندہ کے تین خطبات میں میں یہ چاہتا ہوں کہ سیاسی واقعات کے ارتقا کو چھوڑ کر ارتقائے تخیل کی طرف متوجہ ہوں یا یوں کہنا چاہیئے کہ نہایت ہی اہم سیاسی واقعات کے اندر جن تخیلات کو نشو و نما ہوا ان کی جانب براہ راست توجہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ علم سیاست جہاں تک مہذب نظمہائے معاشرت کے قوانین سے بحث کرتا ہے اس کے موضوع کے لئے یہ ایک ضروری جزو ہے اور یہ ایسا جزو ہے کہ تہذیب و تمدن کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس جزو کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

خطبۂ بست و چہارم

خیالات سیاسیہ - ہابس و لاک

میں اس خطبے اور آئندہ کے دو خطبوں میں یہ چاہتا ہوں کہ زمانۂ جدید سے کے اس وقت تک کے سیاسی خیالات کا مختصر تذکرہ کروں جب ان خیالات نے انقلاب فرانس کی صورت میں ظہور کیا۔

سیاسی تخیلات کو سیاسی واقعات کے ساتھ جو عام تعلق ہے ابتداءً اسی کی نسبت چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ سیاسی تخیلات سے میری اولین مراد یہ ہے کہ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے بنی نوع انسان کی کسی زیر حکم قوم یا ملت کے اندر کیا کیا امور ہونے چاہئیں۔ اس قسم کے تخیلات کا تعلق امور ذیل سے ہوگا:-

(۱) حکومت کے اعضا کس طریق پر مقرر ہونے چاہئیں۔ (۲) انھیں کیا اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ (۳) زیر حکم اشخاص پر ان اختیارات کا نفاذ کس طرح پر ہونا چاہیئے۔ (۴) جداگانہ حکومتوں یعنی سلطنتوں اور قوموں کے تحت میں گروہوں کی توسیع و تکوین یعنی نئی سلطنتوں اور قوموں کی بنا کس حد تک اور کس طرز پر ہونا چاہیئے (۵) ان گروہوں کے خارجی یا بین الاقوامی تعلقات کیا ہونا چاہئیں۔ تمام سوالات کم و بیش ایک دوسرے سے وابستہ ہیں مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سب سوالوں کو چھوڑ کر ایک ہی سوال کی طرف توجہ مائل ہو جاتی ہے اور جس سلسلہ خیال کی ہم اسوقت ایک ساتھ جانچ کرنا چاہتے ہیں اسمیں توجہ باعموم پہلے دو سوالوں کی طرف مرکوز ہے یعنی وہ اصول جن پر حکومت کی ترکیب مبنی ہونا چاہیے

اور زیرِ حکم اشخاص پر اس کے جائز اقتدار کی وسعت و جواز صحت۔
اس کہنے سے کہ سیاسی تخیلات سے اولین مقصود حکومت کے وہ تخیلات ہیں جس طرح پر کہ حکومت ہونا چاہئے' میری غرض یہ نہیں ہے کہ یہ تخیلات حکومت کے وہ تخیلات نہیں ہیں کہ جس طرح پر حکومتیں ہیں اور رہی ہیں۔ حکومت کو جیسا ہونا چاہئے پر سکون وقتوں میں اکثر و بیشتر لوگوں کے لئے وہی حکومت ہے جو اس وقت موجود ہوتی ہے اگرچہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض جزئیات میں تغیر ہو جائے' اور انقلابی اوقات تک میں بھی جب کہ ہر طرف یہ ارمان دلوں میں جوشزن ہوتا ہے کہ جو کچھ حقیقتاً موجود ہے اس سے کوئی بالکل مختلف شئے حاصل کی جائے اس وقت بھی کوئی سیاسی تصویر خیال جسے عمل کا جامہ پہنایا جائے، باغلب وجوہ کسی نہ کسی ایسے ہی نمونہ پر بنے گی جس کے دوسری جگہ موجود ہونے کا علم ہو یا کم از کم یہ یقین ہو کہ اس کا وجود کہیں نہ کہیں رہا ہے۔ ہم اکثر اس وقت بھی اس امر کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں جبکہ اس تصویر خیالی کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ کسی مجرد سابقہ طریقے کو بتایا جاتا ہے۔ یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ سیاسی فلسفی جو انتہائی خیالی مدارج پر پہنچے ہوئے ہیں ان کی پرواز خیال بھی ہر پھر کر تجربہ ہی کے حدود و قیود کے اندر رہتی ہے مثلاً یہ کہ سیاسی معاشرے کی کسی بہشت ارضی کے لئے اگر کوئی نظم سلطنت بنایا جائے تو افلاطون کی جمہوریہ اسکے لئے ایک ضرب المثل اصطلاح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شخصی ملک اور شخصی خاندانوں کے محو کرنے کی جیسی اجتماعی تجویز افلاطون نے پیش کی ہے وہ نہ کہیں بروئے کار آئی اور نہ آئیگی۔ اس پر بھی افلاطون یونانی معاشرت کے عملی واقعات سے اس درجہ جکڑا ہوا ہے کہ اس کے ذہن میں سیاسی منتہائے خیال کا تصور یہی قائم ہو سکتا تھا کہ ایک شہر کے اندر رہنے والی قوم ہو جس کی ترتیب و تنظیم زیادہ تر جنگ کے نقطۂ نظر سے قائم کی گئی ہو۔ ایک آزاد قوم جو ایک براعظم پر پھیلی ہوئی ہو اور جس کے نزدیک جنگ ایک تحتانی خیال ہو' اس کا تصور بھی افلاطون کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔
لیکن اس کے بعد' سیاسی تخیلات کے سیاسی واقعات کے ساتھ متعلق ہونے سے ان تخیلات پر ایک دوسرے طریقہ سے بھی اثر پڑتا ہے۔ سیاسی تاریخ کے ان تخیلات کا تعلق صرف ایسا ہی تعلق نہیں ہے جو نتیجہ کو سبب کے ساتھ ہو بلکہ

ایسا تعلق بھی ہے جو سبب کو نتیجہ کے ساتھ ہو۔ انسان خواہ حاکم ہو یا محکوم دونوں صورتوں میں اس کے واقعی طرز عمل پر بہت بڑی حد تک اس کی اس رائے کا اثر پڑتا ہے کہ کس شئے کو وہ حق و انصاف سمجھتا ہے، اور اس طرح جہاں سیاسی نظریات کا تعین کسی حد تک سابق الوجود واقعات سے ہوتا ہے وہیں اپنی باری میں یہ نظریات ایسی سیاسی قوتیں بن جاتے ہیں جو واقعات کو تبدیل کر دیتی ہیں اور اسی وجہ سے بہت اہم حد تک یہ نظریات اس طرح بنائے اور ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اس عملی مقصد کے حصول کا آلۂ کار بن جائیں۔

لیکن نظریات سے واقعات پر جو اثر اس طرح پڑتا ہے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اس کی حد ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہے، اور یہ امر قابل لحاظ ہے کہ یہ حد یورپ کی قدیم تاریخ کے بہ نسبت ازمنۂ جدیدہ بلکہ ازمنۂ وسطے کی تاریخ میں قطعاً بہت بڑھی ہوئی ہے جہاں تک ہماری نظر کی رسائی ہے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ یونانی تاریخ کی رفتار پر سقراط افلاطون اور ارسطو کے تفکر کا اثر کچھ ایسا اہم نہیں پڑا۔ سقراط و افلاطون فلسفیانہ اصول کے بموجب اعیانیت کے حامی تھے اور ان کے خیالات تعلیم یافتہ اشخاص میں شائع ہو گئے تھے، مگر ایتھنز میں سیاسی تغیر کی جو مستقل رو عمومیت کی طرف چل رہی تھی اس پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا، اور جہاں تک ہمیں علم ہے افلاطون و ارسطو کے سیاسی تخیلات کے عمل میں آنے کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں تھا اور اس کے حصول کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی گئی۔

برخلاف ازیں، آٹھویں صدی کے بعد سے یورپ کی تاریخ میں واقعات پر خیالات کا اثر مختلف طریقوں سے بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ غیر اہم اور متنازعہ فیہ اثرات سے قطع نظر کرکے، اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ازمنۂ وسطے کی رومانی شہنشاہی کے نظری حقوق نے جرمنی اور اطالیہ کی تاریخ کو فرانس و اسپین کی تاریخ کے بہ نسبت بالکل مغائر شاہراہ ترقی پر لا ڈالا جیسا کہ میں ایک سابق خطبے میں بیان کر چکا ہوں [1]، اور یہ کہنا تقریباً بالکل درست ہے کہ یہ رومانی شہنشاہی اپنی ہستی کے

---

[1] خطبۂ سیز دہم۔

بیشتر حصہ میں ایک حقیقت واقعہ ہونے کے بجائے زیادہ تر محض نظری شئے تھی) دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کرسکتا کہ زمانۂ جدید کے بین الاقوامی قانون میں بین الاقوامی معاملات کے حقیقی مسلمہ قواعد پر قانون فطرت سے متعلقہ نظری خیال کا بہت بڑا اثر پڑا ہے[۱] آخری امر یہ ہے کہ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ انسانی حقوق اور قومی اقتدار اعلیٰ کے مجرد مسلمات اس اہم تحریک کی ایک قطعی قوت رہی تھی جو ۱۷۸۹ء کے بعد سے یک بیک یا رفتہ رفتہ جدید یورپی نظم سیاست کو منقلب کرتی رہی ہے۔

غرضکہ سیاسی نظریات و تقلبات کا یہ تواتر دو قسم کے اسباب کے زیر اثر چلتا رہتا ہے ایک داخلی دوسرے خارجی، ان اسباب کے نتائج کا ایک دوسرے سے جدا کرنا اگرچہ تاریخ فلسفۂ سیاسیہ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے غایت درجہ اہم ہے مگر ایسا کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اول یہ کہ اس تواتر میں ہم ارتقا کے داخلی کلیات کے فعل کا ہمیشہ پتا چلا سکتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو تصورات و اصول پہلے مبہم سے تھے وہ غور و فکر سے واضح و معین ہو گئے اور جو معنوی نتائج ان میں مضمر تھے وہ زیادہ واضح طور پر قرار پا گئے۔ اس طرح پر حاوی و غالب اصول میں جو کچھ تضاد مخفی تھے وہ عیاں ہو گئے اور اس کے نا واجب ادعا کا پردہ فاش ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عقل انسانی نے جب ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو اس کا میلان یہ ہو گیا کہ کسی اور مخالف نظریہ کی خاطر یہ اصول ساقط کر دیا گیا یا اسے محدود کر دیا گیا۔ اولاً یہ نظریہ بھی نسبتاً اپنی عدم تحقیر کے باعث محفوظ رہا اور پھر اس کامیابی کے بعد اس پر بھی ارتقا کا وہی عمل جاری ہوا، مثلاً ہم ادھر حال کے زمانہ میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شئے "آزادی" تھی جب جوش بڑھا ہوا تھا تو اولاً اس کے معنی میں دونوں مفہوم داخل تھے کہ افراد جو چاہیں کریں اور کثرت رائے اپنی سی جو چاہے کرے بعد میں ان دونوں کے درمیان مخالفت و تصادم ظاہر ہوا، اور عمومیت ایسے لباس میں جلوہ گر ہوئی کہ اس میں "آئندہ کی غلامی" کا امکان نظر آنے لگا۔[۲]

---

[۱] مقابلہ کیجئے میری تصنیف مبادی سیاسیات باب پانزدہم صفحہ (۲۴۳ طبع دوم)

[۲] ملاحظہ ہو مسٹر ہربرٹ اسپنسر کی تصنیف فرد بمقابلہ مملکت (The manursees the state)

لیکن اگر سیاسی نظریات محض دار المطالعہ یا درسی کمرے میں بند رہتے تو اس حالت میں اس تواتر کی کیفیت اور اس کی واقعی رفتار اس سے بہت مختلف ہو گئی ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ سیاسی اصول جس حد تک جنگ وجدل کے کار آمد آلات ہیں اسی حد تک جب کام کی ضرورت پڑتی ہے تو ان سے کام لیا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی تنازعات کی نازک ضرورتوں کے لحاظ سے اس میں بہت کچھ ترمیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ازمنۂ وسطے کے دوران میں ایک خاص اصول کی قسمت کا جو حشر ہوا وہ اس کی نہایت ہی نمایاں مثال ہے۔ اس اصول پر ہمیں بہت کچھ کہنا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ دنیاوی حکومت کے اقتدار کا جائز منبع محکوم کی مرضی ورضامندی ہے۔ ازمنۂ وسطے کے بیشتر حصہ میں اس اصول کو مقننوں نے فی الجملہ قبول کر لیا تھا، اور اس زمانے کے نقطۂ خیال سے عالم عیسوی کی ترتیب (نظم) سیاسی کے لئے سب سے اعلیٰ دنیاوی اقتدار شہنشاہوں کا تھا چنانچہ جسٹینین کے "ادارات" میں یہ لکھا ہوا ہے کہ شہنشاہوں کو یہ اقتدار رومانی قوم سے حاصل ہوا ہے۔ جب تک کلیسا اور سلطنت میں ہم آہنگی رہی اس اصول کی دلچسپی محض آثار قدیمہ کی سی تھی مگر جب پاپاؤں اور شہنشاہوں میں جنگ ہونے لگی، تو اس وقت پاپائیت کے پرجوش طرفداروں کو یہ سوجھا کہ قوم نے جو کچھ دیا ہو وہ جائز طور پر اسے واپس بھی لے سکتی ہے، اور جو شہنشاہ اپنے نقض معاہدہ کا مرتکب ہو وہ ایسطرح خارج کیا جا سکتا ہے جیسے مرتکب دزدی گلہ بان[1]۔ اس طرح "انتقال اختیار" کے ایک قطعی خیال کو فوری دلچسپی حاصل ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بادشاہوں کو جو اختیار الحال حاصل ہے وہ ابتدا قوم کا حق تھا تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر بادشاہ ان اختیارات کو ایک مرتبہ ترک کر دیں تو قوم انھیں پھر اپنے قبضہ میں لیلے۔ اگر ایسا ہو تو کس طرح اور کن حالات کے تحت میں؟ ان سوالات کا جواب جس طرح بھی دیا جائے لیکن اس اصول میں استدلالی ارتقا حاصل ہو گیا تھا اور اقتدار اعلےٰ کے اساسی تصور کو نسبتاً زیادہ قطعی وحتمی نوعیت حاصل ہو گئی۔ الغرض

---

[1] ۔ یہ مانے گولڈ فون لاؤٹرباخ (وفات سنہ ۱۱۰۳ء) Manegold von Lauterbach کا مقولہ ہے جسے گیرسے برنجیٹ نے روداد اکادمیہ بویریا بابت ۱۸۶۸ء میں نقل کیا ہے۔

سیاسی خیال نے سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے دقیق وپیچیدہ 'معاہدۂ معاشری' کے نظریئے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا۔

لیکن اس موخر دور میں سر برآوردہ اصحاب فکر نے معاہدۂ معاشری کے اس خیال کو جس طرز سے استعمال کیا ہے اس سے بہت ہی نمایاں طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ خیال پر واقعات کا اثر کس حد تک پڑتا ہے۔ ہابس نے اس سے مطلق العنانی کی بنیاد کا کام لیا۔ لاک نے اسی کو محدود آئینی بادشاہی کی بنا قرار دی، اور روسو نے اسی پر قوم کی فرمانروائی کی عمارت کھڑی کر دی۔

۲۔ ہابس سے شروع کیجیے، اور حقیقت یہ ہے کہ جدید سیاسی تخیلات کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ ان کی ابتدا اسی نے کی ہے۔ عالم واقعات میں سیاسی نظم واتحاد کے ملوکی بنیاد پر قائم ہو جانے کا جواب عالم خیال میں ہابس[۱] کے اصول تھے، اقتدار اعلے کے جدید اصول مسلمہ کی جس واضح اور بےلاگ طور پر اس نے تعریف وتوضیح کی اس سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول تخیلات جدیدہ کی طرف پلٹا کھا گیا ہے۔

۱۶۴۲ء میں جب انگلستان کی عظیم الشان بغاوت کا وقت سر پر آگیا تھا مگر ہنوز بغاوت واقع نہیں ہوئی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں اس کے تخیلات نے پہلی مرتبہ ایک صورت اختیار کی مگر میں ان کی اس شکل پر بحث کروں گا جو اس نے ہابس کے شہرۂ آفاق رسالہ لیویاتھن میں اختیار کی جس کی اشاعت ۱۶۵۱ء میں ہوئی یہ سال ۱۶۴۹ء میں بادشاہ کے قتل اور ۱۶۵۳ء میں پارلیمنٹ کے "قتل" کے عین وسط میں واقع تھا۔ پس اس میں کوئی امر باعث استعجاب نہیں ہو سکتا کہ ایسے نازک موقع پر لاحلیت کے متعلق کسی سیاسی فلسفی کو بہت تیز بلکہ مبالغہ آمیز احساس پیدا ہو جائے اور وہ نظم وامن کے حالات پر مبالغہ کی حد تک زور دینے لگے۔

بودین کی طرح ہابس بھی اس امر پر زور دیتا ہے کہ ہر ایک سیاسی قوم میں جو اس نام کی سزاوار ہو یعنی ہر ایک قوم میں جو پائدار سیاسی نظم وامن سے لطف اندوز ہو کہیں نہ کہیں کسی جماعت یا کسی شخص کے اندر ایسا اختیار مرکوز ہونا چاہیے جو قانون کا

---

[۱] خطبۂ بست وسوم۔

منبع ہونے کی وجہ سے خود قانون کے قیود کے تابع نہ ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اختیار ایجابی قانون کے قیود کے تابع نہیں ہو سکتا (ایجابی قانون وہی ہے جسے ہم ملک کے قوانین یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین کہتے ہیں) کیونکہ وہی اختیار ملک کے اندر سب سے برتر انسانی قانون ساز ہے، اور وہ خود اپنے قوانین سے مقید نہیں ہو سکتا البتہ یہ اس اعلیٰ و افضل اخلاقی ضابطہ کے تابع ہے جسے فطرتاً ہر شخص فرو ذی عقل کی حیثیت سے اچھی طرح سمجھتا ہے، اسی کو قانون فطرت، قانون ربانی، قانون عقل اوّل جو چاہئے کہیے۔ ہابس کے زمانے میں کوئی شخص اس امر سے انکار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی مفہوم میں قانون فطرت سے مقید ہے اور اس لئے مقتدر اعلےٰ کا بھی اسی طرح مقید ہونا لازمی ہے، مگر عملی حیثیت سے ہابس کی رائے میں یہ قانون مقتدر اعلےٰ کو صرف خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہے کیونکہ قانون فطرت کے لئے تاویل کی ضرورت ہے اور رعایا پر یہ لازم ہے کہ مقتدر اعلےٰ اس قانون کی جو تاویل کرے وہ اسے قبول کریں، اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ ہر شخص اس حق کا دعویٰ کرے کہ اس کی اپنی رائے کے موافق قانون فطرت کی جو تاویل ہو اس کے موافق وہ فرمانروا پر حکم لگائے، اور جس امر کو وہ اپنی رائے میں اس قانون کی خلاف ورزی سمجھے اس کی مخالفت کرے، کیونکہ اس طرح تو ایسی لاحکمیت کا دروازہ کھل جائے گا کہ اس کے سدباب کی کوئی صورت نہ رہیگی۔ اسوجہ[1] سے

(۱) "صاحب اقتدار اعلےٰ کے افعال پر رعایا جائز طور پر الزام نہیں عاید کر سکتی"۔

(۲) "صاحب اقتدار اعلےٰ جو کچھ بھی کرے رعایا اس کی سزا دینے سے معذور ہے"۔

(۳) "صاحب اقتدار اعلےٰ کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے اور اس پر عمل کرے کہ رعایا کی امن و محافظت کے لئے کن امور کی ضرورت ہے"۔ (۴) اور یہ بھی فیصلہ کرے کہ کن اصول و عقاید کی انھیں تعلیم ہونا چاہیئے"۔ (۵) صاحب اقتدار اعلےٰ کو یہ کل اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے قواعد معین کرے جن کے موافق ہر شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ بغیر اس کے رعایا میں سے کوئی دوسرا شخص اسے

---

[1] "لیویاتھن" باب ۱۸۔

کسی قسم کا آزار پہنچائے وہ کن کن چیزوں سے نفع حاصل کر سکتا ہے اور اسے کون کون سے کام کرنے کی اجازت ہے۔" (۶) "تمام عدالتی کارروائی اور تنازعات کے فیصلہ کا حق بھی اسے حاصل ہے۔" (۷) اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ "جس طرح وہ مناسب سمجھے صلہ و سزا دے۔" (۸) "اپنے حسب صوابدید صلح و جنگ کرے۔" (۹) "تمام مشیروں اور وزیروں کا انتخاب کرے۔" (۱۰) "یہ حقوق ناقابل تقسیم و ناقابل انفکاک ہیں۔"

یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ نگرانی عقاید پر خاص زور دیا گیا ہے جس سے ہابس کی مراد بالتخصیص مذہبی تعلیم سے ہے۔ ہابس نے جیسی "دولت عامہ" کا جو نقشہ تجویز کیا ہے اس میں اسی (تعلیم مذہبی کی) ہیئت کی حمایت میں تقریباً نصف کتاب صرف ہوگئی ہے ازمنۂ وسطے کے تمام آخری دور یعنی گیارھویں صدی کے ختم ہونے کے بعد سے مغربی یورپ کی سلطنتیں اس مشکل کو محسوس کرتی رہی تھیں کہ انھیں دو مختلف آقاؤں کی خدمت کرنا ہے' ایک مذہبی اور دوسرا ملکی مگر عالم عیسوی کے انتشار سے پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کی پرغضب کشمکش میں عارضی طور پر اس مشکل میں اضافہ ہوگیا تھا ہابس کے خیالات نے جب پہلی مرتبہ (۱۶۴۲ء سنہ ہجری) ایک صورت اختیار کی اس وقت تک مغربی یورپ میں ملکی مناقشات یا ملکی مناقشات کے اندیشہ میں ایک صدی گزر چکی تھی' اور یہ مناقشات مذہبی تنازعات کی وجہ سے برپا ہوئے تھے پس اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہوئی کہ وہ عقیدۂ مسلمہ جو قواعد مذہبی کو قوانین کے خلاف اور روماتی اقتدار کو ملکی اقتدار کے بالمقابل قائم کرتا ہو ہابس کی نظر میں وہ عقیدہ دولت عامہ کے امراض میں سے ایک بدترین مرض معلوم ہوتا تھا۔[1] اس کا بداوا اس کی نظر میں صرف یہی تھا کہ صاحب اقتدار کے لئے اس ناقابل انفکاک حق کا دعوے کرے کہ "رایوں اور عقیدوں کا فیصلہ وہی کرے" اور ہر ایک ایسے عقیدے کی تعلیم کو روک دے جو صلح و امن کا پیدا کرنے والا نہو۔

اس لئے ہابس کے سیاسی عقیدے کی تعریف یہی ہوسکتی ہے کہ وہ "مطلق العنانی" کا طریقہ تھا مگر اصولاً یا ابتداءً یہ ضرور نہیں کہ یہ شاہی مطلق العنانی ہو۔ یہ حکومتی مطلق العنانی ہو

---

[1] لیویاتھن Leviathan باب بست و نہم۔

یعنی نظم وامن کے اصول کو سیاسی تعمیر کے تمام متصادم اصول پر نظری حیثیت سے فتح حاصل ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ ہابس کے حقیقی مسلک میں سیاسی نظم کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ یہ ناقابل بحث و ناقابل تقسیم اختیار اعلیٰ (جو از روئے قانون غیر محدود ہو) کسی جماعت یا فرد واحد میں موجود ہونا چاہیئے وہ اس ضرورت کو لازمی نہیں قرار دیتا ہے کہ یہ اختیار کسی بادشاہ کے اندر مرکوز ہونا چاہیئے۔ اگر یہ اختیار امرا کی کسی جماعت یا قوم کے عامۃ الناس ہی میں مرکوز ہو تب بھی اس کی شرط اسی طرح پوری ہو جائے گی۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر ایک منتظم قوم کے افراد کو حکومت کی کسی مسلمہ شکل پر یکساں طور پر رضامند ہونا چاہیئے لیکن اس اطاعت میں یہ استثنا بھی ہے کہ اطاعت کی یہ پابندی اسی حد تک ہے کہ وہ بقائے ذات کے اس سے بھی زیادہ بنیادی اصول کو مغلوب نکردے اور صرف اسوقت تک کے لئے ہے جب تک کہ حکومت میں اس فرد کی حفاظت کی قابلیت موجود ہو۔ سنہ ۱۶۵۱ء میں یہ آخری شرط نہایت ہی اہم تھی یہاں میں اپنا یہ خیال ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ ایسے نفسانہ مطلق العنانی جو رعایا کی وفاداری کو بادشاہ کی طاقت محافظت تک محدود کرتی ہو وہ ان عام وفاداران شاہی کے مذاق کے عین موافق نہ تھی جو انگلستان کے عارضی مسلوب الاختیار بادشاہ کے جانبدار تھے۔

اس کے ساتھ تجریدی حیثیت سے ہابس کا بادشاہی کو مرجح سمجھنا صاف طور پر مسلم ہے (اس کے نزدیک) حکومت کی یہی ایک جائز شکل نہیں ہے مگر یہ شکل بہترین شکل ہے کسی اور شکل کی بہ نسبت اس میں مفاد زیادہ اور مضار کم ہیں نیز اس کا یہ یقین واعتقاد بھی صاف ظاہر ہے کہ اگر انگریز اقتدار اعلےٰ کے متعلق اس کے اصول کو ایک مرتبہ قبول کرلیں یعنی اگر یہ قبول کرلیا جائے کہ برطانی دستور سلطنت کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی غیر محدود الاختیار صاحب اقتدار اعلےٰ موجود ہے تو پھر اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ انگریزوں کی آئینی روایات کے بموجب وہ صاحب اقتدار اعلےٰ یہی موروثی بادشاہ ہے ہابس کا خیال یہ ہے کہ جس پارلیمنٹ کے برطرف کردینے کا حق بلاشک وشبہ بادشاہ کو حاصل ہو تو وہ پارلیمنٹ مقتدر اعلےٰ نہیں ہوسکتی بلکہ اقتدار شاہی پر پارلیمنٹ کی یہ روک ناگوار ہے اور اس لئے نظم وامن کے لئے خالی از خطرہ نہیں ہے۔

غالباً خیال فرمانروائی کے انطباق کے متعلق اس بیان سے اس وقت کی عام رائے کا

اظہار ہو جاتا ہے۔ یورپی تاریخ کے اس دور میں یہ اصول کہ ہر سلطنت کے لئے ایک ایسے مقتدر اعلےٰ کا وجود لازمی ہے جس کے اختیارات قانوناً محدود نہ ہوں از روئے قانون فرمانروائی کا غیر محدود اصول (جیسا کہ ہر ایک سلطنت کے لئے لازمی ہے) اگرچہ نظری و حقیقی اعتبار سے غیر شاہی تھا مگر نتیجۃً و عملاً عام طور پر شاہی تھا جو جماعتیں بادشاہی سے مقابلہ کر رہی تھیں واقعتاً ان کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ وہ اقتدار اعلےٰ میں حصہ لینا چاہتی تھیں بلکہ وہ اسے محض محدود کرنا چاہتی تھیں

۲۔ اب ہابس کے اصل نظریہ کی طرف پلٹنا چاہئے اور یہ دریافت کرنا چاہئے کہ جس امر کا اس نے دعویٰ کیا ہے اس کی ضرورت کو اس نے کس طرح ثابت کیا ہے؟ کوئی فرد واحد ایسے صاحب اقتدار اعلیٰ کے اس کامل انقیاد کی حالت میں کس طرح لایا جائے؟ اس موقع پر ہابس نے اپنے مسلمہ کے قائم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں زمانۂ حال کے خصائص نظر نہیں آتے وہ ان خیالات و مفروضات سے کام لیتا ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلے آرہے تھے۔ وہ حکومت کے اس اصول مسلمہ کو اختیار کرتا ہے جو رعایا کی رضامندی سے پیدا ہوتا ہے اور جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں وہ مسلمہ یہ ہے کہ سیاسی نظم معاشرت عموماً اس معاہدے سے قائم ہوتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر "حالت فطری" میں رہتے تھے وہ سب ملکر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اور حکومت کی اطاعت کی پابندی اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس طرح متحد ہو کر ایک پائدار دولت عامہ کا بنانا اس قسم کے افراد میں ہر ایک کے لئے منفرداً و مجتمعاً نہایت سودمند ہے کیونکہ "حالت فطری" لاحکمیت کی حالت ہونے کی وجہ سے ہمہ گیر جنگ و مصیبت کی حالت ہے اور پھر اس کی دلیل یہ ہے کہ واقعی طور پر ایک پائدار دولت عامہ کا قیام صرف اس صورت سے ممکن ہے کہ ایک ایسا معاہدہ ہو جو منفرداً و مجتمعاً سب کو کسی غیر محدود الاختیار صاحب اقتدار اعلےٰ کی بے چون و چرا اطاعت کا پابند کر دے۔ اس معاہدہ میں اگر ذرا بھی شرائط کا شمول ہوا تو اس سے بحث و جدل کا دروازہ کھل جائے گا جس کا قرار واقعی تدارک نہ ہو سکیگا اور وہ لاحکومتی تک منجر ہوگا۔

پہلا یہ امر اہم ہے کہ ہابس کے مسلمہ میں روایتی اور طبعزاد عناصر کے درمیان فرق ملحوظ رکھا جائے۔ یہ کہ سیاسی نظم معاشرت کے قبل کوئی حالت فطرت کی تھی۔

یہ مدتوں کی قبول شدہ رائے تھی۔ اور نیز یہ کہ حکومت اور محکوم کے باہمی حقوق و فرائض ان دونوں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کے معاہدے پر مبنی تھے۔ مگر مقبولہ رائے یہ تھی کہ فطرت کی حالت میں افراد فطرت یا عقل کے قوانین کے پابند تھے۔ اور یہ کہ سرشت انسانی کے نقص کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی حالت میں توقع ہو سکتی تھی کہ وہ ان قوانین کی اطاعت کرتے ہونگے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان ایک ذی عقل و مدنی الطبع مخلوق ہے۔ اور دوسرے حیوانات میں اور اس میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ پرسکون ارتباط کا شوق اور عقل کی رہبری میں چلنے کا میلان ہے۔ اس لئے جب وہ انسانی حکومت کے تحت میں نہیں بلکہ فطرت کی حالت میں ہوتا تھا تو وہ عموماً یہ تسلیم کرتا تھا کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے اوپر دست درازی کرنے سے بچنا چاہئے اور ان کے ساتھ اتفاق و ارتباط کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں ایک ضعیف البنیان مخلوق ہونے کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معاہدوں کو توڑ دیتا۔ اپنے ہمسایوں پر حملہ کر بیٹھتا اور ان سے مناقشات برپا کر دیتا تھا۔ اور پھر اس میں بھی شک نہیں کہ اس ہمسائے کے لئے یہ امر باعث زحمت ہوتا تھا کہ کوئی حکومت ایسی نہیں ہوتی تھی جو نظم و امن کو بحال رکھے اور اس لئے اسے خود ہی اپنے حقوق کے لئے جنگ کرنا پڑتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فطرت کی حالت ایک ایسی حالت تھی جس میں جنگ واقع ہوتی تھی۔ اور اسے جائز قرار دینا پڑتا تھا۔ اور یہ ایسی حالت ہے کہ زمانۂ جدید کی قوموں کے باہمی تعلقات میں بھی اس حالت کا صاف اظہار ہو رہا ہے مگر اس پر بھی جنگ ایک استثنائی حادثہ تھا یعنی جن سیدھے سادھے قواعد کو انسان معمولاً ملحوظ رکھتا ہے جو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کی ممانعت اور معاہدے کے عملدرآمد کے حکم پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن کبھی اتفاقیہ انسان انھیں توڑ دیتا تھا۔

یہی مقبولہ رائے تھی۔ مگر ہابس نے دلیرانہ طور پر ان سب کو قطع کر دیا۔ اس نے یہ کہا کہ انسان فطرتاً ایک خود غرض مخلوق ہے۔ جن معاشری میلانات کا وہ اس بلند آہنگی سے اعلان کرتا ہے وہ فی الاصل ان خواہشوں پر مبنی ہیں کہ دوسروں سے وہ انتفاع و شان و شوکت حاصل کرے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دوسروں کی

مدد کا محتاج ہے، لیکن اگر اس کے تمام خطرات رفع ہو جائیں مثلاً یہ کہ اس کی قوت کا غلبہ صاف طور پر عیاں ہو جائے تو یہ احتیاج اسے اس طرف لیجاتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مساویانہ معاشرت کے بجائے وہ ان پر تسلط و تغلب کا خواہاں ہو جائے۔ اس لئے حالت فطری کو (لامحالہ) یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک ایسی حالت تھی جس میں انسان کی متصادم خواہشوں اور عملاً قوت کی برابری کے احساس کے باعث دائمی جنگ برپا رہتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے مال واسباب پر حریصانہ نظر لگائے رہتے اور اسے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ اس قسم کے حملے کے خوف سے وہ بغرض حصول اطمینان اپنے ہمسایوں کو فتح کر لیتے تھے، اور جب اور کوئی محرک نہیں ہوتا رہا تو وہ شان ورفعت کے لئے جنگ کرنے لگتے تھے اس لئے کسی فہمیدہ شخص کے لئے بھی جو خود کو اس حالت میں پائے امن اور ان قواعد کی نگہداشت کی خواہش جن سے قیام امن کا مقصد حاصل ہوتا ہو، اس وقت تک محض ایک آرزو وتمنا رہتی تھی، جب تک کہ کوئی دولت عامہ قائم نہ ہو جاتی۔ ہم اس حالت میں ہر ایک شخص کے حق، یا اس فطری آزادی کو محدود نہیں کر سکتے کہ وہ جس شے کو چاہے اپنے قبضہ میں کرلے یہاں تک کہ دوسرے انسان پر بھی قبضہ کرلے، کیونکہ اپنی زندگی کے قائم رکھنے کے لئے اس قسم کا قبضہ وانتفاع بہترین ذریعہ ہے اور عقل اسے اس امر سے روکتی تھی کہ وہ ایسے وسائل کو ساقط کر دے جس سے اس کی زندگی بہترین طور پر قائم رہ سکے اخلاقی قواعد پر اس طرح عمل کرنے سے کہ دوسرے بھی اسی طرح اس کی پابندی نہ کریں نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ وہ دوسروں کا شکار ہو جاتا اور ایسا کرنا اس کا فرض نہیں ہو سکتا۔

ہابس کے پرزور الفاظ میں، ایسی حالت میں انسان کی زندگی، بلاشک وشبہ یکہ وتنہا، ضعیف، ناگوار، وحشیانہ اور مختصر ہو جائیگی[1] مگر بایں ہمہ انسان کی فطری حالت یہی ہے اگرچہ فطرتاً اسے امن کی قوی ضرورت ہے مگر فطری طور پر (یعنی سیاسی نظم وترتیب کے کسی معاہدے کے قائم کئے بغیر) وہ اس کے حاصل کرنے کی قابلیت بھی نہیں رکھتا ہے۔ امن کا موقع اس کے لئے صرف اسی صورت میں ہے

[1] لیویا تھن، باب سیزدہم۔

کہ وہ کسی ایسی حکومت کی اطاعت پر اتفاق کرے جس کی کارفرمائی کے حق کے متعلق اس نے یہ اقرار کیا ہو کہ جب تک اس حکومت کی وجہ سے امن کی نعمت عظمٰی حاصل رہے اس وقت تک وہ اس کے اس حق پر ردوقدح نہ کرے گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس رائے کے دونوں حصے باہم متعلق ہیں۔ چونکہ غیر محکومانہ حالت ایسی پرآلام ہے اس لئے حکومت کے لئے غیر محدود اختیار روا رکھنا چاہیئے۔ اگر آپ حالت فطری کی نسبت اس رائے کو معرض بحث میں لاتے ہیں تو اس کے متعلق ہابس کا جواب پر زور ہے۔ اگرچہ نصف ہی صداقت سہی مگر پھر بھی صداقت کا ایک تکلیف دہ عنصر اس کے اندر موجود ہے۔ میں اسے خود اسی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں "تمام جگھوں میں جہاں انسان چھوٹے چھوٹے خاندان بناکر رہا ہے، وہاں ایک دوسرے کو لوٹنا اور غارت کرنا گویا ایک پیشہ ہو جاتا تھا، اور بجائے اس کے کہ اسے قانون فطرت کے خلاف سمجھا جائے جو لوگ غارتگری سے جتنا ہی زیادہ مال حاصل کرتے تھے وہ اتنے ہی زیادہ معزز سمجھے جاتے تھے علہ۔" مگر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ وحشی ہوتے تھے ہابس کہتا ہے "کہ نہیں ایسا نہیں تھا، اس وقت چھوٹے چھوٹے خاندان جو کچھ کرتے تھے وہی اب شہر اور بادشاہتیں کرتی ہیں، یہ گویا بڑے خاندان ہیں اور (اپنی حفاظت کے لئے) وہ ہر طرح کے حیلے تراشتے ہیں کہ انھیں اپنے اوپر حملے کا یا حملہ آوروں کو مدد ملنے کا خوف واندیشہ ہے اور اس بنا پر وہ اپنی مملکت کو بڑھاتے جاتے ہیں، اور جہاں تک ان سے ہو سکتا ہے علانیہ قوت سے یا بہ نظر احتیاط خفیہ حیل وتدابیر سے اپنے دشمنوں کو زیر کرلیں یا انھیں کمزور کردیں، اور یہ سب کچھ وہ انصافاً کرتے ہیں، اور ان کاموں کے لئے از منۂ مابعد میں عزت کے ساتھ انکا نام لیا جاتا ہے علہ۔" پھر کہتا ہے کہ ان لوگوں کے طرز زندگی پر نظر ڈالئے جو پہلے ایک پرامن حکومت کے تحت میں رہتے آئے ہوں اور پھر خانہ جنگی کی ذلت میں

علہ۔ "لیوایاتھن" باب ہفدہم۔

علہ۔ "لیوایاتھن" باب ہفدہم۔

بعینہٖ جائیں ملہؔ، ہابس اپنے ہمعصروں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ "اگر آپ کو آپ کبھی شک ہو تو آپ اس امر پر خیال کیجیئے کہ کسی ایسے نظم معاشرت میں بھی جہاں حکومت کا اثر ہے انسان کے افعال سے اپنے ہمجنسوں کی نسبت کیا خیال مترشح ہوتا ہے کوئی شخص جب سفر کو جاتا ہے تو وہ خود ہر طرح مسلح ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساتھیوں کی بھی کافی تعداد اس کے ساتھ ہو۔ وہ جب سونے جاتا ہے تو دروازے کو مقفل کر دیتا ہے وہ جب گھر میں موجود ہوتا ہے اس وقت بھی اپنے صندوقوں میں قفل لگائے رہتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس حالت میں کرتا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے جو کچھ بھی ضرر پہنچے گا اس کے انتقام لینے کے لئے قوانین و سرکاری عہدہ دار مسلح کھڑے ہیں عـ۲ـہ

پس اس قسم کی مخلوق کے لئے کوئی معاہدہ جو ایک پائدار سیاسی نظم و ترتیب مہیا کر سکے صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کہیں نہ کہیں بادشاہ مجلس سفیات یا جمعیت عامہ کی ذات میں حکمرانی کی کوئی مطلق العنان، ناقابل انفکاک، ناقابل تقسیم اور غیر محدود قوت موجود ہو اور اگر اس میں واقعی حد بندی ہو تو صرف اتنی کہ افراد کو سزا کی مقاومت کرنے یا اس سے بچنے کا حق ہو یعنی اسے بقائے ذات کا حق حاصل ہو۔

پس اس طرح ہابس کا اصول مسلمہ (جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) اس عام اعتقاد کی نہایت ہی پر زور اور یکطرفہ شکل میں تائید کرتا ہے جو مغربی یورپ کی تقلیب لعظیم کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوا اور جسے سترھویں صدی میں تکمیل حاصل ہوئی کہ جدید سلطنت شاہی مطلق العنانی کی بنیاد پر مرتب ہوئی ہے۔ وہ اعتقاد یہ تھا کہ پائدار سیاسی نظم و ترتیب کے لئے سلطنت کے اندر کہیں نہ کہیں ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو ناقابل تقسیم اور بلا روکد سب سے اعلیٰ ہو اور یہ مقصد بہترین طور سے اس طرح پر حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ اختیار موروثی بادشاہ کی تفویض میں دیدیا جائے مگر جیساکہ میں تشریح کر چکا ہوں یہ اصول مسلمہ ابتداءً ایسا حکومتی مطلق العنانی کا اصول ہے اور شاہی مطلق العنانی پر اس کا اطلاق صرف بالمعنی اور واقعات ہمعصر

عـ۱ـہ "لیویاتھن" ہابس باب سیزدہم۔
عـ۲ـہ "لیویاتھن" باب ۱۷۔

کی تطبیق میں ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ بعد کے سیاسی خیال پر اس کا اہم اثر زیادہ تر اس کی پہلی ہیئت کے اعتبار سے پڑا ہے یعنی یہ اصول مسلمہ کہ ہر ایک منتظم سیاسی جماعت میں از روئے قانون غیر محدود اقتدار اعلےٰ کہیں نہ کہیں مرکوز ہونا چاہیئے ہنوز مروجہ سیاسی نظریہ کا ایک وسیع القبول عنصر بنا ہوا ہے۔ انگلستان کی کشمکش میں ہابس کے اصول مسلمہ کو شاہی کی تائید کی حیثیت سے کچھ اثر نہیں حاصل ہوا۔ یہ اصول وِھگوں کے احساس آزادی اور ٹوریوں کے احساس وفاداری دونوں سے بیگانہ تھا۔ ٹوریوں کے احساس سے اس وجہ سے کہ وہ مسلوب الاختیار بادشاہ کے لئے کسی قسم کی ذمہ داری کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دوسری طرف اس اصول کا کلیسا کو بغیر چون و چرا مملکت کے ماتحت قرار دینا کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ تاہم جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں خیالات کے عالم میں یہ اصول اس کا قائم مقام تھا جو مغربی یورپ کے نظم سلطنت کو خالص شاہی کی طرف لئے جارہی تھی۔

۴۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اگرچہ شاہی کا یہ دور جسے سرسری طور پر مطلق العنانہ دور کہہ سکتے ہیں، عام طور پر مغربی یورپ کی سلطنتوں کی ارتقا میں ایک معتدل درجہ قرار پاتا ہے لیکن انگلستان کے ارتقائی رفتار مختلف و مستثنیٰ تھی۔ شاہی اور پارلیمنٹ دعاوی میں مدت سے جو تصادم برپا تھا وہ ۱۶۸۸ء میں اس قرارداد سے دفعۃً ختم ہوگیا جسنے اسٹوارٹ کے خودکام خاندان کی علیحدگی کو قطعی کردیا۔ اس سے یہ حتمی طور پر قرار پاگیا کہ انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے انگریزوں کی اطاعت کا دعوی حتماً و قطعاً اس قاعدۂ قانون کے تابع ہے جس میں ترمیم صرف پارلیمنٹ کرسکتی ہے، اس کا نفاذ وہ جج کرسکتے ہیں جن کی برطرفی صرف پارلیمنٹ کی طرف سے ہوسکتی ہے اور نیز یہ کہ حکومت کے اخراجات کے لیئے قوم پر جو کچھ محصول لگانے کی ضرورت ہو اس کا تعین صرف نمائندگان قوم ہی کرسکتے ہیں۔

اس طولانی جد و جہد کے اس اہم نتیجے کو جس عام سیاسی نظریئے سے حق بجانب ثابت کیا وہ لاک کے "رسالۂ حکومت ملکی" میں ملتا ہے۔ جب اس کے اصول کا مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا یاد رکھنا نہایت اہم ہے کہ اس نے یہ رسالہ ایک ایسی قوم کے لئے لکھا تھا جسے چار صدیوں کی مسلسل روایت نے یہ سمجھا دیا تھا

کہ انگریز جن قوانین کی اطاعت کے پابند ہیں ان کے وضع کرنے اور انگریز جن محصولوں کے ادا کرنے کے پابند ہیں ان کے وصول کرنے کے لئے دو ایوانوں کی ایک پارلیمنٹ کے (جو سلطنت انگلستان کے لئے واحد پارلیمنٹ ہے) اتحاد عمل اور رضامندی کی ضرورت ہے اور وہ انگریز اسے عادتاً اپنا ایک امتیاز خاص سمجھتے تھے کیونکہ وہ فرانس کی اس حالت سے اچھی طرح واقف تھے جو اس سے بالکل مختلف تھی۔

ہابس کی طرح لاک بھی اس روایتی مقبولۂ عام رائے سے ابتدا کرتا ہے کہ محکوم کی اطاعت کے لئے کسی حکومت کا جائز دعوی معمولی حالت میں کسی بنیادی معاہدے پر مبنی ہونا چاہئے جس کے بموجب کسی سیاسی نظم معاشرت کے ارکان حکومت کے صحیح فوائد سے مستفید ہونے کے لئے ان حقوق کے ایک حصے سے دست بردار ہو جائیں جو ابتداً آزاد انسانی مخلوق ہونے کے اعتبار سے انھیں حاصل تھے[1] لیکن اس معاہدے کے شرائط کے متعلق لاک کا خیال اصولی طور پر ہابس کے خیال سے مختلف ہے۔ لاک کی رائے کے موافق افراد جس معاہدے کی رو سے ایک سیاسی نظم معاشرت قائم کرتے ہیں، اور نظم معاشرت کی کثرت رائے کے فیصلہ پر کاربند ہونے کا اتفاق کرتے ہیں، وہ معاہدہ چند معینہ اغراض کے لئے عمل میں آتا ہے اور اس طرح سے جو معاشرہ مرتب ہوتا ہے اس کی کثرت رائے جب کوئی حکومت قائم کرتی ہے تو یہ فرض کرنا چاہئے کہ وہ اس حکومت کو صرف انھیں اغراض کے حصول کے لئے اختیار تفویض کرتی ہے، اور اگر اس اعتماد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو حکومت کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

بنیادی معاہدہ اور اس کے نتائج کے اس اساسی فرق کا تعلق اس رائے سے ہے کہ سیاسی نظم معاشرت میں داخل ہونے کے قبل انسان کی طبعی حالت کیا تھی، (اور اس موقع پر لاک کی رائے) ہابس کی رائے سے بہت مغائر ہے

[1] ۔ میں نے روایتی رائے کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کے متعلق مقابلہ کیجئے ہُوکر کی تصنیف قوانین کلیسائی نظم حکومت Laws of Ecclesias tical polity کتاب اول باب دہم۔

اور یہیں ہمیں یہ لحاظ کرنا چاہیئے کہ فطرت کی اس حالت کے متعلق لاک کی رائے اگرچہ بعض اہم اعتبارات سے اس زمانہ کی روایتی و عام مقبولہ رائے کے خلاف تھی، پھر بھی ہابس نے جو تاریک تصویر کھینچی ہے اس کی نسبت یہ رائے روایتی رائے سے زیادہ قریب تھی۔ جیساکہ میں کہہ چکا ہوں، روایتی رائے یہ تھی کہ سیاسی نظم معاشرت سے علیحدہ چونکہ بنی نوع انسان دوسرے حیوانات سے عقل کے عطیہ وہبی کیوجہ سے ممتاز ہے اس لئے وہ قانون فطرت کی اطاعت کرنے کا پابند رہا ہے اور ہمیشہ پابند رہے گا،' اور خدا نے انسان کو جو عقل عطا فرمائی ہے اس کے صحیح استعمال سے ہر شخص جان سکتا ہے کہ یہ قانون فطرت کیا ہے وہ قانون فطرت جو بلا استثنا تمام انسانوں پر من حیث الانسان قابل اطلاق ہے اور جو مختص انسانی معاشرتوں کے ایجابی قوانین کی بہ نسبت اپنے ماخذ اصلی اور اپنی صحت کے لحاظ سے زیادہ بلند و برتر ہے،' اس کا یہ تصور ازمنۂ وسطے سے ازمنہ جدیدہ کے خیال کی طرف دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے ازمنۂ وسطے کے اصحاب فکر نے اسے رومانی اصول قانون سے اخذ کیا تھا، پہلے تو محض کلیسائی روایات کے وسیلہ سے اور بعد کو کسرو اور قدیم رومانی شہنشاہی کے جلیل القدر مقننوں کی تصانیف کے براہ راست مطالعہ سے انھوں نے واقفیت بہم پہنچائی مگر اصلاح کے بعد جب وہ ناکمل مگر حقیقی انضباطی اثر درہم برہم ہوگیا جو اصلاح کے قبل مذہب کیتھولک کو مغربی یورپ پر حاصل تھا تو پھر یہ ضرورت عظیم محسوس ہوی کہ حقوق کے ایسے اصول منضبط ہونے چاہئیں جو کلیسائی اقتدار سے آزاد ہوں اور جو عام طور پر قابل قبول بھی ہوں اور اس ضرورت نے قانون فطرت کے تصورات میں زیادہ آب و تاب پیدا کی اور اس کے ساتھ ہی معاشرۂ سیاسی سے قبل کی حالت فطرت کو بھی زیادہ نمایاں منزلت عطا کی۔ جہاں تک بالغ اشخاص کا تعلق تھا اس قانون کے زیادہ اہم قواعد سلبی تھے۔ اس کا خلاصہ یہ قاعدۂ کبری تھا کہ دوسروں کو کسی قسم کا جسمانی ضرر پہنچانے سے مجتنب رہنا چاہیئے اور متاع ارضی (جو ابتداءً سب کے لئے عام تھیں) اسے دوسرے جس طرح استعمال کریں اس میں خلل انداز

نہ ہونا چاہیئے مگر ضرر رسانی سے مجتنب رہنے کے فرض سے یہ لازم آتا تھا، کہ اگر ضرر پہنچایا جائے تو اس کی تلافی بھی فرض ہونا چاہیئے۔ نیز یہ اہم ایجابی فرض موجود تھا کہ جو معاہدات آزادانہ طور پر منعقد ہوں ان کا ایفا کیا جائے والدین کو بچوں پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں انھیں بھی ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ اس کی سیاسی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ مطلق العنان بادشاہی کے بعض طرفداروں نے سترھویں صدی میں یہ سرفروشانہ کوشش کی کہ اس قسم کی بادشاہی کے لئے قانون فطرت کے مقبولہ خیال کے اندر کوئی بنیاد پیدا کرلیں اور وہ اس طرح کہ اس بادشاہی کو یہ قرار دیں کہ والدین کو اپنے بچوں پر جو فطری اقتدار حاصل ہے اس سے ترقی کرکے یہ بادشاہی قائم ہوئی ہے چنانچہ لاک کے بحث آرا دلائل میں یہ سب کچھ نظر آسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سلطنت کے قدیمی انفرادی تخیل کے بموجب قانون فطرت ہی کے قواعد وہ قواعد تھے جن کا نافذ کرنا سلطنت کا اولین فرض تھا، مگر فطرت کی حالت میں افراد کو خود اپنے حقوق کی مدافعت کرنا اور اپنے نقصانات کا عوض لینا پڑتا تھا، اس لئے اس قسم کا عوض حاصل کرنے کے لئے خانگی لڑائی کو اگرچہ حالت فطرت کی معمولی کیفیت نہیں مگر ایک ناگزیر حادثہ تسلیم کرنا پڑتا تھا، جیسا کہ ہابس نے مسلمۂ عام کے خلاف دعوی کیا ہے۔

پس جب حالت فطری اور قانون فطری کی مقبولہ رائے یہ قرار پاگئی تو پھر فطری حقوق کے ان محولۂ بالا اصول پر حکومت کا اقتدار کیونکر مبنی کیا جاتا اس کا مقبولۂ عام جواب یہ تھا کہ دو طریقوں سے ایسا ہو سکتا تھا یا تو اس کا ماخذ قوم اور محکوم کی رضامندی اولین پر قرار دیا جائے یا کسی باضابطہ جنگ کی فتح پر اس کی بنا رکھی جائے، کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ جو فریق بداشتداد تعدی کو دفع کر رہے ہوں انھیں یہ فطری حق حاصل ہے کہ ان تعدی کرنے والوں کو مار ڈالیں، پس اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ جب انھیں قتل کردینے کی اجازت ہے تو انھیں یہ بھی اجازت ہونا چاہیئے کہ وہ قتل سے ہلکی سزا یعنی غلامی کی سزا دیدیں۔

۵۔ یہاں تک لاک جائز حکومت کی ابتدا کے متعلق روایتی رائے کو قبول کرتا ہے مگر اس نقطے پر پہنچکر وہ ایک اہم تغیر پیش کرتا ہے کیونکہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظریئے سے جس حد تک میں نے اسے اس وقت تک بیان کیا ہے نہایت ہی غیر محدود مطلق العنانی کے بجا ثابت کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے جیساکہ عام طور پر دعویٰ کیا جاتا تھا اگر صرف اتنا ہی تسلیم کرلیا جائے کہ ہر شخص کو یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنے کو غلامی میں دیدے تو بھی یہی نتیجہ نکل آتا ہے کیونکہ اس اصول کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی قوم دو طرح سے غلام بنائی جاسکتی ہے، یعنی خواہ اس طرح سے کہ اس نے ابتداءً اپنی آزادانہ مرضی سے ایسا کیا ہو یا کہ ناواجب تعدی کے لئے اسے (غلام بناکر) واجب سزا دی گئی ہو اور فی الحقیقت گروشیس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حقوق بین الاقوامی در جنگ و صلح" میں (جو ۱۶۲۵ء میں شایع ہوی) یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریقہ سے بھی جائز طور پر دائمی مطلق العنانی قائم ہوسکتی ہے۔ دائمی اس وجہ سے کہ اس کے قول کے بموجب کسی قوم کی غلامی دائمی ہوتی ہے اس کے مختلف اجزا کا یکے بعد دیگرے شامل ہوتا رہنا اس قوم کے ایک ہی قوم رہنے میں مانع نہیں ہوتا۔[۱]

اس موقع پر لاک کی رائے بہت ہی مختلف ہے۔ اس کی رائے کے موافق کسی شخص کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ وہ غلام ہونے پر رضامندی ظاہر کرے کیونکہ انسان کو خود اپنی زندگی پر بھی اختیار مطلق نہیں حاصل ہے، خودکشی قانون فطرت کی رو سے جائز نہیں ہے، اور اس لئے انسان معاہدہ کرکے اپنے کو کسی کا غلام نہیں بنا سکتا۔ نہ اپنے کو کسی کے اس اختیار

---

[۱] گروشیس "قانون جنگ و امن" کتاب دوم باب پنجم فقرہ (۳۲) عام الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ فطری حقوق کے متعلق جدید خیال کا کام یہ تھا کہ رومانی مقننین نے جن اصول کا شخصی قانون پر اطلاق کیا تھا انھیں اصول کا اطلاق قانون عامہ پر کیا جائے۔ گروشیس کا مابہ الامتیاز کارنامہ زیادہ تر یہ ہے کہ اس نے اس کا اطلاق بین الاقوامی قانون پر کیا۔ لاک کی تصنیف کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اسے آئینی قانون پر عاید کیا۔

مطلق کے تابع کر سکتا ہے کہ وہ جب چاہے اس کی جان لے لے[1] نیز یہ بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ اگلوں نے تعدی کی ہو تو پچھلے ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں درحقیقت فطری آزادی کی حالت کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی شے ہے جس کا وجود محض کسی قدیم زمانے میں تھا، یہ ایک ایسی حالت ہے جس کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قبل اس کے کہ حکومت کو کسی شخص پر کوئی حق حاصل ہو سکے، اسے خود صراحۃً یا کنایۃً اپنی مرضی سے اس حالت سے ہو کر گزرنا ہے۔ جو شخص کسی ملک میں کوئی ملک رکھتا ہو اور وہ عارضی باشندہ بھی جو ملک میں رہے اور اس کی زمین سے کام لے، انھیں کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب تک وہ ملک کا مالک رہے یا زمین کو کام میں لاتا رہے، اس نے اس ملک کی حکومت کی اطاعت کرنے کی رضامندی دیدی ہے۔

جس معاہدے کی رو سے ملک کی حکومت ابتداءً قائم ہوئی ہو، چونکہ اس کی کوئی بلاواسطہ شہادت موجود نہیں ہے کہ وہ معاہدہ کیا تھا اس لئے ذہن میں اس کا تصور قائم کرتے وقت ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسا معاہدہ تھا کہ جو لوگ فطری آزادی و خود مختاری کی حالت میں رہتے تھے وہ عقلاً ایسا معاہدہ کرنے کے لئے متحد ہو جائینگے، اور اگر ایسا ہی ہو تو جو حکومت نتیجۃً قائم ہو گی اسے خود رایانہ و غیر محدود اختیار نہیں حاصل ہو سکتا، کیونکہ یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ زیادتی کی سزا دینے کے لئے اپنی فطری آزادی اور اپنے فطری حق کو خیرباد کہہ دینگے۔ بجز اس کے کہ اپنی جان، اپنی آزادی، اور اپنی جائداد کے لئے جیسا استحکام وہ خود مہیا کر سکتے اس سے بہتر سامان کیا جائے تو البتہ وہ اپنی فطری آزادی سے دست بردار ہوں مختصر یہ کہ حکومت کا اختیار فطرتاً و عقلاً اس غرض و غایت سے محدود ہے جس کے لئے وہ حکومت قائم کی جاتی ہے اور یہ غایت یہی ہے کہ حالت فطرت کے نقائص کا تدارک کیا جائے۔

یہ نقائص تین ہیں، انھیں لاک ہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، "اولاً ایک ایسے قائم شدہ، مقرر و معلوم قانون کی کمی جسے مرضئ عامہ نے قبول کر لیا ہو،

[1] لاک "رسالہ حکومت ملکی" کتاب دوم باب چہارم فقرہ ۲۳۔

اور یہ جائز رکھا ہو کہ وہی قانون حق و باطل کا معیار ہو اور ان کے درمیان جس قدر تنازعات و مناقشات برپا ہوں ان سب کے تصفیہ کا ذریعہ مشترک وہی ہو کیونکہ فطرت کا قانون اگرچہ تمام ذی عقل مخلوقات کے لئے واضح و قابل فہم ہے تاہم چونکہ لوگ اپنے مقصد کے لئے خود غرض ہوتے ہیں اور اس قانون کے مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے اس سے لاعلم بھی رہتے ہیں اس لئے ان میں یہ اہلیت نہیں رہتی کہ ان کے خاص واقعات پر اس قانون کا جو اطلاق ہو اس کی وہ پابندی کریں۔

ثانیاً۔ فطرت کی حالت میں کسی ایسے معلوم و بے غرض منصف کا فقدان ہوتا ہے، جسے یہ اقتدار حاصل ہو کہ وہ قائم شدہ قانون کے موافق تمام اختلافات کا تصفیہ کرسکے، کیونکہ اس حالت میں ہر شخص فطرت کے قانون کا فیصلہ کرنے والا اور اس کا نافذ کرنے والا دونوں ہوتا ہے اور چونکہ انسان خود اپنے طرفدار ہوتے ہیں اس لئے خود اپنے معاملہ میں جذبۂ ذاتی اور جوش انتقام انھیں بہت دور لے جاسکتا، اور ان میں زائد از ضرورت حرارت پیدا کرسکتا ہے، اس کے ساتھ دوسروں کے معاملات میں غفلت و بے توجہی انھیں ضرورت سے زیادہ لاپروا بناسکتی ہے۔

ثالثاً۔ فطرت کی حالت میں اکثر اس قوت کی کمی ہوتی ہے، جو کسی صحیح سزا کی پشت پناہی و تائید کرسکے اور اسے مناسب طور پر عمل میں لاسکے، بہت کم ایسا ہوگا کہ جن لوگوں کو کسی ناانصافی سے صدمہ پہنچے گا جب انھیں موقع ملے گا تو وہ جبراً اس کی تلافی نہ کریں گے۔ پس جو لوگ سزا کو عمل میں لانا چاہتے ہیں بسا اوقات اس قسم کی مقاومت ان کے لئے سزا دہی کو خطرناک اور اکثر مہلک بنادیتی ہے[1]

مختصر یہ کہ حالت فطری میں ان تین اعتبارات سے نقص ہے، (۱) قانون کی واضح تعریف، (۲) قانون کا بے لوث انطباق (۳) کا ملاً موثر نفاذ۔ یہ نقائص بلاشبہ حالت فطری کی حالت کو غیر محفوظ و تکلیف دہ بنادیتے ہیں (لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہابس کے دعویٰ کے مطابق دائمی جنگ و مصیبت اس کا

---

[1] لاک، حسب بالا کتاب دوم باب نہم فقرہ ۱۲۴ - ۱۲۶ -

باعث نہیں ہیں) اور اس لیئے یہ بالکل قرین عقل ہے کہ اگر حکومت ان نقائص کا کوئی انتظام کر سکے تو لوگ اپنے ان طبعی حقوق کی اس تجدید پر راضی ہو جائیں جو حکومت کے لیئے درکار ہوں، مگر اس شرط کے سوا اور کسی بنا پر ان کا مطیع ہونا قرین قیاس نہیں ہوگا۔ اس لیئے حکومت کے اقتدار کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اس شرط کے ساتھ محدود ہے کہ اس کا استعمال مسلمہ ومعلومہ قوانین کے نفاذ میں ہوگا جنھیں بے لوث عادلوں نے عاید کیا ہو۔ اور مزید شرط یہ بھی ہونا چاہیئے کہ حکومت کے لیئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محکوم جب تک اصالتاً یا وکالتاً اپنی رضامندی نہ دے وہ اس کی ملک پر قبضہ کرے، کیونکہ ملک کی نسبت افراد کا حق حکومت سے یا دوسرے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کے معاہدے سے حاصل نہیں ہوا ہے (اور لاک کے بیان میں یہ ایک اہم وطبعزاد بحث ہے) یہ استحقاق ہر شخص کے اس فطری حق سے ماخوذ ہے کہ جن مادی اشیاء کے ساتھ اس نے اپنی محنت کو شامل کر دیا ہے وہ اس کی ہیں، بشرطیکہ اس طرح کسی شے کو اپنے لیئے مخصوص کر لینے کے ساتھ دوسروں کے لیئے بھی کافی ووافی بچ رہے[1] متاع ارضی جو فطری حالت میں ہے وہ طبعی حق کے اعتبار سے عام ہے، مگر اس حالت میں یہ بھی صاف عیاں ہے کہ انسان کی محنت خود اسی کی ہے، اور جب وہ اس موخرالذکر کو مقدم الذکر کے کسی جزو کے ساتھ شامل کر دیتا ہے تو از روئے استحقاق وہ شے اسی کی ہو جاتی ہے بشرطیکہ دوسروں کے مفاد میں کوئی خلل نہ پڑتا ہو۔ پس یہ استحقاق اس معاہدے سے آزاد اور اس سے مقدم ہے جس پر حکومت مبنی ہے۔ لہذا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ذی فہم شخص اس حکومت کو جس کے قیام پر اس نے اتفاق کیا ہو، یہ حق دیدیتا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی ملک پر قبضہ کرے۔ اگر حکومت ان شرائط کو پورا نہیں کرتی، اگر وہ نفاذ قانون کی ضرورت سے خود رایانہ تہدید سے کام لیتی ہے اور ایسے محصول لگاتی ہے

[1] حسب بالا، کتاب دوم باب پنجم فقرہ ۲۷۔

جس کی رضامندی نہ دی گئی ہو تو اس صورت میں وہ ان مقاصد کی خلاف ورزی کرتی ہے جن کے لئے حکومت قائم کی گئی تھی، اور محکوم کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس معاہدے کو باطل قرار دیدے۔

دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ محکوم میں ابتداءً یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کی حکومت چاہیں اپنے لئے پسند کرلیں مگر انھیں یہ حق نہیں ہوتا کہ جب وہ ایک مرتبہ ایک حکومت کو پسند کرلیں تو پھر جب تک کہ وہ اپنے مفوضہ شرائط کو پورا کرتی رہے اسے بدل دیں۔ لیکن جب کسی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے خواہ طبعی طور پر جیسے یہ کہ شاہی خاندان کا سلسلہ منقطع ہو جائے، خواہ اعتماد کی خلاف ورزی کرنے سے، دونوں صورتوں میں اعلیٰ تشریعی اختیارات قوم کی طرف عود کر جاتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی اور مرضی سے جس طرح چاہے اسے قائم رکھے یا جسے چاہے عطا کرے۔ پس اس صورت میں قوم کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے ناقابل انفکاک دوائمی طور پر باطنی فرمانروائی حاصل ہے مگر صرف باطنی۔

ایک اور شرط کا نام لینا بھی ضروری ہے، قوم نے ابتداءً جس اعلیٰ حکومت کا تقرر کیا ہو اسے یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اختیار کو دوسرے کی طرف منتقل کردے۔ اس قسم کے انتقال کو کسی قسم کا جواز حاصل نہ ہوگا۔ حکومت کا اعلیٰ طبقہ لازماً وہی طبقہ ہوتا ہے جو قانون بناتا ہے نہ کہ وہ گروہ جو قانون پر چلتا ہے۔ یعنی وہ حصۂ جماعت مقننہ ہے نہ کہ جماعت عاملہ، انگلستان میں اول الذکر بادشاہ اور دونوں ایوان پارلیمنٹ ہیں، اور ثانی الذکر بادشاہ بغیر ایوانوں کے ہے اس لئے اگر جماعت مقننہ ابتداءً جس طرح مقرر کی گئی تھی اس سے بدل جائے خواہ خود اس کی مرضی سے یہ تبدیلی واقع ہو یا کسی دوسری طرح سے، دونوں حالتوں میں، اس کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اور لاک یہ کہتا ہے کہ جب کوئی حکمران جو جماعت مقننہ کا صرف ایک جزو ہے مجلس کے وضع کردہ قوانین کو بدل دیتا یا اسے معلق کر دیتا ہے اور ان کے بجائے اپنے خود رایانہ احکام کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تو جماعت مقننہ کی ہیئت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

نیز نتیجہ کے اعتبار سے جماعت مقننہ اس وقت بھی بدل جاتی ہے جب حکمراں اسے مقررہ وقت پہ جمع ہونے یا آزادانہ طور پہ کام کرنے سے روکتا ہے۔ یا یہ کہ وہ قوم کی مرضی یا اس کے مشترک مفاد کے خلاف اپنے خود رایانہ اختیار سے انتخاب کنندگان یا طریق انتخاب میں تغیر کر دے۔ اور آخری امر یہ ہے کہ قوم کو کسی غیر ملکی طاقت کے زیر فرمان کرے۔ جو حکمران ایسے امور کا مرتکب ہوتا ہے وہ اس دستور کو بدل دیتا ہے جس کی اطاعت پر اس کی قوم نے اتفاق کیا تھا، اور اس طرح اپنے اس حق کو زائل کر دیتا ہے کہ قوم اس کی اطاعت کرے اور وِگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جیمز دوم نے یہی کیا یا ایسا ہی کرنا چاہا تھا۔

خطبۂ بست و پنجم

خیالات سیاسیہ ۔ از لاک تا مانٹسکو

۱۔ میں نے اپنے آخری خطبے میں ہابس و لاک کی رایوں کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ہابس نے عالمِ خیال آرائی میں اس تحریک کی نمایندگی کی ہے جو مغربی یورپ کو ازمنۂ وسطیٰ کے منقسم اقتدار اور نامکمل سیاسی نظم وارتباط سے زمانۂ جدید کی اس مملکت کی طرف لئے جارہی تھی جو شاہی بنیاد پر قائم ہوئی تھی ۔ لاک کا اصول مسلمہ واقعات کی اس مستثنیٰ رفتار کے ہم آہنگ ہے جس نے انگلستان میں مطلق العنان شاہی کے بجائے آئینی بادشاہی قائم کردی تھی ۔ ہابس کی تحریر بغاوت عظمیٰ کے نازک زمانے کی ہے اور اس میں جائز حکومت کا ایک ایسا نظریہ مہیّا کیا گیا ہے جو چارلس اور کرامویل دونوں کے لئے یکساں کارآمد ہوسکتا ہے مگر کسی قسم کی تقسیم اختیارات کا وہ منکر ہے ۔ لاک کی کتاب ۱۶۸۸ء کے انقلابِ اعظم کے عین بعد ہی شائع ہوئی تھی اور اس میں وہ نظریہ دیا گیا ہے جس سے اس انقلاب کی تائید ہوتی تھی[۱]۔

اب ہمیں اُن خیالات پر نظر ڈالنا چاہیئے جو ان دونوں میں مشترک تھے ۔ دونوں حالت فطرت کے تصور سے آغاز کرتے ہیں جس میں ہر بالغ شخص استحقاقاً آزاد تھا، قوت سے کام لیکر وہ جو چاہے کرے مگر ایک کو دوسرے پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسی جائز حکومت کے طرز قیام کے لئے دونوں اس خیال پر متحد ہیں کہ یہ ایسی ہی لوگوں کے

---

[۱]۔ یہ ضرور ہے کہ جس سیاسی عقیدے کو پیش نظر رکھکر انقلاب ہوا تھا، اس کے بجائے اس کتاب میں زیادہ تر وہ اصول مسلمہ درج کیا گیا ہے جسکی بنا پر دستوری نظریہ سازوں نے اس انقلاب کو بجا ٹھہرایا تھا۔

"ابتدائی معاہدے" سے ہوا ہے جو ابتداً آزاد تھے۔ میں اس میں یہ بھی اضافہ کرسکتا ہوں کہ دونوں اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حکومتی اقتدار کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ فتح بھی ہے، اگرچہ ہابس کا دعوی یہ ہے کہ یہاں بھی فاتح و مفتوح کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہی ہوتا ہے، برخلاف ازیں لاک کا دعوی یہ ہے کہ جائز تسلط صرف منصفانہ جنگ ہی سے قائم ہوسکتا ہے اور وہ بھی صرف انھیں لوگوں پر جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا ہو۔

آپ دیکھیں گے کہ اس تمام بحث میں سوال جو کچھ ہے وہ استحقاق کا سوال ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حکومت کیونکر وجود میں آئی بلکہ سوال یہ ہے کہ اسے جواز کیونکر حاصل ہوا۔ اس کی تشریح "معاہدے" ہی میں نظر آتی ہے۔ اب یہ خیال ہوسکتا ہے کہ حکومت کے حقوق اگر کسی قدیم معاہدے پر منحصر ہوں تو اس کے تعین کا مسئلہ مورخوں کا کام ہے، مگر ہابس اور لاک دونوں میں سے کوئی بھی واقعی تاریخی طرز استدلال سے کام نہیں لیتا بجز اس کے کہ اپنے نتائج کی تصدیق کے لئے وہ اسے ذیلی طریقے پر کام میں لاتے ہیں۔ ہابس تو درحقیقت اصولاً اس کی تکذیب کرتا ہے[۱] اور لاک اگرچہ اس حد تک جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے مگر عملاً وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے، کیونکہ معاہدے کی خواہ کوئی صورت فرض کی جائے اس کا تعین وہ اسی طرح کرتا ہے کہ ان غایات پر غور کرنا چاہئے[۱] اس معاہدے کے موکد کرنے میں حالت فطرت کے معقول پسند اشخاص کو کیا خیال مدنظر ہوسکتا تھا۔

اس کے بعد دونوں اپنے مخالف یکدگر مسلمات کو ہر شکل کی حکومت پر عاید کرتے ہیں۔ ہابس کا مطلق العنان مقتدر اعلیٰ ایک ذات واحد یا متعدد اشخاص پر مشتمل ہوسکتا ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اقتدار تمام قوم کو اجتماعاً حاصل ہو، لیکن اس کا میلان ملوکیت کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح لاک کا نظریہ بھی ہر شکل کی حکومت کو قابل قبول سمجھتا ہے شرط صرف اتنی ہے کہ ان حکومتوں کا نفاذ اختیار اس کے شرایط کے موافق ہو۔ ابتدائی معاہدہ، عمومیت، عدیدیت، شاہی یا کوئی مرکب صورت قائم کرسکتا ہے۔ جو طریقہ بھی پسند کرلیا جائے، اس کی اطاعت صرف اسی وقت تک واجب ہوگی جب تک کہ وہ اپنی شرط

---

[۱] دیکھئے "لیوایاتھن" باب ہستم کا آخری حصہ۔

اعتماد کو پورا کرتا ہے، لیکن جس طرح ہابس بادشاہی کو مرجع قرار دیتا ہے، اسی طرح لاک اس کے برعکس اس حکومت کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہے جس میں تشریعی اختیار، عاملانہ اختیار سے جدا ہو، اور تمام تر یا زیادہ تر ایسے متعدد و مختلف اشخاص کے ہاتھوں میں ہو جو ایک جماعت کی حیثیت سے قانون وضع کریں اور اس کے بعد بہ حیثیت افراد کے اس کی اطاعت کریں۔ اور یہ صورت اس وجہ سے قابل ترجیح ہے کہ یہ قانون سازوں کو انسانی کمزوری کے اس تقاضے سے بچاتی ہے جو قانون سازی کی اس شکل میں اپنا کرشمہ دکھاتی ہے جب انھیں لوگوں کو جو قانون بناتے ہیں، یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو جاری بھی کریں اور اس طرح اپنی ذات کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت سے آزاد کرلیں اور قانون کو توضیع و تنقید دونوں پہلوؤں سے اپنے اغراض ذاتی کے مفید مطلب بنالیں[1]۔"

اور جب یہ تفریق عمل میں آجاتی ہے تو مجلس مقننہ کو فطرتاً و لازماً جماعت عاملانہ پر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے کیونکہ جو گروہ قوانین کو عمل میں لاتا ہے اسے بالضرور اس گروہ کے تابع ہونا چاہئے جو قوانین وضع کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان کی طرح جہاں کہیں حکومت عاملانہ کا سرگروہ اعلیٰ مجلسِ مقننہ کا شریک ہوتا ہے اور اس لئے قانون سازی کے لئے کوئی دوسری شخصیت اس سے بالاتر نہیں ہوتی تو ایک قابل قبول مفہوم میں اسے بالاتر یا مقتدر اعلیٰ کہہ سکتے ہیں اور روایتی طور پر تو اسے واقعی مقتدر اعلیٰ کہا ہی جاتا ہے، مگر یہ امر بدستور صحیح رہتا ہے کہ وہ حکومت کے حقیقی بالاتر یا مقتدر اعلیٰ حصے کا محض ایک جزو ہوتا ہے، اور اس کے لئے اطاعت شعاری و وفاداری کا جو حلف لیا جاتا ہے وہ بہ حیثیت اعلیٰ وضع قوانین کے نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ متفق ہوکر اس نے جو قانون بنایا ہے وہ اس کا عامل اعلیٰ ہے[2]۔ ہابس کی یہ دلیل کہ انگلستان میں کئی صدیوں سے صرف بادشاہ مقتدر اعلیٰ کہلاتا رہا ہے اسے لاک نے اس طرح رد کیا ہے کہ جہاں مجلسِ مقننہ جماعت عاملانہ سے ممیز ہے وہاں

---

[1] لاک حسب بالا باب دوازدہم فقرہ ۱۴۳۔

[2] لاک، باب ۱۳۔

اس مجلس کو فایق ہونا چاہئے اور انگلستان میں صدیوں سے بادشاہ مجلس مقننہ کا صرف ایک شریک کار رہتا آیا ہے۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا کہ جب بادشاہ پارلیمنٹ کے مقررہ قوانین کو بدل دیتا یا معطل کر دیتا ہے یا قوم کی مرضی کے بغیر اور اس کے مشترکہ مفاد کے خلاف دارالعوام کے انتخاب یا طرز انتخاب میں تغیر و تبدل کر دیتا ہے یا پارلیمنٹ کو اس کے وقت مقررہ پر منعقد ہونے یا آزادی کے ساتھ کام کرنے سے روک دیتا ہے تو ان سب صورتوں میں دراصل قایم شدہ جماعت مقننہ کو بدل دیتا ہے۔ اسی طرح جن قوانین کے عمل میں لانے کے لئے اس کا تقرر ہوتا ہے جب وہ جماعت عاملہ کے منتظم کی حیثیت سے ان قوانین کے برعکس خود غرضی سے کام لینے لگتا ہے، یا جبکہ وہ نمایندوں کو رشوت دینے اور ان سے اپنے حسب مطلب کام لینے کے لئے قومی قوت ملکی خزانے اور سرکاری عہدوں سے کام لینے لگتا ہے تو وہ اپنے اعتماد کے خلاف عمل کرتا ہے، ان دونوں صورتوں میں رعایا کی اطاعت کا جو حق اسے حاصل ہے وہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ جائز طور پر اس کے بجائے دوسرا بادشاہ مقرر کر سکتی ہے [۱]

لیکن ہابس کی اس قوی ترین دلیل کا لاک اس طرح جواب دیتا ہے کہ اگر اس اساسی معاہدے میں جس پر حکومت کی بنا ہو اس قسم کے شرائط داخل کر دیے جائیں تو پھر طوائف الملوکی پیدا ہو جاتی ہے۔ لاک نے اسے کسی حد تک تسلیم کیا ہے، طوائف الملوکی ضرور پیدا ہوتی ہے کیونکہ جو حکومت اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرتی ہو اس کی مقاومت کرنے کے متعلق محکوم کے حق کا تعلق با ضابطہ تنظیم سیاسی سے نہیں ہے بلکہ اس سے مقاومت کے اُس حق کا اعادہ ہوتا ہے جس سے حالت فطری میں انسان کو اپنے نقصان رساں کے خلاف مقاومت کا حق تھا۔ لاک اسے پوری طرح تسلیم کرتا ہے، اور نہایت لطیف شاعرانہ زور کے ساتھ اس دلیل کو اپنے مخالفین ہی کے اوپر پلٹ دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہی تو وجہ ہے کہ اس حکومت کا جرم کس قدر سخت ہو جاتا ہے جو اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرے اور اس کی پاداش میں طوائف الملوکی کے مصائب نازل ہوں [۲]

---

[۱] حسب بالا باب نوزدہم۔

[۲] حسب بالا باب نوزدہم۔

مگر ہمیں اس خطرے کے متعلق بہت مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا چاہئے۔ یہ آسان نہیں ہے کہ کوئی قوم انقلاب کے مشکلات وخطرات اور اس کے لابدی مصائب وآلام کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔ قائم شدہ حکومت جب اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرنے میں نہایت ہی شدت وابرام سے کام لے اسی وقت یہ ممکن ہے کہ قوم انقلاب پر آمادہ ہوجائے اور درحقیقت وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ عام طور پر یہ تسلیم کئے جانے سے کہ حکومت کا اعتماد خود رایانہ اختیار نہیں ہے بلکہ شرائط سے جکڑا ہوا ہے، بغاوت و طوائف الملوکی کا خطرہ بڑھنے کے بجائے درحقیقت گھٹ جاتا ہے کیونکہ اس سے ظلم وستم کا اندیشہ کم ہوجاتا ہے اور تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریات کے سوچنے والے جو چاہیں کہیں مگر حقیقت میں ظلم وستم ہی سے انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ جدید یورپ کے سیاسی خیالات کے ارتقا کا قدم بقدم پتا چلاتے ہوئے جب ہم سترھویں صدی سے گزر کر اٹھارھویں صدی میں پہنچتے ہیں تو اس کے آغاز میں طالبعلم کی خاص توجہ کا مرکز انگلستان ہوتا ہے مگر وسط صدی تک یہ مرکز فرانس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فرانسیسی جو اس خیال کے اجزا کی جستجو کر رہا ہو جس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب عظیم تک نوبت پہنچائی تو اس کے لئے بھی سترھویں صدی کے کسی فرانسیسی مصنف کی بہ نسبت ہابس ولاک زیادہ اہم ہوں گے، اور اسی طرح جو انگریز جدید انگلستان کے حالات ماقبل میں خاص دلچسپی رکھتے ہوئے، سیاسی خیال کا مطالعہ کریں گے میرے خیال میں انھیں بھی اٹھارھویں صدی کے وسط میں اپنی خاص توجہ عارضی طور پر انگلستان سے فرانس کی طرف منعطف کرنا پڑیگی کیونکہ اس صدی کے آخری نصف حصے میں انگریزوں کے سیاسی خیالات میں سب سے زیادہ دلچسپ اجزاء کا پتا فرانسیسی خیالات ہی میں ملے گا۔ یہ اثرات یا تو اتباعی طرز کے تھے اور ان سے براہ راست جوش پیدا ہوتا تھا یا شدت مخالفت کی وجہ سے وہ بالواسطہ موجب اشتعال ہوتے تھے[۱]۔

اس صدی کے پہلے نصف حصے میں انگلستان میں خیالات کی رفتار کچھ سست

[۱]۔ اس آخرالذکر صنف کی مثال میں برک کے تحریریات پیش کی جاسکتی ہیں جو اس زمانہ کے انگریز ارباب قلم میں سب سے بڑا تھا۔

سی تھی، لیکن ایک غور کرنے والے طالبعلم کے لئے اس میں وہی دلچسپی ہے جو اکثر جمود کے اُس زمانے میں ہوتی ہے جو ذہنی قوت و حرکت کے زمانوں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس میں یہ پتا چل سکتا ہے کہ خیالات کی قدیم شکل ہٹ رہی ہے اور ان کے لئے نئی صورتیں پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہو رہا ہے۔

حکومت کے چشمۂ اختیار اور اس کی تجدید کے متعلق اساسی معاہدہ معاشری کی نسبت لاک کا خیال وسعت کے ساتھ مقبول تھا مگر زیادہ تر اسے محض رسماً قبول کیا گیا تھا، اس پر اصولی اتفاق رائے نہیں تھا۔ اس پر جہاں تک خیال آرائی ہوئی اس کا عام رجحان ایک عملی سوال کو تاریخی مسئلے سے جدا کر دینے کی طرف تھا، سوال یہ تھا کہ اس عہد اور اس زمانے میں جو حکومت موجود ہے اس کے فرائض و اختیارات کا تعین کس طرح کیا جائے؟ تاریخی مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے اسلاف نے کن شرائط کے ساتھ حکومت کی اطاعت پر رضامندی تاریخی یا قبل تاریخی ظاہر کی تھی؟۔ یہ خیال روز بروز زیادہ راسخ ہوتا جاتا تھا کہ اول الذکر مسئلے کو موخر الذکر مسئلے کی تحقیقات کے نتیجہ پر مبنی نہ ہونا چاہیئے، اور یہ خیال صرف انھیں لوگوں کا نہیں تھا جن میں انقلاب کا میلان پایا جاتا تھا کہ فرض کیا جائے کہ انگریزوں کے اسلاف سے یہ محال شدید سرزد ہو گیا ہوتا کہ وہ اپنی رضامندی کے بغیر اپنے اوپر محصول عائد ہونے دیتے اور اس طرح ان سے یہ نہایت نتیجہ خیز لغویت سرزد ہوتی کہ وہ اپنے اوپر محصول لگانے کی اجازت دیدیتے تھے تو کیا یہ کوئی دلیل اس امر کی ہو سکتی ہے کہ انگریز ہر وقت ان کی ناقابل برداشت حماقت کے نتائج کو برداشت کرتے رہیں؟ (مثلاً) کہتا ہوں کہ فلسفۂ اخلاق کے ایک فہمیدہ پروفیسر فرانسس ہچیسن نے (جنھوں نے گلاسکو میں سنہ ۱۷۳۰ء سے ۱۷۴۶ء تک درس دیا تھا) یہ جواب دیا ہے کہ "نہیں، ہم ایسے غیر معقول معاہدے کی پابندی سے آزاد ہیں اور ہم نظم سلطنت کے ایک نئے نمونے کے لئے اصرار کر سکتے ہیں۔"[1] اس شرط کے ساتھ لاک کے آرا وہگوں کے قدیم مسلمات کے بجائے مقبول ہو گئے تھے، مگر ان سے کسی کو گہری دلچسپی نہیں تھی، دوسری طرف بادشاہوں کے مسلمہ حقوق ربانی کا وعظ جو لاک کے دلائل کا ہدف بنا تھا، اگرچہ منبروں پر جاری رہا مگر روزمرہ کی زندگی میں اس کا کوئی زبردست اثر باقی نہیں رہا تھا چنانچہ بولنگ بروک نے اسے ایک دقیانوسی محال قرار دیا ہے جو اس قدر طفلانہ طرز کا ہے کہ اس کی

---

[1] ہچیسن: نظام فلسفۂ اخلاق (Sytem of Moral Philosophy) کتاب سوم باب پنجم فقرہ ۴ -

تردید کی بھی ضرورت نہیں، اور مسٹر لیزلی اسٹفن نے جس زمانے کو عہد والپول کا لقب دیا ہے اس کا خاص سیاسی صاحب فکر بھی بولنگبروک تھا۔

فلسفۂ سیاسی کی تاریخ میں بولنگبروک کو کسی جگہ کا سزاوار قرار دیا جانا ذرا دشوار ہے مگر سیاسی خیالات یا تصورات اور فلسفۂ سیاسیہ بالکل ایک ہی شے نہیں ہیں اور انگریزوں کے سیاسی تخیلات کی تاریخ میں اس سے روگردانی ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ نہ صرف والپول (۱۷۴۱-۱۷۲۵) کے پارلیمنٹی فریق مخالف کا (جو برابر بڑھتا جا رہا تھا) "رہبرِ فلسفی ورفیق" علہ تھا اور اس کے تخیلات نے نہ صرف انگلستان کے اسوقت کے دستور پر قابلِ قدر روشنی ڈالی بلکہ اس کی سیاسی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ خیالات زندہ رہے اور انگریزی سیاسیات کی روش پران کا بہت معقول اثر پڑا۔ ہم ان خیالات کے اثر کو ہیوم کے زیادہ باشکوہ اور واضح تر تصورات میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے سیاسی فریقوں پر جو مقالہ لکھا ہے (Dissertation on Parties) اور جس میں اس نے والپول کے ساتھ اپنی مدت دراز کی مخالفت کا خلاصہ درج کیا ہے، اس میں دو ابتدائی ہانوری بادشاہوں کے تحت میں انگلستان کے پارلیمنٹی فریقوں کی جو مخصوص حالت تھی اس کی طرف توجہ دلانے میں وہ ہیوم سے سبقت لے گیا ہے وھگ محض اپنی کامیابی ہی کے زور سے درباری فریق بن گئے تھے اور اس کامیابی کی وجہ سے ٹوریوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ وہ حکمران بادشاہ کے فریق مخالف بنجائیں، اس طرح حالات گرو وپیش کی رو میں پڑ کر ہر فریق نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ابتدائی اصول ہی سے ٹکرا رہا ہے۔ فریق جب اس حالت میں آجاتے ہیں تو وہ محض گروہ بندی کی پستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بولنگبروک نے انھیں خوب ذہن نشین کیا ہے۔ غالباً ایک حد تک اسی اثر کے باعث سے یہ ہوا کہ آنے والی نسل میں سیاسی فریقوں کی طرف سے بہت ہی سخت بدظنی پیدا ہو گئی، حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ پارلیمنٹی حکومت کے لئے فریق ہی مسلمہ آلہ ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے قبل، جبکہ زوال والپول کے تقریباً تیس سال کے بعد، برک نے "موجودہ خلفشار پر خیال آرائی" (Thoughts on the present Discontent) کے نام سے ہنگامہ برپا کیا تھا

علہ۔ پوپ۔ "انسان" (Essay on Man) قطعۂ چہارم

انگریزی ادب میں پارلیمنٹی فریقوں کے اتحادِ عمل کے متعلق کوئی زبردست مدافعت کی گئی تھی یا نہیں ؟

اب یہ سوال ہے کہ بولنگبروک کا سیاسی منتہائے خیال کیا تھا۔ یہ منتہائے خیال بے حد مبہم اور سطحی سا تھا، اور میں اس پر نظر صرف اس وجہ سے ڈالتا ہوں کہ مغربی یورپ کے ارتقائے سیاسیہ میں انگلستان کی دستوری تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے تحفظ کی غرض سے بولنگبروک یہ چاہتا تھا کہ "دستورِ مملکت میں توازن قائم رہے"۔ اور اس مقصد کے لئے اس کی خواہش تھی کہ ایک حقیقی "ملکی فریق" بناکر (جس میں ٹوری اور وھگ گروہوں کے امتیازات مٹا دیئے جائیں) اس خرابی کا خاتمہ کر دے جس سے پارلیمنٹ کی آزادی خطرے میں پڑی ہوئی تھی لیکن ہیوم پر اس کے خالی الذہن اور دوررس تصور کی وجہ سے جوامر صاف عیاں ہوگیا بولنگبروک کی نظر اس حد تک نہیں پہنچی، وہ یہ کہ فی الحقیقت یہی خرابی یا کم از کم یہ کہ مناصب و وظائف کی وجہ سے ارکان (دارالعوام) پر بادشاہ کا جو اثر پڑتا تھا، اسی کی وجہ سے اٹھارھویں صدی میں بادشاہ اور دارالعوام کے درمیان توازن قائم تھا۔ یہ اثر اگر برباد ہوجاتا تو پھر جدید دستورِ مملکت کا لابدی میلان یہی ہوتا کہ اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر پارلیمنٹ کے مقرر کردہ وزرار کے ہاتھ میں آجائے چنانچہ مابعد کی تاریخ نے اسے ثابت کر دکھایا۔ بولنگبروک اسے نہیں دیکھتا، وہ اپنے "محبِ وطن بادشاہ کے خیال" (Idea of a Patriot King) کو شرح وبسط سے بیان کرتا ہے جس کا کام وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا بادشاہ خرابیوں کو دور کر دے گا، اور صاحبِ تاج وتخت ہونے کے سوا کارفرمائی بھی وہی کرے گا، گروہ بندی کی مضرتوں کا خاتمہ کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی نظامِ سلطنت کے توازن کو بھی قائم رکھے گا۔

یہ خیال حقیقتاً ناقابلِ عمل تھا مگر اس نے عملی اثرات پیدا کئے۔ جیسا کہ رسالۂ سہ ماہی "(کوارٹرلی ریویو) میں کسی نے لکھا ہے کہ "جس انقلابِ عظیم نے فلم اور راچسٹر کے ٹوری اصول کو جانسن اور پٹ کے ٹوری اصول سے بدل دیا، اس کے پیدا کرنے میں اس تخیل نے کچھ کم مدد نہیں کی"[1] اس کے بجائے کہ بادشاہ اپنے حقوقِ ربانی کی بنا پر

---

[1] کوارٹرلی ریویو Quarterly Review جلد ۱۵۱، (۱۸۸۱ء) صفحہ ۳۴۳

اطاعت کا خواستگار ہوتا، ان لوگوں نے ایک ایسے بادشاہ کو اپنا قبلۂ وفاداخلاص بنالیا جو اس بنا پر اطاعت کا طالب تھا کہ وہ اپنی حب الوطنی کی وجہ سے فریقوں سے بالاتر ہے اور اس کی تمام تر توجہ ہمیشہ ملک کے اصلی مفاد کی طرف منعطف رہتی ہے، اور اسی بنا پر اس نے اس قسم کی اطاعت حاصل بھی کرلی تھی۔ جارج سوم نے اپنے ابتدائی عہد میں بلاشک وشبہ اس قسم کا تخیل قائم کیا تھا، اور اگرچہ خرابیوں کے رفع کرنے کا خیال بہت جلد ہوا ہوگیا جارج سوم اور پٹ اصغر نے ۱۷۸۳ء میں وھگوں کو جس تدبیر سے پامال کیا اس میں ایک جزو اس کا بھی تھا کہ انھوں نے اس مبہم مگر پرزور جذبے کی طرف رجوع کیا جو جارج سوم کے تخیل کی تائید میں ہنوز قوم کے اندر موجود تھا۔

میں بولنگبروک کے اثر کا پتا لگانے میں اس دور سے آگے نکل گیا جس میں وہ موجود تھا اور جس میں اس نے یہ تصنیف لکھی تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس دور کا خیال بہ حیثیت مجموعی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شاندار انقلاب" کی معرکہ آرائی کے بعد اور شاید ان کے نتائج سے کسی قدر بددلی کے باعث ضعف وکلال کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس زور کے ساتھ جس مقصد کی تلاش تھی وہ حاصل ہوگیا تھا۔ قانون کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور وضع قوانین واجرائے محاصل کے معاملے میں بادشاہ قطعی طور پر پارلیمنٹ کے زیر اقتدار آگیا تھا۔ دستور سلطنت کا توازن معقول حد تک محفوظ ہوگیا تھا مگر اپنے جس متوازن دستور پر انگریزوں کو فخر تھا اس میں اس یقین سے کسی قدر کمی پیدا ہوگئی تھی کہ پارلیمنٹ درحقیقت عدیدی فرقہ بندیوں کا نشیمن ہے اور بادشاہ نے رشوت کے زور سے ان میں عارضی وناپائدار ہم آہنگی پیدا کردی ہے۔

اس کے بعد ۱۷۴۸ء میں مون ٹسکیو کی کتاب "روح القوانین" (Esprit des Lois) شایع ہوئی اور انگریزوں نے دفعۃً یہ دیکھا کہ ان کا دستور سلطنت نمونۂ کمال بن گیا ہے، اور تعلیم یافتہ یورپ کی قدردانی کے لئے منظر بلند پر رکھ دیا گیا ہے۔ گویا اس دستور کی ترکیب آزادی کے حصول کے لئے ان عمومی جمہوریتوں سے بڑھی ہوئی تھی جن کی شہرت قدیم زمانے سے قائم ہے۔ مون ٹسکیو نے انگریزی دستور کا اس خوبی، جامعیت اور تحسین کے ساتھ جب تجزیہ کیا تو اس سے نہ صرف غیر ملکی مبصروں کی توجہ اس طرف منعطف ہوگئی بلکہ خود انگریز اس پر زیادہ فخر کرنے اور اس کے خصوصیات کو

ایک نئی نظر سے دیکھنے لگے [۱]

۳۔ جب اس صدی کے عین وسط کے قریب انقلاب فرانس سے پہلے کے خیالات کی ترقی شروع ہو گئی تھی اس وقت ہم انگریز مصنفوں کو چھوڑ کر فرانسیسی مصنفوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انگریزی اور فرانسیسی انقلابوں کے درمیانی زمانے میں نظریے اور واقعے کے تعلق میں جو فرق ہو گیا تھا، اسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ہابس اور لاک دونوں میں سے کسی نے بھی سیاسی واقعات پر عملی اثر نہیں ڈالا۔ بغاوت کے بعد جو رجعت قہقری ہوئی اس کی ہابس نے اپنی کتاب میں پیش بندی تو ضرور کر دی تھی مگر اس کے اثر کو اس رجعت کا باعث قرار دینا دشوار ہے۔ لاک کی تصنیف نے ایک ایسے انقلاب کو حق بجانب ثابت کیا جو ختم ہو چکا تھا۔ فرانسیسی مصنفوں نے ایک ایسے انقلاب کے لئے راستہ تیار کیا جو آیندہ پیش آنے والا تھا۔ سیاسی خیالات کی کوئی فرانسیسی تاریخ کھوئیے اور میں اس کے لئے ژانے (Janet) کی تاریخ سیاسیات (Histoire de la Politique) کی سفارش کر سکتا ہوں، یہ کتاب اگرچہ شدید غلطیوں سے پاک نہیں ہے مگر پھر بھی ایک گراں بہا کتاب ہے، بہر حال اس کتاب کو کھولئے اور آپ یہ دیکھیں گے کہ مونٹسکیو کی "روح القوانین" کو روسو کے "معاہدۂ معاشری" کے ساتھ یکجا کر کے یہ قرار دیا گیا ہے کہ یہی دونوں کتابیں انقلابی تحریک کا عملی منبع و ماخذ ہیں ژانے ہونٹسکیو کی کتاب کو بلاشک و شبہ اٹھارویں صدی کی سب سے بڑی تصنیف خیال کرتا ہے

یہ صحیح ہے کہ جو انگریز مونٹسکیو کی کتاب کو اب پڑھتا ہے اسے یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ جس تحریک کا منتہائے خیال ایک ایسے سیاسی نظم کا پیدا کرنا ہو جو فطری حق کے قدیم غیر متغیر اور ہمہ گیر اصولی پر مبنی ہو، اس میں یہ کتاب کیا مدد دے سکتی ہے

[۱] اس خیال کی جس پر ظاہر ہے انگریز سب سے زیادہ مانوس ہیں یا وہ بلیکسٹن کے شروح (کتاب اول باب دوم) میں پایا جاتا ہے ان مشہور شروح کی پہلی جلد ۱۷۶۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ بلیکسٹن اپنے کام کے لحاظ سے کسی سیاسی نظریہ کی نہیں بلکہ انگلستان کے قوانین کی توضیح و تشریح کر رہا تھا مگر تعلیم یافتہ ناظرین کے مذاق کو پورا کرنے اور اس کے تشریحات کو صحیح نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ قانونی جزئیات کا بیان سیاسی نظریات کے سانچہ میں ڈھالا جائے اور اس کا مواد زیادہ تر مونٹسکیو کی تصنیف سے لیا گیا تھا، البتہ اس زمانہ کے طرز کے موافق اس کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا۔

کیونکہ انگریزوں کے نزدیک مونٹسکیو کی جدت و دلچسپی زیادہ تر یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید اصول قانون و سیاسیات میں تاریخی طرز کی عظیم الشان باقاعدگی شامل کی اور انگریزوں کے خیال کے بموجب تاریخی طرز اور روسو کی استدلالی اشکل اور سیاسی ترکیب کے ساتھ اس کے مفروضہ ہمہ گیر اصول میں ایسا ہی بیر ہے جیسا آگ اور پانی میں۔ اس لئے مجھے اس میں تعجب نہیں کہ مین، مونٹسکیو کے اثر کو روسو کے اثر کے مخالف اور اس میں توازن پیدا کرنے والا خیال کرتا ہے[1]۔ میرے خیال میں یہ مغالطہ انگیز رائے ہے، اور ژرانے کی رائے اس سے بہت زیادہ صحیح ہے، لیکن مجھے مین کی غلطی پر کوئی حیرت نہیں ہے کیونکہ درحقیقت مونٹسکیو کا اساسی مسلمہ یہ ہے کہ قوانین اور اشکال حکومت کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ مجرد و ہمہ گیر طرز پر نہیں ہو سکتا بلکہ صرف تاریخی اور تناسبی طرز پر ہو سکتا ہے۔ اس کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ خاص خاص قوانین و ادارات سیاسیہ کے اچھے یا برے قرار دینے کے متعلق یہ ضروری ہے کہ ان پر اس لحاظ سے غور کیا جائے کہ جس نظم معاشرے میں وہ قائم ہیں اس کی حکومت کی شکل کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ قانون بادشاہی یا اعیانیت کے لئے کارآمد و مناسب ہو مگر عومیت کے لئے برا ہو اور اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ دوسرا دعویٰ اس کا یہ بھی تھا کہ ہم کو اشکال حکومت کی خوبی پر مجرداً خیال نہیں کرنا چاہئے بلکہ بنی نوع انسان کے جن مخصوص حصوں میں حکومت کی مختلف شکلیں، واقعاً قائم ہوں، ان کی متغائر نوعیت و فطرت، عادات و خصائل، اور حالات گرد و پیش سب کو پیش نظر رکھکر ان پر غور کرنا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق یہ سوال کہ اس میں عمومی حکومت ہونا چاہئے یا نہیں، اس کا جواب مونٹسکیو کی رائے کے مواقف ہم اسوقت تک نہیں دے سکتے جب تک کہ ہیں اس قوم کی اندرونی و بیرونی کیفیت کا علم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی اخلاقی حالت اتنی کمزور ہو کہ وہ جمہوری ادارات کا بار نہ اٹھا سکے یا وہاں کی آب و ہوا اتنی گرم ہو کہ وہ انجام کار ہیں مطلق العنانی ہی کے غار میں جا گرے۔

حکومت کے ساتھ قوانین کے تعلق اور داخلی و خارجی حالات کے ساتھ حکومت کے تعلق باہمی کی نسبت ان دونوں خارجی مقالات کی توضیح و تشریح میں بہت ہی وسیع علمیت

---

[1] ۔ قانون قدیم (Ancient Law) باب چہارم

نہایت ہی جدت و دقیق النظری اور اس سے بھی زیادہ تدبیر و تلمیح سے کام لیا گیا ہے، اور یہ سمجھنا آسان ہے کہ کیوں اس کتاب کو ایسی درخشاں علمی کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کتاب انقلابی تحریک کا منبع کیسے ہوسکتی تھی۔ اس کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ مونٹسکیو کا تاریخی غیر جانبدارانہ جذبہ وسیع نہیں ہے، اور ایک قسم کی حکومت کو دوسری قسم کی حکومت پر ترجیح دینے میں اس نے اجتناب سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے اپنا کام یہ رکھا ہے کہ وہ یہ ظاہر کردے کہ جمہوریت، بادشاہی اور مطلق العنانی، حکومت کی جو یہ تین شکلیں ہیں (جنھیں وہ ان کی نوعیت فطری اور اصول کے لحاظ سے اساسی طور پر ایک دوسرے سے ممیز تسلیم کرتا ہے) وہ مختلف قوموں کی حالت کے لئے موزوں ہیں اور ان کے قائم رہنے کے لئے ہر ایک کے واسطے جدا جدا قوانین کی ضرورت ہے مگر اس بنا پر مونٹسکیو، ان ستون کے اصول کی بابت غیر جانبدار نہیں رہتا، بلکہ اس کے برعکس وہ ان اصول کو جس طرح پیش کرتا ہے اس میں ایسا تغیر پایا جاتا ہے جیسا روشنی، شفق اور تاریکی کے درمیان ہے۔

جمہوریت کا اصول "سیاسی نکوکاری" ہے (یعنی ذاتی اغراض کی کیسی ہی قربانی کیوں نہ کرنا پڑے لوگ خدمات عامہ کے انجام دینے پر کمربستہ رہیں)، اور حب الوطنی و مفاد عام کا جوش ان میں موجود رہے، یہی وہ کمانی ہے جس کے بل پر یہ حکومت چلتی ہے اور جب حکومتِ جمہوری بواقعی سرسبز رہتی ہے تو یہی کمانی اس کے موثر عمل کو قائم رکھتی ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ وصف اعیانی جمہوریت کی بہ نسبت عمومی جمہوریت کے ساتھ زیادہ مختص ہے۔ ان میں سے اول الذکر ثانی الذکر کے جس قدر قریب پہنچتی جاتی ہے اسی قدر وہ زیادہ مکمل ہوتی جاتی ہے[ٹ]۔ اس وصف کی اس کیفیت کے ساتھ بادشاہی میں حاجت نہیں ہے، اور بادشاہی سے آپ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے مراد مونٹسکیو کے زمانے کی مغربی یورپ کی بادشاہی ہے جس کی سب سے زیادہ شاندار مثال فرانس میں پائی جاتی تھی جمہوریت میں جس سیاسی وصف کی ضرورت ہے اس کی حاجت بادشاہی میں نہیں ہے اور یہ خوش قسمتی ہے کیونکہ یہ یقینی ہے کہ بادشاہی اس قسم کے

ٹ۔ اعیانیت اور عمومیت کے فرق کو اس طرح محض ثانوی قرار دینا مونٹسکیو کے خصوصیات میں سے ہے۔

وصف کی پرواخت نہیں کرتی اور اس لئے اگر اسے اس کی ضرورت پڑے تو وہ کسی بڑے پیمانے پر اس کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ بادشاہی جس بل بوتے پر کام کرتی ہے وہ "اعزاز کا حس شعور" ہے یعنی ان ذی امتیاز طبقات (خاص کر امرا اور قانون پیشہ اشخاص کے سرگروہوں) کا احساس عزت جو بادشاہ اور عام رعایا کے مابین درمیانی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسی اعزاز کا احساس بادشاہی کی قوت کا ذریعہ ہے کیونکہ جب تک بادشاہ ان لوگوں کے روایتی امتیازات و قواعد کا لحاظ رکھتا ہے اس وقت تک ذی امتیاز طبقات نہایت انہماک و تندہی کے ساتھ اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگر بادشاہ ان امتیازات کو نظر انداز کر دینا چاہتا ہے تو یہ لوگ مقاومت کا بھی منبع بن جاتے ہیں جسے حسب دل خواہ گھٹانے بڑھانے پر انھیں قدرت ہوتی ہے۔ میں اسے حسب دل خواہ گھٹنے بڑھنے والی مقاومت اس وجہ سے کہتا ہوں کہ بادشاہ جس نقطے پر بھی جم جائے وہیں وہ اس مقاومت کو توڑ سکتا ہے مگر عملی حیثیت سے یہ ایک عملی روک ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مونٹسکیو کی رائے میں یہ مغربی یورپ کی بادشاہی اور مشرقی مطلق العنانی کے درمیان ایک اساسی فرق ہے، کیونکہ مشرق میں سب یکساں غلام ہوتے ہیں اور حکومت جس قوت کے بھروسے پر کام کرتی ہے وہ محض خوف و ہراس کا جذبہ ہے۔

اب آپ دیکھتے ہیں کہ مونٹسکیو کی تاریخی بے لوثی کہاں آکر ختم ہوئی یہ صحیح ہے کہ وہ اہل ملک کے سامنے عملی نہتائے خیال کے طور پر عمومیت کی سفارش نہیں کرتا بلکہ اس کا عملی منشا زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی بادشاہی کے مطلق العنانی کے غار میں گر جانے کا جو خطرناک میلان پیدا ہو گیا تھا اس سے وہ بادشاہی کو بچائے، اور اس مقصد کے حصول کی توقع وہ اس طرح کرتا ہے کہ بادشاہ اور رعایا دونوں پر امرا کی عزت اور اہل قانون کے احساس جماعتی کے لحاظ کرنے پر زور دے کیونکہ اس سے دونوں فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک طرف تو بادشاہ کو حکومت کے کام کے لئے اس سے بہتر آدمی ملتے تھے جیسے محض غلاموں میں سے میسر آ سکتے تھے اور دوسری طرف بادشاہ کی اندھا دھند حرص و ہوس پر ایک طرح کی لوچدار مگر حقیقی روک قائم رکھتے تھے لیکن اگرچہ مونٹسکیو نے عمومی جمہوریت کی سفارش نہیں کی ہے تاہم اس نے اپنے تاریخی معلومات کے ذخائر اور اپنی خوش بیانی کی تمام قوت کو اس کوشش میں صرف کر دیا ہے کہ حکومت کی اس شکل کی نسبت جس میں حب الوطنی اور جذبۂ مفاد عامہ کی ضرورت اور پرداخت

دونوں ملی ہوئی ہیں،، اس کے لئے معقول دلائل قدردانی کی اشاعت کرے۔ یہ خیال کہ "سیاسی نکوکاری،، میں جمہوریتیں سب سے مقدم ہیں بلکہ یوں کہئے کہ انھوں نے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے اسی کو فرانس کے انقلابی خیالات کا خاص تاریخی عنصر قرار دے سکتے ہیں، اور ممکن ہے کہ انقلابی جوش کی آگ کے بھڑکانے میں اس نے بھی اتنا ہی کام دیا ہو جتنا کہ فطری آزادی ومساوات اور قوم کے ناقابلِ انفکاک وناقابل تقسیم اقتدارِ اعلیٰ کے خیالات نے کیا تھا۔

۴۔ لیکن "۱۷۸۹ء کے خیالات،، میں مون ٹسکیو نے صرف اتنا ہی اضافہ نہیں کیا ہے اور نہ یہی وہ شئے ہے جس نے مدت دراز کے بعد اس دستور سازی میں سب سے زیادہ اثر دکھایا ہو جس کی پہلی تحریک ۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پیدا ہوی۔ مدت دراز کے بعد یونانی رومانی عالم کی عمومی جمہوریت نے جدید عمومی حکومت کیلئے نمونہ مہیا نہیں کیا بلکہ اُس نظامِ سلطنت نے یہ نمونہ مہیا کیا جسے مون ٹسکیو نے قدرافزائی کے لئے سب سے الگ کر لیا تھا، یعنی یہ وہ انگریزی دستور تھا جو ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بموجب قرار پا گیا تھا۔

برطانوی دستور سیاسی کو مون ٹسکیو نے جس طرح بیان کیا ہے اس کی اہمیت کا باعث یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ عمومی جمہوریتوں کا گرویدہ تھا پھر بھی اس نے صاف طور پر یہ دیکھ لیا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ عمومی دستور ہی سب سے زیادہ آزادی لئے ہوئے ہو یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی ترتیب اس طرح پر ہو کہ اس سے افراد کی معقول آزادی کو بیش از بیش تحفظ حاصل ہو سکے۔ درحقیقت وہ تاریخ کے مطالعے سے یہ جانتا تھا کہ افراد پر ناواجب سختی کرنے میں عمومی کثرت بھی ایسی ہی ظالمانہ ہو سکتی ہے جیسا کسی مطلق العنان بادشاہ کا ہونا ممکن ہے۔ دوسری جانب وہ یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ ایک نادر ونمایاں حد تک انگریزی آئینی بادشاہی کے پیچیدہ انتظامات کا مقصود سیاسی آزادی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اس کا امتحان کریں تو ہم دیکھیں گے کہ "اس دستور میں آزادی ایسی ہی صاف نظر آرہی ہے جس طرح کہ آئینے میں چہرہ"[۱]

---

[۱] روح القوانین (Esprit des Lois) کتاب یازدہم باب پنجم

مون ٹسکیو کی رائے میں وہ بنیادی اصول جو ایسی حکومت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے جو آزادی کے بروئے کار لانے کے لئے موزوں ہو، وہ یہ ہے کہ حکومت کے اساسی اختیارات کی تفریق کردیجائے، اور انھیں متوازن طریقے پر مختلف شاخوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان کا تقرر مختلف صورتوں سے عمل میں آئے خواہ وہ جماعات ہوں یا افراد تاکہ حکومت کی کسی شاخ میں اگر ظلم وزیادتی کا میلان پیدا ہو تو کل تنظیم کے نظری عمل سے دوسری شاخیں اس ظلم وزیادتی کو روک دیں۔ پس تشریعی اختیار کو عاملانہ اختیار سے جدا کرنے کی تائید میں وہ لاک کی پیروی کرتا ہے۔ جماعت مقننہ کو صرف عام قوانین بنانے کا اختیار ہونا چاہیئے، نظم ونسق کے کسی خاص کام کے حکم دینے کا اختیار اسے نہ ہونا چاہیئے یہ البتہ مفید ہوسکتا ہے کہ وہ انتقاد ونکتہ چینی سے حکامِ عاملانہ پر نگرانی رکھے۔ جماعت مقننہ کی ناواجب مداخلت کے روکنے کی غرض سے قوانین کے لئے حکومت عاملانہ کے سرگروہ کی منظوری ہونا چاہیئے مگر اسے خود قوانین بنانے کا مجاز نہ ہونا چاہیئے۔

مگر وہ اس سے اور آگے بڑھتا ہے اور ایک ایسے نکتے پر توجہ دلاتا ہے جدھر لاک کا خیال نہیں گیا تھا، وہ یہ کہ عدالتی اختیارات بھی ان دونوں سے علٰحدہ ہونا چاہیں۔ اگر جج واضع قوانین بھی ہوگا تو اس صورت میں اس کا ہمہ تن صرف قائم شدہ قوانین کی تعبیر ہی کی طرف متوجہ رہنا مشکل ہوگا۔ اگر عاملانہ اور عدالتی اختیار ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوں گے تو اس مجتمعہ اختیار سے عام افراد کے خلاف ظالمانہ کام لینے کا خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔ علاوہ ازیں مون ٹسکیو یہ بھی کہتا ہے کہ مجرموں کو سزا دینے کا "خطرناک اختیار" کسی مستقل حاکم کے تفویض نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ انگلستان میں ہے بلکہ یہ اختیار جوری کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جن کا تقرر عام قوم سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہے، اور وہ اس طمانیت وضمانت پر بھی زور دیتا ہے جو انگلستان میں قانون "احضار ملزم" سے حاصل ہے جس کے ذریعے سے مقدمہ کے قبل حکام عاملانہ کا شہریوں کو قید کردینے کا اختیار بہت سختی سے محدود ہوگیا ہے۔

انگلستان کی طرح توضیع قانون اور اجرائے محصول ایک ایسی جمعیت کو تفویض ہونا چاہیئے جس کا انتخاب آزاد شہریوں کی تمام جماعت سے ہوا ہو جنھیں مقامی حلقوں میں تقسیم کردیا گیا ہو۔ لیکن اس کے بعد خود اس مجلس پر بھی امرا کی ایک جماعت کے

ذریعہ سے روک ہونا چاہیئے تاکہ متمول وممتاز لوگوں کی تعداد قلیل پر ظلم نہ ہو سکے۔

اس قسم کے دستور سلطنت سے جس میں باہمی انسدادی اختیارات کا متوازن نظم قائم ہو، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم موثر طور پر سیاسی آزادی حاصل کرلیں، یعنی یہ کہ نہ تو کوئی شخص کسی ایسے فعل پر مجبور کیا جائے جسے قانونی طور پر کرنے کا وہ پابند نہیں ہے یا کسی ایسے فعل سے روکا جائے جس کا وہ از روئے قانون مجاز ہے[1]۔

حکومت کے ان تین اساسی اختیارات کی تفریق کا اصول انقلابی لائحۂ عمل کا ایک ممیز واہم عنصر بن گیا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۷۸۹ء کے مشہور اعلان حقوق میں ہم دیکھتے ہیں کہ پرزور طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "ہر اس معاشرے کا جس میں تفریق اختیارات قطعی طور پر معین نہیں ہے درحقیقت کوئی دستور نہیں ہے"۔ دوسرے فقرے میں اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ عام شہریوں کو گرفتار کرنے اور انھیں قید کرنے کا جو اختیار حکام عاملانہ کے ہاتھ میں ہے اسے سختی کے ساتھ محدود ہونا چاہیئے۔ یہ مونٹسکیو کے خیالات ہیں، اور "روح القوانین" کی اشاعت کی بعد والی صدی میں جو دساتیر مرتب ہوئے ان میں ان خیالات کی اہمیت کسی دوسرے عنصر سے کم نہیں ہے۔ مونٹسکیو کے ان خیالات کی تائید برطانی دستور کی مثال سے ہوتی تھی یا یوں کہئے کہ مانٹسکیو نے برطانی دستور کی جس طرح توضیح وتشریح کی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی تھی۔

تاہم خیالات کی اس تحریک میں جس کا لب لباب "اس اعلان حقوق" میں ہے، (جس کا اقتباس دیا جا چکا ہے) مونٹسکیو کا اثر روسو کے اثر کی بہ نسبت محض ثانوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ مختصر قراردادوں کی صورت میں "روسو کے معاہدۂ معاشری کے بنیادی اصول دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ آپ اس اعلان کے ابتدائی فقروں کو یکے بعد دیگرے پڑھ لیجئے۔

---

[1] "روح قوانین" Esprit des Lois کتاب یازدہم باب چہاردہم

خطبہ بست و ششم

خیالات سیاسیہ ۔ روسو کا اثر

مونٹسکیو پر جس دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنا چاہئیے، اس کی نسبت میں نے اپنے آخری خطبے میں توجہ دلائی ہے ۔ ژانے اور مین نے اسے جن مختلف حیثیتوں میں پیش کیا ہے ان سے اس دوگونگی کے عجیب وغریب تضاد کا اظہار ہوتا ہے ۔

ژانے نے جس باب سے مونٹسکیو کا ذکر شروع کیا ہے، وہاں اس نے اس سلسلۂ انقلابات کا ذکر کیا ہے جو ۱۷۸۹ء سے فرانس میں پیش آتے رہے ہیں اور یہ کہا ہے کہ، "جب ہم اپنے خیالات کو ان کتابوں ("روح قوانین"، "معاہدۂ معاشری") کی طرف پھیرتے ہیں جو ان تغیرات کا مبدا اول رہی ہیں تو پھر ہم ان انقلابات کو اپنے دلوں سے کیونکر بھلا سکتے ہیں"، غالباً فرانسیسی انقلاب کے اسباب اور اس کے نتائج کو ژانے نے اپنے اس فقرے میں سیاسی خیالات وادب کے اثر کی طرف ضرورت سے زیادہ، اور سیاسی واقعات کی طرف ضرورت سے کم منسوب کیا ہے۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے لیکن اگر ہم اپنے کو خیالات ہی کے اثر یعنی انقلابی تحریک کے اعلیٰ مبدا تک محدود رکھیں تو ایک ایسے مختصر بیان میں جس قدر صداقت ہو سکتی ہے، ژانے کا بیان اسی قدر صادق ہے اور رائج الوقت فرانسیسی رائے کا اس سے بالیقین اظہار ہوتا ہے ۔ برخلاف ازیں، مین اپنی تصنیف "قدیم قانون" کے چوتھے دلچسپ باب میں اس سے بالکل ہی مغایر اور بظاہر متضاد رائے کا اظہار کرتا ہے ۔ مونٹسکیو اور روسو کو وقوع پذیری انقلاب کا معاون خیال کرنا تو کجا وہ انھیں اس کا قطعی مخالف تصور کرتا ہے ۔ پہلے تو اس نے یہ بیان کیا ہے کہ

ﻋﻪ ۔ تاریخ سیاسیہ (Hisloire de la Politique) جلد دوم کتاب چہارم باب پنجم ۔

فرانسیسی تاریخ میں مقننوں نے کس قدر اہم حصہ لیا، قانون داں اشخاص کے شریک کار ہونے کی وجہ سے امرا اور کلیسا کے خلاف کشمکش میں فرانسیسی بادشاہوں کو کس قدر عظیم الشان فواید حاصل ہوئے اور جاگیری طبقۂ اعیان کے پہلو بہ پہلو ایک ذی امتیاز طبقہ ہونے کی حیثیت سے اہل قانون کو (جو تمام فرانس کی بڑی بڑی نشو یافتہ بلدیات میں پھیلے ہوئے تھے) کس قدر اہم حیثیت حاصل تھی اس کے بعد آگے چلکر مین یہ دکھاتا ہے کہ ان اہالی قانون نے کیونکر اپنے تفکری آزادی اپنے ذہنی میلان کو اپنے پیشے کے اغراض و مفاد اور اپنے ان عادات و خصائل سے تطبیق دی جسے میں "قانون فطرت" کی پرجوش پاکبازانہ محبت سے تعبیر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ فی الواقع "یورپ کے تمام ممالک سے بڑھکر ایک بے ربط و بے ترتیب اصول قانون کا طوق لعنت" فرانس کے گلے میں پڑگیا تھا،[1] مطلب یہ ہے کہ قوم کے سیاسی و معاشری اتحاد کے باوجود مقامی قوانین کے اختلاف و التباس نے اسے پریشان کر دیا تھا، اور اہلِ قانون کو "اصول قانون کے ان کمالات کا بہت کچھ احساس تھا جو سادگی و اتحاد سے پیدا ہوتے ہیں"، مگر یہ اہل قانون یہ بھی یقین رکھتے تھے یا ایسا ظاہر کرتے تھے کہ فرانسیسی قانون پر جو بلائیں واقعاً نازل ہو رہی ہیں وہ ناقابل استیصال ہیں اور عملی طور پر یہ لوگ ان خرابیوں کی اصلاح کی اکثر اسی شدت سے مخالفت کرتے تھے جس کا اظہار بہت سے نسبتاً کم تعلیم یافتہ اہالی ملک کی طرف سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ قانون فطرت کے پرجوش مداح بن گئے تھے۔ فطرت کا قانون تمام صوبجاتی و بلدی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، یہ قانون امیروں اور شہریوں اور کسانوں کے درمیان کسی فرق و امتیاز کو جائز نہیں رکھتا تھا، یہ قانون صفائی، سادگی اور نظم کو سب سے زیادہ بلند جگہ دیتا تھا مگر یہ اپنے پیرؤں کو کسی مختص ترقی کا پابند نہیں کرتا تھا اور خود براہ راست کسی مقدس یا نفع بخش اصلاح کی دھمکی بھی نہیں دیتا تھا۔[1]

یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ اگر کسی وقت میں سیاسی تغیر کے لئے کوئی زوردار و وسیع مطالبہ اس قدر قوت پکڑے کہ قانون داں اصحاب کی خود غرضانہ تنگدلی پر غالب آجائے تو اس وقت میں قانون فطرت کی یہ پرجوش قدردانی کیونکر انقلابی تحریک کی ممد و معاون

---

[1] مین، قانونِ قدیم Ancient Law صفحہ ۸۵ (طبع سوم)

ہوجائیگی۔ پھر آگے چلکر مین یہ بیان کرتا ہے کہ روسو نے انقلابی جوش کے اس شعلہ کو کس طرح بھڑکایا، مگر مونٹسکیو کے خیالات کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ان خیالات نے اس سے بالکل ہی مخالف جانب عمل کیا اگرچہ یہ عمل فی الجملہ بے اثر سارہا۔ وہ کہتا ہے کہ مونٹسکیو اس تاریخی طرزِ استدلال پر کاربند ہوا جس کے سامنے قانونِ فطرت کو ایک لمحے کے لئے بھی کبھی قدم جمانے کا موقع نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ مونٹسکیو انقلابی تحریک کو اس طرف بڑھنے سے روک نہ سکا کہ وہ انسان کے پیدائشی حق کو عملی صورت میں لاسکے۔ مین اس کی وجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی (مونٹسکیو کی) تصنیف کو وہ اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ لوگوں کے خیالات پر اثر ڈال سکے۔" کیونکہ جس مخالف اصول کی نسبت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس تصنیف سے اس کا تباہ ہوجانا لازمی ہے وہ دفعتہً خلوت سے جلوت میں آگیا اور بزمِ خاص سے نکل کر کوچہ و برزن میں پھیل گیا۔" اس کے اس جلوۂ عام و شیوعِ تام کا باعث روسو ہوا۔ "یہ وہ عجیب و غریب شخص ہے جو علم سے معرا، اوصاف تک سے مبرا اور مضبوطیٔ اخلاق سے بیگانہ محض تھا، مگر با این ہمہ اس نے اپنے نمایاں تخیل کی قوت اور بنی نوع کے لئے اپنی سچی محبت کی مدد سے صفحۂ تاریخ پر اپنا ایسا نقش جما دیا ہے کہ اب وہ محو نہیں ہو سکتا، اس کے ان محاسن کی وجہ سے اس کے بہت سے معایب سے ہمیشہ درگزر ہوتی رہے گی۔"[1]

اسناد کے اس تصادم میں مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ طرفین کے بیانات میں صداقت موجود ہے۔ جیسا کہ ژانے نے کہا ہے "روحِ قوانین" نے بالیقین انقلابی تحریک میں مدد دی۔ اس کے ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مین کے خیال کے مطابق مونٹسکیو کے تخیلات روسو کے اس اساسی مفروضہ کے حقیقتاً مخالف ہیں کہ "وہ فطری حق"، کہ ایسے قواعد موجود ہیں جو ناقابلِ تغیر ہیں جن کا نفاذ بلا استثنیٰ ہر جگہ ہو سکتا ہے اور انسان کو حکومت کی جائز بنیاد صرف اسی حق فطرت میں مل سکتی ہے۔

ایک تخیل کی حیثیت سے قانونِ فطرت کی پاکبازانہ الفت کو، ایسی مجسم

---

[1] مین۔ قانونِ قدیم صفحہ ۸۶ و ۸۷ Ancient Law

صورت میں لانے کے عملی جوش سے بدل دینا، اور اہل قانون کو اس سے جتنا واسطہ تھا یعنی محض مدنی تعلقات سے بڑھا کر اسے سیاسی آئینی تعلقات تک وسیع کر دینا" یہ کام فرانس میں روسو اور اس کے متبعین نے انجام دیا۔ اس زمانہ کی انقلابی "ہشتہائے ارضی" کی بنیاد "قانون فطرت" کے انھیں مدتہائے دراز کے باوقعت مقبولہ مسلمات پر قائم تھی کہ "تمام انسان فطرتاً آزاد ہیں" "اور تمام انسان فطرتاً مساوی ہیں"۔ اس وقت جو کچھ ہوا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے متعلق اعتقاد کی ایک جدید وعجیب سرگرمی پیدا ہو گئی، اور نہایت ہی حیرت افزا طریق پر سیاسی انہدام وتغیر کے بجا ثابت کرنے کے لئے انھیں بطور مسلمات کے بالکل ہی نئے طریق پر استعمال کیا گیا۔

۲ - یہ ایک معمولی سی مشہور عام بات ہے کہ فرانس میں مطلق العنان بادشاہی نے انقلاب کا رستہ تیار کیا مگر محض بادشاہی کی مطلق العنانی ہی اس کا باعث نہیں ہوی بلکہ وہ طریق بھی اس کا باعث ہوا جس پر یہ مطلق العنانی جاگیریت سے ترقی کر کے پیدا ہوئی تھی۔ بادشاہی چونکہ اپنے اس ارادے پر جمی ہوئی تھی کہ تمام اختیارات کو اپنے ہی ہاتھوں میں مجتمع کر لے، اس لئے اس نے یہ اصول اختیار کیا کہ پرانے جاگیری معاشرے میں جو عناصر اسے روکنے کی قابلیت رکھتے ہوں ان سے مصالحت کر لے چنانچہ امرا کے سیاسی اور تمام اہم معاشری فرائض کو سلب کر کے اس نے انھیں زیادہ تر بے مصرف بار بنا دیا، اور اس سیاسی معدومیت پر ان کے خندہ پیشانی سے راضی ہو جانے کے لئے ان کے مالی امتیازات اس حد تک رہنے دئے کہ وہ اس قدر بار گراں ہو جائیں جن کا برداشت (ملک کے لئے) کرنا دشوار ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس غرض سے کہ وہ بادشاہ کی رقابت یا مخالفت کی روش کو زیادہ موثر طور پر اختیار نہ کر سکیں اور اس کے لئے جتنا اثر درکار ہے وہ اثر پیدا نہ کر سکیں، بادشاہ نے سربرآوردہ امرا کو ان معاشری فرائض سے جو بالطبع بڑے بڑے زمینداروں پر عائد ہو جاتے ہیں، اس طرح علیحدہ کر دیا تھا کہ ان کا وسیع وشاندار دربار بنا لیا تھا جس پر بادشاہ کی نوازشوں کی بارش خزانہ کے چمکدار سکوں کی صورت میں ہوتی رہتی تھی لیکن یہ زرپاشی اتنی فراواں نہیں ہوتی تھی کہ درباری شان وشوکت کے لئے جن اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمامہا اس سے مہیا ہو جائیں

سیاسی و انتظامی حیثیت سے لوئی چہار دہم کا طریق کار مختلف اعتبارات سے کامیاب تھا
اس کے عہد حکومت میں فرانس نے جو شان وشکوہ پیدا کی تھی، ورسائی کی طمطراق سے
اس کا اظہار بھی مناسب طور پر ہوتا تھا اور اس میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ امراء کو اس طمطراق
میں جو حصہ ملتا تھا اس سے وہ بہ حیثیت مجموعی پوری طرح قانع تھے اور اس مرکزی نظم ونسق
سے قوم کو عام طور پر بہت سے فوائد حاصل ہوگئے، کچھ تو خلاف قانون شخصی ظلم وستم سے
امن حاصل ہوا، کچھ جدید قسم کے ضابطوں کی اشاعت ہوئی اور بھی اسی قسم کی باتیں عمل میں
آئیں مگر مالی اعتبار سے یہ نظم ونسق مہلک حد تک کمزور تھا اور اس مالی کمزوری نے شورانگیز
معاشری عدم مساوات وتباہی کو اور بھی مضبوط اور المضاعف کر دیا تھا اور یہ عدم
مساوات وتباہی بعض خصوص میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ نظر آتی تھی کہ اس کی بنیاد
قدامت اور قانون پر تھی، اور رسم ورواج اور تاریخ نے اس کو گویا مقدس بنا دیا تھا۔

اب ہمیں چاہئیے کہ تفصیلی طور پر ان دونوں لازم وملزوم کیفیات کی جانچ کریں۔
وہ دونوں واقعات یہ ہیں کہ ایک تو حکومتی مالیات کا از سر تا پا مضر طریقہ تھا اور دوسرے
بے سروپا معاشری عدم مساوات وظلم وستم تھے۔ ہمیں پیچھے ہٹ کر اس مہلک وقت کی
طرف جانا پڑے گا جب فرانس نے جاگیری حالت سے نکلکر جدید ترقی کی طرف قدم بڑھایا
اور انگلستان کی ہم مثل رفتار ترقی سے قطعی طور پر الگ ہوگیا۔ ۱۴۳۹ء میں چارلس ہفتم
نے اسٹیٹس جنرل کی مرضی کے بغیر محصول دائمی Taille perpetuelle عاید کر دیا
حالانکہ جاگیری نظام میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مثل دوسرے جاگیری امرا کے بادشاہ
بھی اپنے معمولی اخراجات کا سامان اپنے علاقوں کی آمدنی سے کرتا تھا اور غیر معمولی اخراجات
کا انتظام منظور شدہ رقوم سے ہوتا تھا جس میں مختلف طبقات بالطبع بحصۂ مناسب
شریک ہوا کرتے تھے، مگر جس وقت سے کہ چارلس ہفتم کے تحت میں وہ شرمناک معاملت
طے ہوئی جس کے بموجب امرا نے رقمی اختیار کے نکل جانے کو روا رکھکر آئینی آزادی کو خیرباد
کہدیا، یعنی وہ اس امر کے روادار ہوگئے کہ در قوم پر بغیر اس کی مرضی کے محصول لگایا جائے
صرف اتنا ہو کہ خود امرا اس محصول سے مستثنی رہیں۔[1] اس وقت سے وہ عدم مساوات

[1] ٹوکویل، حکومت قدیم وانقلاب & Ancience Regime et la Revolution کتاب دوم باب دہم صفحہ ۱۶۹۔

قایم ہوگئی جو سیولی، رشلیو اور کولبرٹ کے ایسے روشن خیال وزرا کی انتہائی کوششوں سے بھی مستقلاً کم نہ ہوسکی تھی۔ یہی محصول (جس سے جاگیری زمانہ میں امرا اپنے فوجی خدمات کی پابندی کے عوض میں مستثنیٰ تھے) اب باقاعدہ شاہی محصول ہوگیا۔

ٹوکول نے ان تمام خرابیوں کو بیان کیا ہے جو اس طرح پر محصول لگانے سے پیدا ہوتی ہیں کہ "جن لوگوں میں محصول کے ادا کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت ہو ان پر محصول نہ لگایا جائے بلکہ ان لوگوں پر محصول لگایا جائے جن میں اس کے مقاومت کی بہت ہی کم قدرت ہو"[1]۔ جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں ان خرابیوں کے انسداد کی مسلسل کوششیں کی گئیں مگر حکومت کے لئے روپیہ کا ہونا ضروری تھا، اور جب نئے بلا واسطہ محصول جاری ہوے جو برائے نام سب لوگوں پر مساوی طور پر عائد ہوتے تھے تب بھی یہ مضرت رساں طریقہ جاری رہا کہ دولتمند و طاقتور اشخاص کے حق میں انھیں گھٹا کر انھیں راضی رکھا جائے۔ پادری جو اب منظم ہو گئے تھے اور جنھوں نے اپنی مجلسیں قائم کر لی تھیں انھوں نے تو قطعی بریت حاصل کر لی، اور امرا نے اپنی خانگی حیثیت میں قدرے کم مرتب طور پر بریت حاصل کی۔ ماسوا اس کے شاہی بیگار (یعنی کم اجرت پر جبری مزدوری)، جو ابتداً سڑکوں کے لئے مخصوص تھی اور پھر بتدریج دوسرے شاہی کاموں کے لئے بھی وسیع کر دیگئی، وہ بدستور قائم رہی بلکہ حکومت کے ضروریات کی وجہ سے اس میں اور بھی توسیع ہو گئی، لیکن "امرا" اور ان کے رشتہ دار اس سے بھی مستثنیٰ رہے۔

انقلاب کے قبل جو نسل گزری ہے اس کے دوران میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت پدرانہ طریق پر کام کرنے کی بو آفیو آ زیادہ کوشش کر رہی تھی مگر روپیہ کی کمی اور اس مضرت رساں طریق محصول کی وجہ سے ایسا کرنے سے معذور تھی[2]۔ پس اس طرح ایک حاجتمند، مالی اعتبار سے تغیر پذیر، قانونی و غیر قانونی طور پر آزاردہ حکومت

---

[1] حسب بالا کتاب دوم باب دہم صفحہ ۱۷۱۔

[2] دیکھو ٹوکول، حکومت قدیمہ کتاب ۲، باب ۱۰ جس میں اور بہت سے محاصل کا جو حکومت کی طرف سے نہایت شہر مناک طور پر جاری ہوے، ذکر کیا گیا ہے۔

ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے دوش بدوش ایک ایسا جاگیر دار طبقۂ امرا اور جاگیر دار طبقۂ قسیس بھی تھا جو قانونی یا غیر قانونی طور پر محصولوں سے مستثنیٰ تھا۔ مگر ان مستثنیات کے ساتھ ہمیں آزار دہ حقوق امتیازی کا بھی اضافہ کر لینا چاہئے۔

فرانس میں جاگیریت کے زوال کی (جس کی وجہ سے وہ انقلاب کے لئے موزوں ترین ملک بن گیا) خصوصیت خاص یہ تھی کہ یہاں (جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں) اٹھارھویں صدی میں امرا حکومت میں شریک نہیں رہے تھے حالانکہ جاگیریت کا وصف خاص یہی ہے کہ وہ حکومت اور ملک ارضی کو درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں مدغم کر دیتی ہے اس طرح ادھر تو امرا حکومت کے شریک نہ رہے اور ادھر محاصل و مستثنیات کا ایک پورا انتظام قائم رہا جس کا ابتدائی تعلق ان امرا سے بہ حیثیت منتظمان ملکی کے تھا اور جس کے باعث ان محاصل و مستثنیات کو بجا قرار دیا جا سکتا تھا، مگر اب اس سے ان افراد کے منافع کے علاوہ ملک کو کوئی فائدہ نہ ہوا تھا، اور اب ان کی حیثیت ملک کے طبقۂ اولٰے سے زیادہ نہ رہی تھی۔ امرا کے تمام مخصوص حقوق میں سے سیاسی حصہ مفقود ہو گیا تھا، صرف مالی حصہ باقی رہ گیا تھا اور اس میں بسا اوقات بہت اضافہ ہو جاتا تھا، [1] اس طرح جاگیریت ایک سیاسی تنظیم ہونے کے بجائے ایک خالص مدنی تنظیم بن کر پریشاں کن ہو گئی اور اس کا ان کسانوں پر خاص طور پر اثر پڑا جو صاحب جائداد ہو گئے تھے [2] غریب کسان صرف یہی نہیں دیکھتا تھا کہ امرا محصولوں سے مستثنیٰ تھے اور وہ خود محصولوں کے بار سے شکستہ ہو رہا تھا، محنت کرنے اور فوجی خدمت انجام دینے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا، بلکہ وہ اپنے کو اس امر پر بھی مجبور پاتا تھا کہ وہ انھیں امرا کو ان کی ذاتی حیثیت میں متعدد اقسام کے تکلیف دہ محصول ادا کرے۔ اگر کسان صاحب جائداد

---

[1] حسب سابق کتاب دوم باب اول صفحہ ۶۰ و ۶۲۔

[2] کسان صاحب جائداد بہت کثیر تعداد میں تھے، اگرچہ امرا اور پادریوں میں سے ہر ایک کے پاس فرانس کی اراضی کا تقریباً پانچواں حصہ تھا انقلاب کے وقت موخر الذکر کی تمام جائدادوں کے اور متقدم الذکر کی جائدادوں کے ایک بڑے حصہ کے فروخت کر دینے کے باوجود بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان صاحب جائداد کسانوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہو۔

نہ ہوتا تو اسے ان میں سے بہت سے محصولوں کا احساس نہ ہوتا۔ اگر یہی امرائے علاقہ اس پر حکمراں ہوتے تو یہ محصول وغیرہ اسے حکومت کے طبعی لوازم معلوم ہوتے مگر حالت یہ تھی کہ یہ محصول وقت ناوقت تکلیف بیہجا رہے تھے اور دوسری طرف رسم ورواج کی وجہ سے امرا پر اخراجات کا جو بار پڑ رہا تھا، اس کے باعث یہ دشوار ہوگیا تھا کہ وہ ان محصولوں کو ترک کردیں۔ ان سب پر ہمیں انصاف ومعدلت کے انتظام کے قدیم جاگیر کی حق کا بھی اضافہ کرلینا چاہیئے۔ یہ حق اگرچہ بہت کچھ محدود ہوگیا تھا اور حالت زوال میں تھا پھر بھی اس خرابی میں حقیقی اہمیت باقی تھی اور حاجتمند امرا اکثر اسے مالی نفع کا ذریعہ بنالیتے تھے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ متمول اور جلیل القدر اصحاب جائداد تو غیر حاضر رہا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے صاحب جائداد غریب، سب سے الگ اور بے مصرف تھے، اس لئے بصورت دگران کے حقوق اور بھی زیادہ آزاردہ ہوجاتے تھے

پس روسو جس آزادی ومساوات کا وعظ کہتا تھا اس کے جذبات کے نشوونما کے لئے اس صورت حالات نے غیر معمولی طور پر موزوں ومناسب زمین مہیا کردی تھی

۲۔ باخبر اشخاص عام طور پر روسو کی تصنیف پر جس طرح سے نظر کرتے ہیں اس کی دو حیثیتیں خاص ہیں اور ضرورت ہے کہ ان دونوں پر بحث کیجائے تاکہ اس کے جملہ غیر معمولی اثر پر تام وکمال احاطہ ہوسکے۔ ایک تو یہ کہ (۱) وہ نام نہاد متمدن ہستی،، کے تصنع اور خفت عقل کے مقابلہ میں اسے "فطرت،، کا گویا پیامبر سمجھا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ (۲) اسے قوم کے ناقابل انفکاک اقتدار اعلی کا ہادی ومبشر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اصول مسلمہ، معاہدۂ معاشری کے قدیم اصول مسلمہ کو جدید وحیرت انگیز طور پر پیش کرنے سے قائم ہوا، مگر میرا خیال ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے سمجھنے میں ہمیں کو غلط فہمی ہوئی۔

وہ اس خیال کو روسو کی طرف منسوب کرتا ہے کہ "محض حالت کے سبب اولاً غور وفکر سے ایک کامل معاشری نظم ظہور پذیر ہوسکتا ہے"۔ فطری حالت سے ہین کی مراد اس ابتدائی حالت سے ہے جو مدنی نظم معاشرت کے بننے سے قبل تھی اور اس میں شک نہیں کہ ہابس ولاک کا مقصود بھی یہی ہوگا۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ روسو کے خیال میں وہ نظم معاشرت میں ایسی تبدیلی جو اسے اس دنیا سے زیادہ مشابہ کردے

جس پر محض "فطری انسان" حکمراں تھا وہ اس قابل اور سزاوار ہے کہ ظاہرا جو کچھ بھی اس کی قیمت دینا پڑے مگر اسے عمل میں لایا جائے"۔ ہر ایک قانون و ادارہ جو ان تصوری حالات کے تحت میں اس خیالی ہستی کے مطابق نہ ہو، اس پر اس اعتبار سے لعنت بھیجنا چاہئے کہ وہ مکمل حالت سے ہٹ گیا ہے[له]

کتاب معاہدۂ معاشری میں روسو نے اپنے اس خیال کو ذرا زیادہ وسعت دی ہے، لیکن یہ غلطی (بشرطیکہ میں اس مغالطہ آمیز لفظ کا استعمال کر سکوں) بہت ہی "طبعی" اور بہت ہی مکمل غلطی ہے۔ یہ کہنا کہ روسو کی وہ رائے نہیں ہے جو مین اس کی جانب منسوب کرتا ہے، بالکل کمزور ہے، روسو کی اس قسم کی کوئی رائے ہی نہیں ہے روسو کی تصنیف نے عوام کے دلوں پر اس وقت اپنا قبضہ جمایا ہے جبکہ (فرانسیسی تاریخ نویسوں کی تقریباً متفقہ رائے کے بموجب) وہ انتقادی و سالبی مسلک جس کا سرگروہ والٹیر تھا، تعلیم یافتہ دنیا کو بہت زوروں کے ساتھ زیر و زبر کر رہا تھا ایک پرشکوہ ولاابالی اعیانی سوسائٹی کے پیدا کرنے میں، (جس کا مرکز دربار تھا)، اس سالبی مسلک نے ان سیاسی حالات سے گویا اتحاد عمل کیا اور ان کی معاونت کی جو بادشاہ کی بالارادہ حکمت عملی کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے۔

جس متمول و خوش خلق معاشرے سے بادشاہی نے تقریباً اس تمام مشتغل و تیز فہمیت فزا اثر کو نکال لیا ہو جو سیاسی اختیارات کی ذمہ داریوں سے عمل میں آتے ہیں یعنی جہاں اپنے بنی نوع کے لئے وسیع و اہم معاشری خدمات کی انجام دہی کا موقع باقی نہ رہا ہو، اس قسم کے معاشرے کے لئے ہنوز یہ امکان رہتا ہے کہ پرزور مذہبی اعتقادات کے ذریعہ سے (جنھیں پر فکر رائے اور بلیغ موضعین کی وقعت و امتیاز کی تائید حاصل ہو) اسے محض لاابالیانہ حالت میں پڑ جانے سے بچایا جائے، جیسا کہ سترھویں صدی کی بادشاہی کے جلیل القدر ایام میں ہو چکا تھا، مگر جب والٹیر کی فقید المثال علمی قابلیت نے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کے دلوں سے کیتھولک قدامت پسندی کو ہوا کر دیا، جب دیوان خانوں اور مجمعہائے ضیافت کے خوش مقال اشخاص

له۔ قدیم قانون، Ancient Law باب چہارم صفحہ ۸۸ - ۸۹

میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں، اور د بالفاظ بارکلے، ''گویا دہریت قانوناً قائم ہوگئی اور مذہب کے ساتھ محض روادارانہ برتاؤ کیا جانے لگا''، جب فلسفہ نے انگلستان سے حصول علم کی تحریک پاکر ڈیکارٹ کو چھوڑا اور لاک کو قبول کرلیا اور لاک کی تعلیم کو مابعدالطبیعیات میں مادیت وحسیت اور اخلاقیات میں عریاں حظ نفس کی جانب ترقی دی تو پھر عیش پرستی و تصنع کے راستہ میں جو کچھ رکاوٹ تھی وہ بالکل اٹھ گئی۔

ٹین[علہ] کہتا ہے کہ ''جاگیری طبقۂ اعیان، دیوانخانہ کی بزم''، بنگیا یعنی وہ بزم عشرت میں بحد وغایت محو ہوگیا، دوسرے اغراض وفرائض کو عیش وعشرت کے تابع کردیا، اور نہ صرف معاملات عامہ سے اس کے ہر طرح گہرے مربیانہ تعلقات زائل ہوگئے بلکہ خانگی حب والفت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ البتہ ذہنی اغراض باقی رہے، ان بزمہائے عشرت نے نوع انسان کو تعلیم دینے والے دیدیرو، ڈالامبرٹ، اور ان کے رفقا کی پذیرائی وہمدردی تحسین وتعریف کے ساتھ کی مگر سنجیدہ مسائل کے ساتھ انکی جو دلچسپی تھی وہ اس شرط کے ساتھ تھی کہ یہ سنجیدہ مسائل لطف اندوزی کا ایک ذریعہ اور کمالات کی وسعت وگوناگونگی کا ایک وسیلہ بن جائیں۔ یہ ارباب بزم اگر کسی شے پر اعتقاد رکھتے تھے تو بنی نوع انسان کی ترقی، علوم وفنون کی ترقی اور بقول اہل جرمنی ''وجملہ روشن خیالی'' پر اعتقاد رکھتے تھے مگر اعلی سوسائٹی کا کام صرف فقرہ بازیوں اور خوش گپیوں کے دوران میں اس ترقی کے مسئلہ پر بھی گفتگو کرلینے تک محدود تھا اور گراں خرچ شان وشوکت کے انتہائی تصنعات کے دوران میں قوم کی فاضل دولت ان مسائل پر گفتگو کرنے میں خرچ کیجاتی تھی۔

روسو نے تمدن کی مصنوعی زندگی پر فطری زندگی کی فوقیت کا وعظ کہکر جس معاشرے کو برانگیختہ کیا اور ایک نمایاں حد تک اس میں پرجوش تحریک پیدا کردی وہ اسی قسم کا معاشرہ تھا۔

جس پہلی تصنیف کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھیں وہ ایک انعامی مضمون تھا جسے نہ صرف دیژون کی اکاڈمی (مجلس علما) میں انعام حاصل ہوا

علہ ''ابتداء فرانس حالیہ''، حکومت قبل از انقلاب Oregnies De la France
Contallorand & Ancien Regmis کتاب ۲، باب ۱۔

بلکہ دارالصدر میں بھی اس کے لئے شور تحسین بھی بلند ہوا، سوال یہ تھا کہ آیا (ازمنۂ وسطیٰ کے بعد) علوم و فنون کی بحالی سے عادات و اطوار میں پاکیزگی پیدا ہوئی ہے یا خرابی آگئی ہے مگر روسو تو کسی اور ہی ہوا میں اڑ رہا تھا اور اس نے خود کہا ہے کہ فن کے اوپر فطرت کی فوقیت کے نغمہ نے اس پر وجدانی کیفیت طاری کر دی تھی، پس اس کی نظر قدیم طرز معاشرت کی بحالی سے گزر کر علوم و فنون کے ابتدائی قیام تک پہنچی اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ بدوی سرشت، جس میں مسرت آمیز جہالت، ظاہر و باطن کی یکسانی اور سادہ خوبیاں موجود تھیں اسے ان اوصاف سے جو علم کے تبع میں آئے اور اس لاحاصل سامانِ عشرت سے جو فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے نفع کے بجائے نقصان ہوا وہ اوصاف جو علم کے ساتھ ساتھ آئے، وہ شک و شبہ دغا و فریب، غرور و نخوت، شاندار ابلہ فریبی، اور لاحاصل تفکرات تھے۔ اس دعویٰ کی تائید مختلف طریقوں سے مسلسل مضامین کے ذریعہ سے کی گئی گو ان میں ہمیں کامل یکسانی رائے کے قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان میں لب و لہجہ اور جذبات کا اتحاد نظر آتا ہے۔

میرے اس موجودہ کام کے حدود کے اندر یہ داخل نہیں ہے کہ میں روسو کی تصنیف کے اس پہلو پر کچھ اور زیادہ گفتگو کروں، مگر مختصر یہ ہے کہ وہ بلاشک و شبہ اس شریف النفس غیر متمدن انسان، کا قدر دان تھا جس کا وجود معاشرہ سیاسی کی تنظیم سے قبل ہوگا، اور یہ خیال کرنا ایک طبعی امر ہے کہ "معاہدۂ معاشری" میں اس کا مقصود یہی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو فطرت کی اس حالت کی نقل کیجائے اور اس کا خیال یہ تھا کہ معاشری معاہدہ کے ذریعہ سے یہ کام کامل طور پر ہو سکتا تھا مگر میں یہی کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلطی تھی۔ یہ غلطی اس امر واقعی سے لاحق ہوئی کہ لفظ "فطری" میں قدیم زمانے سے یہ خیال بہت استحکام سے خلط ملط ہو گیا تھا کہ "جو اختیار کیا گیا تھا" اور "جو کیا ہونا چاہئے"، گو روسو کے سیاسی تخیلات سے یہی امر ایک بڑی حد تک ناپدید ہو گیا ہے لیکن اس کی تحریر میں باقی رہ گیا ہے۔ سیاسی ترکیب و تنظیم میں روسو کا عملی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا دستور مرتب کیا جائے جس کے ذریعہ سے عدل و انصاف حاصل ہو سکے اور اس کا خیال ہے کہ عدل و انصاف صرف اس دستور میں حاصل ہو سکتا ہے

جس کی بنا ایسے حق پر ہو جسے وہ بھی دوسروں کے مانند "فطری حق" کہتا تھا یعنی یہ وہ اصول تھا جس کی عظمت و دعاوی کو (بقول میں) انقلاب سے قبل کے مقننین بھی نہ صرف فرانس میں بلکہ عام طور پر تمام براعظم یورپ میں غیر مشروط تعریف و توصیف کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

مگر "قانونِ فطری" کا جو تصور مقننین کے ذہن میں تھا اس میں کبھی بھی زیادہ نمو و اہمیت اس مفہوم کو نہیں دیگئی تھی کہ اس کا اطلاق سیاسی معاشروں کی تکوین سے قبل انسان کی مفروضہ ابتدائی حالت کے قواعد پر ہوتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ سمجھا جاتا تھا کہ کسی خاص سیاسی معاشرے کے جو قوانین اس معاشرے کے ارکان پر عائد ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں جو قوانین انسان پر بحیثیت انسان ہمہ گیر طور پر عائد ہوتے ہیں اس سے مراد وہی قوانین ہیں اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کے ساتھ کسی خاص مملکت کے قوانین کی تغیر پذیر نوعیت کے مقابلے میں قانونِ فطرت کے دوام اور عدم تغیر کا وہ تصور بھی شامل کر دیا گیا تھا جو حیوان عاقل ہونے کی حیثیت سے انسان پر منطبق ہوتا تھا اور جو مجرد استدلال سے منکشف ہو سکتا تھا۔

یہ ایک معمولی سی بات تھی کہ سیاسی و معاشرتی تنظیم کو حق فطری کے ہموار ہونا چاہئے اور "قانونِ فطری" سے مراد چند خارجی و ناقابل تغیر اصول سے ہے، چنانچہ اس پر مونٹسکیو تک نے علی الاعلان کوئی جرح و قدح نہیں کی ہے "قانونِ فطری" کے اس تصور کو روسو نے قائم رکھا اور اس کے سیاسی مباحث میں اسے اساسی حیثیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک اس حد تک مین بلاشک و شبہ غلط فہمی سے محفوظ ہے مین سے غلطی اس فرض کرنے میں سرزد ہوئی ہے کہ روسو یہ سمجھتا ہے کہ "قانون فطری" کا مکمل حصول انسان کی ابتدائی حالت میں ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت سے مقصود وہ وحشیانہ حالت ہے جسے اس نے اپنے "رسالۂ عدم مساوات"[1] میں "حقیقی حالتِ فطرت" کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ اس موقع پر روسو کے الفاظ صاف واضح و ناقابل اشتباہ ہیں، ابتدائی انسان، "حقیقی حالت فطرت" میں "حق فطری" کے بموجب زندگی

[1] Discours Sur l'origine de l'inegal parun les hounues

نہیں بسر کرتا، کیونکہ وہ نفس ودیعت کو برے سے سمجھ ہی نہیں سکتا بقول روسو" میرے اور تیرے کا اسے ادنے تصور بھی نہیں ہوتا، انصاف کا کوئی واقعی خیال اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، نیک وبد کا کوئی تخیل اسے نہیں ہوتا جب تک کہ ان اصطلاحات کو ان اوصاف کے مفہوم میں نہ استعمال کریں جو خود اس کے تحفظ کے باعث ہوں"۔ یہ بیان تقریباً ہابس کے بیان کے موافق ہے مگر روسو کا خیال یہ ہے کہ ہابس نے اس معاملہ میں غلطی کی ہے کہ اس نے ابتدائی انسان کی جانب ان جذبات کو منسوب کیا ہے جو منجر بہ تصادم ہوتے ہیں حالانکہ فطرت کی حالت میں یہ تصادم اس میں پایا ہی نہ جائیگا روسو کا انسان نسبتاً زیادہ منفرد و خود کفیل مخلوق ہے، "اور اسے نہ اپنے ہمجنسوں کی ضرورت ہے اور نہ انھیں نقصان پہنچانے کی خواہش ہے" اور اس لئے اگرچہ وہ "معقول طور پر ان تمام چیزوں پر اپنا حق سمجھتا ہے جن کی ضرورت ہوتی ہے، مگر اس کی اپنی حفاظت ذات کے اس حاوی جذبہ سے دوسروں کے لئے بہت ہی کم خطرہ تھا، علاوہ ازیں ہر شخص کی اپنی ذات میں بھی جذبۂ ترحم کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، اور اس ابتدائی حالت میں یہی جذبہ، "قوانین عادات و اطوار اور نکوکاری" کا قائم مقام ہوتا ہے۔

پس اگر ابتدائی حالت فطری شاید خوشگوار ترین نہ بھی ہو تاہم کم از کم اتنا تو ضرور تھا کہ عدم مساوات سے وہ سب سے زیادہ مبرا تھی مگر یہ یقینی ہے کہ ایسی کوئی حالت نہیں تھی جس میں "قانون فطرت" کا حصول عملی ہو سکے، اور اگرچہ بعد کی حالت میں جو بہ حیثیت مجموعی سب سے زیادہ خوشگوار تھی، اور جس کا ذکر روسو نے آگے چلکر کیا ہے، اور جس میں ایک حد تک کیفیت معاشری کا آغاز ہو گیا تھا، اس حالت میں روسو نے جائے سکونت یعنی مٹی اور شاخوں کے جھونپڑوں میں ایک طرح کی ملکیت کو فرض کیا ہے، مگر اس نے یہ خیال رکھا ہے کہ اس ملکیت کے لحاظ کے متعلق وہ یہ ظاہر کر دے کہ اس ملکیت کی بنا حق تملیک کے احساس پر اس درجہ نہیں تھی جس درجہ اس احساس پر تھی کہ اپنے ہمسایہ کے جھونپڑے پر قبضہ کر لینے کی کوشش کرنا عاقبت اندیشی کے خلاف تھا۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ اسی نئی حالت میں، رشتہ داروں کی محبت صناعی و فنون لطیفہ اور رقص و سرود سے معاشری زندگی کی

ترقی ہو رہی تھی اس لئے لحاظ باہمی کی خواہش نے "نقصان" کا احساس بھی پیدا کر دیا، مگر "انصاف کے اولیں قواعد" اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوئے جبتک کہ ملکیت تسلیم نہیں کر لی گئی اور ملکیت اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آئی جب تک کہ فلزات و زراعت کے مہلک فنون نے وہ انقلاب عظیم نہ پیدا کر دیا جس نے اس دوسرے یعنی خوشگوار ترین حالت کو (جبکہ خاندانوں میں خانگی ومعاشری کیفیت تو پیدا ہو گئی تھی مگر وہ اپنی اپنی جگہ پر آزاد تھے) برباد کر دیا۔

پس یہ ہویدا ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظم ترتیب دینے میں جس کی بنا "حق فطری" پر ہو روسو کو حقیقی حالتِ فطرت کی نقل کرنے تک کا خیال نہیں تھا چہ جائے کہ وہ اس کے کامل حصول عملی کا خیال قائم کرتا۔ وہ حالت تو ہمیشہ کے لئے جا چکی تھی اس کے نزدیک ہابس کے فرض کردہ انسان کے خلاف فطری انسان کو خود مختاری کا نفع حاصل تھا، اصلی حالتِ فطرت میں اسے نہ تو دوسروں کی ضرورت تھی اور نہ اس میں انھیں نقصان پہنچانے کا میلان تھا مگر موجودالوقت معاشرے کو اس طرح بدل دینے کی خواہش جس سے وہ تاحدامکان آزادی کی اس اصلی حالت سے مشابہ ہو جائے، روسو کے دل سے اتنی ہی بعید تھی جتنی کسی دوسرے شخص کے دل سے بعید ہو سکتی ہے۔ اس آزادی کو تو آدمی کھو چکا، اس کا بہترین قائم مقام مرضی عامہ پر انحصار کامل ہے اور اس مرضی عامہ میں خود اس کی مرضی محض ایک جزو حقیر ہے۔ درحقیقت مین کا یہ خیال کہ روسو کے نزدیک فطری کیفیت ہی پر غور و فکر سے کسی مکمل نظم معاشری کا اندازہ ہو سکتا ہے روسو کے واقعی خیال سے اس قدر بعید ہے کہ روسو نے صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی معاشرہ مکمل ہو نہیں سکتا اور یہ صرف اس وجہ سے کہ فی نفسہ معاشرہ فطری نہیں۔ جو شئے فطرت میں نہیں ہے اس کے ساتھ دقتیں لگی ہوئی ہیں اور معاشرۂ مدنی تو اس خصوص میں سب سے بڑھا ہوا ہے[ع۵]۔

یہ اگرچہ بظاہر اجتماع ضدین معلوم ہو مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ روسو فطری و

ع۵۔ "معاہدۂ معاشری" کتاب ۳ باب ۱۵ ء

معاشری انسان کے درمیان جس درجہ فرق قرار دیتا ہے اس کے اعتبار سے وہ تمام دوسرے مصنفین کی بہ نسبت ہابس سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہابس اور روسو کے اختلاف عظیم کے باوجود ان دونوں کے معاہدات معاشری میں ہم مماثلت پاتے ہیں۔ ہابس کی طرح روسو کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان ابتدائی حالت میں بالکلیہ ایک دوسرے سے آزاد تھے، فرق صرف یہ ہے کہ روسو کے نزدیک انسان ایک دوسرے سے برسر جنگ نہیں تھے۔ انسان کو ایک دوسرے کی امداد کی ضرورت نہیں تھی تو انھیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی بھی ضرورت نہیں تھی مگر اس کا دعوی یہ ہے کہ رفتار تمدن کے نہایت ہی اولین مدارج میں اس خودمختاری کا خاتمہ ہوگیا لیکن "جس ساعت سے کہ انسان کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوئی یعنی جس وقت سے کہ ایک انسان کو اس میں اپنا نفع نظر آنے لگا کہ وہ دو شخصوں کے سامان ضروریات اپنے قبضہ میں کر لے اسی وقت سے قدیمی حالت کی مساوات وخوشوقتی زائل ہوگئی اور انسان بہ تعجیل تمام اس حالت جنگ میں متنزل ہونے لگا جس کا نقشہ ہابس نے کھینچا ہے۔ لیکن روسو کے نزدیک انسان کو اس حالت سے نکال کر پھر ابتدائی آزادی کی حالت میں پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے نزدیک انسان کو غلامی سے بچانے کا صرف ایک ہی چارۂ کار ہے کہ ایک ایسا معاہدہ کیا جائے جو اسے بالکلیہ دوسروں پر منحصر کردے، یہ انحصار اگرچہ متبادل ومساوی ہوتا ہے مگر پھر بھی مکمل ہوتا ہے۔ روسو کے سیاسی نظم میں انسان جس جماعت کا رکن ہوتا ہے اس کی مرضی کے مقابلہ میں اپنی مرضی سے وہ ویسی ہی مکمل وغیر مشروط طور پر دست بردار ہو جاتا ہے جیسا کہ ہابس کے نظم سیاسی میں ہوتا ہے مگر فرق اتنا ہے کہ روسو کے نظم میں معاہدہ کو شکست کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے۔ تصور میں تو بہر نوع یہ فطری شخص فنا ہو جاتا ہے تاکہ وہ ایک مدنی شخص یا شہری کی حیثیت سے دوبارہ جنم لے سکے اور ایک مجموعہ شخصی کا رکن یا جزو بن سکے۔

۴۴ پس جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خیال کی رفتار جو انجام کار انقلابی اصول پر ختم ہوئی، وہ محض اس عمل مسلسل کی آخری منزل ہے جو ہمیں تاریخ جدیدہ کے آغاز سے بہت پیچھے لیجاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ

حکومت کے ہیئت و اختیارات کا تعین انصافِ مجرد کے اصولوں پر کیا جائے اور یہ صاف عیاں ہے کہ ان اصولوں کے مبدا و ماخذ کا پتہ چلانے کے لئے ذرا پیچھے ہٹ کر اس قانونِ فطرت تک جانا چاہیے جس کا تصور اور جس کا نفاذ رومانی اہلِ قانون نے زمانۂ مابعد کے یونانی فلسفہ کے زیر اثر قائم کیا تھا۔ اس ارتقا کے عمل مسلسل کو میں اب مختصر طور پر بیان کروں گا۔ انقلابی اصول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنا دو یا تین نہایت ہی سادے اصولوں پر ہے۔ وہ اصول یہ ہیں کہ (۱) انسان از روئے فطرت آزاد و مساوی ہیں، (۲) حکومت کے حقوق کی بنا کسی ایسے معاہدے پر ہے جس میں یہ مساوی و خود مختار اشخاص آزادانہ طور پر شریک ہوئے ہوں۔ (۳) ایسا معاہدہ جو افراد کے لئے منصفانہ اور معاشری اتحاد کے لئے کافی ہو، وہ وہی ہے جس میں ہر فرد اس جماعت کا ایک جزو لاینجزی ہو جاتا ہے جسے خود اندرونی دستور سیاسی و وضع قوانین کے تشخص کرنے کا غیر منفک حق باقی رہتا ہے اور وہ مقتدر اعلیٰ جماعت قوم بن جاتی ہے۔ روسو نے آزادی کا جو منشور بنی نوع انسان کے نام جاری کیا اس کے تین مباحث ہیں اور ان تینوں کے تاریخی آغاز و ابتدا کو ہم مختصراً اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ کہ (۱) مبحث اول کا تعلق رومانی مقننین کے قانونِ فطرت سے ہے اور ان کے ذہن میں اس کا مقصود صرف مدنی تعلقات کا ایک اتم و اکمل ضابطہ تھا، یہ کام بعد کے ازمنۂ وسطیٰ و زمانۂ جدیدہ کے اہلِ فکر کا تھا کہ انھوں نے اسے دستوری و بین الاقوامی تعلقات پر عائد کیا۔ (۲) دوسرا مبحث ایک نتیجہ کے طور پر اسی قانونِ فطرت سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معاشرۂ سیاسی سے قبل فطری حالت کے اندر یہی ایک قانون برقرار تھا اس مبحث کی نسبت بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ جدید خیالات کا ثمر ہے معاہدے کے متعلق مختلف طریقوں سے خیال آرائی کی گئی ہے، اس کی تاویل ہابس کی طرح امن و امان اور مطلق العنانی کے مفید مطلب بھی کی جا سکتی ہے اور لاک کی طرح آزادی و دستوری حکومت کے حسب دلخواہ بھی اس کی تاویل ہو سکتی ہے۔ (۳) تیسرے مبحث کا تعلق روسو کی ذات سے ہے اور اس نے ہابس و لاک کی روش ہائے خیال کو باہم ملا کر اپنا یہ

طبعزاد نتیجہ پیدا کر لیا ہے ۔

روسو اس امر میں لاک سے متفق ہے کہ اساسی معاشری معاہدے کی غرض وغایت یہ ہونا چاہئے کہ جو لوگ اس میں شامل ہوں ان میں سے ہر ایک کی ذات و جائداد کے لئے بہتر تحفظ کا سامان ہو، لیکن یہیں سے دونوں میں فرق پیدا ہوتا ہے، لاک کا دعوی یہ ہے کہ اس سے لازماً حکومتی اقتدار پر تحدیدات عاید ہو جاتے ہیں، اور وہ بالتخصیص اس امر کو حکومت کے لئے خلاف قانون قرار دیتا ہے کہ وہ محکوم پر بغیر اس کی رضامندی کے محصول لگائے، برخلاف ازیں روسو کا دعوی یہ ہے کہ یہ نتیجہ جس معاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ صرف وہی معاہدہ ہے جس میں افراد اپنے تمام حقوق سے قوم کے حق میں کلیتہً دست بردار ہو جائیں اور معاشری اتحاد سے جو حاکمانہ مرضی پیدا ہوتی ہے اس کے سامنے اپنی مرضی کو بالکلیہ پست کر دیں ہابس اسی انتہائی حد تک پہنچا ہوا ہے، لیکن ایک طرف ہابس کا خیال یہ ہے کہ حاکمانہ مرضی اس حکومت کی مرضی کا ہی دوسرا نام ہے جس کی اطاعت کا افراد نے معاہدہ کیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ وہ کیسی حکومت ہے، ایک شخص کی حکومت ہے، چند افراد کی حکومت ہے یا کل قوم کی حکومت ہے، دوسری طرف روسو کا دعوی یہ ہے کہ یہ مرضی کل قوم کی مرضی ہونا چاہئے یعنی صحیح معنی میں مرضی عام ہونا چاہئے ۔ معاشری اتحاد سے جو "کل" یا مجموعہ بنتا ہے اصلاً ودائماً ولازماً وہی "صاحب اقتدار اعلی" ہے ۔ حکومت کے جو مختلف اختیارات تشریعی وعاملانہ وغیرہ عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں وہ اقتدار اعلی کے اجزا نہیں ہیں بلکہ اس کی فروع ہیں اور صاحب اقتدار کو ہمیشہ اور غیر منفک طور پر تشریعی اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہئے ۔ حکومت کی جو مختلف شکلیں بادشاہی، عدیدی وغیرہ کہلاتی ہیں وہ از روئے قانون اس سے زیادہ نہیں ہو سکتیں کہ وہ حکومت عاملانہ کی شکلیں ہوں، اور ان کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ذی اقتدار اعلی قوم کی مرضی کو عمل میں لائیں حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی ایک خیال کسی ایک اصول کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فی نفسہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب عظیم کا ذہنی مبدا و ماخذ تھا تو وہ قوم کے دائمی و غیر منفک اقتدار اعلی کا ہی اصول تھا ۔

چونکہ معاشری اتحاد کے شرائط سب کے لئے ایک ہی ہوں گے اس لئے

کوئی بھی ایسے دوسروں کے لئے موجب تکلیف بنانا نہیں چاہے گا، لہذا لاک کے برخلاف روسو ارکان مجموعہ پر مجموعہ کی مطلق العنان طاقت پر کوئی روک نہیں قائم کرتا، اس میں صرف ایک استثنیٰ کرتا ہے اور یہ بہت ہی اہم روک ہے کہ عام مرضی کا اظہار ایسے عام قوانین میں ہونا چاہیئے جو تمام شہریوں پر یکساں اثر کریں، اس مرضی عام کی تشریعی اہلیت پر ساقط انفرادی حقوق کی بنا پر کوئی تحدید نہیں قائم ہوتی ملت کے حق میں افراد کی دست برداری حقوق غیر محدود و کامل ہوتی ہے مگر یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اور تمام لوگ بھی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں، اس لئے صاحب اقتدار اعلیٰ مجموعہ کی مرضی صحیح معنی میں مرضی عام ہونی چاہیئے۔ ع۱

۵۔ اس رائے کے بالمقابل رائے کا پیش کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ صرف ایک ہی ایسا اصول ہے جو منصفانہ حکومت کے قیام کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ اطمینان ہو کہ قوانین تمام قوم کی عام مرضی سے بنائے جائیں، اور ہر ایک فرد اس میں مساوی اجزا کے طور پر شامل ہو اور نیز یہ کہ اس عام مرضی کا اظہار ہمیشہ عام قوانین کی صورت میں ہوتا رہے۔ اس کے بالمقابل رائے وہ ہے جس کا اثر سنہ ۱۷۸۹ء میں شاید ہی کچھ محسوس ہوتا ہو مگر اٹھارھویں صدی کے سیاسی خیالات کی تاریخ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بعد کو اس کا اثر بالواسطہ بہت زیادہ پڑا۔ اس سے میری مراد حامیان حکومت فطری یا "اقتصادیوں" سے ہے، یہی لوگ ایڈم اسمتھ کے دلیل راہ اور طبعی آزادی یا عدم مداخلت کے طریق کے واضع اوّل تھے، اب مجھے اس وقت پیداوار اور محصول کے متعلق ان کے

ع۱۔ یہ ملاحظہ ہو کہ اصول معاہدۂ معاشری کی اس آخری شکل میں معاہدے کے تاریخی واقعہ ہونے کے تمام سوالات لاطائل ہو گئے ہیں۔ معاہدے کو ایک خیالی تصور میں بدل دیا گیا ہے، اور دراصل ان تعلقات کو بیان کرتا ہے جو ایک صحیح النظم مملکت میں ہونا چاہیئے یعنی ایک طرف تو وہ تعلقات ہیں جو افراد اور مجموعی قوم میں ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ تعلقات ہیں جو اس قوم اور اس کے اعضائے حکومت میں ہوتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم ۱۶۸۸ء کے "بنیادی اصول" اور ۱۷۸۹ء کے بنیادی اصول کا باختصار مقابلہ کرنا چاہیں تو اس کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ لاک کی "حکومت ملکی" Civil Government باب سیزدہم فقرہ ۱۴۹۵ - اور روسو کے معاہدۂ معاشری کتاب اول باب ششم کا مطالعہ کریں۔

خاص نظریات سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ فطری آزادی و عام بہبود کے حصول کے لئے جس سیاسی نظم کی ضرورت ہے محض اس کے متعلق ان کی رائے سے بحث ہے۔ اگرچہ فطری مساوات کی ہمنوائی کے ساتھ معاشرے کو از سر نو ترتیب دینے کی عام تحریک میں اس زمانہ کے فرانسیسی خیالات میں اس خیال کو بھی شرکت حاصل تھی تاہم یہ خیال روسو کے خیال سے عجیب و غریب طور پر مخالف ہے حالانکہ مقصود اس کا یہی تھا کہ ایک ایسا معاشری نظم قائم کیا جائے جس سے افراد کے فطری حقوق بھی حاصل ہوں اور قوم کے لئے بیش از بیش مفاد بھی میسر آئے۔ روسو کے طریق کے لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ قوم کے اقتدار اعلیٰ کو قائم کر کے حکومت کی ہیئت و ترکیب کی بنیاد کو بدل دیا جائے، اس کے برخلاف اقتصادیوں کے خیال میں اہم نقطہ یہ تھا کہ اس سے بحث نہیں ہے کہ حکومت کی ترکیب کس طرح پر ہو بلکہ سوال یہ ہے کہ حکومت کو کرنا کیا چاہئے۔ روسو اور اس کے متبعین کے ذہن میں تو قانون سازی کی حدود وسعت کے محدود کرنے کی ضرورت کا خیال تک نہیں تھا، اس کے برخلاف حامیان حکومت فطری کا دعویٰ یہ تھا کہ حکومت کا فرض اولیں یہ ہے کہ وہ اپنے دماغ سے یہ خیال نکال ڈالے کہ قوانین کا بنانا بھی اس کا کام ہے، اس کا جو کچھ کام ہے وہ یہ کہ فطرت کے بتادے، دائمی اور غیر متغیر قوانین کی تحقیق کرے اور انھیں مداخلت سے محفوظ رکھے، ہر شخص کی اس فطری آزادی کو محفوظ رکھے کہ جب تک کہ وہ دوسروں کو کوئی گزند نہ پہنچائے وہ خود جس طریق پر بہتر سمجھے کام کرے، یعنی حکومت ہر طرح کے صنعی امتیازات، قیود و امتناعات کو منسوخ کر دے، اور ہر شخص کی محنت کے ثمر کی حفاظت کرے۔ ان کا خیال بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ کام ایک مطلق العنان بادشاہ بہترین طریق پر انجام دیسکتا ہے۔ کم از کم اتنا ضرور تھا کہ وہ بیشتر اس امر پر رضامند تھے کہ مطلق العنان بادشاہی کو علی حالہا چھوڑ دیا جائے۔ درحقیقت وہ اس تقسیم اختیارات کے مخالف تھے جسے مونٹسکیو انگریزی دستور میں قابلِ مدح قرار دیتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک اس سے حکومت کے کام میں پیچیدگی و کمزوری پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ عله

عله۔ فی الجملہ ایک ہی غایت المرام یعنی افراد کو ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنے کی سعی میں طرز عمل کا

مگر مطلق العنانی کے خلاف اس زور کا سیل رواں تھا کہ ۱۷۸۹ء سے قبل فرانس میں اس مسلک کے پیروں کا کچھ ایسا دائمی اثر پیدا نہیں ہو سکا۔ حامیان حکومت فطری جن امور پر زور دیرہے تھے ان کا بیشتر حصہ مفید و ضروری تھا، مثلاً یہ کہ صنعتی کاموں پر سے قید و بندش کا اٹھا لینا، بیگار سے چھٹکارا دینا، اجاروں کا موقوف کر دینا اور اگر ان کا اجرا مناسب غور و فکر کے ساتھ ہوتا، مربیانہ حکومت کے طویل دور کی وجہ سے جو توقعات و عادات پیدا ہو گئے تھے ان پر کافی لحاظ کیا جاتا اور اس دور حکومت کے تعلق سے جن کاموں میں جائز طور پر سرمایہ لگا دیا گیا تھا ان کے مناسب معاوضہ کا خیال رکھا جاتا تو اس قسم کے اصلاحات سے فرانس کے زیر بار مالیات میں نظم و ترتیب کا پیدا ہو جانا ممکن تھا مگر اس طریق خیال کے سب سے زیادہ ممتاز رکن تیورگو نے اپنی صدر مستوفیت کے مختصر دور (۱۷۷۶ء-۱۷۷۴ء) میں جو کوشش کی اس میں ضروری احتیاط کی نمایاں کمی تھی، اس نے اپنے اصلاحات پر ایک متقشف کی سی بے رو رعایت سختی کے ساتھ زور دیا جس سے عام رائے اس سے برگشتہ ہو گئی اور پارلمان سے اس کا تصادم ہو گیا اور چونکہ شاہی اقتدار پر روایتی آئینی روک صرف ابھی پارلمان ہی کی تھی اس لئے اسے آزادی کے ترقی پذیر احساس عامہ کی زبردست تائید حاصل تھی جب تیورگو کا زوال ہوا تو یہ عیاں ہو گیا کہ حقیقی تغیر کی طرف اس تحریک کی سربراہی طبعیئین کے ہاتھ سے نکل گئی ہے

بقیۂ مضمون صفحہ گذشتہ۔ یہ اساسی اختلاف ہمارے لئے اس وجہ سے اور بھی زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے کہ یہ اس وقت کے اصول جدت پسندی میں ہنوز باقی ہے۔ مدنی اور دستوری آزادی بہت ہی مختلف چیزیں ہیں، اول الذکر سے حکومت کو واسطہ نہیں ہوتا اور ثانی الذکر خود حکومت پر اقتدار پیدا کر لیتی ہے۔ انتخاب کنندوں کی جماعت کی کثرت کے عملی لحاظ سے یہ دونوں، متحد ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ کثرت حکومت کو اس امر سے روک دیگی کہ وہ ناپسندیدہ طور پر ان کے کاموں میں مداخلت کرے مگر قلت کے لحاظ سے وہ دونوں متحد نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص جو یہ چاہتا ہو کہ وہ اتوار کو ایک شراب کا ایک جام پی لیا کرے اور ناٹک دیکھنے جایا کرے وہ اس ملک کی یہ نسبت جس میں ہمہ گیر حق رائے دہی رائج ہو اور جہاں کثرت آراء سے اس کام سے روک دے، خود کو اس مطلق العنان حکومت کے تحت میں زیادہ آزاد سمجھے گا جہاں

اور اب روسو کے زیر اثر قومی بہبود کی تلاش میں حکومت کے فرائض کے محدود کرنے کے بجائے حکومت کی ہیئت و ترکیب کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام آئندہ کے انقلاب میں بے روک ٹوک جاری ہوجائے گا۔

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ - اسے ان لطف اندوزیوں کا موقع مل سکے۔

خطبۂ بست و ہفتم

ارتقائے نظم سلطنتِ انگلشیہ از ۱۶۸۸ء

۱۔ مغربی یورپ کے نظم سیاسی میں آخری عظیم الشان تغیر پیدا کرنے یعنی اس طرز حکومت کے قائم کرنے میں جسے ہم دستوری بادشاہی کا لقب دیتے ہیں فرانس و انگلستان نے سب سے بڑھکر حصہ لیا مگر دونوں کے طریقے اصولاً ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ وہی طرزِ حکومت ہے جو اس وقت روس کے سوا تقریباً تمام یورپ میں رائج ہے، فرانس اگرچہ بادی النظر میں اس سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً وہ بھی اس کے اندر داخل ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ فرانس کی حکومت جمہوری ہے، شاہی نہیں ہے لیکن یہ کہنا اگرچہ اجتماع ضدین ہے مگر ہے یہی کہ مغربی یورپ کی دستوری بادشاہیاں بھی معمولی مفہوم میں حقیقتاً ملوکی نہیں ہیں یعنی ان بادشاہیوں کے لئے دائمی موروثی بادشاہوں کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ تمام صورتوں میں مگر بہت سی صورتوں میں، موروثی بادشاہ جن فرائض کو انجام دیتا ہے اگر وہ کسی رئیس جمہوریہ کی جانب منتقل کر دئیے جائیں جس کا انتخاب چند معینہ برسوں کے لئے ہوا ہو، تو اس سے جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ بالیقین اس قدر اساسی و اصولی نہ ہوگا کہ ہم اس کی نسبت یہ سمجھیں کہ یہ واقعی حکومت کی کوئی مختلف صورت ہے۔

آپ یہ ملحوظ رکھیں کہ مغربی یورپ کے نظم سیاسی کا یہی عام تغیر ہے جس کی میں تخصیص و توجیہ کرنا چاہتا ہوں نہ کہ اس خاص واقعۂ عجیبہ کی جسے ہم انقلاب فرانس کہتے ہیں۔ فرانس کے قبل از انقلاب خیالات کی تحریک کے متعلق مجھے خاص طور پر توجہ دلانا پڑی ہے مگر اس میں میں نے ہمیشہ یہ مد نظر رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے

مغربی یورپ میں جو عام تغیر واقع ہوا اسے بیان کروں نہ کہ فرانس کے ایک خاص سلسلۂ واقعات کو لے بیٹھوں۔ اگر میری کوشش یہ ہوتی کہ انقلاب فرانس کے مخصوص واقعے کی تشریح کروں تو میں ان دوسرے اسباب کو نمایاں کرکے دکھاتا جن کے نظر انداز کردینے میں میں حق بجانب تھا کیونکہ "وہ جو خرابی سب سے زیادہ صریحی بے قیل و قال طور پر فرانسیسی انقلاب کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی وہ فرانسیسی حکومت کا دیوالیہ ہونا تھا۔ جو کہ واقع ہوگئی تھی اس سے تنہا عہدہ برا ہونے سے مایوس ہوکر نیکر نے یہ عزم کرلیا کہ اپنی تقویت کے لئے طبقات مجتمعہ کو طلب کرے" [عله] اور اگر ہم اس سے آگے بڑھیں، اور اس کے دیوالیہ ہونے کے اسباب کی تحقیق کریں تو ہمیں صرف اتنا حوالہ دیدینے پر قانع نہ ہونا چاہئے کہ مالیات کا "نظم" بیخ و بن سے ناقص تھا اور محصولوں میں عدم مساوات تھی (جس کا ذکر میں آخری خطبہ میں کرچکا ہوں)، کیونکہ یہ عدم مساوات اگرچہ ایک حد تک افلاس کا سبب ضروری تھی مگر یہی واحد سبب نہیں تھی۔ بقول سیلی، "یہ افلاس جنگ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور اگر ہم اپنی تحقیقات کو اور آگے بڑھائیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کا سبب لوئی چہاردہم کی حرص و ہوس تھی، یعنی یہ نتیجہ تھا ان یورپی جنگوں کا جنھیں لوئی نے بھڑکایا تھا، اور اس وقعت کا جو اس کی حکمت عملی سے یورپ کے اندر فرانس کو حاصل ہوگئی اور جس کی وجہ سے فرانس اس قابل نہ رہا تھا کہ وہ عدم مداخلت کی روش اختیار کرسکتا، اور یہی ایک روش تھی جس سے اس کا مالی بار ہلکا ہوسکتا تھا"، مگر خیالات کے اس دلپذیر سلسلہ کو میں تاریخ فرانس کے مطالعہ کرنے والے کے لئے چھوڑتا ہوں ہمیں اس وقت جس امر سے غرض ہے وہ نظم سیاسی کا وہ عام طرز ہے جو یورپ کے سیاسی ارتقا کے مختلف مدارج میں رائج ہوتا رہا ہے اور نیز ان اسباب سے غرض ہے جن کی وجہ سے ایک مروجہ طرز دوسرے طرز کے قالب میں ڈھلتا رہا ہے اور اس نقطۂ نظر سے فرانس کے افلاس اور اس کے اسباب کی وہ دلچسپی

عله یہ الفاظ پروفیسر سیلی کے ہیں جنھوں نے کیمبرج ہی میں ایک مرتبہ اپنے سلسلۂ خطبات میں پرزور طور پر اس کی تشریح کی تھی۔

گھٹ جاتی ہے۔

میں نے اس وقت اس کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس خطبہ میں انگریزی تاریخ کے واقعات پر خاص توجہ کروں، اور میرے ایسا کرنے کی وجہ موجہ یہ ہے کہ جب ہم حکومت کے اس شغل کی توجیہ کی کوشش کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے ربع ثالث کے آخر تک تقریباً تمام مغربی یورپ میں رائج ہوگئی تھی، تو اسکی توضیح و تشریح کے لئے فرانس کی صورت حالات کے بہ نسبت انگلستان کی صورتِ حالات بالیقین زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ انگلستان کی صورتِ حالات اس کا اہم ترین عنصر ہے، اگر میرا ایسا خیال ہوتا تو میں نے اٹھارھویں صدی کے سیاسی خیالات کے ارتقا پر توجہ کرنے کے لئے آپ پر اس درجہ زور نہ دیا ہوتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ انقلابی خیالات و حیات یعنی آزادی و مساوات اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کی تحریک کا جو سیل فرانس سے اٹھ کر قرب و جوار کے ممالک میں پھیلا (جہاں لوئی چہاردہم کے شاندار زمانہ سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ کرنے اور جدید خیالات، جدید علوم و فنون اور جدید طرز ماند و بود کے منبع و ماخذ کے طور پر فرانس ہی پر نظر ڈالنے کا عادی ہوگیا تھا) وہ سیل عام ارتقا کے سبب کے طور پر اپنی اہمیت میں حقیقتاً کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں تھا، مگر اس کے ساتھ ہی اسباب و علل میں فرانس کا یہ حصہ نسبتاً زیادہ تاریک ہے اور اس کی مقدار کا قطعی یقین بھی زیادہ مشکل ہے۔ انگلستان کا حصہ نسبتاً زیادہ واضح اور زیادہ قطعی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان قرب جوار کے ممالک پر فرانسیسی خیالات کا کتنا ہی اثر کیوں نہ پڑا ہو مگر انھوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ فرانسیسی دل و دماغ کی تعمیری جدت طرازی سے جو خاص خاص دساتیر ظہور پذیر ہوئے تھے (اور جن میں انقلابی تغیر کے سریع التکرار خطرات بھی شامل تھے)، ان میں سے کسی دستور کی نقل کرتے، ۱۷۹۱ء کا دستور سنہ ۳ انقلابی و سنہ انقلابی کے دساتیر اور پھر ۱۸۴۸ء، ۱۸۰۷ء اور ۱۸۷۵ء کے دساتیر، ان میں سے کسی دستور کی بھی کسی نے نقل نہ کی۔ انھوں نے جس دستور کی نقل کی وہ واضح و لائح طور پر انگریزی دستور ہے، اور اسی کی نقل خود فرانس میں ۱۸۱۴ء و ۱۸۳۰ء میں کی گئی۔

۲۔ پس اب میں انگریزی دستور کی طرف پلٹتا ہوں، ابتدا میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس دستور کی نقل کرنے والوں کو ہمیشہ یہ علم نہیں ہوا کہ یہ کیا تھا اور مختلف مدارج میں اس کی شکلیں کیسی مختلف رہی ہیں۔ انھوں نے تغیر کے اس سلسلۂ عمل پر پوری طرح قابو نہیں پایا جو ۱۶۸۸ء کے انقلاب اور انیسویں صدی کے دور تعمیر دساتیر کے مابین اس دستور میں جاری رہا ہے۔ یہ ناکمل استقصاہیت حال کے زمانہ تک قائم رہا اور اس وقت تک بعض بعض اطراف میں چلا جا رہا ہے۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس استقصائے ناقص کی دو شکلیں ہیں۔ بعض وقت تو انیسویں صدی کا دستور ناید از ضرورت اس دستور کے مشابہ کر دیا جاتا ہے جو حقیقتاً اٹھارہویں صدی میں موجود تھا، اور کبھی اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔

پہلے بیان کی توضیح کے طور پر میں اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ بلنچلی نے اس موضوع پر جس طرح بحث کی ہے، اس پر نظر کرتے وقت ہمیں دل میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بہ حیثیت مدبر کے بلنچلی نہایت وسیع المعلومات شخص ہے، اس کے مقاصد جدت پسندانہ ہیں، اگرچہ اس کی فکر غائر و عمیق نہیں ہے مگر سرسری و سطحی بھی نہیں ہے۔ اس کتاب میں آپ کو جدید جرمانی نقطۂ نظر سے ایک موثر بیان اس تحریک کا ملیگا جس کے وسیلے سے مغربی یورپ کی سلطنتوں میں آئینی بادشاہی، طرز رائج الوقت بنگئی ہے۔ بلنچلی کی رائے کے موافق بعض "نتائج" ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے حاصل ہوئے تھے، مطلق العنان بادشاہی متروک کر دیگئی، اور اس کے بجائے دستوری یا مشروط بادشاہی قائم ہوگئی، اور یہ ایسے اصول پر مبنی تھی جن کا سمجھنا (بقول بلنچلی) خاندان ہانوور کے بادشاہوں کے لئے مشکل ہوگیا مگر "حالات اس قدر قوی تھے،" کہ وہ ان کے تسلیم کرنے سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے، اور خود ہمارے اس زمانے میں انگلستان میں "شاہی خاندان" بلا بیش و کم آئینی بن گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی "بادشاہی کے احترام و اختیار میں کسی طرح کا زوال ابھی نہیں آیا ہے"۔ ("اختیار میں زوال" نہ آنے کے الفاظ پر نظر رکھنا چاہیے) عـلـه

عـلـه حسب بالا صفحہ ۳۷۳۔۳۷۴۔

اس کے بعد وہ مختصراً یہ بیان کرتا ہے کہ کیونکر ایک ایسا نظام سلطنت جو بیشتر انگریزی دستور کے مشابہ تھا انیسویں صدی میں، (باستثنائے فرانس) رومانی الاصل سلطنتوں (یعنی بلجیم، ہالینڈ) میں اور نیز اسکینڈینیوی ڈیموٹنی ممالک میں قائم ہوگیا۔ میں نے یہ الفاظ کہ "بیشتر انگریزی دستور کے مشابہ تھا" اس وجہ سے استعمال کئے ہیں کہ ہر جگہ اعلیٰ تشریعی اختیار، بادشاہ، مجلس نمائندگان اور مجلس سینات یا مجلس خاص کے قبضے میں ہیں اور عاملانہ اختیار بادشاہ اور ذمہ دار وزرا کے ہاتھوں میں ہیں۔

مگر یہ آخری فقرہ ہمیں اس نازک سوال کی طرف لیجاتا ہے کہ بادشاہ اور اس کے ذمہ دار وزرا کے درمیان اس عاملانہ اختیار کی تقسیم کیونکر ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں بلنچلی کو وہ غلط فہمی واقع ہوی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، کیونکہ ہمیں سے وہ دستوری بادشاہی کے متعلق "صحیح" و "غلط" خیالات کا باہم مقابلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے، اور یہ صاف عیاں ہے کہ اس مقابلہ میں "صحیح خیال" سے اس کی مراد کسی دوسری بادشاہی کی طرح انگریزی دستوری بادشاہی بھی مراد ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ یہ فرض کرنا کہ "آئینی بادشاہی" کے متعلق ایک غلط خیال ہے کہ اعلیٰ اختیار بادشاہ کے ہاتھوں سے نکل کر وزرا کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے تو اس کا مقصود یہ ہے کہ کسی اور بادشاہی کی طرح انگریزی بادشاہی کے متعلق بھی یہ ایک غلط خیال ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ دستوری بادشاہی کا اصول اس خیال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا کہ "وہ بادشاہ قومی نمایندگان یا اپنے وزراء کے ماتحت ہوگیا ہے، اور وہ لوگ اسے خود اس کی مرضی کے خلاف کسی رائے کے اظہار پر مجبور کر سکتے ہیں"[1] اور یہ کہ "وہ آئینی بادشاہی حکومت کے مرکز ثقل کو ایوان یا وزرا کی طرف منتقل نہیں کر دیتی"[2] نیز یہ کہ "وضع قانون میں بھی آئینی بادشاہ کی شرکت ہوتی ہے اور یہ شرکت علی العموم قانون کے نفسِ مطلب کے لحاظ سے قطعی ہے"[3]۔ اور یہ کہ "حکومت مکمل" یعنی متقرر کردہ

۱؎ - حسب بالا صفحہ ۴۰۵،

۲؎ ایضاً صفحہ ۴۰۶ -

۳؎ ایضاً صفحہ ۴۰۸ -

قانون کے حدود کے اندر حکمرانی کا تمام فرض حقیقتاً نہ کہ رسماً دو بادشاہ کے اندر مرکوز ہوتا ہے،،[1] تو بظاہر وہ یہی یقین کرتا ہے کہ یہ اقوال جس طرح براعظم کے دستوروں کے لئے درست ہیں اسی طرح انگریزی بادشاہی کے لئے بھی درست ہیں۔ درحقیقت (الخ) حدود کی وسعت سے واقف ہے جو شاہی اختیارات پر مختلف ممالک میں عائد کئے گئے ہیں اور وہ اسے تسلیم کرتا ہے کہ انگریزی دستور "شاہی حقوق پر اس سے بہت زیادہ قیود عائد کرتا ہے جن کا تحمل براعظم کے اکثر بادشاہوں سے ہو سکتا ہو"[2] مگر وہ اسے محض حدود وسعت میں ایک فرق سمجھتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ فرق اتنی دور تک پہنچا ہے کہ جن مسلمات کو اوپر بیان کیا گیا ہے وہ انگلستان کے لئے ناقابلِ اطلاق ہو جاتے ہیں۔

بہرحال بلنچلی نے جب اپنی کتاب ۱۸۵۲ء میں شایع کی (اور اس سے بڑھکر جب اس نے ۱۸۷۰ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن شایع کیا)، تو اس وقت اس نے ان بیانات کو انگریزی نظم سلطنت کے متعلق جس حد تک صحیح سمجھا اس کی نسبت میرا خیال ہے کہ کوئی معقول تعلیم یافتہ انگریز اس کے غلط ہونے میں شک نہ کرے گا۔ (بلنچلی کو میں نے درحقیقت اس مخصوص خیال کے نمائندے کے طور پر پیش کیا ہے جو جرمنی میں وسعت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے) اور یقیناً اس کا مقصود (کلاً نہیں مگر) جزاً یہی تھا مگر "صحیح و غلط خیالات" کی نسبت جہاں اس نے گفتگو کی ہے وہاں اس نے امر واقعی کے مسئلہ کو کسی قدر اس مسئلہ سے کہ کیا ہونا چاہئے اور کسی قدر محض ایک سوال لفظی سے ملا دیا ہے اور چونکہ اس قسم کے مسائل پر بحث کرنے میں عام طور پر ان دونوں قسموں کے التباس واقع ہو جاتے ہیں اس لئے میں ان مباحث کو صاف کر دینے میں دو ایک منٹ صرف کروں گا۔

بلنچلی ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر حکومت کے رسمی سرگروہ کا اختیار اس حد تک گھٹا دیا جائے جس حد تک کہ "غلط خیالات" والے اسے گھٹانا چاہتے ہیں تو

---

[1] حسب بالا صفحہ ۴۰۸ -

[2] حسب بالا صفحہ ۴۰۷ -

پھر اس رسمی سرگروہ کو بادشاہ نہیں کہنا چاہئے لیکن یہ محض لفظی قیل وقال ہے، ہم حکومت کی اس شکل کو (بالفاظ ٹینسن) "تاجدار جمہوریت" کہتے ہیں، نام سے کچھ نہیں ہوتا، علی سوال یہ ہے کہ آیا یہ صورت مفید ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اس میں شک نہیں رہتا کہ بلنچلی یہ حجت لانا چاہتا ہے کہ یہ مفید نہیں ہے، بلکہ اگر قانون کے مقرر کردہ حدود کے اندر اور وزرا کے اتحاد عمل کی ضرورت کی شرط کے ساتھ بادشاہ کو اپنی مرضی پر چلنے اور اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا موقع دیا جائے تو ہمیں اس سے بہتر صورت حکومت کی حاصل ہوگی۔ یہ بھی وہی مسئلہ ہے کہ ہونا کیا چاہئے مگر اسے اس مسئلہ سے ملانا نہ چاہئے کہ واقعاً انگلستان یا کسی اور ملک میں صورت حال کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہی خلط مبحث اس وقت بھی بہت ہی عام طور پر پیش آتا ہے جب ہم کسی دستور کے کسی ایسے مسئلے پر غور کرتے ہیں جس کا انحصار کلیۃً یا قطعاً قانون پر نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر رسم ورواج یا اس عام رائے پر منحصر ہوتا ہے کہ حکومت کے کسی رکن کو کیا کرنا چاہئے اور اگر وہ کوئی دوسری روش اختیار کرنا چاہئے تو اس کی باقاعدہ مخالفت کو کس قدر قبول عام حاصل ہوگا اور یہی صورت اس تقسیم اختیار کی ہے جو بادشاہ اور اس کے وزرا کے درمیان ہے۔

فی الحقیقت آئینی بادشاہی کی انگریزی وجرمانی انواع میں بہت وسیع فرق ہے مگر یہ فرق زیادہ تر قانونی فرق نہیں ہے، دونوں صورتوں میں یکساں طور پر یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کے ہر ایک سرکاری فعل میں کسی ذمہ دار وزیر کی شرکت ہو اور اس کے ساتھ ہی جرمنی سے زیادہ انگلستان میں اس کی کوئی قانونی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر اعظم ایوان نمائندگان کے فرقۂ کثیر کا مسلمہ سرگروہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت (۱۸۹۹ء میں) ملکۂ انگلستان، لارڈ سالسبری کو صرف اس بنا پر برطرف کردے کہ ملکہ کو اس کی حکمت علی سے اتفاق نہیں ہے (جس طرح کہ شہنشاہ ولیم نے بسمارک کو برطرف کردیا) تو ملکہ کے اس فعل پر تقریباً ہمہ گیر ناپسندیدگی کا اظہار ہوگا جس کی علی صورت یہ ہوگی کہ دار العوام کی بہت بڑی کثرت رائے سے رقوم کی منظوری سے انکار کردیا جائے گا اور اس لئے اس کا خاتمہ بہت عاجلانہ وقاطعانہ طور پر بادشاہ کی دولت واطاعت پر ہوگا۔ انگلستان میں بلاشک وشبہہ یہی ہوگا اور اس لئے انگلستان کی بابت

یہ کہنا لغو معلوم ہوتا ہے کہ جب وزیر اعظم کو دارالعوام کی کثرت رائے کا اعتماد حاصل ہو اسے برطرف کر دینے کا یہ عملی عدم امکان دستوری بادشاہی فرائض کی بابت کسی "غلط خیال" پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو اس کی نسبت صاف طور پر یہ سمجھا جائیگا کہ وہ ان سہولتوں اور امیدوں کی نسبت خیال ظاہر کر رہا ہے جو ہونا چاہئیں نہ کہ وہ ان امور کو واقعاً رائج سمجھتا ہے۔

لیکن اگر صورتِ معاملات اس کے برعکس ہو (جیسی کہ بلاشک و شبہہ بلنچلی کی تحریر کے وقت جرمنی میں تھی)، اگر اس معاملہ میں رائے منقسم ہو کہ نظامِ سلطنت کی رو سے بادشاہ کے لئے جو اختیار چھوڑ دیا گیا ہے معمولاً اس کی مناسب وسعت کیا ہونا چاہیے تو اس صورت میں کسی مصنف کی ذاتی رائے کے اظہار سے کہ کیا ہونا چاہئے عام رائے کی ترمیم پر بہت اہم اثر پڑے گا۔ اس وقت اس توقع میں کہ اپنی رائے کو مروجہ خیال کی حیثیت سے قائم کرنے میں مدد ملے یہ کہنے کی بہت ہی قوی ترغیب ہو گی کہ دستوری بادشاہی کا صحیح خیال ایسا اور ایسا ہونا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں میرا خیال یہ ہے کہ ۱۶۸۸ء کے بعد کی تاریخ انگلستان کے بعض انگریزی مورخین پر بھی اس رغبت کا اثر پڑا ہے جس نے بلنچلی کو مغلوب کر لیا مگر اس رغبت میں پڑ کر وہ مخالف جانب چل نکلتے ہیں۔ وہ مبہم طور پر یہ یقین ظاہر کرتے ہیں یا کم از کم یہ چاہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اس کا یقین کریں کہ ملکہ وکٹوریہ کے دور میں انگریزی دستور کا جو انداز ہے یہ طریقہ انقلاب ۱۶۸۸ء کے زمانہ سے قائم ہو چکا ہے یا کم از کم اس زمانہ سے قائم ہے جب سے ولیم سوم کے دور میں شاہی حق امحا کا استعمال بند ہوا ہے۔ (ملکہ وکٹوریہ کے اس عہد دستور سے مراد یہ ہے کہ حکمراں باقاعدہ طور پر اور بالعموم اس فریق کے سرگروہ کو وزیر اعظم تسلیم کر لیتا ہے جسے دارالعوام میں کثرت رائے حاصل ہوتی ہے، اور اسے اپنے رفقا کے انتخاب کا مجاز قرار دیتا ہے اور اس طرح کے مرتب شدہ کابینہ کے لئے یہ جائز رکھتا ہے کہ اکثر اہم امور میں حکمراں کے فعل کا تعین کرے)، اس خیال کو میں کلیۃً غلط سمجھتا ہوں، لاک کے رسالہ میں جس قسم کی دستوری بادشاہی کے قایم کرنے کی سعی کی گئی ہے، اس مفہوم میں دستوری بادشاہی (یعنی ایسی بادشاہی جس میں قانون کو بے چون وچرا

غلبہ حاصل ہو اور قانون میں ترمیم صرف "بادشاہ، امرا اور عوام" کے ذریعہ سے ہو سکے) ایسی بادشاہی کے حصول کی ۱۶۸۸ء میں کوشش بھی کی گئی اور وہ قائم بھی ہو گئی لیکن عاملانہ اختیار یعنی ان حدود کے اندر حکومتی اختیار کو بادشاہ کے ہاتھوں سے نکال کر وزرا کی جماعت کے ہاتھوں میں دیدینا (جن کا ہر گروہ عملاً پارلیمنٹ کی کثرت رائے سے منتخب ہوتا ہو)، اس کی کوشش نہیں کی گئی تھی اور کچھ زمانہ بعد تک اس کا کوئی شائبہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ شاہی اختیار کے زوال پذیر ہونے کی نمایاں علامت جارج دوم کی وسط حکومت تک نظر نہیں آتی اور اس کے بعد پھر بادشاہ کے واقعی اختیارات جارج سوم کے تحت میں دوبارہ قائم ہو گئے۔

۲۔ اٹھارھویں صدی میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے نظم سلطنت کے صرف تخم نظر آسکتے ہیں اور اس نے اپنی موجودہ صورت زیادہ تر پہلے قانون اصلاح کے بعد سے اختیار کی ہے۔ اٹھارھویں صدی کی مسلمہ رائے یہی تھی کہ وزیر اعظم و دیگر وزرا کا انتخاب بادشاہ کرتا ہے۔ بیشک ان میں سے کسی نہ کسی کو دار العوام میں کثرت رائے کا قائم رکھنا ضروری ہوتا تھا مگر اس کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ جس کام کے لئے انھیں مقرر کرتا ہے یہ بھی اسی کام کا ایک جزو ہے۔ یہ کہ اگر وہ اس کام سے عہدہ برا نہ ہو سکیں تو انھیں علیحدہ ہو جانا چاہیئے، یہ امر نی نفسہ شاہی اختیار پر اس سے زیادہ روک کا کام نہیں دیتا تھا کہ ایک غایت درجہ کے مطلق العنان بادشاہ کے تحت میں (جو اپنی فوجوں کے ذریعہ سے معرکہ سر کرنا چاہتا ہو) اس سپہ سالار کو علیحدہ ہو جانا چاہیئے جو فوجی انضباط قائم نہ رکھ سکتا ہو۔

مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس وزیر کو کثرت رائے کا تیار کرنا اور اسے قائم رکھنا ہو، اس کو بہر نوع دار العوام پر انحصار کرنا پڑے گا اور آخر نتیجہ یہ ہو گا کہ عملاً دار العوام ہی اس کا انتخاب کرے گا۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ خود اس امر واقعہ سے کہ وہ بادشاہ کا وزیر ہوتا تھا اسے کثرت رائے حاصل کرنے میں بہت بڑی مدد مل جاتی تھی۔ یہاں میں یہ خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ۱۶۸۸ء کے اثرات کو بہت بڑھا کر بیان کیا جاتا ہے تو ۱۶۶۰ء میں جو تغیر ہوا، اسے بقول سیلی[۱] بہت گھٹا کر دکھایا جاتا ہے۔ انگلستان کے

[۱] مقابلہ کیجئے سیلی کی تقریب السیاسیت Scely Intorduction and Pot Science صفحہ ۲۵۳

بادشاہ اٹھارھویں صدی میں جس طرح پر پارلیمنٹ سے برتاؤ کرتے تھے اس کا آغاز شاہی کی بحالی یا اس کے عین بعد کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ بحالی کے بعد ہی سے شاہی اثر حکومت کا ایک اہم جزو ہو گیا، اور لفظ اثر میں ترغیب ہی کے وہ تمام ذرائع داخل ہیں جن سے بادشاہ کسی قدر شاہی وجاہت کی وجہ سے اور کسی قدر اپنی دولت و سرپرستی کی وجہ سے کام لے سکتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے استقلال کی تاریخ رجعت شاہی کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور جیسا کہ سیلی نے کہا ہے "جب پارلیمنٹ مستقل ہو گئی تو بادشاہ کو اس کا عوض یوں مل گیا کہ پارلیمنٹ بھی اس کے دسترس کے اندر اور اس طرح اس کے زیر اثر آ گئی" [۲]۔

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ:- اس خطبے کے باہر مسٹر سجک نے یہ حاشیہ لکھ دیا تھا "اور کچھ حصہ سیلی سے اخذ کیا ہے۔ اشاعت کی صورت میں اس پر غور سے نظر ڈالنا چاہیئے"۔ اور جو شخص دونوں کتابوں کا مقابلہ کر کے دیکھے گا اس پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہاں سے آگے اس خطبہ کا بیشتر حصہ فی الواقع سیلی کی "تقریب علم سیاست" سے لیا گیا ہے (خطبات سوم و چہارم سلسلۂ دوم)، تاہم دونوں مصنفوں میں کسی نہج سے کامل اتفاق نہیں ہے۔ نہ صرف ٹکڑوں ہی کا اقتباس کیا ہے بلکہ بعض حصوں میں بعینہٖ عبارت کو ترک کر کے خیالات و الفاظ لئے گئے ہیں۔ سر جان سیلی کی یہ کتاب ان کے بعد ۱۸۹۶ء میں شایع ہوئی اور مسٹر سجک ہی نے اسے اشاعت کے لئے مرتب کیا تھا اور میرا یقین یہ ہے کہ جب وہ اس کتاب کو مرتب کر رہے تھے اس زمانہ میں یہ موجودہ خطبہ اسی صورت میں تیار ہوا جس صورت میں وہ فی الجملہ اس وقت موجود ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ خود ان خطبات کو کتاب کی صورت میں شایع کرتے تو اس میں کس حد تک تغیر کرتے۔ یہ خیال دلا دینا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ مسٹر سجک جس وقت سر جان سیلی کے ان خطبات کو مرتب کر رہے تھے تو یہ خطبات ان کے لئے نئے نہیں تھے وہ انہیں مسودات کی صورت میں پہلے ہی پڑھ چکے تھے اور ان کے کاغذات میں ان خطبات کے زیادہ وسیع تعلیقات موجود ہیں جن پر بظاہر سیلی سے گفتگو کرنا مقصود تھا۔ ان اشارات میں اتفاق و اختلاف دونوں محلات کو ظاہر کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں سیلی (سجک کے) ان خطبات یا ان میں سے بعض خطبات کو پڑھ رہے تھے۔ (جو اب اس کتاب کی صورت میں تیار ہوئے ہیں) اور بالضرور ان پر تنقید کر رہے تھے۔ بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے۔

عله - مقابلہ کیجیے سیلی کی کتاب بالا صفحہ ۲۶۱

عله ایضاً صفحہ ۲۶۱ -

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے اندر حکومت عاملانہ کے متعلق شاہی وپالیمنٹی اختیار کے تضاد میں دوہرے دوہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ نے ایک ایسی بادشاہی کے تمام قانونی ظواہر کو برقرار رکھا جو قانون کے اندر حقیقی عاملانہ اختیار کو عمل میں لاتی ہو اور وضع قوانین میں بھی اس کی شرکت ہو مگر اس کے عقب میں رقوم کا اختیار پارلیمنٹ ہی کے ہاتھ میں تھا اور قانون فدر کی منظوری سے وہ ہمیشہ انکار کرسکتی تھی۔ بادشاہ اس سے واقف تھا، اور وہ پارلیمنٹ سے علانیہ پرخاش کی فکر نہیں کرتا تھا اس نے اپنے حق امحا کو متروک ہوجانے دیا مگر اس کے عقب میں اس کے پاس ایک مہیب قوت شاہی اثر کی تھی۔ بادشاہ نظروں سے اوجھل ہوگیا اور داخلی سیاسیات میں وہ زیادہ اثر انداز نہ رہا مگر جو لوگ اٹھارھویں صدی میں ان تاریخی بے اثر بادشاہوں کے تحت میں رہتے تھے وہ ہمیشہ ان کی ضرورت سے زیادہ اختیار کے شاکی رہتے تھے۔ شاندار انقلاب کے تقریباً سو برس بعد، جارج سوم کے دور حکومت کے وسط میں ایک قرارداد دارالعوام میں یہ پیش ہوئی تھی کہ "تاج کی طاقت بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے، اسے گھٹانا چاہئے"۔ واقعہ یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں بہت ہی تھوڑے زمانہ کے لئے یہ طاقت کسوف کے تحت میں آگئی تھی۔

۱۶۸۹ء کے بعد کے بادشاہوں پر ہم مختصر نظر ڈالتے ہیں۔ ولیم سوم کو کوئی شخص محض رسمی بادشاہ نہیں سمجھتا۔ این خود اپنی مرضی سے وزرا کا عزل ونصب کیا کرتی تھی۔ حکمت عملی کے اہم تغیرات کے تعین میں اس کی مرضی کو خاص الخاص حیثیت حاصل تھی[1]۔ جب ہم جارج اول اور جارج دوم کے دور میں پہنچتے ہیں تو بیشک اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت طویل کے لئے اختیار والپول کے قبضہ میں چلا گیا تھا، مگر فرانسیسی بادشاہوں کے تحت میں بھی ایسا ہوا تھا تا آنکہ لوئس چہاردہم کے بعد تک کے زمانے میں اکثر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اختیارات وزرا کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اصل وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کی عنایت وزیر کے شامل حال تھی[2] اور والپول کے ہمعصر اس معاملہ کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۱۶۸۹ء کے بعد نصف صدی تک بھی

[1] ۔ مقابلہ کیجئے سیلی کی کتاب مذکور صفحہ ۲۷۴۔

[2] ۔ لیکن والپول اور (شاذ) رشلیو یا مازارین کے درمیان مقابلہ اس اعتبار سے ناکمل ہے کہ

نہیں ہے اس کا اظہار نہیں ہوتا کہ دارالعوام کو اس کی خواہش بھی رہی ہو کہ وہ قانون سازی و اجرائے محصول پر قابو حاصل کر کے بادشاہ کو وہ اس وزیر کا تقرر کرنے پر مجبور کرے جسے دارالعوام نے منتخب کیا ہو۔ کوئی وزیر جسے دارالعوام کے فرقۂ کثیر کی تائید حاصل ہو وہ بے شک ایک زبردست وزیر ہوتا مگر یہ خیال تک نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے مقابلے میں زبردست ہوگا [1] ایسا نہیں ہوتا تھا کہ بادشاہ اسے برطرف کرنا چاہے اور اس میں اسے کامیابی نہ ہو۔ ایک دوسرے کی قوت کی آزمائش نہیں تھی، بلکہ یہ خیال ہی نہیں تھا کہ بادشاہ کے ایسا کرنے میں کوئی امر سد راہ ہے، بجز اس کے کہ اسے یہ یقین تھا کہ والپول اپنے کام کو دوسروں کے مقابلے میں خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے، اسے (بادشاہ کو) روپیہ کی جب ضرورت ہوتی وہ مہیا کر دیتا اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وزیر بڑی حد تک اپنی رائے پر چلتا تھا تو مطلق العنان بادشاہی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب والپول کے خلاف اتحاد قوی ہو گیا تو اس سے بادشاہ کا کام ناممکن ہو گیا تھا، چنانچہ اسے ساقط کرنا پڑا مگر اس سے یہ مقصود نہیں تھا کہ بادشاہ کے جدید انتخاب پر کسی قسم کا دباؤ پڑے۔ ہماری تاریخ میں بہت بعید زمانہ تک گاہ بگاہ ایسا ہوا ہے کہ پارلیمنٹ نے بادشاہ پر یہ حکم لگا دیا ہو کہ کن وزرا سے اسے مشورہ نہ کرنا چاہئے [2] یہ اس سے بہت ہی مختلف امر ہے کہ انتخاب کو بادشاہ

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ آخر الذکر کو ان کے اختیارات بادشاہ کے سوا اور کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں حاصل ہوئے تھے برخلاف ازیں والپول کو یہ اختیار ایک حد تک اس وجہ سے بھی حاصل ہوا تھا کہ اس نے دارالعوام کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ پارلیمنٹی وزرا کی جانب میلان اسی وقت سے قایم ہو گیا تھا جب سے رقوم کے اختیار کو اپنے قبضہ میں لیکر پارلیمنٹ کی حیثیت مستقل ہو گئی اگر بادشاہ اس جانب مائل ہو گیا ہو کہ وہ اپنے وزیر اعظم کا انتخاب اس کے پارلیمنٹ پر قابو رکھنے کی قابلیت کا لحاظ کر کے کرے تو پھر اس ـــــ کے بعد اس منزل پر پہنچ جانا کچھ دور نہیں ہے کہ بادشاہ اسے ضروری سمجھنے لگے کہ وہ اس شخص کو وزیر مقرر کرے جسے فرقۂ غالب کے سرگروہ وزیر بنانا چاہتے ہوں

[1] ۔ ایضاً صفحہ ۲۷۶۔

[2] ۔ ایضاً صفحہ ۲۷۶۔

کے ہاتھ سے نکال لیا جائے تاہم جو اسباب وزیر کو بادشاہ سے آزاد کرنے میں ممد ہوئے بلاشک وشبہ اس وقت سے اپنا عمل کرنے لگے جب سے کہ خاندان ہانوور کے بادشاہ انگلستان میں آئے؟ میں سیلی کے ساتھ اس خیال میں متفق ہوں کہ اس نظم کی ترقی کے پہلے بدیہی آثار جارج دوم کے عہد حکومت کے آخری پندرہ برسوں میں ظاہر ہوئے۔

بہرحال کوئی سی صورت ہو یہ اسباب انقلاب کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے، بلکہ وہ اس نہایت ہی مخصوص فریقانہ نظم کے عمل کی وجہ سے پیدا ہوئے جو خاندانِ ہانوور کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوا[۱] اس طریق کار کا خلاصہ یہ ہے کہ وھگ ہمیشہ برسر اقتدار رہیں جسے ہانووری بادشاہوں کو اس وقت تک قبول کرنا پڑا جب تک ٹوریوں نے خود کو "حمایت جیمز" سے صاف نکر لیا۔ اس سے عملاً بادشاہ وھگوں کے ہاتھ میں پڑ گیا اور اس لئے وہ باہم متفق رہنے سے اپنی پسند کے شخص کے اختیار کرنے پر بادشاہ کو مجبور کر سکتے تھے۔

اس طرح برادران پیلہم ۱۷۴۶ء میں اس کے گلے منڈھے گئے لیکن غالباً اس میں کوئی گہرا ورخیال اس امر کا نہیں تھا کہ اصول انقلاب کو اور آگے بڑھایا جائے اور بادشاہ کے اختیار کو اور پست کیا جائے،[۲] تاہم اس سے یہی اثر پیدا ہوا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جارج دوم کو اس امر کا احساس تھا کہ بادشاہی پر آہستہ آہستہ سکتہ کی حالت طاری ہوتی جاتی ہے ایک دفعہ جب اُس نے کسی شخص کو انگریزی دستور کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو اسنے کہا کہ "بادشاہ کے لئے یہ اچھا نہیں ہے"[۳]

مگر جب ہم جارج سوم کے عہد پر پہنچتے ہیں تو پھر شاہی اختیارات کی تجدید ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت بیجٹ کے ایک حاشیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آئینی بادشاہی کے "صحیح خیال" کو جو اس نے انگریزی دستور تک وسعت دی تو اس وقت یہی جارج سوم کے عہد کا دستور اس کے پیش نظر تھا، اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ جارج سوم کے زمانے کے دستور اور وکٹوریہ کے عہد کے دستور کو یکساں تصور کرتا ہے۔ مگر انگریزی

---

[۱] سیلی۔ حسب بالا صفحہ ۲۷۸۔

[۲] ایضاً　۲۷۸ - ۲۸۱

[۳] ایضاً　۲۸۲۔

مصنفین اکثر بظاہر اس سے متخالف غلطی میں پڑ جاتے ہیں اور وہ جارج سوم کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ انقلاب کے قائم کردہ دستور کے خلاف جد و جہد کر رہا تھا، جارج سوم کو جیمز دوم کی کشمکش کے از سر نو زندہ کرنے کا مطلق کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی قانون کو معلق و ساقط کر دے یا اس کی خلاف ورزی کرے یا کسی قانونی ذمہ داری سے بچ نکلنے کی کوشش کرے یا یہ کہ پارلیمنٹ کے تشریعی اختیار کو معرض بحث میں لائے یا اسے کم کرے۔ وہ جس شے کے خلاف جد و جہد کر رہا تھا وہ وگ فریق کا وہ نیا اغتصاب تھا جو ۱۷۴۵ء میں شروع ہوا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس میں آسانی اس وجہ سے ہو گئی کہ قدیم شاہی فریق کا ایک اہم جزو اب بھی ظاہراً یا باطناً خاندانِ اسٹوارٹ سے وابستہ تھا اور جارج دوم کسی ٹوری حکومت پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

جارج سوم کے عہد کے ساتھ وگوں کی اس لابدی ماتحتی کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے اس "نئے اغتصاب" کے مقابلہ میں جس کے ذریعہ سے برادرانِ پلہم جارج دوم کے گلے منڈھ دئیے گئے تھے، کامیابی کے ساتھ جد و جہد کی۔ جیسا کہ سیلی کہتا ہے "آپ اس کے تمام دور حکومت میں یہ دیکھیں گے کہ وہ اس امر پر مصر ہے کہ وزیر اس کا وزیر ہونا چاہیئے" اور بہ حیثیت مجموعی وہ اس میں کامیاب رہا۔ ۱۷۷۰ء سے قبل کے پریشان دور کا خاتمہ لارڈ نارتھ کی وزارت پر ہوا جو قطعاً بادشاہ کا وزیر تھا اور جو بارہ برس تک برسر اقتدار رہا، پریشانی کا دوسرا مختصر دور پٹ اصغر کی وزارت پر ختم ہوا کہ وہ بھی بادشاہ کے حسب مرضی تھا اور یہ وزارت اٹھارہ برس تک قائم رہی اور پٹ کے انتقال کے بعد فریق ثانی صرف ایک برس عہدہ پر قائم رہ سکا"[عہ]

بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ پٹ کو ملک کی تائید حاصل تھی اس لئے وہ فی الحقیقت بادشاہ سے آزاد تھا، اور اس کو منتخب کر کے بادشاہ نے درحقیقت گویا اپنے کو ایک مالک کے تحت میں دے دیا تھا۔ جو شخص ایسا خیال کرتا ہو اس سے میں یہ سفارش کروں گا کہ وہ اس تحریر کو پڑھے جس کا کچھ اقتباس لارڈ روزبری نے شایع کیا ہے اور لارڈ موصوف اس قسم کے معاملات میں سند کا رتبہ رکھتے ہیں۔ یہ

عہ۔ سیلی حسب سابق صفحہ ۲۰۳۔

دارالعوام کی ایک کارروائی منعقدۂ یکم مئی ۱۷۸۸ء کا خلاصہ ہے، جو حال میں پٹ کے ایک معتمد خانگی کے کاغذات میں ملا ہے۔ اس میں "تاج کے فریق" کا اندازہ ۱۸۵ ارکان کا کیا گیا ہے۔ "یہ وہ فریق ہے جو غالباً اعلیحضرت کی حکومت کی تائید ہر ایک وزیر کے تحت میں کرتا بشرطیکہ وہ بالتخصیص غیر مقبول نہ ہو، ایوان کے آزاد یا بے تعلق ارکان کا اندازہ (۱۰۸) کا ہے"، فاکس کے فریق میں (۱۳۸) اشخاص تھے اور پٹ کے فریق میں ۵۲۔ اس غیر خوشکن اندازہ میں اس رائے سے مزید کمی ہوگئی ہے "کہ اگر کوئی نئی پارلیمنٹ ہوا اور اس میں مسٹر پٹ وزیر نہ رہیں تو اس آخری فریق میں سے بیس سے زائد اشخاص منتخب نہ ہوں گے"[1] بہر حال اسی زبردست اثر کی وجہ سے جس کی ایسی حیرت انگیز شہادت اس تحریر سے ملتی ہے، "جس فریق نے جارج سوم کے پیشرو کو ذلیل کیا تھا اسے اس نے اس طرح اپنے سے دور کر رکھا تھا۔ برادران پلہم کا فریق جس کی رہبری نیوکاسل کے بعد راکنگھم اور راکنگھم کے بعد فاکس کر رہا تھا، اور جو اس عہد میں محض "وھگ فریق" کے نام سے مشہور رہا تھا، وہ بہت طویل وقفوں کے بعد کبھی نہ کبھی لڑجھگڑ کر اقتدار حاصل کر لیتا تھا بادشاہ کو اگر کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا تو وہ کچھ دیر کے لئے اسے برداشت کر لیتا تھا مگر ہمیشہ اعتراض کے ساتھ ایسا کرتا تھا۔ وہ اس کے وزیر نہیں تھے اور اس کی قطعی رائے یہ تھی کہ اسے اپنی مرضی سے اپنے وزیروں کے تقرر کا حق حاصل ہے۔ لہذا وہ ترشروئی کے ساتھ انھیں قبول کرتا تھا، ان پر گہری نظر رکھتا تھا، اور اگر وہ پوری مجلس وزرا کا تقرر نہیں کر سکتا تھا تو کسی نہ کسی طرح سے جد و جہد کر کے اس میں تھرلو یا ایلنبرا کے ایسے اپنے دو ایک نمائندے تو مقرر ہی کر دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے موقع کی تاک میں لگا رہتا تھا جو بالعموم سال کے اندر ہی اندر آجاتا تھا اور پھر وہ انھیں برطرف کر کے دوبارہ اپنی پسند کی وزارت منتخب کر لیتا تھا"۔

تقریباً نصف صدی تک جارج سوم اس قابل رہا کہ وہ انگریزوں کے نظم کو اس حالت پر قائم رکھے مگر جارج چہارم اور ولیم چہارم کے عہد میں پھر پارلیمنٹ کے

[1] سوانح عمری پٹ Pitt مصنفہ لارڈ روزبری صفحہ ۸۷

اور وزرا کا انحصار رعیت کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ کینگ بزور جارج چہارم پر مسلط ہو گیا اور ارل گرے کے متعلق اگر قطعاً یہ نہ کہا جائے کہ وہ ولیم پر مسلط ہو گیا تھا، تو کم از کم اتنا تو صحیح ہے کہ اس کے تقرر میں قوم کے حصے کے ساتھ بادشاہ کا حصہ ایک اور سو کی نسبت رکھتا تھا۔[1]

۴۔ قانون اصلاح کے بعد ۱۸۳۴ء میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وزرا کے تقرر کا اختیار بادشاہ کے قبضے سے نکل گیا۔ "ولیم چہارم" "اصلاحی وزارت" سے تھک گیا تھا، اس نے لارڈ النتھارپ کے ایوان بالائی میں جانے کے موقع سے فائدہ اٹھا کر بقولِ خود "ایک نیا انتظام کیا"، یعنی موجودہ وزرا کو برطرف کر دیا اور سر رابرٹ پیل کو وزارت مرتب کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت یہ ظاہر ہوا کہ انگریزوں کا دستور سیاسی نامحسوس طور پر کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ سر رابرٹ پیل کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا وہ ناقابلِ حل تھا۔ ایوان نے اس پر تو کچھ رد و قدح نہ کی کہ بادشاہ کو خود اپنا وزیر مقرر کرنے کا اختیار ہے یا نہیں بلکہ اس نے اس وزیر کا ہر طرح پر مناسب اعزاز و اکرام کیا، مگر جب اس نے اپنی حکمت عملی کو ایوان کے سامنے پیش کیا تو وہ کثرتِ رائے کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہا۔[2]

اس کشمکش کے تفصیلات پر نظر ڈالنا بھی دلچسپ ہوگا۔ قوم کی منظوری سے انکار کرنے کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، یہاں تک کہ ہیوم کی یہ تحریک بھی کہ اس منظوری کو صرف تین ماہ کے لئے محدود کر دینا چاہئے ساقط ہو گئی، عدم اعتماد کی کوئی تحریک پیش نہیں ہوئی۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر پیل اپنے کام کو صرف عاملانہ فرائض تک محدود رکھتا اور قانون سازی کے کام کو دونوں ایوانوں کے لئے چھوڑ دیتا، تو اس حالت میں کیا صورت واقع ہوتی مگر اغلب یہ ہے کہ وہ استعفا دینے پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن اس نے اپنی ایک مخصوص روش کا اختیار کرنا یعنی تشریعی تجاویز کا پیش کرنا ضروری سمجھا، قوانین دیوانی کی اصلاح و ترقی، قانون کلیسائی کی اصلاح، آئرلینڈ کے مسئلہ عشر کا انتظام، انگلستان میں عشر کی تبدیل

---

[1] سیلی، حسب بالا صفحہ ۲۸۳ - ۲۸۴ —

[2] ایضاً صفحہ ۲۸۴ - ۲۸۵ —

رفہی ہکلیسا کی حقیقی خرابیوں کی ہو قوفی، منحرفوں کی ان : تکالیف کار فہرادجو جائز شکایات پر مبنی ہوں،، ان امور کو اس نے اپنی حکمت علی کے طور پر چلانا چاہا اور اس طرح گویا اس نے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لی کہ اگر کثرتِ رائے اِس کی حکمتِ عملی کو قبول نہ کرے تو اسے استعفا دینا پڑے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو تغیر واقع ہوا وہ قطعی صورت میں کیا تھا فرض کیجئے کہ اُس قسم کا کوئی تقرر جارج دوم کے عہد میں ہوا ہوتا تو وزیر اس مصیبت سے بچنے کیلئے کیا صورت اختیار کرتا؟" جواب یہ ہے کہ "اٹھارھویں صدی میں وزیر کو من حیث الوزیر کثرتِ رائے حاصل ہو جاتی تھی،،[1] یہ ضروری نہیں تھا کہ رشوت سے ہی ایسا ہو، پیل نے "قانون محصول کا غذاتِ مہور،، کی تنسیخ کے وقت جو تقریر کی اس کا مقابلہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ "معزز رکن ہم سے یہ نہیں کہسکتے کہ چونکہ ہم نے خود یہ قانون منظور کیا اس لئے ہم اس کے ویسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے وہ خود ہیں، ایسا نہیں ہے، ہم نے ان کے وزیر ہونے کے اعتماد پر اسے قبول کر لیا، میری تمنا یہ ہے کہ ایوان کی ایسی عادت نہ ہوتی مگر اب تو ہے، خود صدارت مآب بھی اکثر محل سنٹ جیمز کی طرف نگاہ لگائے رہتے ہیں،،۔ مگر مناصب و وظائف کا اثر اس "عادت،، کا زبردست پشتیبان تھا،[2] دونوں ایوان یہ جانتے تھے کہ وہ قانون کے ذمہ دار ہیں، اور پیٹ کی تقریر تو ایک وکیل کی سی تقریر ہے، سیلی کے الفاظ میں یوں کہسکتے ہیں کہ "نمایندوں کے دل میں ہنوز یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ

---

[1]. سیلی حسب بالا صفحہ ۲۸۵۔

[2]. مقابلہ کیجئے ہیوم کا خطبۂ ششم "خود مختاری پارلیمنٹ،، (شایع شدہ ۱۷۴۲ء) "بادشاہ کے قبضے میں اتنے عہدے ہیں کہ جب اسے ایوان کے دیانتدار و بے غرض حصہ کی تائید حاصل ہو جائے تو ہمیشہ کل ایوان کی قرارداد پر اتنا قابو تو ضرور ہی رکھے گا کہ قدیم دستور کو خطرے سے محفوظ رکھ سکے پس ہم اس اثر کا جو نام چاہیں رکھیں، ہم اسے "رشوت دہی" اور دربار داری،، کے مذموم ناموں سے یاد کر سکتے ہیں مگر دستور کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ بہ تغیر کیف و کم اس کا کچھ نہ کچھ قائم رہنا لابدی اور انگریزوں کی مخلوط حکومت کی بقا کے لئے ضروری ہے" سیلی کا بھی مقابلہ کیجئے (۱۷۸ـ)

ملک کی حکومت انھیں تفویض کی گئی ہے،" (اگر حکومت میں وضع قوانین بھی داخل ہو)
مگر میرے خیال میں تو اس میں بہت کچھ مبالغہ آمیزی ہے۔ اس سے بھی بڑھکر وہ یہ کہتا ہے کہ "ان کی عادت یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ملک پر حکومت کرنا بادشاہ کا کام ہے اس لئے جب اسے یہ منظور ہوتا کہ وہ اپنے وزرا کے ذریعہ سے یہ واضح کردے کہ عاملانہ حکومت کے لئے بعض کارروائیوں کو وہ ضروری سمجھتا ہے تو ارکان یہ خیال کرتے تھے کہ ان کارروائیوں کی ضرورت کے لحاظ سے انھیں یہ استحقاق ہے کہ وہ ان کارروائیوں کو بادشاہ کے اعتماد پر قبول کرلیں، وہ اپنے کو اس حد تک پابند سمجھتے تھے کہ وہ یہ دیکھیں کہ ان کارروائیوں کا اثر قوم یعنی رائے دہندوں پر کیا پڑتا ہے" ؎۱

یہ اس صورتِ حال سے بہت ہی قریب ہے جو شہنشاہِ ولیم کو رشتاگ کے ساتھ ہے، اس مثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی دستوری بادشاہی کے قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا انحصار رشوت پر ہو، اگرچہ اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں یہ کام واقعاً رشوت وہی کے ذریعہ سے انجام پاتا تھا۔ جرمنی میں ایسا نہیں ہوتا، مگر پارلیمنٹی رائے کے سوا اپنے وزیروں کی آزادانہ پسندیدگی کے لئے بادشاہ کے مفیدِ مطلب اور بھی تائیدیں حاصل ہیں۔ یہ خیال قائم ہے کہ اگر بادشاہ پر ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑے تو شاہی کے روایات اور فوج کی وفاداری کی وجہ سے بادشاہ پارلیمنٹ سے مقابل پیش آسکتا اور فتح حاصل کرسکتا ہے۔ یہ غور و فکر کے لئے ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ دستوری بادشاہی جو جرمنی میں مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور اسکنڈینوی سلطنتوں میں کشاکش کر رہی ہے، اس کا آئندہ حشر کیا ہوگا، مگر پیشینگوئی نہ میرا فرض ہے نہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔

انگلستان کے تغیر کی نسبت ہم متعدد اسباب تسلیم کرسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ جارج سوم کے عہد میں بتدریج شاہی اثر کو زوال ہوتا گیا اس کے خلاف اس نے بڑی ہی استقامت سے جد و جہد کی مگر جارج چہارم بالطبع اس کے مقابلے میں بے بس ہوگیا، فریق راکنگھم کے وہگوں نے شاہی سرپرستی کو گھٹا دیا تھا اور اغلب یہ ہے کہ قوم کی دولت

؎۱ ۔ سیلی حسب بالا صفحہ ۲۸۷۔

و آبادی کی وسیع ترقی نے دربار کے اضافی اثر کو کم دیا تھا،[1] خود جارج چہارم کے زمانے کے کثیر العمل تجارتی و صنعتی انگلستان میں پارلیمنٹ کے ارکان درباری نہیں رہے تھے،[2]
پارلیمنٹ کے تشریعی کاموں کا بڑھ جانا بھی ایک دوسرا سبب ہوا، پس جب وہ قانون سازی وزیر کا خاص فرض ہو گیا اور یہ قانون سازی، جانشینی شاہی، مدعیان سلطنت اختیارات، حلف غیاب اور دوسرے ایسے مسائل کے متعلق نہیں تھی جن سے بادشاہ کو دلچسپی ہو بلکہ یہ توضیع قوانین، کارخانوں، صنعت گاہوں، بنک، محصول درآمد و برآمد اور جہاز رانی سے متعلق ہو گئی تو پھر وزیر کا طبعی میلان یہی ہو گیا کہ وہ پارلیمنٹ کا وزیر ہو جائے (کیونکہ یہ ایسے مسائل تھے کہ تاج کے روایات بادشاہ کو اس پر آمدہ نہیں کرتے تھے کہ وہ ان قوانین میں پر زور مداخلت کرے)، اور اس میلان کا مقابلہ کرنے کے لئے جارج چہارم بلکہ ولیم چہارم سے بھی مختلف طبیعت کے بادشاہ کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں جارج سوم کے ان بیٹوں اور خاصکر جارج چہارم کی شخصی غیر ہر دلعزیزی اور بد نامی کو بھی جارج سوم کے عہد کے یاران شاہی کی شخصی وفاداری کو زائل کرنے میں کچھ کم اہمیت نہیں تھی۔ سب سے آخری امر یہ ہے کہ خیالات کی تحریک اور ابتدائی اور شخصی دستور کے درمیان فرق کے صریح احساس کی عدم موجودگی نے اس تغیر میں سہولت پیدا کر دی لیکن اب یہ صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی، اور اگر خاندان ہونیور کا کوئی بادشاہ پارلیمنٹی وزیر اعظم کے قبول کرنے پر مجبور ہو تو اسے یقیناً یہ علم ہو جائیگا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

---

[1] سیلی، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۸۹۔

خطبۂ بست و ہشتم

انیسویں صدی کی دستور سازی

۱۔ سابق خطبات میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جدید مملکت کا جیسا تصور قائم کرنے پر ہم متفق ہوئے ہیں (خاصکر از منۂ وسطیٰ کی مملکت کے مقابلے میں)، اس کی تکوین کی پہلی منزل بالطبع اس مطلق العنان شاہی کے میلان کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی جیسے ہم سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں، دیکھتے ہیں۔ مملکت کے جدید تصور کیلئے یہ لازمی معلوم ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی طاقت ہونا چاہئے جو قوانین کے بنانے کے قابل ہو اور چونکہ وہی طاقت قانون کا منبع و مخزن ہوگی اس لئے وہ خود کسی قانون سے محدود نہ ہوگی اور جدید مملکت لاحکومتی میں نہیں بلکہ معمولی حالت میں، یہ بھی لازمی تھا کہ یہ طاقت سب سے بالا و برتر ہو اور یہ کہ اہلِ ملک کی بہت ہی کثیر تعداد کی کامل اطاعت اسے حاصل ہو اور ان کی اس اطاعت کے ذریعے سے وہ اس قابل ہو کہ افراد یا جماعات کی علانیہ مقاومت کو کچل دینے کے لئے وہ قوم کی منضبط قوت کو کام لا سکے، اور میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس تخیل کو کم و بیش موزوں و مناسب حد تک عمل میں لانے کا آسان ترین طریقہ یہی تھا کہ اس طاقت کو شاہی کی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور تمام اعلیٰ اقتدار ایک شخص واحد کے سپرد کر دیا جائے، اور اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہلِ فکر و اہلِ عمل دونوں قسم کے اشخاص کی ایک اہم جماعت سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک اس خیال پر جمی ہوئی تھی کہ مطلق العنان بادشاہی سے نظم و امن کا جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اور طوائف الملوکی کی جو خرابیاں اس سے درفع ہوتی ہیں، ان کا نفع اس طرز حکومت کے نقائص سے بڑھ جاتا ہے۔

جیسا کہ میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں، مطلق العنان بادشاہی کی جانبدارانہ رائے پر خیالات کی ان ترقیوں کا بھی لازما اثر نہیں پڑا جنھوں نے بتدریج بادشاہوں کو اس قدیم نیم جاگیری تخیل سے نکالکر کہ ملک پر انھیں ایک طرح کی مِلک حاصل ہے، ان میں جدید خیالات پیدا کر دئے تھے۔ درحقیقت انقلاب فرانس سے عین ماقبل ہی ۱۷۶۶ء میں شاہی مہر بردار نے اس عدالتی جماعت کے سامنے جسے پیرس کی پارلمان کہتے تھے، دعوی کے ساتھ یہ کہا کہ "فرانس کے اندر اقتدار اعلی کا محل صرف بادشاہ کی ذات ہے، اور وہ اس کے استعمال کے لئے صرف خدا کو جواب دہ ہے، قوانین کے وضع کرنے کا اختیار آزادانہ و غیر قابل تقسیم طور پر کلیتہً اسی کے ہاتھ میں ہے" مگر شاہی مہر بردار نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی نہیں کی تھی۔ لوئی چہاردہم کے عہد میں اس بیان سے بہت ہی شد و مد کے ساتھ رائج الوقت رائے کا اظہار ہوتا ہے مگر جب زمانہ ترقی کر گیا اور فرانس میں آزادانہ تنقید کو ترقی ہوئی اور اس کا اثر یورپ کے دوسرے حصص میں بھی پہنچا تو (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) تعلیم یافتہ رائے کا میلان شدت کے ساتھ دوسری جانب ہو گیا۔ اس انتقاد کی نسبت یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس کی ابتدا مذہبی حکمرانی سے ہوئی (اور اس کے بعد دنیاوی حکمرانی بھی اس کی زد میں آگئی) اگرچہ فی الواقع ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ جس انقلاب نے نئے نظم سلطنت کا راستہ کھول دیا اس کا واحد سبب صرف یہی سیاسی خیال کی رو تھی تاہم مجھے اس امر میں شک نہیں کہ رائے کا یہ میلان بھی ایک حقیقی اہم عنصر تھا (اور ان مالیاتی اسباب پر تو میں خصوصیت سے نظر ڈال چکا ہوں جنھوں نے اس میں اہم اتحاد عمل کیا اور جن کے وجود میں آنے کا سبب وہ خاص طرز تھا جس طرز پر ترقی کر کے فرانس جاگیریت سے نکلا تھا) یہ امر لحاظ رکھنے کا ہے کہ مطلق العنان بادشاہی میں دو مختلف اقسام کے نقائص ہیں، صرف یہی ایک نقص نہیں ہے کہ وضع قوانین کا اعلی اختیار ایک فرد واحد کے ہاتھ میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قوم کے مفاد کے لئے نہ استعمال کرے، بلکہ ایک مزید نقص یہ بھی ہے کہ چونکہ قوانین کا عمل میں لانا بھی اسی شخص کے اعلی اقتدار کے تحت میں ہوتا ہے اس لئے اگر اپنی خواہشوں یا کسی کی رعایت کے خیال سے وہ خود اپنے ہی قوانین کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو کوئی کافی ضمانت

اس امر کی نہیں ہے کہ وہ ان قوانین کا پاس ولحاظ رکھے گا۔ ان دونوں امور کا
فرق اہم ہے، کیونکہ بالفاظ جی سی لیوس، "دیدہ ودانستہ، ہمہ گیر وبالقصد
جبر ستانی وناانصافی اور بے خیالی، مخصوص واتفاقی جبر ستانی وناانصافی میں بڑا
فرق ہے۔ بہت سی حکومتیں جو عادتاً اپنی رعایا کے ساتھ نہایت ہی سخت گیری کا
برتاؤ کرتی ہیں، وہ بھی اس سے شرمائیں گی کہ جن اصولوں کی رہنمائی میں وہ
فی الواقع چل رہی ہیں انھیں قانون کی شکل میں لاکر اپنی رعایا اور تمام مہذب دنیا
کے سامنے شایع کریں"[1]

پس اگر ایک ہی شخص کو قوانین کے وضع کرنے اور ان قوانین کے عمل
میں لانے کا اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو اور اگر اس پر کم از کم اتنا ہی اعتماد ہو کہ وہ خود
اپنے ہی قوانین کی پابندی کرے گا تو بھی بہت غنیمت ہے۔ اس سے ہمیں اس
جانب رہبری ہوتی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی بحث سے علیحدہ ہو کر بھی تشریعی فرائض
کو عاملانہ وعدالتی فرائض سے اس طرح پر علیحدہ کرنے میں صریحی نفع ہے کہ جو لوگ
قوانین کو عمل میں لاتے ہیں وہ بھی ان قوانین کی اطاعت کے اتنے ہی پابند ہوں
جتنے وہ لوگ پابند ہوں جن پر وہ ان قوانین کا نفاذ کرتے ہیں، اور اس مسئلے کے
طے کرنے کے لئے کہ آیا انھوں نے قانون کی اطاعت کی ہے یا نہیں کی ہے یہ ہمیشہ
بے لاگ ججوں کے سامنے آنا چاہئے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اقتدار اعلیٰ جب قوم یا قوم
کی نمائندہ جمعیت کے ہاتھ میں ہو اس وقت بھی اقلیات کی حفاظت کے لئے
فرائض کی یہ تقسیم کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی اعلیٰ جمعیت فرد واحد سے
کم ظالمانہ نہ ہو۔ عمومی ادارات کو جس واحد مفہوم میں قطعی طور پر بادشاہی کے بہ نسبت
"زیادہ آزاد" کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ مفہوم ہے کہ بادشاہی کے تحت میں حصۂ کثیر
پر ظلم ہو سکتا ہے برخلاف ازیں عمومیت کے تحت میں اس ظلم کا تختۂ مشق صرف حصۂ قلیل ہو گا[2]

[1] حکومت توابع، تحقیقات ابتدائی Government and dependences, Preliminary ص ۳

[2] مقابلہ کیجئے۔ مبادی سیاسیات باب بستم پیرا ۲۔

دستورسازی کی جس صدی میں ہوکر اس وقت ہم گزر چکے ہیں اس کے ابتدائی حصہ میں ان صداقتوں کا عام طور پر تسلیم کیا جانا زیادہ تر مونٹسکیو کا زیر بار احسان ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس نے یہ معلوم کیا کہ یہ تقسیم اختیارات اس کے وقت کے برطانوی دستور میں نمایاں حد تک عمل پذیر ہو چکی ہے اور اسی کے اثر نے یہ کر دکھایا کہ دنیا کی نگاہوں نے اس دستور کو نمونہ بنا لیا۔ مونٹسکیو نے برطانوی دستور کے جس خاص وصف کی مدح سرائی کی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ حکومت کے تشریعی عاملانہ و عدالتی ان تین فرائض کو مختلف الترکیب اور زیادہ تر جداگانہ و آزاد جماعتوں کو سپرد کرنے سے اس دستور نے خلاف قانون ظلم و زیادتی سے افراد کی آزادی کو محفوظ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی جمعیت کو جو قوم کی نمائندہ تھی جماعت مقننہ کا ایک حقیقی جزو بنا دیا۔ اس دستور سے کم و بیش یہ اطمینان ہو گیا کہ کم از کم قوم کے ایک اہم جزو کی پسندیدگی کے بغیر کوئی قانون منظور نہ ہوگا اور خاصکر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے گا۔

مونٹسکیو کے زمانے کے انگریزی دستور میں بلکہ درحقیقت "روح القوانین" کی اشاعت کے اسی برس بعد تک، نمایندگی کے اصول پر بہت ہی ناکمل طور پر عمل ہوتا تھا، اس نمایندگی کی نسبت اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک حد تک اس کی خرابیوں کا انسداد ایک وسیع اور مناسب حق رائے دہی سے ہو گیا ہے، تو پھر اس صورت میں ایک ایسا دستور حاصل ہو جاتا ہے جس میں اگر عمومی اقتدار اعلیٰ کا تخیل تمام و کمال عمل پذیر نہ ہو تو پھر بھی اتنا تو ضرور ہے کہ بالواسطہ شکل ہی سے سہی مگر ایک حد تک وہ اس طرح حاصل ہو گیا ہے کہ وضع قوانین و اجرائے محصول پر نمایندہ جمعیت کا اقتدار قایم ہے اور عاملانہ حکومت پر بایں طور روک قایم ہو گئی ہے کہ اس جمعیت سے رقوم کی منظوری لینا ضروری ہو۔ اس کے ساتھ ہی بشمول جوری عہدہ داران عدالتی کی آزادی کا، اور مقدمے سے پیشتر کسی کے گرفتار کرنے اور قید کرنے کی بابت حکومت عاملانہ کے اختیار کی قطعی تحدید سے قانون کی حکومت اور افراد ملک کی آزادی کی موثر حفاظت مستحکم ہو گئی تھی۔

پس یہ ایک مختصر بیان سیاسی ارتقا کے اس آخری نتیجے کا ہے

جو مغربی یورپ کی سلطنتوں میں سے بیشتر میں حاصل ہو سکا ہے۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں یہ طرز ایک بہت ہی وسیع الاختلاف طرز ہے، اور جس تخیل کا ابھی ابھی خاکہ کھینچا گیا ہے اس کے عملی حصول کی بابت بھی اُس کے مدارج میں بہت فرق ہے۔ اجمالاً یہ کہ انگلستان و جرمنی گویا وہ دو نقطہائے قطبی ہیں جن کے اندر ہی اندر یہ اختلافات وتنوعات واقع ہوتے ہیں اور یہ صرف حکومت کی شاہی شکل تک محدود نہیں ہے، اس کے سب سے زیادہ حقیقی خصایص جمہوری فرانس کی موجودہ حکومت میں پائے جاتے ہیں [۱]۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے دستور میں مونٹسکیو اور روسو دونوں کے تخیل معقول حد تک عمل پذیر ہو جاتے ہیں، مگر مجھے اس میں یہ اضافہ کرنا چاہئے کہ روسو میری اس رائے سے منکر ہو جاتا، وہ اسے لازمی خیال کرتا کہ قوم کے اقتدار اعلیٰ کا نفاذ براہ راست ہونا چاہئے نہ کہ نمایندوں کے توسط سے بالواسطہ، وہ کہتا ہے کہ ”انگلستان کے لوگ صرف پارلیمنٹی انتخابات کے اوقات میں آزاد ہوتے ہیں،“ [۲]

میں اسے اس وجہ سے بیان کرتا ہوں کہ زمانۂ حال کی دو قوموں نے جن میں عمومی خیالات پوری طرح ترقی کر گئے ہیں، انھوں نے روسو کے تخیل کی جانب بہت اہم قدم اٹھائے ہیں، اول تو ممالک متحدہ امریکہ ہے جہاں کے دساتیر کی رو سے معمولی قانون سازی کو محدود کر دیا گیا ہے، دوسرے سوئزرلینڈ ہے جہاں مراجعہ جاری ہے یعنی نمایندگان جو قوانین وضع کرتے ہیں انھیں جملہ رائے دہندگان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دونوں وفاقیتیں ہیں اور سردست مجھے وحدانی مملکتوں کی دستور سازی سے بحث ہے جو وفاقی مملکتوں سے بالکل ممیز ہیں۔ میں تفصیل کے ساتھ اس کا بیان

---

[۱]۔ مقابلہ کیجئے میری تصنیف مبادی سیاسیات Elements of Politics باب بست و دوم فقرہ ۵۔

[۲]۔ انگریزی قوم کا خیال ہے کہ وہ ایک آزاد قوم ہیں، لیکن نہیں بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے اس لئے کہ وہ صرف پارلیمنٹ کے انتخاب عام میں حصہ لینے کے زمانے میں آزاد ہوتے ہیں۔ ”معاہدۂ معاشرتی“ کتاب ۳، باب ۱۵۔

نہیں کروں گا، اپنے حدود کار کے اندر میرا ایسا کرنا، بیکار تاریخوں کا طومار اور بے کیف بیانات کا جمع کرنا ہے، مگر میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فرانس اس میں پیش پیش تھا اور انیسویں صدی کے وسط تک کے تجربات میں وہی سب سے زیادہ بیباک اور دوسری سلطنتوں پر اثر اندازی میں سب سے بڑھا ہوا تھا یعنی اصلاح و انقلاب کے فریق کو جوش و تحرک فرانس ہی سے حاصل ہوتا تھا۔ انقلاب کے نازک زمانے سے متعلقہ مختصر الحیات آئینی تجربے، قومی مطلق العنانی کی طرف گامزنی، اس مطلق العنانی کے خلاف یورپ میں ردعمل، اور فرانس میں یورپ کے دباؤ سے رجعت شاہی، یہ سب منزلیں یکے بعد دیگرے طے ہوتی رہیں مگر ان سب کے بعد بھی انیسویں صدی کے ربع ثانی میں فرانس سیاسی تخیلات کے میدان کا خاص مرکز اثر بن گیا تا آنکہ (۱۸۴۸ء کی) دوسری جمہوریت کے بعد پھر دوسری شہنشاہی قائم ہوگئی، اس وقت مغربی یورپ میں فرانسیسی طریقوں کے متعلق یہ عام بدگمانی پھیلی کہ ان طریقوں سے آزادی اور نظم و امن کے متحد کرنے کے غایت المرام تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور تیسری جمہوریت (۱۸۷۰ء - ۱۸۷۵ء)، جس کی بنا تباہی و ابتری پر رکھی گئی، اسے قرب و جوار کی قومیں توصیف آمیز ہمدردی سے دیکھنے کے بجائے ہنوز زیادہ تر سرد مہری و استعجاب سے دیکھ رہی ہیں۔

۲۔ اس تحریک کے ساتھ انگلستان کا تعلق کلیتہً مختلف نوعیت کا رہا ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، انگلستان نے حکومت کی اس شکل کا خاص نمونہ مہیا کیا جو اس تمام کشمکش و تصادم کے بعد انجام کار میں نتیجہ کے طور پر حاصل ہوئی، اور جیسا کہ ہمیں اس خیال کے اظہار کا موقع مل چکا ہے، قبل ازیں کہ یہ انگریزی دستور نمونے کے طور پر کام میں آئے خیالات کی اس تحریک میں اسے جگہ مل چکی تھی جس کا مرکز فرانس تھا کیونکہ اس تحریک میں ایک خاص عنصر وہ مقابلۂ باہمی ہے جسے بعض بااثر فرانسیسی مصنفوں نے (جن میں اول والٹیر اور بعد ازاں مونٹسکیو کا درجہ ہے) فرانس کی فقدان آزادی اور اس آزادی کے درمیان قائم کیا ہے جسے انہوں نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں واقعاً انگلستان میں دیکھا تھا۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برطانی دستور (بالخصوص مونٹسکیو کے زیر اثر) واقعہ میں نکالکر

تخیل کے عالم میں داخل کر دیا گیا، مگر اس طرح جو تخیل قائم کیا گیا وہ اس وقت کے واقعہ کی ٹھیک ٹھیک نمایندگی نہیں کرتا تھا، اور جیسا کہ ہم آخری خطبہ میں دیکھ چکے ہیں اس وقت واقعہ کی جو صورت ہے اس سے بالکل ہی غیر مشابہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب کا آخری نتیجہ اس انقلاب کے اصل مقصد سے بالکل مختلف ہوا۔

آخری نتیجہ اس نظم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جسے بیجٹ "دو کابینی حکومت" کہتا ہے، جس میں عاملانہ اختیارات عملاً دونوں ایوانوں کی ایک ذیلی مجلس کے ہاتھ میں ہیں جس کا انتخاب ان کا سرگروہ یعنی وزیر اعظم کرتا ہے اور جو اپنی باری میں اس کا تعین معمولی حالات میں عملاً دار العوام کی کثرت رائے سے ہوتا ہے جو اسے اور اس کے شرکا کو جب چاہے برطرف کرا دے، بشرطیکہ وہ انتخاب کنندگان کی جانب رجوع کرے۔ وزیر اعظم اس ایوان کے بالکلیہ مطیع و منقاد ہو جانے سے اس طرح محفوظ ہے کہ اسے ایوان کو برطرف کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ موروثی بادشاہ اور دار الامراء ان دونوں کے اختیارات بھی غیر اہم نہیں ان کا درجہ محض ثانوی ہے، امرا اپنے ایوان کے ذریعہ سے وضع قوانین کو روک سکتے ہیں، لیکن عملاً وہ اس کا دعوی نہیں کرتے کہ وہ کسی مسئلہ کے اہم خصوصیات پر (جس کے متعلق دار العوام کی رائے انتخاب کنندگان کی قطعی کثرت رائے سے صریحاً و حتماً ہم آہنگ ہو) دار العوام سے بہ تقابل پیش آئیں گے، وہ صرف ضروری تاخیر، غور مکرر اور انتخاب کنندگان کی جانب رجوع کرنے کے دعویدار ہیں۔ بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے ہر معاملہ کا علم ہو اور ہر معاملہ پر اس سے گفتگو کی جائے اور اس گفتگو ہی کے ذریعہ سے وہ اہم فیصلوں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ نیز اسے یہ اہم اختیار بھی حاصل ہے کہ دار العوام کو برطرف کر دے اور اس طرح یہ تحقیق کرے کہ آیا کابینہ یعنی دار العوام کے فریق غالب کو حقیقتاً قوم کی تائید حاصل ہے یا نہیں[1] مگر حکمت عملی کی رہبری وزیر اعظم و کابینہ کے ہاتھ میں رہا ہے۔ موجودہ

---

[1]۔ (۱) یعنی بادشاہ کے لئے یہ امر خلاف آئین نہ ہوگا کہ وہ اپنے وزرا کو اس حالت میں بھی

امور متنازعہ فیہ میں یہ سب باتیں مسلمہ ہیں۔

مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حکومت کی یہ شکل اُس شکل سے بالکل ہی مختلف ہے جس کا پیدا کرنا ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے مقصود تھا، اور جس سلسلۂ عمل سے تدریجاً یہ صورت واقع ہورہی تھی اسے ایک مدت تک دقیق النظر مبصروں نے بھی نامکمل طور پر محسوس کیا تھا۔ انقلاب کا مقصود یہ تھا کہ قانون سازی میں پارلیمنٹ کو فوقیت حاصل ہوجائے مگر اس کا یہ مقصود نہیں تھا کہ عملاً دارالعوام کے فریق غالب کو حکام عاملانہ کے مقرر کرنے کا اختیار دیدیا جائے بلکہ یہ بھی مقصود نہیں تھا کہ دارالعوام کو یہ قدرت حاصل ہوجائے کہ وہ اپنے وضع کردہ قوانین کو بادشاہ پر (جس کی منظوری ہنوز باضابطہ طور پر مسودات پر لازمی تھی) بزور عاید کرسکے۔ لاک کی صاف رائے یہی ہے (اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ملکی حکومت پر اس کی تصنیف کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں ۱۶۸۸ء کے انقلاب کا نظریہ بیان کردیا گیا ہے) لاک کے نزدیک، بادشاہ حکام عاملانہ کا اصلی سرگروہ ہے، نظم ونسق میں اسے حقیقی فوقیت حاصل ہے اور جس پر ہیچ عضو کا کام قانون سازی ہے اوہ حقیقتاً اس نظم کا ایک رکن ہے۔ لاک کی تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ وہ قانون سازی میں فایق نہیں ہے، یعنی اس کا فرض یہ ہے کہ جو قوانین پارلیمنٹ متعین کرے ان کی تصدیق کردے، اور اگر اس قسم کے قانون کو وہ معلق یا معطل کردے تو یہ گویا اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

اور اگر آپ بادشاہ کے حقوق کے متعلق بلیکسٹن (۱۷۶۵ء) کے بیان کو دیکھیں تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس کی نسبت نہ صرف سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ جنگ وصلح،

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ برطرف کردے جبکہ انھیں مجلس نیابتی میں کثرت رائے حاصل ہو، اور ان کے بجائے دوسرے وزیر مقرر کرے جو بعدازاں اس امید میں مجلس کو برطرف کردیں کہ نئے انتخاب سے پارلیمنٹ کے اندر فریقوں کا توازن بدل جائیگا،،۔ ملاحظہ ہو مصنف کی ’’مبادی سیاسیات،، باب بست ودوم صفحہ ۴۳۹ (طبع ثانی) اس بحث پر اسی خطبہ کے دوسرے حصص میں جو بحث کی گئی ہے، ان کے متعلق بھی اس باب کو دیکھ سکتے ہیں۔

مدیر]

معاہدات و مخالفات کی نسبت اپنے تنہا حق امتیازی کے ذریعہ سے، معاملات خارجہ کا چلانا اس کا کام ہے بلکہ داخلی معاملات میں بھی، جماعت مقننہ کے شریک کار، فوج کے سپہ سالار اعظم، انصاف و اعزاز کے سرچشمہ، اور کلیسا کے سرگروہ ہونے کے لحاظ سے اس کے اختیارات کے حدود بہت ہی وسیع ہیں ملیکسٹن یہ سمجھتا ہے کہ دار العوام کو ان اختیارات کے ناواجب استعمال کے روکنے کا موقع وزراپر مقدمہ چلانے کے ذریعہ سے حاصل ہے مگر بلیکسٹن کی تصنیف کے کسی پڑھنے والے کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آئے گا کہ ان اختیارات کا ماحصل ایک ایسی کمیٹی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے جس کا انتخاب وہ سرگروہ کرتا ہے جسے خود دار العوام کے فرقۂ غالب نے منتخب کیا ہو اور جیسا کہ ہم آخری خطبہ میں دیکھ چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ تغیر بلیکسٹن کے زمانہ میں مکمل بھی نہیں ہوا تھا، مگر جس شے نے اس وقت تک بادشاہ کو یہ قوت دے رکھی تھی کہ وہ دار العوام میں توازن قایم رکھے وہ حق انکار نہیں تھا، جو عملاً متروک ہو چکا تھا بلکہ یہ وہ اثر تھا جو بادشاہ دار العوام کے ارکان پر عمل میں لاتا تھا، یہ کچھ تو اس رائے کے باقیات کی وجہ سے تھا جو قانون کے اندر شاہی حکمرانی کی جانبدار تھی (اور یہ حالت بالخصوص ٹوری فریق کی تھی) مگر زیادہ تر یہ اثر منصبوں اور وظیفوں کی مستحکم ترغیبات کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس آخر الذکر شق کا لابدی ہونا ہیوم کے پرسکون مگر گونہ لاابالیانہ مشاہدات سے صاف ظاہر تھا جس نے رشوت کے خلاف غوغا کرنے والوں سے یہ کہا تھا کہ وہ اس قوت پر حملہ کر رہے ہیں جس سے نظام سلطنت کا توازن برقرار ہے اور اگر یہ رشوت بند ہو گئی تو انگریزی نظام کے جمہوریت تامہ کی جانب مائل ہو جانے میں کوئی روک نہ رہے گی[1] مگر مونٹسکیو پر یہ امر صاف واضح نہیں ہوا، مونٹسکیو جس دستور کی مدح سرائی کرتا تھا، وہ دستور وہ تھا جو سرکاری طور پر مسلم تھا نہ کہ وہ جس پر عمل ہو رہا تھا۔ اس کی خاص خوبی اس امر میں مضمر سمجھی جاتی تھی کہ اس میں اختیارات کی تقسیم اس طرح کر دی گئی ہے کہ کسی ایک حصے کو ایسا مطلق العنانہ

[1] ہیوم خطبۂ ششم۔

غلبہ نہیں حاصل ہو سکتا جس سے انفرادی آزادی کو خطرہ ہو، برخلاف ازیں کابینی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پارلیمنٹ کی ایک چھوٹی سی ذیلی جماعت کے اندر جیسے دارالعوام کی کثرت رائے کا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے تشریعی و عاملانہ فرائض کا عملاً گہرا اتحاد ہو گیا ہے۔ کابینی حکومت کے تحت میں جماعت مقننہ و جماعتِ عاملانہ کی جو زبردست روک ایک دوسرے پر واقعاً قائم ہے، وہ اس سے بالکل ہی دوسری نوعیت کی ہے جس کا خیال بھی مونٹسکیو کے ذہن میں آیا ہو۔

یہ غلط فہمی تاریخی حیثیت کے لحاظ سے اس وجہ سے اہمیت رکھتی ہے کہ بلیکسٹن اور مونٹسکیو نے جس طرح پر برطانی دستور کا تصور پیدا کیا تھا اسی حیثیت سے وہ امریکی دستور کے بانیوں کے سامنے تھا، اور یہ ان کے لئے محض نمونہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک طرز تھا جس کی خوبیوں کی وہ نقل کر سکتے اور اس کے نقائص کو بچا سکتے تھے اور فی الحقیقت اگر امریکی دستور کا برطانیہ کے دستور کے مختلف مدارج سے مقابلہ کیا جائے تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ بہت بڑی حد تک یہ نتیجہ حاصل ہو گیا ہے۔ امریکی صدر جمہوریہ کو حقیقتاً وہ حق امتناع حاصل ہے[1] جو مدتوں سے انگلستان کے بادشاہ کے اختیار میں محض رسماً رہ گیا ہے۔ رئیس جمہوریہ حقیقتاً اپنے وزرا کو مقرر و برطرف کرتا ہے، جماعت عاملہ کے فیصلے درحقیقت اس کے فیصلے ہیں نہ کہ ان وزرا کے اور اس غرض سے کہ وہ اس اختیار سے ایوان نمایندگان یا مجلس سینٹ پر قابو حاصل کرنے کا کام نہ لیکے، اس کے وزرا ان ایوانوں میں بیٹھنے سے ممنوع قرار دئے گئے ہیں۔

مگر مغربی یورپ کی سلطنتوں میں جہاں آئینی دستور حکومت زیادہ تر انیسویں صدی کی پیداوار ہے، وہاں اکثر صورتوں میں اس ارتقا کے دوسرے درجہ یعنی کابینی حکومت کو اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں مدارج کے درمیان صاف فرق کے نہ ہونے کی وجہ سے حکمران کے اختیار کسی قدر غیر معین و مختلف

[1] البتہ موتمر کی دو ثلث کثرت رائے اس اختیار کو بیکار کر سکتی ہے۔

رہ گئے ہیں۔ درحقیقت جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں آئینی بادشاہی انھیں دو طرزوں کے درمیان کم و بیش حائل رہی جو وسیع معنی میں بلنچلی کے "صحیح" و "باطل" طرزوں کے مرادف ہیں، مگر جنھیں جرمانی و انگریزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا (انگریزی سے مراد جدید انگریزی طرز ہے کیونکہ جرمانی طرز تو قدیم انگریزی طرز کے بہت ہی مشابہ ہے) ان میں سے ایک موروثی بادشاہ واقعاً و معاملاً کا سرگروہ ہے، اگرچہ قانون سازی و اجرائے محصول کے لئے جمعیت نیابتی کی منظوری کی شرط ہے۔ دوسرے میں اہم و خاص عاملانہ اختیار کابینہ کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں جس کی صدارت اس فریق کا سرگروہ کرتا ہے جسے جمعیت نیابتی میں کثرت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ چونکہ اس فرق کا مدار کار زیادہ تر رواج و رائے پر ہے، قانون پر نہیں ہے، اس لئے ہمیشہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی خاص وقت میں کوئی خاص دستور کس طرز سے زیادہ قریب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بادشاہ کا اعتماد کسی ایسے وزیر اعظم پر ہو جسے ملک کا اعتماد[1] اور جمعیت نیابتی کی مسلمہ کثرت کی تائید بھی حاصل ہو تو اس صورت میں یہ صاف عیاں نہیں ہوتا کہ اختیارات کس جانب واقع ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بادشاہ اگر وزیر کو برطرف کرنا چاہے ہے اس حالت میں کیا صورت پیش آئے گی اور یہ ہم اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب اس کا وقت آ جائے[2]۔ امر بحث طلب یہ نہیں ہے کہ کسی خاص وقت میں بادشاہ کالعدم ہے اور وزیر مختار کل ہے کیونکہ مطلق العنان بادشاہی میں بھی کسی کمزور بادشاہ کے تحت میں اکثر ایسی صورت پیش آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر بادشاہ وزیر کو برطرف کرنا چاہے تو آیا وہ وزیر اتنا قوی ہوگا کہ بادشاہ ایسا نہ کر سکے۔

---

[1] ۔ جارج سوم کے عہد میں ولیم پٹ (ولیم اصغر) کی حالت یہی تھی اور زمانۂ حالیہ جرمنی میں بسمارک کی یہی کیفیت تھی۔

[2] ۔ علاوہ ازیں، اگر ایک مرتبہ اس کا تجربہ کیا جائے اور اس میں ناکامی ہو تو بھی یہ ہو سکتا ہے کہ دوسری مرتبہ زیادہ مناسب موقع سے کارروائی کرنے سے اس میں کامیابی ہو جائے۔ اس طرح اختیار کا پلہ کبھی ادھر کبھی ادھر جھکتا رہے گا۔

۴- اس کہنے سے کہ انگریزی طرز رائج الوقت طرز ہے، میں نسبتاً غیر اہم جزوی اختلافات کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ مثلاً ایک اختلاف ایوان اعلیٰ کے متعلق ہے، یہ ایوان اگر ایوان ادنیٰ کے منظور کردہ قوانین سے مسلسل اختلاف کرے تو انگلستان میں اس کا تدارک نئے امرا کے بنانے سے ہو سکتا ہے مگر بر اعظم کی اکثر سلطنتوں میں یہ صورت نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ظاہراً اس میں جتنا خلاف معلوم ہوتا ہے عملاً اتنا نہیں ہے کیونکہ بر اعظم کے امرا میں مقاومت کی زیادہ قوت ہی نہیں ہے، وہاں اصلی کشمکش ملوکیت و عمومیت کے درمیان ہے

لیکن وسیع معنی میں، جسے میں نے انگریزی طرز کہا ہے اس کی نقل عملاً بلجیم میں ہو گئی ہے، جس نے ساٹھ برس سے زائد تک انگریزی نوع کی دستوری بادشاہی کے عملدرآمد کی بہت ہی منضبط و قطعی مثال پیش کی ہے، اور ۱۸۴۸ء سے ہالینڈ میں بھی یہ طرز اختیار کر لیا گیا ہے۔ پرتگال میں انیسویں صدی کے ربع ثانی میں انقلابات کا طوفان برپا رہا، کبھی وہ پیچھے ہٹتا تھا اور کبھی آگے بڑھتا تھا مگر میرا قیاس یہ ہے کہ ۱۸۵۲ء کے بعد سے اس نے پر امن پارلیمنٹی حکومت اختیار کر لی ہے جس میں یہ اصول عملاً قبول کر لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹی فریق غالب کا سرگروہ وزیر اعظم ہوا کرے، نیز، سارڈینیا کے ۱۸۴۸ء والے دستور کا عمل بھی اسی اصول پر رہا ہے اور اسی دستور کو ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے مابین تقریباً اطالیہ پر وسعت دیگئی ہے۔ ۱۸۷۶ء کے بعد سے اسپین کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے، مگر انیسویں صدی کے پہلے تین ربع میں اس کے سیاسی ارتقاء میں خصوصیت کے ساتھ ابتری و ناپائداری برپا رہی۔

پس رومانی ملکوں میں علی العموم ہم بے شک و شبہہ پارلیمنٹی طرز حکومت کو شایع دیکھتے ہیں اور فرانس کے سوا ہر جگہ یہ طرز شاہی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، ہر جگہ پارلیمنٹ دو ایوانی طریق پر ترتیب دی گئی ہے، مگر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ برسر اقتدار وزرا کو لازمی تائید ایوان نیابتی سے یعنی اس ایوان سے حاصل ہوتی ہے جس میں نیابت براہ راست اور سادہ طریق سے ہو میں نے یہ آخری الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں کہ ایک اطالیہ کو مستثنیٰ کر کے اور تقریباً تمام جگہوں میں،

مجلس سینات یا ایوانِ اعلیٰ کے ارکان کا تقرر کلاً یا جزاً انتخاب سے ہوتا ہے۔ اس انتخاب کی مختلف شکلیں ہیں، بلجیم میں سینائیوں کا انتخاب زیادہ تر وہی انتخاب کنندگان کرتے ہیں جو ابتدائی ایوانِ نیابتی کا انتخاب کرتے ہیں، مگر قابلِ انتخاب اشخاص کی تعداد زیادہ مرفہ الحال قلیل التعداد افراد تک محدود ہوتی ہے۔ اسپین میں جہاں نصف سینات انتخاب سے مقرر ہوتی ہے، وہاں بھی قابلِ انتخاب ہونے کا تعین ایک حد تک آمدنی کی بنا پر ہوتا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ سینائی نے ملکی، فوجی، اور پیشہ کے متعدد کاموں میں سے کوئی کام انجام دیا ہو، کسی جامعہ کی معلّمی بھی انھیں کاموں میں داخل ہے، لیکن یہاں مجلس سینات کے انتخاب کنندگان ایوانِ نمایندگان کے انتخاب کنندے نہیں ہوتے بلکہ یہ جداگانہ انتخابی جماعتیں ہوتی ہیں جن میں منجملہ اور جماعتوں کے صوبے کی مجالس کے ارکان بھی داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح فرانس میں بھی سینائیوں کا انتخاب مقامی حکمراں جماعتوں کے ارکان کو حاصل ہوتا ہے مگر وہاں قابلِ انتخاب ہونے کے لئے آمدنی کی شرط نہیں ہے۔ ہالینڈ میں بھی صوبے کی حکومتیں انتخاب کرتی ہیں مگر قابلِ انتخاب ہونے کا حق زیادہ متمول اشخاص تک محدود ہو جاتا ہے۔ اطالیہ میں سینائیوں کی نامزدگی مدت العمر کے لئے ہوتی ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ جزئیات معاملۂ زیر بحث کو اور پیچیدہ نہ بنا دیں لیکن ان کی تفصیل دو مطالب پیدا کرنے کی غرض سے کی ہے۔ اول، یہ کہ انگریزی نمونے کی نقل میں دارالامرا کی نقل کی نوبت نہیں آئی بجز اس کے کہ جہاں تک روہانی ملکوں کا تعلق ہے، صرف ایک اسپین میں کسی حد تک اس کی نقل ہوئی ہے، دوسرے یہ کہ مختلف قوموں کا طریق کار بہت ہی مختلف و متغائر ہے یہ اختلافات اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ غالباً ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کسی قوم نے بھی ایوانِ بالائی کے بنانے کے مسئلہ کو نمایاں کامیابی کے ساتھ حل نہیں کیا ہے۔ شاید ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس اصول کی طرف میلان پایا جاتا ہے کہ جو لوگ خود منتخب ہوئے ہوں (خاص کر حکومت کے منتخب شدہ صوبجاتی مجالس کے اراکین) وہ ایوانِ ثانی کا انتخاب کریں، اور اب اس اصول کی نسبت زیادہ قطعی

صورت میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وفاقی مجالس مقننہ جو دو ایوانی طریق پر مرتب ہوئی ہیں ان میں بالعموم اس اصول کا انطباق ہوا ہے[۱] جب ہم اسکنڈنیوی سلطنتوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، تو سویڈن میں بھی ہمیں یہی اصول نظر آتا ہے۔ مغربی یورپ کی سلطنتوں میں سے صرف ناروے کی سلطنت ایسی ہے جہاں ایوان بالائی ایوانِ زیریں کی جانب سے اور اسی میں سے منتخب ہوتا ہے مگر یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ سوئیڈن اور ناروے دونوں میں اور خاص کر ناروے میں جماعت مقننہ کی دو ایوانوں میں تقسیم اور جگہوں کی بہ نسبت کم مکمل ہے، چنانچہ ناروے میں دونوں ایوانوں میں جس قانون کے متعلق عدم اتفاق ہوجائے، اس پر آخری رائے دینے کے لئے وہ یکجائی کارروائی کرتے ہیں اور سوئیڈن میں یہ طریقہ مالی معاملات کے ایسے الجھاؤ کو روکنے کے لئے عمل میں آتا ہے جو دونوں ایوانوں کے مابین پیدا ہوگیا ہو۔

نیز، حق رائے دہی کی وسعت کے متعلق بھی انگلستان کے نمونے کی تقلید نہیں کیجاتی، اس معاملے میں تو انگلستان رہبری کرنے کے بجائے خود برا عظمی تحریک کے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلتا ہے۔ تقریباً تمام مقاموں پر اس تحریک کا میلان ہمہ گیر حق رائے دہی کی طرف ہے۔

۴۔ دوسری طرف، انگلستان کے عدالتی طریق کی بہت ہی اہم تقلید کی گئی ہے، اول تو جوری کے معاملہ میں، لیکن اس موقع پر دیوانی و فوجداری کے مقدمات میں فرق کرنا ضروری ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے سلطنت متحدہ سے باہر دیوانی مقدمات میں جوری کا طریقہ صرف پرتگال میں اختیار کیا گیا ہے، لیکن فوجداری کے مقدمات میں مغربی یورپ کی اکثر سلطنتوں میں اس کا شیوع ہوگیا ہے اور اسے آزادی کی ضمانتوں میں سے ایک اہم ضمانت سمجھا جاتا ہے اور دستوری حکومت کا مطالبہ زیادہ تر اس آزادی ہی کے لئے ہوا ہے۔

نیز، وہ عدالتی تحفظ جس نے انگلستان کے اندر اہل ملک کی انفرادی آزادی پر

---

[۱] [مصنف آسٹریلیوی دولت عامہ کے قیام کے دیکھنے تک زندہ نہ رہا۔]

حکام عاملانہ کی دست درازیوں کو بہت خوبی کے ساتھ روکا ہے اسے بھی مختلف صورتوں میں اور مختلف حد تک کم و بیش نقل کیا گیا ہے، مگر یہاں ہمیں مختلف ممالک خاص کر انگلستان و فرانس کے اندر تقسیم اختیار کے اصول کی تاویل کے بارے میں نمایاں فرق بلکہ قطعی اختلاف کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ دونوں مغائر رائیں ایک ہی اصول کے ارادۂ صادق کے ساتھ عمل میں لانے سے پیدا ہوئیں اور دونوں رائیں ایک طرح پر مونٹسکیو ہی سے ماخوذ ہیں جو تاریخی اعتبار سے پہلا شخص تھا جس نے افراد ملک کے تحفظ کے اصول کی اساسی اہمیت کی جانب پہلے توجہ دلائی عہ

مونٹسکیو کے اصول کی تاویل انگلستان میں ہمیشہ یہ کی گئی ہے کہ "اہل ملک کی قانونی آزادی کے تحفظ کے لئے چاہئے کہ ایک خاص عضو حکومت یعنی جماعت مقننہ، قانون مرتب کرے، دوسرا عضو حکومت یعنی محکمۂ عدلیہ یہ فیصلہ کرے کہ آیا خلاف ورزی قانون ہوئی ہے یا نہیں اور تیسرا یعنی جماعت عاملہ، اُس مادی قوت کی تنظیم و ہدایت کرے جو قانون کی اطاعت حاصل کرنے کے لیے درکار ہو اور قانون کو عمل میں لانے کے لئے دوسرے جو کام ضروری ہوں انھیں بھی عمل میں لائے، نیز چاہئے کہ ان تینوں کو مناسب حد تک آزادی حاصل ہو" لیکن یہ مناسب آزادی کیونکر حاصل ہو یہ ایک مشکل مسئلہ ہے اور مونٹسکیو نے یہ رائے دی ہے کہ جدید قوانین کے لئے حکام عاملہ کی منظوری لازمی قرار دینا چاہئے، تاکہ جماعت مقننہ کو حکام عاملہ کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت سے روکا جا سکے پس جس بنا پر تقسیم کار کا مطالبہ کیا جاتا ہے اسی کا اقتضا یہ ہے کہ تقسیم مکمل نہ ہو، مگر حکام عدالت کے ساتھ حکام عاملہ کے تعلق کے بارے میں اس اصول کا انطباق انگریزوں کی

عہ۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خاص امر زیر بحث کے متعلق مونٹسکیو کی رائے مجھے بالکل ہی مبہم معلوم ہوتی ہے درحقیقت اس نے اپنی تصنیف "برطانی دستور" کے مشہور باب (کتاب یازدہم باب ششم) میں اس پر صریحی طور پر بحث نہیں کی ہے مگر اس کا عام خیال بالیقین یہ ہے کہ "خودرایانہ جور و ستم کو روکنے کے لئے اختیارات حکومت مختلف ہاتھوں میں رکھے جائیں"۔

نظر میں ایک سیدھی اور صریحی بات معلوم ہوتی ہے۔ بڑا اہم سوال یہ ہے کہ حکام عاملانہ قانون کے حدود کے اندر رکھے جائیں، یہ سوال کہ آیا اسی جماعت کے کسی رکن یا کسی ماتحت نے ان حدود سے تجاوز کیا ہے یا نہیں، اسے خود حکام عاملانہ کے فیصلے کے لئے نہ چھوڑنا چاہئے، یہ انگریزوں کے نزدیک بدیہی امر ہے۔ "کسی شخص پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اپنے معاملے میں بے لوث منصف ثابت ہوگا" اس لئے انگریز یہ دلیل لاتے ہیں کہ ان سوالات کا فیصلہ ایک آزاد محکمۂ عدلیہ کے سپرد ہونا چاہئے۔

لیکن فرانسیسیوں کی تاویل اس سے قطعی مخالف ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈائیسی نے اس مسئلے کے متعلق اپنی تصنیف "قانونِ دستوری" (حصۂ دوم باب دوازدہم) میں یہ لکھا ہے کہ "تقسیم اختیارات" کے فقرے کی تاویل جس طرح، فرانس کی تاریخ، فرانس کے قوانین اور فرانس کی عدالتوں کے فیصلوں سے ہوئی ہے اس کے معنیٰ اس سے زیادہ یا کم کچھ نہیں ہیں کہ اس اصول کو برقرار رکھا جائے کہ جس طرح جج ناقابلِ برطرفی اور اس لئے حکامِ عاملانہ سے آزاد ہونا چاہئے، اسی طرح حکومت اور اس کے عہدہ دار (جب سرکاری حیثیت سے کام کرتے ہوں) وہ بھی معمولی عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے خارج اور ایک حد تک آزاد ہوں"، اسی سلسلہ میں وہ (ڈائیسی) کہتے ہیں کہ اس طرح مونٹسکیو کے اصول مسلمہ کا "دورِ انقلاب کے فرانسیسی مدبرین نے غلط انطباق کیا، ان لوگوں کی قوت فیصلہ پر دو امور سے خراب اثر پڑ گیا تھا، ایک تو ان دقتوں کا علم تھا جو سلطنت کے معاملات میں فرانسیسی پارلمان کی دخل دہی سے پیدا ہوتی تھیں اور دوسرے انہیں مرکزی حکومت کے اختیارات بڑھانے کی روایتی خواہش تھی"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "انفرادی اہلِ ملک اور حکومت اور اس کے عمال کے تعلقات کے انضباط کے لئے مخصوص قوانین کے ایک پورے مجموعہ کی ضرورت پیش آگئی جو ان قوانین سے مختلف تھے جو افراد کی ذاتی حیثیت سے ان کے تعلقات باہمی پر حاوی ہیں"، اور عام طور پر یہ کہنا چاہئے کہ جسے انتظامی قانون، کہتے ہیں اس کے کسی معاملہ سے معمولی عدالتوں کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہلِ ملک کی ذاتی حیثیت سے ان کے شخصی حق کے تمام مسائل اور

جرم کے تمام الزامات دیوانی عدالتوں کے حیطۂ عمل میں داخل ہیں مگر عام ججوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ چھوٹے بڑے کسی عہدہ دار کے کسی فعل پر (جو اس نے نیک نیتی کے ساتھ سرکاری حیثیت سے انجام دیا ہو) کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔" کسی عہدہ دار کے ادائے فرائض میں اگر کسی شخص کو (ذاتی حیثیت سے) کوئی نقصان پہنچے تو وہ اس کی رفعداد کے لئے انتظامی عدالتوں کی طرف رجوع کرے۔

ان عدالتوں کی بابت مسٹر ڈائیسی یہ کہتے ہیں کہ "ان نام نہاد "عدالتوں" نے ابھی حال میں ایک طرح کی نیم عدالتی حیثیت حاصل کر لی ہے مگر ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے کہ ہم نام سے مغالطے میں نہ پڑ جائیں۔ وہ انتظامی حکام جو قانون انتظامی کے معاملات کے متعلق تمام تنازعات کا فیصلہ کرتے ہیں، انھیں "محکمہ" کہنا زیادہ مناسب ہے، وہ ضابطے کی وہ صورتیں اختیار کر سکتے ہیں جو "عدالتوں" کے طرز پر ہوں مگر وہ سب کے سب سرکاری اشخاص پر مشتمل ہوتے ہیں اور قانون انتظامی کے معاملات کو دیوانی عدالتوں کے قبضے سے نکال لینے کی حمایت میں جو عذرات پیش کئے جاتے ہیں، ان عذرات ہی میں یہ مقدر ہے کہ جو تنازعات ان سرکاری اشخاص کے سامنے آتے ہیں وہ ان پر حکومت کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کا تصفیہ ان جذبات کے ساتھ کرتے ہیں جو عام طور پر ججوں کے احساس قلبی سے مختلف ہوتے ہیں"۔

پس، آپ دیکھتے ہیں کہ "تقسیم اختیارات" کے مسئلہ کو فرانسیسی انگریزوں سے کس درجہ مختلف سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عدالتی طور پر اس امر کا فیصلہ کرنا کہ حکومت عاملانہ کا کوئی رکن یا ماتحت قانونی حدود کے اندر رہا ہے یا نہیں، اسے عاملانہ فرائض سے الگ کر لینا چاہئے"۔ فرانسیسیوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عدالتی طور پر اہل ملک کے انفرادی حقوق باہمی کے تنازعات کے فیصلے کو اس امر کے فیصلہ کرنے کے فرض سے جدا رکھنا چاہیئے کہ آیا حکومت عاملانہ کے ارکان یا ماتحتوں نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں۔ اس لئے یہ موخر الذکر فرض خاص "انتظامی محکمات" کو تفویض ہونا چاہیئے"۔ مجھے تو بالیقین یہی واضح معلوم ہوتا ہے کہ

انگریزوں کی تاویل مونٹسکیو کے خیالات کے عام میلان سے زیادہ ہم آہنگ ہے [1]

---

[1] لیکن اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مونٹسکیو کے خیالات سے الگ ہو کر خوبی کار اور ترکیب سیاسیہ کی عام بناؤں کے موافق فرانسیسی نقطۂ نگاہ کی حمایت میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو مسٹر ڈائسی کی کتاب صفحہ ۳۲۶ - ۳۲۸ - (طبع چہارم) اور میری تصنیف ”مبادی سیاسیات“ باب بست و چہارم فقرہ ۸ -

خطبہ بست و نہم

وفاقیت جدیدہ

۱۔ میں نے اپنے آخری دو خطبات میں وحدانی مملکتوں میں دستور سازی کی تاریخ کے خصوصیات مختصراً بیان کئے ہیں، اور ان دونوں صورتوں کا فرق دکھلایا ہے جن کے بین بین، وہ واقعی نظامہائے سلطنت واقع ہیں جو عام طور پر دستوری بادشاہی کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض صورتوں میں جیساکہ انگلستان میں ہے وہ طرزِ حکومت قایم ہے جسے دستوری بادشاہی کی شکلوں کے تحت میں پارلیمنٹی حکومت کہنا چاہئیے اور بعض صورتوں میں اس طرز دستوریت اور اس شاہی میں ہنوز کشمکش جاری ہے جسے صحیح دستوری بادشاہی یا محض دستوری بادشاہی کہنا چاہئیے جس میں بادشاہ صاحب تاج و تخت بھی ہوتا ہے اور کار فرما بھی ہے۔ برخلاف ازیں جرمنی میں اختیار کی باگ ابھی تک بے قیل و قال مضبوطی کے ساتھ موروثی بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ صرف فرانس کی ایک صورت ہے جس میں پارلیمنٹی حکومت شاہی شکل کے اندر نہیں بلکہ جمہوری شکل کے اندر قایم ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ہم پر اس طرز کے اس نوع کی کامیابی و استقامت اس درجہ صاف طور پر عیاں نہیں ہوئی ہے کہ اس نوع کی جانب دلکشی کی قوت منسوب کر سکیں یا یہ پیشینگوئی کر سکیں کہ مغربی یورپ کی دوسری سلطنتیں بھی اغلباً فرانس کی نقل کرینگی زمانے کے آثار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اغلباً آنے والی نسل کے مدبروں کی خاص توجہ

اندرونی نظم سلطنت کی صورت کے تغیر کے مسایل کے بجائے زیادہ تر فرائض حکومت کی وسعت کی طرف منعطف رہے گی۔

تاہم، میرے سامعین کے دل میں یہ خیال آیا ہوگا کہ جدید دستوری بادشاہی کی دو شکلوں کو انگریزی و جرمانی طرز قرار دیکر مقابلہ کرنے میں میں نے ان دونوں ملکوں کے (جنھیں نمونہ کے طور پر منتخب کیا گیا ہے) ایک اہم فرق کو نظر انداز کردیا ہے یعنی یہ کہ جرمنی دستور وفاقی ہے اور انگلستان کے دستور کا یہ حال نہیں ہے۔ سہولت مقابلہ کی کسی غرض سے یہ کہنا چاہئے کہ انگلستان، فردی مملکت ہے۔ لیکن در حقیقت میں نے اسے نظر انداز نہیں کیا ہے، البتہ اتنا تھا کہ میرے استدلال کے لئے اس جانب اشارہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ وجہ یہ ہے کہ جس امر پر مجھے زور دینا تھا یعنی جو وزرا عاملانہ فرائض کو انجام دیتے ہیں اور قانون سازی و موازنہ کے لئے جس مجلس نیابتی کی منظوری کی ضرورت ہے ان دونوں کے ساتھ بادشاہ کا تعلق کیا ہو، یہ امر جرمانی شہنشاہی اور اس کی خاص خاص ترکیب وہ سلطنتوں بالخصوص، پروشیا میں زیادہ تر ایک ہی سا ہے۔ پس وفاقی طریق سے فرائض کی جو تقسیم لازم آتی ہے اس پر اس کا کوئی قوی اثر نہیں پڑتا۔ ولیم ہوہنزولرن خواہ شہنشاہ جرمنی کی حیثیت سے کارروائی کرتا ہو، خواہ شاہ پروشیا کی حیثیت سے دونوں صورتوں میں وہ خود اپنے وزرا کا تقرر کرتا ہے اور نیابتی مجلس خواہ وفاقی کی ہو یا پروشیا کی، وہ بادشاہ پر کسی ایسے وزیر اعظم کے مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہے جسے عملاً اس مجلس کے فرقۂ غالب نے منتخب کیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم مغربی یورپ کے سیاسی تغیر کے مجموعی نتیجہ پر بحث کر رہے ہوں تو جس شے کو ہیں نے جرمنی کی "وفاقیت" کہا ہے (یعنی آسٹریا سے باہر جرمانی ریاستوں کا بعض اعتراض خاص کر خارجی معاملات و جنگ کے لئے ایک وسیع تر مجموعہ میں متحد ہو جانا اور اس کے ساتھ داخلی و ملکی قانون سازی و نظم و نسق کے بہت سے اہم معاملات میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنا) یہ شے نہایت قابل لحاظ بن جاتی ہے۔

ہمیں یہ بھی غور کرنا ہے کہ اسی سے کسی قدر مشابہ مگر زیادہ پیچیدہ طرز کی

وفاقیت آسٹریا میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ پیچیدگی اس وجہ سے ہے کہ آسٹریا و ہنگری میں ایک بالکل ہی خاص قسم کا اتحاد ہے اور اس پر یہ مستزاد ہو گیا ہے کہ ہنگری سے علیحدہ آسٹریا جن دوسرے صوبجات یا ممالک پر مشتمل ہے، ان صوبوں کی مقامی "مجلس ملی" اور آسٹریا کی شہنشاہی "مجلس ملی" کے درمیان تشریعی فرائض کی تقسیم ہو گئی ہے۔ پس اس طرح آسٹریا کے معاملات کے لئے تین مباحثی جماعتیں ہیں (۱) ایک قسم کی ثنائی جماعت ہے یعنی مساوی تعداد کی دو ورد توفیدین "آسٹروی" اور ہنگروی پارلیمنٹوں کی جانب سے منتخب ہوتی ہیں جو ایک ہی وقت میں مگر بالعموم علیحدہ علیحدہ آسٹریا اور ہنگری کے مشترکہ مفاد کے مسائل پر غور کرتی ہیں، باہم گفت و شنود کرتی اور کبھی کبھی یکجا ملکر کام کرتی ہیں۔ (۲) آسٹروی شہنشاہی "ڈائٹ" (۳) بوہیمیا، آسٹریا ہیٹر دل وغیرہ کی مقامی "مجالس" ہیں اسی کے مطابق عاملانہ فرائض کی بھی تقسیم ہے۔ اس کے بعد پھر خود ہنگری کے معاملات میں اور بھی زیادہ عجیب قسم کی وفاقیت داخل ہو گئی ہے جو اس حکومت خود اختیاری کے مشابہ ہے جس کے اجرا کی تجویز سلطنت متحدہ میں پیش ہے۔ شاید مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ وہ "سوراج" کی اس شکل کے مشابہ نہیں جس کی آئرلینڈ کیلئے واقعاً یہاں تحریک ہوئی تھی بلکہ اس شکل کے مشابہ ہے جو نیابتی حکومت کے عام اصولوں سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے یعنی ہنگری کے ایک خاص حصہ کروشیا میں ۱۸۶۸ء سے ایک جداگانہ پارلیمنٹ قائم ہو گئی ہے اور جن معاملات کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا ہے ان کا تعلق تاج ہنگری کے جملہ زیر نگیں ممالک سے ہے، ان معاملات کے ایک جزو کی بابت یہی پارلیمنٹ قوانین وضع کرتی ہے، اور باقی اس قسم کے معاملات کے متعلق بوداپسٹ کی ہنگروی پارلیمنٹ میں قوانین وضع ہوتے ہیں جس میں کروشیا بھی اپنے نمایندے بھیجتی ہے کروشیا کے نمایندے ہنگروی پارلیمنٹ میں جملہ امور پر رائے نہیں دیتے بلکہ صرف ان امور پر رائے دیتے ہیں، جو کروشیا کی پارلیمنٹ میں جداگانہ طور پر وضع نہیں ہوتے۔

پس آپ دیکھتے ہیں کہ جس شے کو میں وفاقی اصول کہتا ہوں، اس کے عملدرآمد کی یہ کس قدر پیچیدہ صورت ہے، وفاقیت سے مقصود حکومت کے بعض اغراض کے لئے چند قوتوں کا اس طرح متحد کرنا ہے کہ بعض دوسرے اہم اغراض کیلئے

ان کی جداگانہ حیثیت و آزادی قایم رہے۔ میں اس قسم کی مبہم اصلاحات اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ مختلف صورتوں میں فرائض کی تقسیم مختلف طور پر کی گئی ہے، مگر ہم کہہ یہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی وفاقیت کا رواج ہوتا ہے وہاں مرکزی حکومت کو جو معاملات تفویض کئے جاتے ہیں، ان میں خارجی معاملات کا جملہ انتظام یا ان کا بیشتر حصہ اس کو تفویض کر دیا جاتا ہے۔

شمالی یورپ یعنی سکینڈنیویا میں ایک ثنئے مملکت بھی ہے جو سوئیڈن اور ناروے سے مل کر بنی ہے۔ اگرچہ یہاں کا رشتۂ اتفاق اس رشتہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہے جس نے آسٹریا اور ہنگری کو ملا رکھا ہے۔

۲۔ آخر میں سوئزرلینڈ میں وفاقیت کی وہ مشہور تاریخی مثال ملتی ہے جو ازمنۂ وسطی سے ازمنۂ جدیدہ تک بالکل ہی غیر منقطع طور پر چلی آئی ہے اور جدید یورپی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ تسلسل ارتقا کے اعتبار سے وفاقی طرز میں سوئزرلینڈ کی وفاقیت کا تقریباً وہی رتبہ ہے جو وحدانی طرز میں انگلستان کا ہے، اور ازمنۂ وسطی میں سوئزرلینڈ وفاقیہ کا نشو و نما اور اس کا ارتقا موخر زمانہ کی یورپی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جس کی افسانہ نما دلچسپی اس جد و جہد کی ہمسری کرتی ہے جو یونانیوں اور رومانیوں سے اپنے غیر ملکی دشمنوں کے خلاف ظہور میں آئی تھی ۱۲۹۱ سنہ میں اوری، شوینز اور انٹر والڈن کے کسانوں نے باہمی اتحاد قائم کیا جس کی غرض اولاً سیاسی آزادی نہیں تھی، کیونکہ یہ لوگ شہنشاہ کے ساتھ اپنی وفاداری کو بے خلل قائم رکھنا چاہتے تھے وہ یہاں تک کہ وہ اپنے ملک کے اندر شہنشاہ کے ماتحت جاگیری امرا کے حقوق کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے بلکہ یہ اتحاد اُن مخلصین یا متوسطین کے ظلم و جور کے خلاف گویا ایک دفاعی محالفہ تھا، جو جاگیری امرا کی جانب سے کاربرداز تھے۔ ۱۳۱۵ سنہ میں ان دہقانی سپاہیوں نے لیوپولڈ (شہنشاہ آسٹریا) کی جاگیری فوج کو ملورگارٹن کی بلندیوں سے پتھر اور درختوں کے تنے لڑھکا لڑھکا کر تباہ کر دیا۔ پھر اس کامیاب عہدیت نے جاگیری امرا کے اقتدار کی بیخ کنی شروع کی، اور جب اس کے ہمسایوں نے اس میں شرکت چاہی تو ۱۳۵۳ سنہ میں یہ آٹھ ریاستوں کی لیگ

کی صورت میں بدل گئی جس میں برن اور زیورش کے آزاد شہنشاہی شہر بھی داخل تھے، بعد ازاں پچیس برس بعد، یہ وسعت یافتہ عہدیت، زمپاخ کی مشہور جنگ میں آسٹریا کی ایک دوسری فوج پر (جو ایک دوسرے لیوپولڈ کی سرکردگی میں تھی) مظفر و منصور ہوی اور اس فیروزمندی نے عملاً اسے خاندانِ ہاپس برگ کی سیادت سے آزاد کر دیا۔ یہ تمام باتیں ان لوگوں کے حافظے میں جمی ہوئی ہیں جو ہنوز نافرسودہ مگر قدیم طرز وخیال کے ساتھ اس جستجو میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ایسی قوموں اور ایسے واقعات سے روشناس ہوں جن سے ان میں ہمدردی پیدا ہو۔ پھر اس "دو بہادرانہ چودھویں صدی" کے بعد وہ صدی آئی جو اخلاقاً اس درجہ قابلِ وقعت نہیں ہے مگر خوشحالی کے اعتبار سے اس سے کم نہیں ہے۔ اس صدی میں عہدیت نے فتوحات کئے اور اپنی حفاظت کو اپنے کمزور ہمسایوں تک وسعت دی، یہاں تک کہ چارلس برگنڈنوی (۱۴۷۷-۱۴۶۷) کے ساتھ ایک کامیاب جنگ کے بعد اس کا فوجی اقتدار تمام یورپ میں اس طرح قائم ہو گیا کہ اس کے بعد جو اطالوی لڑائیاں پیش آئیں ان میں ہر جانب یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ اول درجے کے اجیر سپاہیوں کے لئے سوئزرلینڈ سب سے افضل و اقدم معدن و مخزن ہے۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک یہ اقطاع جرمانی شہنشاہی سے عملاً آزاد ہو گئے اور ۱۶۴۸ء میں ان کی آزادی کا باضابطہ اعلان ہو گیا۔ یہ سولھویں صدی کے اوائل ہی میں یہ آٹھ سے بڑھکر تیرہ ریاستیں ہو گئی تھیں، اور ان کے ساتھ ان کے ماتحت علاقے بھی تھے نیز یہ ریاستیں دورِ اصلاح کی کشاکش سے بغیر کسی قسم کی شکست وریخت کے گزر گئی تھیں۔ وفاقی اصول نے اس وقت تک جو قوت حاصل کر لی تھی اس کا یہ ایک حیرت انگیز ثبوت تھا۔ اس کے بعد سے اٹھارھویں صدی تک پھر کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا۔

مگر اس دوران میں یہ عہدیت کسی نوع سے یکرنگ یا عمومی نہیں تھی، چودھویں صدی کے وسط سے یہ عہدیت بہت ہی متغائر دساتیر والی ریاستوں کی ایک لیگ تھی، جس میں چند زرعی کینٹن اور برن کی طرح چند ایسے شہر شامل تھے جن میں عہدیت کے محدود کرنے کا تھوڑا بہت میلان پایا جاتا تھا (جس پر میں ازمنۂ وسطی کے شہری نظمِ سلطنت کے ارتقا کی آخری صورت کی بحث میں

نظر ڈال چکا ہوں)[۱]۔ شہروں کے ساتھ جو دیہاتی قطعات ملے ہوئے تھے، انھیں وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے، اور خاص کر برن کی شہری عدیدیت اپنے ماتحت اقطاع پر سختی کے ساتھ حکومت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس کی انقلابی تحریک کو یہاں ایسے عناصر ملگئے جنھوں نے ذوق وشوق سے اس کا خیر مقدم کیا، اور قدیمی عہدیت کا ۱۷۹۸ء میں زوال ہوگیا۔ اس وقت پہلی اور آخری مرتبہ اصول وفاقیت کا خاتمہ معلوم ہوتا تھا، اور واحد وغیر منقسم "جمہوریہ ہیلویٹیہ" کا اعلان ہوگیا۔ مگر وفاقی روایت بہت قوی تھی چنانچہ ۱۸۰۲ء میں نپولین کو اس کے سامنے دبنا پڑا اور اس نے کسی حد تک وفاقیت کو بحال کر دیا، اور ۱۸۱۵ء میں کچھ اس قسم کا ردعمل ہوا جس سے سابق دستور ایک حد تک بحال ہوگیا۔

اس کے بعد ۱۸۴۸ء میں ایک جدید وفاقی دستور قائم کیا گیا جو ایک بڑی حد تک ایک نئے نمونے یعنی ممالک متحدہ امریکہ کے طرز پر تھا۔ اب یہاں پہنچکر سوئیزرلینڈ اور انگلستان کے تشابہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سوئیزرلینڈ وفاقی اصول کا قطعی نمونہ نہیں پیش کرتا، یہ نمونہ ممالک متحدہ امریکہ پیش کرتا ہے۔ پس یورپی سیاسی ارتقاجن وفاقیوں کے بروئے کار آنے کا باعث ہوا ہے ان سب میں اہم ترین یعنے امریکی وفاقیہ کی جانب میرا خیال رجوع ہوتا ہے، اس کی اہمیت بالخصوص اس ملک کی وسعت کی وجہ سے ہے جس پر اس اصول کا عملدرآمد ہوا ہے، مگر اس کے متعلق میں کچھ اور آگے چل کر ذکر کروں گا۔

۲۔ سوئزرلینڈ کے دستور کے ارتقا کا یہ خاکہ میں نے اس کی اس حیرت فزا یا افسانہ وار دلچسپی کی وجہ سے نہیں دیا ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے بلکہ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) یہ خاکہ اس وجہ سے پیش کیا ہے کہ انگلستان کے مانند سوئیزرلینڈ بھی ازمنہ وسطی سے ازمنہ جدیدہ تک نظم سلطنت کے ایک خاص طرز کے عجیب وغریب مسلسل دستوری ارتقا کا ایک نمونہ ہے حالانکہ اس قسم کے دوسرے متعدد نمونے اپنی بقا میں ناکام ہو گئے ہیں۔

---

[۱] خطبۂ شانزدہم، ہفدہم، بستم

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ سوئزرلینڈ کے صوبوں اور شہروں کا اتحاد اپنے پہلے دور میں کوئی منفرد یا مخصوص واقعہ ہے، پہلے دور سے میرا مقصود چودھویں اور پندرھویں صدیوں سے ہے جب کہ یہ ریاستیں شہنشاہی فوقیت کو پوری طرح تسلیم کرتی تھیں۔ برخلاف ازیں، اس دور میں سترھویں صدی کے بعد ہی جب یہ صاف عیاں ہوگیا کہ مقدس رومانی شہنشاہی جرمنی و اطالیہ میں بحالی نظم و امن کی سعی میں ناکام ہوگئی تو اس دور میں (بشرط ضرورت بزور اسلحہ) مشترک اغراض و حقوق کی حمایت کے لئے دفاقیتیں قایم ہوئیں (جیسا کہ مجھے سابق کے ایک خطبے میں ظاہر کرنے کا موقع ل چکا!) آپ شمالی جرمانی شہروں کی "ہمسائی لیگ" کو پیش نظر رکھئے جس نے سنہ ۱۳۷۰ء تک اسکینڈینیوی سلطنتوں کے خلاف کامیاب جنگ کی تھی، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس سے کم مشہور مگر اسی قسم کے شہروں کے اور بہت سے معاقدات تھے نہ صرف شہروں کے بلکہ چھوٹے امرا بڑے امرا کی دست درازیوں کے خلاف اس قسم کے معاقدے قائم کر لیتے تھے بلکہ یہ میلان اور آگے بڑھتا اور امیروں اور شہروں میں اسی قسم کے معاقدے ہوجاتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ازمنۂ وسطی کے نیابتی ادارات جس حد تک نیچے سے اٹھنے والے تحریکات پر مبنی تھے (جیسا کہ جرمنی میں زیادہ تر تھا) اسی حد تک ہم ان کی نسبت یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے مقاصد جاگیری نوعیت کے تھے لیکن جرمنی جب ملکی سلطنتوں کی صورت میں بکھر گئی اور اس جاگیری ارتباط میں روز بروز برابر ضعف آتا گیا جو ان سلطنتوں کو شہنشاہی کے اندر مربوط کئے ہوئے تھا، تو پھر انجام کار میں جس دستور کی صورت میں اس کا نتیجہ ظاہر ہوا، اس صورت میں جاگیری حیثیت ملکی سلطنتوں کی شاہی سرگروہی حیثیت کے سامنے مٹ گئی۔

پس جہاں تک شہروں کا تعلق ہے، سوئزرلینڈ کی عہدیت ایک منفرد واقعہ ہونے کے برعکس ہے مگر زرعی کینٹنوں کی یہ حالت نہیں تھی۔ جرمنی کے بیشتر حصص میں کسانوں میں آزادانہ اتحاد کی تحریک نہیں تھی اس لئے کہ نظم معاشرت کے جاگیری تنظیم کے باقیات نے انھیں بہت زور کے ساتھ دبا رکھا تھا۔ سوئزرلینڈ کے علاوہ جو مستثنیات ہیں ان کی توجیہ بھی سوئزرلینڈ ہی کی طرح ملک کی حالت و نوعیت سے ہوسکتی ہے۔ کسانوں کی آزادانہ جماعتوں کی ترقی و اتحاد کے لئے آلپس کے

کوہستان یا فریزستان و ڈنمارکش کے سواحل زیادہ مناسب معلوم ہوتے تھے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سمندر کی حفاظت پہاڑ کی حفاظت کی بہ نسبت کم موثر تھی فریزستان میں آزاد عموميت اور وفاقی دستور کے تخم برباد ہو گئے اور ڈنمارکش میں بھی جو عام رفتار حالات میں بحری استثنا تھا، یہ صورت استثناء سولھویں صدی میں ختم ہو گئی۔

لیکن سمندر اور فریزلینڈ کے ذکر سے آپ کو یہ یاد آیا ہو گا کہ میں نے ایک یورپی سلطنت کو حذف کر دیا ہے جس میں ایک مدت تک وفاقی دستور موجود تھا، اور یہ موجودگی اس کی تاریخ کے ایک ایسے دور میں تھی، جس کی حیرت فزا جد وجہد (جو فتحمندی اور شاندار کامیابی پر ختم ہوئی)، اس کی دلچسپی سویزرلینڈ کی جد وجہد کی ہمسری کرتی ہے۔ میرا یہ اشارہ لازماً ولندستان یا یہ کہ متحدہ نشیبستان کی طرف ہے۔ میں نے یورپی وفاقی اصول پر نظر ڈالتے وقت اسے اس وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ انیسویں صدی میں ندرلینڈز کی وفاقیہ آثار باقیہ سے زیادہ نہیں تھی وہاں کا دستور زیادہ تر معمولی دستوری بادشاہی ہے، صرف اتنا ہے کہ قدیم متحدہ صوبہ جات کو جو کسی وقت میں ذی اقتدار و متحد تھے، کسی قدر وسیع اختیارات اور اعلیٰ اعزاز حاصل تھے۔ اس لئے میں ان کے وفاقی نظم سلطنت کی تکوین اور طبقات مجتمعہ (اسٹیٹس جنرل) پر جو وفاقی آلۂ کار تھا، اور شاہ نما "اسٹیٹ ہولڈر" کے پیچیدہ و تغیر پذیر تعلقات پر درجہ بدرجہ بحث نہ کروں گا۔ اٹھارھویں صدی میں آخرالذکر کو غلبہ ہوتا جاتا تھا۔ میں متحدہ ندرلینڈز کی کشاکش کی تاریخ میں بھی نہیں پڑوں گا، یہ تاریخ سویزرلینڈ کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ ولندیزوں کو مسلسل کامیابی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خشکی پر اسپین کے مقابلے میں (جو انھیں زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا)، وہ علانیہ کمزور تھے۔ یہ بھی صاف عیاں ہے کہ جس طرح اہل سویزرلینڈ، اپنے پہاڑوں کی وجہ سے بچے اسی طرح یہ لوگ اپنے سمندر کی وجہ سے بچے مگر یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر کا تحفظ نسبتہً کم مکمل ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس دستور کو وفاقی جمہوریت کی شکل سے نکال کر شاہی محدود کی شکل میں لانے کے لئے جس امر کا خاص زور پڑا وہ جنگ کا

خطرہ مزید تھا۔

۴۔ اب اس کا موقع آگیا ہے کہ ہم وفاقی اصول کے تصور، اس کی ترویج واشاعت کے حسب خواہ شرائط اور وفاقی مملکت کے امتیازی خصوصیات پر زیادہ دقت نظر سے غور کریں۔

میں اس کے آغاز میں یہ خیال ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ جرمانیوں نے ”وفاقی مملکت“ (Bundes Staat) اور ”عہدیت ممالک“ (Staaten bund) کے تصور میں تمیز پیدا کرنے میں اپنی ساری ذہانت و فطانت صرف کردی ہے مگر میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان صریحی وقطعی امتیاز کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیگئی ہے، تاہم میں ان تمام ممکنہ فرقوں پر بحث نہیں کرنا چاہتا جو ان دونوں کے درمیان قائم کئے جاسکتے ہیں، نہ میں قطعی طور پر یہ معین کرنا چاہتا ہوں کہ جو قومیں بہ ارادۂ دوام آپس میں اتحاد قائم کرسکتی ہیں ان کا انفرادی اقتدار اعلی کس حد پر پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے، خاصکر جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سوئیزرلینڈ کی وفاقیہ نے کسی قسم کے اقتدار اعلی کا دعوی ایک طویل زمانہ گذرنے کے بعد ہی کیا ہو۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس امر پر خیال کرنا زیادہ اہم ہے کہ جب ایسی قوموں کے اتحاد سے جو پہلے خود مختار تھیں کوئی وفاقیہ وجود پذیر ہوتی ہے تو جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اسی قدر یہ اتحاد زیادہ مربوط ہوتا جاتا ہے اور حالات زیادہ متعین ومستحکم ہوتے جاتے ہیں، اور کس طرح عہدیت ممالک اور وفاقی مملکت کے ان دونوں تصورات سے وفاقیت کے ارتقا میں مختلف مدارج کا اظہار ہوتا ہے، آگے چل کر میں یہ بتاؤں گا کہ اگرچہ مذکورۂ بالا طریق وفاقی اصول کی ترویج کا سب سے اہم طریقہ ہے مگر یہی ایک تنہا طریقہ نہیں ہے، لیکن یہاں میں اپنے کو صرف ایسے ہی اتحادات پر غور کرنے تک محدود رکھوں گا جو نسبتاً زیادہ پائدار حالت میں ہیں اور جن پر وسیع مفہوم میں ”وفاقی مملکت“ کی اصطلاح کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

میں ابتداہی میں یہ ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ وفاقی مملکت مرکب سلطنت کی صرف ایک نوع ہے۔ جیساکہ میں اپنی تصنیف ”مبادی سیاسیات“ (Elements of Politics) میں کہہ چکا ہوں، جس مملکت میں ایسے اجزا شامل ہوں جن میں کسی نہ کسی وجہ سے

سیاسی علیحدگی کا وقوف ایک نمایاں حد تک پہونچ گیا ہو، اس کو مرکب مملکت کہہ سکتے ہیں، خواہ اس کے اجزا کی حکومتیں باقاعدہ طور پر ایک ہی اعلیٰ جماعت مقننہ کے اس حد تک زیر نگرانی ہوں کہ اس کے دستور کو رسمی طور پر "وحدانی" دستور کہہ سکتے ہوں۔ جو مملکت اس طرح پر مرکب ہو اگر وہ کسی عمومی حکومت کے تحت میں ہو اور اس کی اعلیٰ مجلسی جماعت مقننہ کا انتخاب اس کی قلمرو کے صرف ایک جزو کے باشندے کرتے ہوں، یا وہ مجلس صرف ایک ہی جزو قلمرو کے باشندوں پر مشتمل ہو، تو اس صورت میں اس مملکت کے دوسرے اجزا بالعموم اس حصہ کے توابع کہلاتے ہیں جس کے سامنے مجلس مقننہ باضابطہ جوابدہ ہوتی ہے، اور عملاً اسی قسم کا فرق حکومت کی اور دوسری شکلوں میں بھی ہو سکتا ہے خواہ اس کے باشندوں کے حصۂ کثیر کے رسمی آئینی دستوری حقوق مملکت کی تمام قلمرو میں یکساں ہوں، مثلاً مطلق العنان بادشاہی کے تحت میں اگرچہ مملکت کا کوئی حصہ باضابطہ طور پر کسی دوسرے حصہ کا ماتحت نہیں ہو سکتا مگر عملاً ایسا ہو سکتا ہے۔ بادشاہ ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے اعلیٰ ماتحتوں کا انتخاب کلیتہً یا بیشتر اپنے زیر نگیں ممالک کے ایک ہی حصہ سے کرے اور خود عملاً تمامتر اسی حصہ کی رائے عامہ کے زیر اثر ہو۔ تبعیت کی یہ صورت خواہ باضابطہ ہو یا صرف عملاً، اس سے بددلی کا پیدا ہونا لازمی ہے اور اغلب یہی ہے کہ جو قومیں حکومت عمومی کی عادی ہوں اور تہذیب و تمدن میں اپنے کو اس حاوی قوم کے برابر خیال کرتی ہوں، وہ دائماً اس ماتحتی پر رضامند نہ رہیں گی البتہ اس صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ ان کی وسعت میں بہت ہی زیادہ فرق ہو، یا یہ کہ سیاسی حقوق سے دستبرداری کا معاوضہ معاشی فوائد سے ہو جاتا ہو، لیکن پھر اس صورت میں ظن غالب یہ ہے کہ اس سے مملکت کے حاوی حصے کے باشندوں کا رشک و حسد بھڑک اٹھے گا۔ پس جب تک کہ اس قسم کی مرکب مملکت میں ایک حصہ اپنی وسعت و قوت کے لحاظ سے دوسرے حصص پر بے اندازہ غالب نہ ہو اس وقت تک یہ میلان رہے گا کہ اس کے اجزا کے مابین سیاسی امتیازات میں کم و بیش مساوات پیدا ہو جائے، اور اس کے ساتھ اگر یہ عام خواہش بھی ہو کہ مجموعۂ اعظم میں اتحاد کے ساتھ ہی، اجزائے سیاسی علیحدگی کی طرف سے بھی اطمینان ہو جائے تو اس صورت

یہ مزید میلان بھی پیدا ہو جائے گا کہ حکومت کلی اور حکومت جزوی کے فرائض کے درمیان ایسے دستور کے ذریعہ سے تفریق کر دیجائے جس میں کل مجموعہ کی مشترک جماعت متقننہ کے ترمیم کرنے کی مجاز نہ ہو، یا کم از کم یہ کہ قانون سازی کے معمولی طریق عمل سے اس میں تغیر نہ ہو سکتا ہو۔

میرا خیال یہ ہے کہ وفاقی مملکت کے متعلق زمانۂ جدید کا جو اندازہ کیا جاتا ہے اس کے حقیقی اوصاف وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے، یعنی وہ ایک مجموعہ ہے جو اجزا سے مرکب ہے، یہ اجزا سیاسی حیثیت سے کم و بیش مساوی المرتبہ ہیں اور مجموعہ کی حکومت اور اجزا کی حکومت کے درمیان، حکومتی فرایض کے متعلق دستوری طور پر صاف و قطعی اور اس کے ساتھ ہی متوازن و مستحکم تقسیم قائم ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے آخر الذکر وصف بعد میں حاصل ہوا ہے۔ تاریخی وفاقیتوں کی ممتاز مثالوں میں ہم مدت تک اس قسم کی صاف و قطعی دستوری تقسیم اختیارات نہیں دیکھتے، اگرچہ اجزا ایک مجموعہ کے اندر پر زور طور پر متفق ہونے کے ساتھ ہی عملاً اپنی خود مختاری پر بھی قائم تھے۔ اس لئے تقسیم اختیار میں صفائی و قطعیت کی بہ نسبت کسی حد تک توازن اختیار زیادہ حقیقی و لازمی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر اس قسم کی صاف تقسیم نہیں ہے تو پھر اجزا اور مجموعہ کی حکومتوں کے درمیان ناچاقی و تصادم کا خطرہ اور وفاقی مملکت کے انصافی توازن اختیار کے برقرار رکھنے کی دشواری صاف عیاں ہے۔ پس انیسویں صدی میں جبکہ دستوری خیالات اچھی طرح ترقی کر گئے ہیں، معمولی جماعت متقننہ جو ان معاملات پر قوانین وضع کرتی ہے جنھیں آئینی تقسیم اختیارات کے بموجب اجزائی ریاستوں کے لئے محفوظ نہیں کیا گیا ہے، اور (بالفاظ آسٹن) اس غیر معمولی جماعت متقننہ کے درمیان جسے اساسی دستور کی تبدیلی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، ان دونوں کے درمیان اس تقسیم کی برقراری بالطبع اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ امتیاز بھی شامل رکھتی ہے۔ یہ فرق فردی مملکت میں بھی پیدا ہو سکتا ہے مگر کسی منتظم و ہم آہنگ وفاقی مملکت کی طبعی حفاظت صرف اس طرح سے ہو سکتی ہے۔

اس سے وفاقی مملکت کے بقاء و قیام کے متعلق ایک عجیب الاختلاف نتیجہ پیدا ہوتا ہے، ایک جانب تو اجزا کی بڑھی ہوئی خود مختاری سے اس کا میلان

یہ ہوتا ہے کہ وحدانی مملکت کی بہ نسبت اس میں ارتباط کم ہوجائے، یعنی اگر ناچاقی پیدا ہو تو اس کے اجزا زیادہ آسانی وسہولت کے ساتھ الگ ہو سکتے ہوں۔ شمالی امریکہ کی خانہ جنگی (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء) سے یہ امر بہت واضح ہوگیا ہے۔ اگر ممالک متحدہ امریکہ کی حیثیت وحدانی مملکت کی ہوتی اور اس کے ایک حصہ میں غلامی رائج ہوتی تو بھی بیشک خانہ جنگی برپا ہو سکتی تھی مگر اس صورت میں یہ دشوار تھا کہ باغی ایسے مستحکم مجموعات میں کٹ کٹ کر الگ ہوجاتے جیسے ظاہری ترتیب و انتظام کے ساتھ جنوبی ریاستوں نے یکے بعد دیگرے اپنے کو اتحاد سے الگ کرنے کی قرار دادیں منظور کیں، اور شمالی ریاستیں دم بخود دیکھتی کی دیکھتی رہیں، دوسری طرف جب تک اختلال و انتشار کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک دستور غیر معمولی طور پر مستحکم رہتا ہے، اس کی مثال بھی ممالک متحدہ امریکہ سے ملتی ہے، جہاں دستور سلطنت میں ترمیم کے لئے وفاقی ریاستوں کے تین ربع کی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے سو برس تک تقریباً کسی قسم کی ترمیم نہ ہو سکی بجز اس کے کہ خانہ جنگی کی وجہ سے حبشیوں کی رائے دہی کے معاملہ میں ایک عظیم الشان تغیر کرنا پڑا۔

مجموعہ کی مرکزی حکومت اور اجزا کی جداگانہ حکومت کے درمیان فرائض کی تقسیم لازماً مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ خارجی تعلقات کے لئے وفاقیہ مختار کار اور داخلی معاملات کے لئے ہر جزو کو مختار ہونا چاہیئے، مگر اس سے (۱) یہ اصول نہیں طے ہوتا کہ جو مسائل اجزا کے لئے خارجی حیثیت رکھتے ہیں اور مجموعے کے لئے داخلی حیثیت رکھتے ہیں ان کا تصفیہ کیونکر ہو، اس سے مراد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق اجزا کے روابط باہمی سے ہے، مثلاً آپس میں آزادانہ تجارت کا مسئلہ۔ (۲) بعض مسائل ایسے ہیں جو ظاہری اعتبار سے اجزا کے لئے داخلی مسائل ہیں مگر اس اعتبار سے کہ ان میں عدم اتحاد کی وجہ سے فساد یا دقت نہ پیدا ہوجائے مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ انھیں مجموعے کی حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ (مثلاً) اس صنف میں ضرب سکجات، افلاس، اجارہ جات ایجاد، اور بالعموم تجارتی قانون، تعزیری قانون وغیرہ داخل ہیں، جو معاملات

ان دونوں اصناف سے تعلق رکھتے ہیں وہ موجودہ زمانہ کی وفاقی مملکتوں میں مختلف الوسعت حد تک مرکزی حکومت کے قبضے میں رہنے دیئے جاتے ہیں۔

۵۔ اب ہمیں ان شرائط پر غور کرنا چاہیئے جن کے تحت میں دستور کی وفاقی صورت موزوں ہوتی اور طبعاً اس کے پیدا ہونے کا میلان پایا جاتا ہے ان حالات میں سب سے زیادہ اہم خارجی تعلقات میں قوت کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت تاریخ کے اس تمام دور میں قائم رہی ہے جس کا بہت قریبی زمانہ تک ہم نے سراغ لگایا ہے اور اب تو اس کی اہمیت تمام سابقہ زمانوں سے زیادہ بڑھ گئی ہے جس جگہ ایسی قومیں قریب قریب میں آباد ہوتی ہیں جو اپنی حقیقی خود مختاری کے قائم رکھنے کے لئے مضطرب ہوتی ہیں مگر انھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ فرداً فرداً وہ اتنی کمزور ہیں کہ اپنے قرب وجوار کی زبردست سلطنتوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتی ہیں وہاں وفاقی اتحاد حصول بقا کا صریحی وبدیہی ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یونانی تاریخ کے تمام دور میں وفاقیت نے جو کچھ کارنمایاں کیا ہے اس سے اس کی مثال روشن نظر آرہی ہے، اور تاریخ ازمنۂ وسطی کے دور آخر اور تاریخ زمانۂ جدیدہ کے دورِ ابتدائی میں وفاقی اتحاد کے لئے جو کچھ کامیاب یا ناکامیاب کوششیں بارہا کی گئیں ہیں ان سے بھی اس کی مثال کچھ کم عیاں نہیں ہوتی۔

چنانچہ جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں، ان پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی جرمنی کے "ہنسیائی" شہروں کی لیگ تجارتی معاد کے برقرار رکھنے کے لئے قائم ہوئی تھی اور یہی حال رائن کے شہروں کی لیگ کا تھا۔ سوئزرلینڈ کے زیادہ دیرپا وفاقی اتحاد کی ابتدا پہاڑیوں کی چھوٹی چھوٹی کسان جماعتوں کی اپنی خود مختاری کو قائم رکھنے کی کوشش سے ہوئی اور ہالینڈ کے صوبوں کا اتحاد سولھویں صدی کے ربع آخر میں اسپین کی ستمگار فوجوں کے مقابلے میں خطرناک دلیرانہ جدوجہد کی وجہ سے وجود پذیر ہوا۔ ان تمام صورتوں میں یہ صاف واضح ہے کہ خارجی معاملات میں تقویت مزید کی ضرورت کے سوا کوئی امر ایسا نہیں تھا جو ان اتفاق کرنے والی قوموں میں اتنے پائدار قسم کا اتحاد پیدا کر دیتا۔ لہذا جزوی وفاقیت کی وہ مختلف النوع کوششیں جو تیرھویں صدی کے بعد سے رومانی جرمانی شہنشاہی کی

خصوصیت خاص بنگئی تھیں ان کا باعث زیادہ تر مرکزی حکومت کی کمزوری تھی۔

حال کے زمانہ میں ممالکِ متحدہ امریکہ میں جو صورت پیش آئی اس میں بھی انگلستان کی جن نوآبادیوں نے ملک مادری کا جوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا تھا اور ابتداً وہ ایک دوسرے سے جدا تھیں ان کی باہمی رقابت اور جب آزادی بہ حیثیت مجموعی قطعاً غالب آجانیوالا امر یہی محرک تھا، تاہم ممالک متحدہ امریکہ کی حالت میں پہلا وفاقی اتحاد جنگ خود مختاری کے باعث وقوع میں آیا مگر ۱۷۸۹ء والے پایدار اتحاد ثانی کے قائم ہونے میں تجارتی خیالات کو بھی اہمیت حاصل تھی، اور آئندہ بھی جب تک مختلف سلطنتیں اپنے وقتی انتظامات محاصل درآمد و برآمد کے ذریعے سے اپنے بازاروں سے غیر ملکی پیداوار کو خارج کرتی یا ان میں وقت حائل کرتی رہیں گی اس وقت تک اس قسم کے خیالات بظن غالب اہم اثر پیدا کرتے رہیں گے۔ عام طور پر کسی بڑی مملکت کے ارکان کے لئے فی الجملہ یہ مفید ہوگا کہ ایک زیادہ وسیع رقبہ میں تقلیہ تجارت کے مفاد سے مستفید ہوں بشرطیکہ داخلی تجارت ہی کسی قسم کی روک نہ ہو۔ ممالک متحدہ کی مثال جب اس حیثیت سے پیش کی جاتی ہے کہ وہ تحفظِ تجارت سے حاصل کردہ خوشحالی کا ایک نمونہ ہے تو اس کا صاف جواب یہ ہے آزاد تجارت کا بڑے سے بڑا رقبہ جو اب تک کہیں عالم وجود میں آیا ہے وہ یہی ممالک متحدہ امریکہ ہے۔

۶۔ اب میں وفاقیت کی اس حیثیت کی طرف پلٹتا ہوں کہ وہ نظم وامن کو قائم رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آزادی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور اس حیثیت میں وحدانی سلطنت کی بہ نسبت جدید عمومیت کے تخیل سے زیادہ ہمنوا معلوم ہوتی ہے۔

عمومی اقتدار اعلیٰ کا جو اصول مسلمہ روسو نے شایع کیا تھا وہ ایک ہمہ گیر اصول تھا، اور جب روسو کی بلا واسطہ عمومیت کا تخیل ایک مرتبہ ترک کر دیا گیا تو صاحبِ اقتدار اعلیٰ قوم کے حدود کا اصولی تعین کسی قدر مبہم چھوڑ دیا گیا، پس جب فرانس میں تغیر کے بحران عظیم کے بعد ہی، فرانس کو مرکز قرار دیکر انقلابی تبلیغ شروع ہوئی تو یہ بہت آسانی کے ساتھ قومی حدود کے توسیع کی قدیم خواہش کیساتھ غلط ملط ہو گیا اور اس طرح جمہوری نظریے کے نام سے یورپ کے نشوونما آزادی کی

پرجوش اشاعت کے بعد نپولین کا ان کوششوں کی طرف عود کر جانا کہ یورپ کے اندر فرانس کی شہنشاہی حیثیت قائم ہوجائے، یہ کوئی ناگہانی تغیر نہیں تھا۔ "قومیت" کی تحریک (جو انیسویں صدی کا ویسا ہی وصفِ خاص ہے جیسے تکوین دساتیر) وہ جس طرح فرانس کی انقلابی تحریک کے تسلسل میں داخل تھی اسی طرح وہ اس کے خلاف رجعتِ قہقری بھی تھی، اور "مظالم اکثریت" کے خطرے کا صاف و صریح اندیشہ جسے روسو نے نظر انداز کر دیا تھا اور جس پر ٹوک ویل کے مانند دوسرے مصنفین نے زور دیا ہے، اس اندیشہ نے آزادی کی اس اہم ضمانت کی طرف توجہ دلائی جو مقامی حکومت خود اختیاری سے حاصل ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دوسری جانب بھی اہم ملحوظات موجود تھے، اور یہ بھی خیال رہے کہ کوئی ملک جس قدر زیادہ مہذب اور جس قدر زیادہ آباد ہوتا جاتا ہے اسی قدر یہ ملحوظات زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں۔ مقامی مجالس مقننہ میں بالاوسط تدبر کی روشن خیالی کی توقع نسبتاً کم کرنا چاہئے اور حاوی طبقے کے مفاد میں مضر قوانین کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے غلبہ و استیلا کو مجموعی ملک کی بہ نسبت متعدد اضلاع میں سے کسی نہ کسی ضلع میں زور دکھانے کے مواقع زیادہ مل جاتے ہیں، لیکن اس وقت مجھے جس امر سے بحث ہے وہ یہ ہے کہ جو قومیں پہلے سے آزاد ہوں ان کے اتحاد کے علاوہ یہاں ایک اور طریقہ ہے جس کی وجہ سے زمانۂ جدید میں وفاقیت کو ترقی کا موقع مل گیا ہے، وہ یہ کہ جو مملکتیں پہلے فردی طرز کی تھیں ان میں احساس قومیت کے اثر کے تحت مستحکم مقامی آزادی قائم ہوگئی ہے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس قسم کی مملکتوں میں اکثر ایک طرح کے وفاقی اصول کا اثر تھا اور اس پر صرف مشترک شاہانہ حکومت کے استیلا کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا تھا جاگیری دور اور جاگیریت کے بعد کے ارتقائی دور میں ان مملکتوں کی تکوین بالطبع اس طرح ہوتی تھی کہ موروثی امرا دوسرے ممالک کی وارث عورتوں سے عقد کر لیتے تھے۔ آسٹریا اس کی ایک نمایاں مثال باقی ہے مگر اور بھی بہت سی مملکتوں کی یہی حالت تھی، صرف ازمنۂ وسطیٰ کے نیابتی ادارات کے زوال اور شاہی طاقت کی ترقی نے بتدریج وفاقی اصول کو محو کر دیا۔

۷۔ دستوری بادشاہی کی آئندہ حالت کی پیشینگوئی کرنا مجھے منظور نہیں مگر وفاقیت کے ارتقا کی نسبت کچھ پیشینگوئی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسکی وجہ کچھ تو طریق عمل کا وہ عمومی میلان ہے جس کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے اور کچھ وجہ وہ رجحان ہے جس کا اظہار تمدن کی تمام تاریخ میں ہوتا رہا ہے وہ یہ کہ وسیع تر سیاسی معاشرے برابر "ترکیب تامہ" حاصل کرتے جاتے ہیں جو تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی معلوم ہوتی ہے (یہ "ترکیب تامہ" کا لفظ اسپنسر کا ہے)۔ یونانی اطالوی شہری مملکتوں کی ابتدائی تاریخ میں بھی میں اس میلان کا پتہ دے چکا ہوں، ارو ما و ایتھنز بظاہر ایسے عناصر کے اجتماع سے بنے تھے جن میں سابقاً عناد کی حالت قائم رہ چکی تھی، ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جرمانی قبائل کی تاریخ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برابر وسیع و وسیع تر مجموعے میں متحد ہوتے جاتے تھے اور اسے تو ہم خصوصیت سے دیکھ چکے ہیں کہ تیسری صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کے جانشینوں کی جنگ وجدل میں جب یونانی شہر چالیس برس تک بے بسی کے ساتھ زیر وزبر ہو چکے (اور یہ محض اس وجہ سے ہوا کہ یہ شہر اپنی قلت وسعت کی وجہ سے ان کی فوجوں کی تاب نہیں لا سکتے تھے) تو پھر اس کے بعد اکائیائی لیگ کی تجدید ووسعت نے انھیں حقیقی خود مختاری کا ایک مختصر زمانہ عطا کیا۔ (وہ قدیم لیگ جس میں اکائیہ کے نسبتاً مختصر شہر شامل تھے، اسی کے ساتھ اب متعدد اہم شہری مملکتیں متحد ہو کر ایک جماعت بن گئی تھیں)، حال کے زمانے میں ہم نے جرمنی و اطالیہ کی تکوین میں بھی یہی میلان دیکھا ہے اور شمالی امریکہ سیاسی معاشرے کی ایک ایسی موثر مثال پیش کرتا ہے جس میں مغربی یورپ سے ایک وسیع تر قطعۂ ارض پر اندرونی امن قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اس تخیل کو تخمین پیش بینی کے حدود سے باہر نہیں سمجھتا کہ مغربی یورپی سلطنتوں میں کوئی اس سے بڑھی ہوئی "ترکیب تامہ" وقوع پذیر ہو جائے، اور اگر ایسا ہوا تو اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی مثال کی تقلید کیجائے گی اور جدید سیاسی مجموعہ ایک وفاقی دستور کی بنیاد پر قایم ہو گا۔ ؎۱

؎۱ ملاحظہ ہو "مبادی سیاسیات"، باب چہاردہم فقرہ ۔ ۱ ۔

جب میں اپنی نگاہ کو ماضی سے مستقبل کی طرف پھیرتا ہوں تو مجھے شکل حکومت کے متعلق سیاسی پیشینگوئیوں میں سب سے زیادہ اغلب پیشینگوئی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وفاقی اصول کو وسعت ہوگی ۔

تمّت

ضمیمہ

تعلیق (الف) متعلقہ صفحہ ۹۰

اہلِ اسپارٹا کی تعداد کا زوال

اہلِ اسپارٹا کی تعداد کا زوال نہایت ہی متحیر کن ہے۔ ہیروڈوٹس (جلد ۷، صفحہ ۲۳۴) جنگ تھرموپلی کے وقت (یعنی سنہ ۴۸۰ ق م میں) اہلِ اسپارٹا کا شمار تقریباً آٹھ ہزار کا کرتا ہے۔ گلبرٹ ("قدیمیات ممالک یونان" (Gilbert: Griech. Staatsalt) یہ اندازہ لگاتا ہے کہ سنہ ۳۷۱ ق م میں ان کی تعداد پندرہ سو سے کچھ یوں ہی سی زائد تھی۔ ارسطو تقریباً سنہ ۳۳۰-۳۲۲ ق م میں "ایک ہزار بھی نہیں" قرار دیتا۔ پلوٹارک ("اگے سی لاؤس" ۵) سنہ ۲۴۳ ق م میں صرف سات سو بتاتا ہے، جن میں سے صرف سو آدمی مالکان اراضی و اقطاع مفوضہ تھے باقی لوگ شہر میں ایک ایسے انبوہ کی طرح سکونت رکھتے تھے جن کا نہ کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ وہ کسی طرح کے حقوق رکھتے تھے۔ اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ (۱) اہلِ اسپارٹا کی آبادی میں نمایاں زوال سنہ ۴۸۰ ق م اور سنہ ۳۷۱ ق م کے درمیانی برسوں میں ہوا اور (۲) کامل الاوصاف شہریوں میں نمایاں زوال سنہ ۳۳۰ ق م اور سنہ ۲۴۳ ق م میں ہوا، کیونکہ ارسطو کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ افلاس کی بنا پر اخراج بہت بڑی حد تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اپی تادیوس کا قانون شقِ اول کی توجیہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپی تادیوس اس زمانے سے قبل نہ ہو گزرا ہو جس کا تعین پلوٹارک نے کیا ہے ("اگے سی لاؤس" ۵) میں کریتوس (مقالۂ دوم باب اول) سے اتفاق رائے کرنے کی طرف مائل ہوں کہ حقوق شہریت تربیت یافتہ غیر شہریوں کو عطا کئے جاتے تھے جو بعض اوقات اہلِ اسپارٹا کی ناجائز اولاد ہوتے تھے۔ بعض اوقات "موتھاکیں"

یعنی ہیلوت یا غیر ملکی (زینوفون: ہیلے نیکا ۵، iii، ۹) جن کی پرورش و تعلیم اسپارٹیوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح پر بادشاہ کی منظوری سے تبنیت کے ذریعہ سے تعداد قائم رکھی جاتی تھی مگر محض اس کے مسدود ہو جانے سے اہل اسپارٹا کی اس کمی کی توجیہ نہیں ہو سکتی جو ٹھہر ہو چکی کے مقابلہ میں جنگ پیلو پونیسر میں تھی۔ یہ ممکن ہے کہ جو طبقہ بعد میں "نیو داموڈیس" کہلاتا تھا اسے ہیروڈوٹس نے اہل اسپارٹا کے ساتھ خلط کر دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ طبقہ اہل اسپارٹا کے دوش بدوش لڑتا ہو اور بعد میں تفریق زیادہ سخت کر دی گئی ہو؟

بوسولٹ (قدیمیات یونان ۱۰۱) اسپارٹا کی اس سریع تنزل آبادی کو دو اسباب سے منسوب کرتا ہے (۱) مسلسل لڑائیوں کے نقصانات (۲) اختلال خاندانی اور عیش و عشرت لیکن (۱) لی کرگوس کے وقت سے جنگ ایران تک بھی اہل اسپارٹا کو اسی طرح جنگ کرنا پڑی تھی (۲) یہ سبب، بوسولٹ کے بیان کردہ اسباب و عمل کے بموجب چوتھی صدی میں کچھ یوں ہی سا عمل کر سکتا تھا درانحالیکہ بہت بڑا زوال سنہ ۴۸۰ ق م سے سنہ ۳۷۱ ق م تک ہوا، مگر بوسولٹ کا دعویٰ یہ ہے اور میرے خیال میں یہ دعویٰ بلا کافی دلائل کے ہے کہ سنہ ۴۱۸ ق م میں بمقام مین ٹی نیہ چھ ہزار اہل اسپارٹا تھے (کتاب متذکرہ بالا ۹۸) یہ سنہ ۴۱۸ ق م سے سنہ ۳۷۱ ق م تک کے تنزل آبادی کو بالکل ناقابل تشریح بنا دیا ہے۔

تعلیق (ب) متعلقہ صفحہ ۹۴

سوار اور عدیدیت

میرے خیال میں بادشاہوں کے بجائے "مبارزوں کی حکومت" قائم ہو جانے کے بعد (ارسطاطالیس: سیاسیات ۶ (۴)، ۱۳) کے پہلے نظم حکومت کے متعلق ارسطو کی تعمیم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک باقاعدہ ہمہ گیر صداقت ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک تاریخی اہمیت و عام قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ متعدد مملکتوں میں سوار عام جمعیت کے ارکان متوازی الوجود رہے ہوں اور انھیں کچھ سیاسی فرائض حاصل رہے ہوں، لیکن جس واحد صورت میں ہم قطعی طور پر ایسے سیاسی دستور کا ذکر سنتے ہیں یعنی

ایوس ہی کیسے کے مقام وہاں پر ہمارے سامنے اصلی دستور نہیں ہے بلکہ اس کی توسیع شدہ شکل ہے
اس گمان کی کوئی وجہ نہیں کہ تھسلی میں عدیدیت (یا عدیدیتوں کا مجموعہ) جو بظاہر مشترک
بادشاہ کی خفیف نگرانی میں غیر محدود زمانہ تک برقرار رہی وہ اس قسم کی عدیدیت تھی یا
یہ کہ تھسلی کی سوارہ فوج تمام تر ایسے اشخاص پر مشتمل تھی جو اپنی اس حیثیت میں سیاسی حقوق
رکھتے تھے۔ چوتھی صدی میں دیموس تھینس (اعیانیت" Anstocr (۶۸۰ ب) دنتیظیم فرسالوی
Syntox) ۳ ، ۷) کا ذکر کرتا ہے کہ وہ دو سو یا تین سو سواروں اور اپنے خانگی خدام کی
فوج کے ساتھ شامل ہوے۔

اور میں اس کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ پانچویں صدی یا اس سے قبل کی سوارہ
فوج کیوں نہ زیادہ تر اسی طریقہ پر بنی ہو۔

تعلیق (ج) متعلقہ صفحہ ۱۰۱

ابتدائی عدیدیت اور تجارت

تاجروں کے مخالف احساس کا زمانہ مقرر کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے
وقوع سے پہلے کا نہ بتا دیا جائے اس کا کوئی کافی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ احساس ابتدائی
اعیانیت یا عدیدیت کے زمانوں میں موجود تھا۔
"اوڈیسی (کتاب اول ۱۸۰) میں اتھینیا نے جو خصوصیت اختیار کی ہے وہ جہاز رانی
سے محبت رکھنے والے اہل تافیانا کے حکمراں" کی یہی خصوصیت ہے جو ایک بحری مہم
پر تانبا خریدنے کے لئے تیمیز کو جا رہا تھا، اور اپنے مال تجارت کے طور پر چمکدار
لوہا لے جا رہا تھا" میرے خیال میں اس بیان کی اہمیت اس اظہار حقارت سے
زیادہ ہے جو اوڈیسی (کتاب ہشتم، ۱۵۶) میں سوداگروں کو غیر ورزشی کہنے سے
ہوئی ہے۔ نیز سافو کا بھائی جو بظاہر اچھے خاندان کا شخص معلوم ہوتا ہے، وہ تاجر
کی حیثیت سے لسبوس سے نوکراتس کو شراب لے جاتا تھا (اسٹرابو ۱۷، ۸۰۸) اسی طرح سے سولن
کی نسبت یہ نہیں ظاہر کیا گیا ہے کہ تجارت میں مشغول ہونے سے وہ ذات سے خارج ہو گیا تھا

یقینی ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں یوبیہ کے بڑے بڑے شہروں کے متعلق ہم جو کچھ سنتے ہیں، اس میں تجارتی و زرعی دولت کے درمیان اس قسم کی کسی رقابت کا نشان نہیں پاتے۔ ہیپوبوٹے کے تحت میں تقریباً ایک صدی تک آباد کارانہ اور تاجرانہ زندگی بسر کرنے کے بعد، کالکس نے ایریتریہ سے قدیم شجاعانہ انداز کے ساتھ زرخیز میدان کے متعلق جنگ کی۔ ایسا ہی مگارہ میں ہوا، ایک صدی سے زائد تاجرانہ سعی و کوشش کے بعد (جس میں مگارہ کورنتھ سے سسلی کے معاملات کے بابت مقابلہ کر رہا تھا، اور اس سے زیادہ موثر طور پر بحیرۂ اسود کی تجارت کے لئے ملطہ سے لڑ رہا تھا، اور دونوں جگہوں (خاص کر پرد پونتس) میں کامیاب نوآبادیاں قائم کر رہا تھا) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سنہ ۶۳۰ ق م کے قریب جس ہنگامہ نے مطلق العنانی کے لئے موقع پیدا کر دیا وہ عام چراگاہ پر دولتمندوں کی مداخلت کا فساد تھا (ارسطو، سیاسیات" ۸ (۵) ۵، باب ۵) ایک صدی کے بعد، دولت کی رقابت کا تلخ اظہار تھیوگنس نے کیا ہے مگر یہ مطلق العنانی کے بعد ہوا ہے اور یہ تلخی ادنیٰ لوگوں کے خلاف ہے نہ کہ تاجروں کے خلاف بحیثیت تجار کے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قرضداروں اور قرضخواہوں کے درمیان جو تنازعات ہوئے اور جن کی ایک جھلک ہمیں ایتھنز میں اس طرح نظر آتی ہے کہ یہی تنازعات سولون کے وضع قوانین کا باعث ہوئے اور مگارا میں بھی یہی صورت کچھ بعد میں پیش آئی (پلوٹارک: "مسائل یونان") ان مناقشات میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ قرضخواہ قدیم خاندان کے دولتمند زمینداروں سے کسی مختلف طبقہ کے لوگ ہیں۔ تمام تحریروں ("حیات سولون" مصنفہ پلوٹارک اور نیز اسی مصنف کے رسالہ نظم حکومت ایتھنز سے مقابلہ کیجئے) ان تصانیف سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "پرانے وقتوں کے دولتمند تھے جو غریب کسانوں کو بہر صورت ان نئے دولتمندوں سے کم نہیں ستاتے تھے جنھوں نے زمین حاصل کر لی تھی۔ میں بوسولٹ (قدیمیات ۳۴) سے متفق ہوں کہ اغلباً یہ تصادم کم از کم جزاً اقتصادیات فطری سے اقتصادیات زر میں بدل جانے کے باعث تھا جبکہ تقریباً ساتویں صدی کے آغاز میں چاندی اور سونا مسکوک ہونے لگا اور بلاشبہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ قدیم خاندانوں کے حلقے میں نئی دولت دخیل ہو گئی یعنی مناکحت میں نسبت کے بجائے دولت کا زیادہ لحاظ رہنے لگا جس کے متعلق تھیوگنس یہ سخت شکایت کرتا ہے کہ "لوگ گھوڑوں میں نسل کا

خیال کرتے ہیں مگر بیبیوں کے بارے میں نسل کا خیال نہیں کرتے' اور عورتوں کی بھی یہی حالت ہے'' (تھیوگنس - ونتہ - ۴۴) اس سے ضمناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مگارا میں عورتوں کو انتخاب زوج میں گونہ غیر متوقع آزادی حاصل ہوگئی تھی سولون کے دستور مملکت میں جو تغیرات ہوئے جن کے بموجب قدیم خاندان کے بجائے دولت کامل سیاسی امتیازات کی بنا قرار پاگئی، اس قسم کے تغیرات بھی اسی کا نتیجہ تھے۔

ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دستکاروں اور خردہ فروشوں کے اخراج سے سوداگروں کا اخراج لازم نہیں آتا۔ مثلاً تھبز کا یہ طریق[عله] کہ سیاسی امتیازات صرف انھیں لوگوں کو دئے جاتے تھے جو برائے چندے ذلیل پیشہ وری سے پرہیز کرتے تھے اس کا اطلاق ایسے لوگوں پر نہ ہونا چاہئے جو بڑی قسم کی تجارت کرتے تھے۔

تعلیق (د) متعلقۂ صفحہ ۱۰۷

تہذیب و تمدن میں یونانی نوآبادیوں کا تقدم

تہذیب و تمدن میں یونانی نوآبادیوں کے تقدم سے زیادہ کوئی امر نمایاں نہیں ہے۔ مثلاً، فلسفہ، دو صدیوں تک نوآبادیوں ہی میں رہا، اس کا آغاز ایشیائے کوچک میں ہوا اور کچھ دنوں تک وہیں مرکوز رہا، بعد ازاں اس کی تاریخی دلچسپی زیادہ تر اطالیہ اور سسلی کی جانب منتقل ہوگئی۔ پانچویں صدی کے وسط کے قریب جنگ ایران کے بعد جب اتھنز کو فوقیت حاصل ہوئی ہے، اس وقت فلسفہ کو گویا اس کا طبعی وطن ملگیا۔

تہذیب و تمدن کا یہ تقدم بلا شبہ کسی حد تک زیادہ بڑھے ہوئے طبعی فوائد فائق کی وجہ سے تھا، یعنی (۱) زمین کی زرخیزی خاص کر اطالیہ ("یونان کبیر") میں جہاں اس زرخیزی کی وجہ سے سیبارس کا تمول و تنعم چھٹی صدی میں ضرب المثل ہوگیا۔ (۲) توسع کی زیادہ قدرت یعنی ملک کے اصلی باشندے تمدن کی ایسی پست حالت میں تھے کہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، کم از کم ابتدائی دو صدیوں تک یعنی ۷۵۰ سے جب کہ آباد کاری کا زیادتی کے ساتھ

عله۔ ارسطو، سیاسیات، حصہ ۷ (۶) باب ۷۔

آغاز ہوا چھٹی صدی کے اختتام تک۔ (بعد میں سامنی، لوکانی، اور بیرونی اقوام کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور اطالوی یونانی ساحل تک ہٹ گئے) مزید براں یہ بھی اغلب ہے کہ اس زمانہ کی طرح اُس زمانہ میں بھی مستعمرات میں مملکت مادری کی قوت و مبادرت کا بڑا حصہ شامل ہو جاتا ہوگا، اور وہاں ایسے سیاسی ادارات سے آغاز ہونے لگا ہوگا جو قدامت کے ان عناصر سے پاک رہے ہونگے جن سے ترقی میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ ان کا خطرہ یہ رہا ہوگا کہ قدیم سیاسی عادات سے منقطع ہو کر ان کی ترقی تیز ہوتی رہی ہوگی مگر اس کے نتائج نسبتاً کم پائدار و قابل اطمینان ہوتے رہے ہونگے، اور اگر مثالاً ایتھنز کا سرقوسہ سے مقابلہ کیا جائے تو یہی حالت معلوم ہوتی ہے۔

تعلیق (۵) متعلقہ صفحہ ۲۰۹

غلامی کے باب میں قانون اجانب اور قانون فطرت کے درمیان تضاد

فلورنٹینس کہتا ہے کہ غلامی قانون اجانب کا ایک دستور ہے جس کے بموجب ایک شخص دوسرے کے تحت میں "فطرت کے خلاف" آجاتا ہے جسٹی نین کے قوانین میں یہ امر اور بھی زیادہ صاف بیان ہوا ہے (۱، ۳، ۲)

رومن مقننین کو جن جماعتوں کا واقعی علم تھا، ان کے ہمہ گیر ادارات اور قانون طبعی کے باہمی تضاد کا مقننین کی جانب سے رضامندانہ تسلیم کر لیا جانا اس امر پر نظر کرتے ہوئے گو نہ حیرت افزا ہے کہ رواقیوں اور سسرو، نیز بعد کے مقننین سے فطرت کے قانون کے خاموشانہ جواز کی (بایں حیثیت کہ وہ اسے عقل ابدی کا قانون سمجھتے تھے) نہایت سخت الفاظ میں تائید کی ہے۔ پلوٹارک نے واقعاً رواقیوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ کسی مملکت کے کسی اثباتی قانون کے جواز کو اس حد سے زائد تسلیم نہیں کرتے کہ وہ فطرت اور عقل کے صحیح قانون کے مرادف ہو، اور یہ یقینی ہے کہ قانون فطرت کے متعلق سسرو کے الفاظ سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے مگر یہ زیادہ حیرت انگیز ہے کہ گائس یہ کہتا ہے کہ فطری حق کی دلیل پر اقتدار سیناتی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ملکی حقوق کو ملحوظ رکھنے سے فطری حق کی قوت متاثر نہیں ہوتی اور سیسل سوس

اس کی تصدیق کرتا ہے کہ فطرت جسے ممنوع قرار دیتی ہے کوئی قانون اسے جائز نہیں کر سکتا“

تعلیق (۹) متعلقہ صفحہ ۳۲۱

دوجے کے اختیار کا بتدریج محدود ہو جانا

سیاسیات کے جدید طالب علم کے لئے وینس کی تاریخ ویسی ہی دلچسپ ہے جیسی مملکتوں کے قدیم ترار تقاء میں اسپارٹا کی تاریخ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شاہی اختیار کی تدریجی تخفیف کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ وینس کا دوجے اگرچہ منتخب ہوتا تھا اور یہ انتخاب ایک ہی خاندان سے نہیں ہوتا تھا پھر بھی بقول سسمنڈی (جلد ۳۔ باب ۲) علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی عادل اعظم تھا مملکت کی تمام فوجوں کا سپہ سالار تھا، اس کا رسمی اعزاز شرقی شان و شوکت سے کسی قدر مشابہ تھا اور اکثر اسے یہ اختیار دیدیا جاتا تھا کہ وہ اپنے منصب کو اپنی اولاد کی طرف منتقل کردے۔ لہذا جس تدریجی کارروائی کے ذریعہ سے اس کے اختیارات محدود کئے گئے، انھیں شاہی سے عدیدیت کی جانب بڑھنے کی کارروائی کہہ سکتے ہیں۔

سنہ ۶۹۷ء میں اول اول ایک ڈیوک یا دوجے کے تقرر کے بعد تین دوجے ہوئے، اس کے بعد ڈیوک کا یہ منصب منسوخ کردیا گیا اور سالانہ صدارت کا تجربہ کیا گیا مگر یہ ناکافی پایا گیا اور سنہ ۷۴۲ء میں دوجے پھر واپس آگیا۔ آئندہ کی تین صدیوں میں دوجوں نے موروثیت کے لئے جدوجہد کی مگر ناکام رہے، اس کے بعد (جیسا کہ سسمنڈی کہتا ہے) سنہ ۱۰۳۲ء میں اسے دو مشیر دئے گئے جن کی رضامندی ہر ایک حکومتی فعل کے لیے درکار تھی اسے اپنے اختیار میں اپنے کسی لڑکے کو شریک کرنے سے ممنوع قرار دیا گیا، اور اسے مجبور کیا گیا کہ ہر اہم موقع پر سربرآوردہ شہریوں سے مشورت کرے، جو صلاح دینے کے لئے مدعو کئے گئے ہوں،“ (Pregadi) ایک سو چالیس برس بعد (قوم کی عام جمعیتوں کو منسوخ کئے بغیر جو اہم مواقع پر چودھویں صدی تک طلب کی جاتی رہیں) چار سو اسی شہریوں کی ایک سالانہ مجلس مشورت قائم کی گئی جسے وہ تمام اختیارات تفویض کئے گئے جنھیں دوجے عمل میں نہیں لاتا تھا اور بشرکت دوجے جمہوریت کا اقتدار اعلیٰ بھی اسے تفویض ہوا مگر

دوسرے اطالوی انتخاب کی طرح، اس مجلس کے معاملے میں بھی انتخاب براہ راست قوم کی جانب سے نہیں ہوتا تھا، ہر محلے سے دو ٹریبیون مقرر ہوتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک ٹریبیون مجلس کے لئے چالیس ارکان کا انتخاب کرتا تھا، کسی ایک ہی خاندان کے چار سے زائد افراد کے لینے کی ممانعت تھی۔ بارھویں صدی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ٹریبیونوں کا انتخاب قوم کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعد میں یہ انتخاب مجلس کے ہاتھ آگیا، مجلس نے اس حق مزید کا بھی دعویٰ کیا کہ اپنے سالانہ عہدے سے دست کش ہونے کے قبل ٹریبیون جو انتخاب کریں انھیں وہ چاہے منظور کرے، چاہے رد کردے، الغرض تیرھویں صدی میں یہ سالانہ منتخب شدہ مجلس جو بظاہر نیابتی معلوم ہوتی تھی، عملاً ایک جزو انتخابی کی جماعت بن گئی لیکن وینسی امرا، عدیدیوں کی معمولی زیادتیوں سے محفوظ رکھے گئے تھے اس لئے ان کے ایک طرف دوجے تھا اور دوسری طرف قوم کیونکہ اگر قوم کے ساتھ جسمانی کشمکش ہو تو وہ کسی ایسے فائدۂ فائقہ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے جیسے لمبارڈی کے امراء کو میدان میں جنگ ہونے کی صورت میں حاصل تھے یہی وجہ ہے کہ اطالیہ کے دوسرے شہروں میں، امرا کے خلاف انصاف کا نفاذ ایک ایسا معاملہ ہوگیا تھا کہ اسے کسی ایک شخص کے ہاتھ میں رکھنا پڑتا تھا جو عظیم الشان قوت سے مسلح ہو، اس کے برخلاف سنہ ۱۱۷۲ء میں وینس میں، تعزیری اختیارات دوجے کے ہاتھ سے نکال لئے گئے اور ایک مجلس کو سپرد کردیئے گئے جو مجلس اعظم کے چالیس ارکان پر مشتمل تھی اور جسے مجلس چہل بزرگان کہتے تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۲۲۹ء میں مجلس مدعوئین کی (جو دوسری جگہوں کی cuza Consiglio di cred- کی طرح کی تھی) تعداد ساٹھ معین ہوگئی، اور اسے مجلس اعظم کی انتخاب کردہ بنا دیا گیا۔ یہ جماعت، مجلس اعظم کے لئے بمنزلۂ "سابق الغور" مجلس کے تھی، اور اسے خاص طور پر تجارتی اور غیر ملکی معاملات کی نگرانی تفویض تھی۔ اس زمانہ میں پانچ "نگران مواعید دوجے" اور تین مفتش دوجے مقرر کئے گئے۔ ثانی الذکر کا کام یہ تھا کہ وہ اس کے چال چلن کی جانچ کریں اور بصورت الزام اس کے ورثا سے تاوان وصول کریں۔ "دوجے کے حلف کی اصلاح کرنے والوں" کی محنت سے سنہ ۱۲۴۰ء کے بعد سے "وعید ہائے دوجے" کا ایک بڑا مجموعہ طیار ہوگیا جس میں تیرھویں صدی تک برابر اضافہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ سسمنڈی کہتا ہے۔ ان وعدوں سے حقوق شاہی

میں کمی آجاتی ہے"۔ ڈوجے صرف یہی وعدہ نہیں کرتا تھا کہ وہ قوانین کو ملحوظ رکھے گا اور مجلسوں کے احکام کو عمل میں لائے گا بلکہ یہ بھی وعدہ کرتا تھا کہ وہ غیر ملکی قوتوں سے مراسلت نہیں کرے گا، رعایا جو خطوط اس کے نام بھیجے گی انھیں اپنے مشیروں میں سے کسی ایک کی موجودگی کے بغیر نہ کھولے گا، مملکت وینس سے باہر کوئی زمینداری اپنے قبضہ میں نہ رکھے گا، کسی فیصلہ میں استحقاقاً یا واقعاً مداخلت نہ کرے گا، مملکت کے اندر اپنی قوت کے بڑھانے کی کبھی کوشش نہ کرے گا، اپنے کسی رشتہ دار کو اپنی جانب سے جمہوریت کے اندر یا باہر کوئی ملکی، فوجی یا کلیسائی عہدہ نہ دے گا، کسی شہری کو یہ اجازت نہ دے گا کہ وہ اس کا ہاتھ چومے یا اس کے سامنے جھکے، شاہی شکلوں کے اندر رہکر عدیدیت کی جانب جو تقلیب ہوتی ہے اس کی عام خصوصیت کے برخلاف اس فہرست میں اصلیت کے بغیر ظاہر کو برقرار رکھنے میں عجیب غیر مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی توجیہ بالغالب یہ ہے کہ سب کچھ ہونے کے بعد وینس والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈوجے محض ایک رسمی وعدالتی شخص ہو کر رہ جائے۔

تعلیق (ز) متعلقہ صفحہ ۴۵۰

مرضی عامہ کے متعلق روسو کا خیال

ہمیں روسو (معاہدۂ معاشری، مقالۂ دوم۔ باب ۳) کے بموجب "مشیت عوام" میں (جو "مختلف مشیتوں کا مجموعہ ہے اور جس میں شخصی اغراض ملحوظ ہوتے ہیں") اور "مشیت عامہ" میں تمیز کرنا چاہئے جو صرف "مفاد عامہ" سے غرض رکھتی ہے۔ اگر ہم افراد کی مرضی کے ان عناصر کو جو ایک دوسرے کی تعدیل کرتے ہیں، بحث سے خارج کر دیں تو جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہی "مشیت عامہ" ہو گا۔ ادارۂ مملکت کی غایت جو "مشیت عامہ" ہے (مقالۂ دوم باب ۱) وہ صرف ان ہی عناصر پر مشتمل ہے جو مختلف قسم کے مفاد میں مشترک ہوں اور وہی سلطنت کے قوتوں کی جانب رہبری کر سکتی ہے مگر اس مرضی کے لئے واقعاً عام ہونے کے واسطے اسے اپنے کو قوانین میں ظاہر کرنا چاہیے جو "جملہ شہریوں پر مساویانہ جبراً ان کی طرف داری کرتے ہوں" امتیازات یا خاص معاملات کے فیصلوں میں (مقالۂ دوم، باب ۴) روسو کی

غلطی یہ ہے کہ (۱) وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مجموعے کا فیصلہ واقعی حیثیت سے کثرت کا فیصلہ ہے۔ اور (۲) کسی قانون کی نسبت یہ تیقن نہیں ہو سکتا کہ وہ سب پر یکساں اثر ڈالے گا جب تک کہ سب لوگ حالت اور ماحول کے اعتبار سے کُلیۃً یکساں نہ ہوں۔

مقالہ چہارم باب ۱ میں وہ یہ تشریح کرتا ہے کہ ایک صحیح الترکیب مملکت میں جس میں "بہت سے لوگ ملکر گویا ایک واحد جسم ترکیب دیتے ہیں" وضع قوانین ایک سادہ امر ہے، مفاد عامہ ہمیشہ نہایت ممتاز ہوتا ہے اور اس کے احساس کے لئے محض عقل سلیم درکار ہے مگر جب کہ منفردانہ مفاد محسوس ہو اور چھوٹی چھوٹی معاشرتیں بڑی پر حاوی ہو جائیں" تو ایسی حالت میں "مشیت عامہ" تباہ یا خراب نہیں ہوتی بلکہ مغلوب ہو جاتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ "مشیت ہمیشہ مستقل" ناقابل تبدیلی اور پاک صاف ہوتی ہے لیکن افراد اپنے شخصی اغراض کو عام اغراض پر مرجح سمجھتے ہیں۔ راشی رائے دہندہ میں بھی اس کا احساس مشیت عامہ فنا نہیں ہو جاتا مگر وہ جس امر کا اظہار کرتا ہے وہ "اپنا ذاتی مفاد" ہے۔ اس کی رائے سے ایک غلط سوال کا جواب ملتا ہے یعنی اس سوال کا جواب نہیں کہ "آیا یہ امر مملکت کے لئے مفید ہے" بلکہ اس سوال کا جواب کہ "آیا یہ میرے اور میرے فریق کے لئے مفید ہے؟ یا نہیں" وغیرہ وغیرہ مختلف مجالس میں قانون ترتیب عامہ یہ ہے کہ ہمیشہ سوال مشیت عامہ سے کیا جائے اور اسی سے جواب ملے ہم اس پر یہ خیال ظاہر کر سکتے ہیں کہ یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ روسو یہ خیال کرے کہ جو مقصد اس کے پیش نظر ہے وہ کسی "قانون ترتیب عامہ" سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اصلی مشکل فریقی اغراض کے باہمی تخالف میں مضمر ہے۔ مزید براں روسو کا یہ خیال ایک نفسیاتی غلطی پر مبنی ہے کہ "مشیت عامہ" اور "مفاد انفرادی" میں جو امتیاز ہے وہ واقعاً افراد کے دلوں میں مرعی ہوتا ہے، زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ عام افراد کے ذہن میں غرض عامہ کا تصور فی الحقیقت خود اپنی غرض کی پر زور خواہش سے متاثر ہو جاتا ہے۔

غلط نامہ ارتقائے نظم حکومت یورپ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۰	اکثر ہوتا ہے	اکثر ایسا ہوتا ہے	۱۴۷	۳	مخلف	مختلف
۲۲	۵	معل	عمل	۱۵۸	۱	لے	کے
۲۵	۷	دوایوائی	دوایوانی	۱۶۳	۶	وقوعہ	وقوعے
"	۱۰	عدیدیہ	عدلیہ	۱۶۶	۱	امر	آمر
"	۲۱	نایئبین	نائبین	۱۶۲	۸	سینیاتی	سیناتی
۲۶	۱۵	اقتدار	اثر و اقتدار	۱۶۶	۱۴	حیران	حیرانی
۳۵	۱۲	قدیم ترکوں	قدیم ترکون	"	۱۸	لیکینوس	لیکی نیوس
"	۱۸	کافی تھاءلہ	کافی تھائلہ	۱۷۷	۱۶	سیات	سینات
۴۶	۱۷	ساتھ ساتھ	ساتھ	۱۷۸	۴	حرات	جرأت
۵۹	۲۵	Aneient	Ancient	"	۱۵	پیذا	پیدا
"	۲۵	Dercent	Descent	۱۷۹	۵	تفیب	تقلیب
۷۰	۷	چنۂ عصیم	جثۂ عظیم	۱۸۲	۸	معائر	مغائر
۸۱	۴	ارفن	ارخن	"	۱۶	تققلیب	تقلیب
۹۱	۹	قسم	اس قسم	۱۸۸	۲۰	کھنے والے	رکھنے والے
"	۲۱	مفاہمت	اسی مفاہمت	۱۹۰	۸	جمیعت تعلق	جمیعت سے تعلق
"	۱۴	خیال ورواقعہ	خیال و واقعہ	۱۹۳	۲۲	منی	مبنی
۱۰۹	۱۶	محبکومین	محکومین	۱۹۵	۱۴	ایتھر	ایتھنز
۱۱۱	۲۴	فرست	فرصت	۲۱۳	۱۳	اوسطہ	اوسط
۱۱۴	۱۴	مقدُانوی	مقدونوی	۲۱۶	۹	تائد	تائید
۱۲۵	۴	بیں	ہیں	۲۱۹	۱۴	لی	کی
۱۲۹	۱	اختشام	اختتام	"	۱۹	مدعم	مدغم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۱	۲۰	یونائی	یونانی
۲۲۷	۱۱	کوہِ آلپس	کوہِ الپس
۲۳۳	۱۷	انجام دیتے تھے	انجام دیئے تھے
۲۳۴	؍	خصہ	حصہ
۲۳۵	۲۰	نقل	نقل
۲۳۹	۲۲	شیوح	شیوع
۲۴۰	۱۳	قرنیکی	فرینکی
۲۶۷	۱۱	اہی	اسی
۲۷۳	۲۴	ہیبت ناک	ہیبت ناک
۲۷۷	۷	گر	مگر
۲۷۸	۲۱	حصیص	حصص
۲۷۹	۲۲	رچڑر	رچرڈ
۲۹۷	۱۴	کرہستان	کوہستان
۳۰۰	۴	جیین	جٹینین
۳۲۱	۸	انطیاق	انطباق
۳۲۲	۲۲	یوں بعید	بون بعید
۳۲۴	۲۴	منافشات	مناقشات
۳۲۹	۲	گرجائیں	گرجامیں
[illegible]	۲۰	پوڈنا	پوڈستا
۳۳۱	۱۴	ادرن کا کام	اوران کا کام
۳۳۸	۱۸	جاتے ہے	جاتے تھے
۳۵۳	۹	قسس	قسیس
؍	۱۰	اس ظلم	جواس ظلم
۳۷۴	۹	محدوود	محدود
۳۸۱	۹	مناقی	منافی
۴۰۰	۱۳	یہلی	پہلی
؍	۱۸	بدادا	مدارا
۴۰۴	۳	تعلب	تغلب
؍	۱۶	رہِ سکے	رہ سکے
۴۰۶	۱	آپ کو آب	آپ کو اپ
۴۱۴	۲۲	اسے	ایسے
۴۲۰	؍	خلاف وزی	خلاف ورزی
۴۲۴	۲۱	ریولو	ریویو
۴۲۴	۲۲	جانس	جانسن
۴۲۷	۵	میں	مین
؍	۱۳	عوبیت	عمومیت
۴۳۲	۱۶	یہ نسبت	بہ نسبت
۴۳۳	۱۳	حب	جب
۴۶۲	۲۵	سیا میلت	سیاسیات
۴۶۸	۲۰	اپنی پسندگی	اپنی پسند کی
۴۷۱	۹	ینشاگ	رینشاگ
۴۷۳	۱۸	کام لا سکے	کام میں لا سکے
۴۷۵	۲	لیوس	لوئیس
۴۸۰	۱۲	کزیا گیا ہے	کر دیا گیا ہے
۴۹۲	۶	دقاقی	وفاقی
۴۹۳	۱۰	ییٹرول	ٹیرول

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۹۳	۱۳	بیش	پیش	۵۰۳	۲	قصبے	قبضے
"	"	سوراج	حکومتِ خود اختیاری	۵۰۴	"	جب آزادی	جُہد آزادی
"	۱۸	قواین	قوانین	"	۲۵	غلط لمط	غلط ملط
۴۹۴	۱	اصلاحات	اصطلاحات	۵۰۶	۱۰	پیشین گوگی	پیشین گوئی

تمت